@TaleefatHakeemUlUmmatThanvi

تسہیل المواعظ

جلد دوم

مرتب

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ

مکتبۃ العلم

۱۸- اردو بازار لاہور۔ پاکستان

حضرت حکیم الامت کے تسہیل شدہ باون ۵۲ خطبات

تسہیل المواعظ

جلد دوم

@TaleefatHakeemUlUmmatThanvi

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا
شاہ محمد اشرف علی تھانوی
رحمۃ اللہ علیہ

دو جلدوں میں

اس "تسہیل المواعظ" کے متعلق حضرت حکیم الامت کا ارشاد
"احقر" کا مشورہ ہے کہ مثل "بہشتی زیور" کے کوئی گھر اس سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ اس کا نفع گھر والوں کی درستی میں بہت جلد آنکھوں سے نظر آ جائے گا

فقط کتبہ اشرف علی اوائل محرم ۱۳۲۵ھ

ناشر
مکتبۃ العلم
۱۸۔ اردو بازار ٥ لاہور ٥ پاکستان
Ph:7231788- 7211788

ایڈمن
محمد طلحہ نذیر

نام کتاب: ——— تسہیل المواعظ

تالیف: ——— حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

طابع: ——— خالد مقبول

مطبع: ——— لعل سٹار پرنٹرز

@TaleefatHakeemUlUmmatThanvi

ملنے کے پتے

- مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ ☎ 7224228، 7221395
- اسلامی کتب خانہ فضل الٰہی مارکیٹ، چوک اردو بازار، لاہور۔ ☎ 7223506، 7230718
- خزینۂ علم و ادب الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ ☎ 7314169
- کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی۔ ☎ 5554798
- مکتبہ مجددیہ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ ☎ 7231294

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لئے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔

(ادارہ)

@TaleefatHakeemUlUmmatThanvi

تسہیل المواعظ کے متعلق رائے مبارک

از

حضرت اقدس مولانا حاجی محمد شریف صاحب مدظلہم العالی

خلیفہ راشد

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرۃ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت حکیم الامت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف، تالیفات، ملفوظات، مکتوبات اور مواعظ رشد و ہدایت کا بے بہا خزینہ اور گنجینہ ہیں۔ حضرت کے مواعظ نے لاکھوں اشخاص کے دل بدل دیئے۔ دین سے بھاگنے والے دین کے عاشق بن گئے۔ حضرت رشد و ہدایت کی ایسی شمع روشن فرما گئے کہ مدت مدید تک کے لیے کتاب اور سنت کا طریقہ واضح ہو گیا جس طریق پر رسوم اور بدعات کا غبار بیٹھ گیا تھا اور حقیقت چھپ گئی تھی۔ حضرت کے مواعظ کی برکت سے ہزاروں گمراہ اشخاص انسانیت اور نیکی کے درجۂ کمال کو پہنچے اور اخلاقی بیماریوں سے شفایاب ہوئے۔ حضرت کی بہت ہی خواہش تھی کہ ''تسہیل المواعظ'' کا سلسلہ جاری ہو، تاکہ نفع عام ہو۔ حضرت کی زندگی مبارک میں باون مواعظ کی تسہیل اور اشاعت ہو چکی تھی۔ حضرت کی تمنا تھی کہ ہر گھر میں مواعظ پہنچ جائیں لیکن اب یہ مواعظ نایاب تھے۔ مجھے دلی خوشی ہے کہ مواعظ چھپ گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو مقبول اور منظور فرمائیں۔

۲۴ رجب ۱۴۰۳ھ　　　محمد شریف مکان نمبر ۷۰۹، نواں شہر، ملتان

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

(۳۳) عالموں کی ضرورت

دنیا میں سب سے زیادہ ضروری وجود کس کا ہے؟ 34
دنیا کی کامیابی کے لیے بھی سب سے زیادہ ضروری عالموں کا وجود ہے اگر چہ لوگ اس کے خلاف کا دعویٰ کرتے ہیں 34
سب مسلمانوں کو پورا عالم بنانا ضروری نہیں اور نہ یہ مولویوں کا مقصود ہے! 35
عالموں سے تعلق اور محبت رکھنا سب کے لیے ضروری ہے 36
عالموں کے ساتھ تعلق اور محبت رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ 36
شریعت اپنے حسن میں یکتا ہے 36
واقعی ہم میں عقل کے دعویدار مولویوں کو ناکارہ سمجھتے ہیں 37
تعلیم اور معلموں کی ضرورت کس درجہ کی ہے 37
آنحضرت ﷺ کو فقر پسند تھا اپنی اولاد کے لیے بھی پسند فرمایا 38
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی چکی چلانے کا قصہ 38
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دنیا سے بے رغبتی 40
قرآن اور دین کی تعلیم کو آجکل لوگ وقت کا ضائع کرنا کہتے ہیں 40
آج کل آخرت سے بہت غفلت ہے اس کی نظیریں موجود ہیں 41
سمجھدار وہ ہے کہ جس کی انجام پر نظر ہو 42
جب علم دین اور اسکی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہو تو یہ وقت کا ضائع کرنا نہیں 43
عالموں سے الگ رہنے کا کمزور عذر اور اس کا جواب مثال کے ساتھ 43
عالموں سے صرف اعتقاد مفید نہیں ان سے دین کا فائدہ حاصل کرنا چاہیے اور خالی اعتقاد رکھنے کی ایک مثال 44
برتاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ عالموں کو نکما سمجھتے ہیں 44
دنیا کمانے کے لیے بڑے عالی دماغ ہونے کی ضرورت نہیں اور دینی علم کے حاصل کرنے کے لیے بڑے عالی دماغ کی

ضرورت ہے 46

جواب اس شبہ کا جو مولوی بن کر کھانے کمانے سے رہ جاتے ہیں' کمانا کھانا ایک معمولی حاجت ہے 46

ایک امیر اور غریب کی حکایت 46

وہ کون سی چیز ہے جو دینی خدمت کرنے والوں میں نہیں ہے 48

دنیا کی ترقی مقصود نہیں بلکہ اس کا خلاف مقصود ہے 48

جس کو جس شئے سے رغبت نہیں ہوتی اس میں ترقی نہیں کرتا 49

دین دار اور دنیا دار دونوں چست بھی ہیں اور ست بھی 49

قیامت میں فیصلہ سمجھ میں آئے گا 49

دنیا سے نکما ہونا عالموں کا فخر ہے اور یہی ان کا جوہر ہے 50

عالمگیر کی علم اور مولویوں سے دلچسپی کی حکایت 50

امیروں کو عالموں سے دلچسپی ہونے کا فائدہ 51

ہارون رشید کی درخواست کہ امام مالک رحمہ اللہ شہزادوں کو پڑھائیں 51

بعض رئیس جماعت میں شریک نہیں ہوتے' اس عذر سے کہ ہمارا رعب جاتا رہے گا۔ اس کا جواب 51

آنحضرت ﷺ کے خلیفوں رضی اللہ عنہم کا رعب 52

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تواضع کا قصہ 52

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیبت اور رعب کا قصہ 52

الگ تھلگ رہنے کے ساتھ جو رعب ہوتا ہے اس کی مثال 53

آج کل عالموں کو امیروں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے 53

اُردو کی دینی کتابوں کا کافی ہونا 53

دینی کتابیں وہ ہیں جو باعمل عالموں کی لکھی ہوئی ہیں تردید دین نیچریوں کی 54

اس وقت مردوں اور عورتوں نے پڑھنے کے لیے کتابیں اپنی رائے سے تجویز کر لی ہیں اور وہ مضر ہیں 54

اولاد کیلئے تعلیم سے زیادہ ضرورت نیک صحبت کی ہے اور ایسی صحبت کی فضیلت 55

خلاصہ درستی کے طریقے کا 55

عربی علم اگر دین کے لیے نہ پڑھایا جائے تو دنیا ہی کے لیے پڑھاؤ وہ بھی بیکار نہ

جائے گا 55

پہلی آیت کی تفسیر اور مولویوں کی ضرورت کو اس سے ثابت کرنا 56

دین کا نہ ہونا فساد کا سبب ہے اور اس دعویٰ کو ثابت کرنا 57

دین حقیقت میں پانچ چیزوں کے مجموعے کا نام ہے 58

دین کی چیزوں میں لوگوں نے نفرین کردی 58

دین کی پانچوں چیزوں کو جدا جدا امن قائم کرنے اور فساد کے مٹانے میں دخل ہے 59

اخلاق اور معاملوں کا دخل تو ظاہر ہے! 59

عقیدوں کا عام طور پر امن میں دخل ہے 59

شریعت کے اعمال کا امن قائم کرنے میں دخل 61

روزہ اور زکوٰۃ 62

حج 62

شریعت کے تجویز کیے ہوئے طرز زندگی کو عام امن میں دخل ہے 63

عقیدے اور عبادتیں اور معاشرت کے لیے عام امن میں دخل ہونیکی ایک وجہ جوان تینوں میں پائی جاتی ہے 64

دین کی درستی کا دنیا کی درستی میں دخل ہونے کی تیسری تقریر 64

دین کا کام دنیا کی نیت سے کرنا نہایت بے تمیزی اور کمینہ پن ہے 64

کام کے وقت فائدوں پر نظر نہ کرنا چاہئے ورنہ وہ کام خراب ہوگا! 65

حدیث لایقوم الساعة حتی لایقال فی الارض الله الله کا بیان اور اس کی شرح 66

یہ نتیجہ نکلنا کہ سب سے زیادہ عالموں کا وجود ضروری ہے 67

طالب علموں کو اپنی درستی کی تعلیم 67

عام لوگوں سے کہنا کہ بدعمل اور بے عمل مولویوں کی اتباع نہ کرو مگر خدمت ان کی کرتے رہو 68

دینی علم کو جو طلب کرے اس کو تعلیم دینا چاہیے چھانٹنا درست نہیں! 68

وعظ کا خلاصہ 69

خاتمہ اور دعا 70

(۳۴) نجات کا طریقہ

عبرت کے معنی 71

ضرورت کا بیان 72

طب یونانی میں مرض جس قدر سخت ہوتا ہے

اسی قدر علاج بھی سخت ہوتا ہے 72
طب ایمانی میں ہر مرض کا علاج اور نسخہ بہت آسان ہے 73
آیت ماجعل علیکم فی الدین حرج اور یرید اللہ بکم الیسر پر اس شبہ کا جواب کہ دین میں تنگی ہے 74
قانون کو سوائے قانون کے بنانے والے کے کوئی نہیں بدل سکتا 78
جواب کا بقیہ: شریعت میں تنگی نظر آنے کا راز 80
جواب کا بقیہ: ایک مثال 80
عقل کی تجویزیں سخت ہیں اور دین سہولت کی تعلیم کرتا ہے 81
مسلمانوں میں کیا مرض ہے اور کس قدر سخت ہے؟ 81
ہمارے دین اور دنیا دونوں تباہ ہو رہے ہیں 82
لیڈروں کا خیال کہ دنیا کی اصلاح سے دین کی درستی ہوتی ہے اس کی تردید 82
دین کے اندر نافع اچھا دل ہے اور اچھے دل کی مثال 83
مال کس کے لیے نافع ہے؟ 83
آمدنی کی بہت سی ناجائز گھڑی ہوئی صورتیں 84
عالموں سے مسئلوں کو دریافت کرنا یہ کوئی عار کی بات نہیں 84
مولوی دین کی باتیں سکھلانے والے ہیں دنیا کے کام کے نہیں اور یہی ان کا کمال ہے 85
دین کی درستی کیساتھ دنیا کی درستی بھی ہوتی ورنہ پریشانی ہے 86
ایک لطیفہ بطور مثال 87
مال اور اولاد یعنی دین سے دنیا میں بھی عذاب کا آلہ ہے چنانچہ اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے 88
دین دار کو پریشانی نہیں ہوتی گو کسی مصیبت سے طبعی رنج ہو 89
بزرگان دین فقر و فاقہ کے اندر بھی مزے میں ہیں ایک حکایت شاہ ابوالمعالی صاحب کی 90
حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے فقر و فاقہ کی حکایت 91
بزرگوں کی حالتوں کو انکار کی نظر سے دیکھنے والے کی مثال اور اس کا شافی جواب 91

جس طرح دنیا تباہ ہے اسی طرح ہماری دین کے اعتبار سے بھی حالت خراب ہے	92
عقیدوں اور توحید کے اندر ہم نے کیا گڑبڑ کر رکھی ہے	92
عبادتوں کی کیا گت ہے	92
معاملوں کو بھی دین سے بالکل خارج سمجھتے ہیں	92
ہماری معاشرت کی کیا حالت ہے؟	93
ہماری وضع اور لباس کی کیا کیفیت ہے	93
داڑھی رکھنا مسلمانوں کی علامت ہے اور اس کی اس وقت پرواہ نہیں	93
حکایت	93
ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب کرنا	95
ہمارے اخلاق کی حالت	96
ہمارے مرض کا علاج اور اس کی دو قسمیں	97
اصلی مرض دو ہیں علم دین کی تعلیم نہ ہونا اور نیک صحبت نہ ہونا	98
سب کا مولوی بنانا عالموں کا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ جائز بھی نہیں	99
عالموں کو مستغنی ہونے کی تعلیم	102
بزرگوں کی صحبت کی ضرورت	103
محنت کی ضرورت کو تمدنی پہلو سے ثابت کرنا	103
اصلاح کے لیے کامل علم بقدر ضرورت علم اور نیک صحبت کی ضرورت ہے اور ہر ایک کے حاصل کرنے کا طریقہ	105
جاہل واعظوں کی حکائتیں اور یہ کہ وعظ معتبر عالم سے سننا چاہیے	105
واعظوں اور عالموں کا ایک مرکز ہونا چاہیے	106
مدرسوں کا سارا انتظام مولویوں پر نہیں رکھنا چاہیے بلکہ مولوی اپنا کام کریں اور رئیس چندہ دیں اور وصول کریں	106
ایک بھانڈ کی حکایت	107
عالموں کو توکل اور مستغنی رہنے کی تعلیم	107
اسلامی مدرسہ قائم کرنے کی ترغیب دینا اور اس کا طریقہ	108
عمل کرنے کے لیے بقدر ضرورت علم حاصل کرنے کا طریقہ	108
نیک صحبت کی ضرورت اور اس کے فائدے اور اس کی ترغیب دینا اور اس کا طریقہ اور بری صحبت کی مضرتیں	109
نیک صحبت میں رہنے کے قاعدے	114

نیک صحبت کا بدل 115
ابتدائی حالت میں تصوف کی کونسی کتاب قابل دیکھنے کے ہے اور کونسی نہیں ہے 116
وعظ کا حاصل 116
خاتمہ اور دعا 116

(۳۵) محبت کے آثار

جو شخص محبت کی شدت سے خالی ہے اور دین کی باتوں سے مسخرہ پن کرتا ہے وہ مسلمان نہیں 119
محبت کی مضبوطی کے درجے مختلف ہیں 121
ہر شخص کو علامتوں سے غور کرنا چاہیے کہ مجھ میں اللہ تعالیٰ کی محبت کس درجہ کی ہے 122
محبت کی علامتیں اور وہ ہم میں موجود ہیں یا نہیں! 122
دنیا کی دولت بہت جلد چھوٹ جانے والی ہے 123
ایمان کی دولت ہی ساتھ رہنے والی ہے 124
خدا کی محبت کے پیدا ہونے کی تدبیر 124
محبت کے حاصل کرنے کا طریقہ موقوف ہے علم دین پر اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ 125
بعض لوگ آخرت کے عذاب کو سن کر کہا کرتے ہیں کہ اللہ غفور رحیم ہے 127
دوزخ سے بچاؤ ایمان اور محبت کی تکمیل سے ہوتا ہے 127
دونوں جہان کی راحت ایمان سے ہے 127
راحت کس چیز کا نام ہے 128
بزرگوں کی مصیبتوں سے طبعی رنج ہوتا ہے پریشانی نہیں ہوتی 129
خدا تعالیٰ کی محبت کی علامتیں اور ہر وقت یاد کرنے اور اطاعت کرنیکی رغبت دلانا 129
ہر عمل اور ہر خلق میں ہم نے شریعت کے خلاف نیا طریقہ اختیار کیا ہے 129
شادی اور غمی کی رسموں کو چھوڑنا ضروری ہے 130
تمام رسموں کے ناجائز اور بری ہونے کی مختصر دلیل 130
ثواب بخشنے کا طریقہ 135
شادی اور غمی کی رسموں کے بے اصل ہونے کو حضور ﷺ کے فعل سے ثابت کرنا 135
کامل محبت کے دو اثر ہیں 135
خدا تعالیٰ ہی کامل محبت کے مستحق ہیں 136
محبت کے اسباب 136
محبت کے حاصل کرنے کی ترغیب دینا 136

دعا بھی محبت کے حاصل کرنے کے طریقے میں بڑی چیز ہے 137

(۳۶) دنیا کی پونجی

آج کل مسلمانوں کا برتاؤان کو آخرت کا منکر بتارہا ہے 140

آخرت خالی ذکر سے درست نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے تدبیر کرنا چاہیے 141

دنیا کی خوشی اور رنج قابل التفات نہیں اور آخرت کی دونوں چیزیں قابل اہتمام ہیں 142

دنیا کی خوشی اختیاری نہیں آخرت کی اختیاری ہے 142

اللہ والے ہمیشہ خوش رہتے ہیں 143

راحت روپے پیسے کا نام نہیں 143

دنیا کی مصیبت قابل اہتمام نہیں 144

آخرت کی ترغیب اور دنیا کا ترک 144

دنیا کی مثال اور آخرت کی ترغیب 145

دنیا داروں کو موت سے بہت خوف ہے اور اللہ والے اس سے خوش ہوتے ہیں 146

دنیا کی حقیت سمجھنے کے بعد بہت غم کم ہو جاتے ہیں 147

دنیا سے کتنا تعلق رکھنا چاہیے 150

دنیا کی محبت دل سے نکال دینے کا طریقہ 152

(۳۷) بیان کی تعلیم

تمہید وضرورت وعظ 154

واردات کا توافق مقبولیت کی علامت ہے 154

تفسیر آیت ''الرحمٰن علم القرآن'' الخ اور مقصود وعظ 155

نعمت بیان پر نعمت قرآن وخلقت انسان کو کیوں مقدم کیا گیا 155

تعلیم قرآن پر توجہ نہ کرنے کی شکایت 156

تقریر میں ملمع سازی اور تصنع کا منشاء 156

اہل اللہ کے سادہ الفاظ میں شستہ تقریروں سے زیادہ خوبی اور دلچسپی ہوتی ہے 157

اہل حق اور جدید طرز کی تقریروں میں فرق 157

اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیکچر دینا نہیں آتا 158

حدیث نَحْنُ اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ کے معنی 158

اہل علم میں بھی رائج الوقت زبان کا طرز آتا جاتا ہے جو ہماری مادری زبان کی خصوصیت کے خلاف ہے 159

اردو کے حامیوں کے لیے اس کی خصوصیات کی حفاظت ضروری ہے 159
ہماری اصلی زبان عربی ہے 159
عربی زبان کی حفاظت نہ کرنے پر افسوس 160
زبان بدلنے کا اصلی سبب 160
اردو زبان کونسی معتبر ہے 161
حق تعالیٰ جس چیز کی جب تک ضرورت ہوتی ہے پیدا کرتے ہیں ضرورت کے بعد پیدا نہیں فرماتے 163
قوتِ بیانیہ بڑی نعمت ہے 165
وعظ اور تقریر و تدریس کے آداب 165
آج کل مجلسوں اور جلسوں کا نام نئے طرز کا رکھتے ہیں 167
تقریروں کے اندر اخلاص کی تعلیم اور نئے طرز کی تقریر سے ممانعت 168
خاتمہ و دعا 169

(۳۸) گناہ کا نقصان

گناہوں سے طاعت کی برکت کم ہو جاتی ہے 170
گناہ کرنے سے طاعت کا ثواب نہ جائے گا 171
باوجود گناہوں کے نیک کاموں کا ثواب ملے گا 174
بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہم کچھ بھی کریں ہم کو گناہ نہیں ہوتا 175
گناہ کرنے سے نیک عمل کی برکت ضائع ہونا' مع ایک مثال 178
گناہ کی دو قسمیں' اور ہر ایک کا طاعت پر کیا اثر؟ 179
حضور ﷺ کی شان میں بے ادبی کرنے سے اعمال برباد ہو جاتے ہیں 180
شریعت صرف نماز روزہ کا نام نہیں بلکہ معاشرت اور معاملات بھی اس میں داخل ہیں 180
یہ خیال غلط ہے کہ ہم لوگ تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں 182
بزرگوں سے ملنے کے آداب 183
پیر و مرشد سے اپنا مرض اور عیب صاف بیان کرنا چاہیے 184
ادب کی تعلیم 186
روزے میں گناہ چھوڑنا زیادہ ضروری ہیں 189
نفس کی خصلتیں' اور اس کو قابو میں لانے کی تدبیر 190

نفس کے ساتھ زیادہ نرمی وسختی دونوں مضر ہیں 192
رمضان میں تقویٰ اختیار کرنے کی برکت 192
پیٹ کو حرام غذا سے خاص کر رمضان میں ضرور بچانا چاہیے 193
ناپاک اور حرام چیز جانوروں کو بھی کھلانا منع ہے 194
وعظ کا خلاصہ 195

(۳۹) نفس کی اصلاح

وعظ کا مقصود 196
اس مضمون کے اختیار کرنے کی وجہ 197
آخرت کی فکر کرنا کتنا ضروری ہے 197
بعض لوگ مصیبت کے وقت کہا کرتے ہیں کہ ''کرتو ڈر نہ کرتو ڈر'' یہ بڑی جہالت کی بات ہے 199
گناہوں سے غفلت سخت مرض ہے 200
ایک مکتب کے لڑکوں کی حکایت 200
ایک نائن کی حکایت 201
گناہ کی سزا فورا ملنا ضروری نہیں ہے 202
آخرت سے ہم کو بہت نفرت ہے 203
ہم میں جو دیندار ہیں علاج کا فکر ان کو بھی نہیں 203
گناہوں پر صرف رونے سے' بغیر تدبیر کے کام نہیں چلتا 204
دل کی بیماریوں کی اصل تدبیر 204
صرف رونا گناہوں کا علاج نہیں 205
ایک بدو کی حکایت 205
بعض لوگ بزرگوں کی توجہ کو گناہوں کا علاج جانتے ہیں 206
ایک سوداگر کے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے حج کے لئے دعا چاہنے کی حکایت 206
ابو طالب کا باوجود حضور ﷺ کی کوشش کے ایمان نہ لانا 206
ارادہ اور آرزو میں بڑا فرق ہے 207
یوسف علیہ السلام کی بلند ہمتی کی حکایت 208
آخرت کے کاموں کے لیے فراغت کا انتظار کرنا نفس کا حیلہ ہے 208
حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکایت 209
ہم کام کا ارادہ نہیں کرتے ہمارا ارادہ صرف ہوس ہے 210
بزرگوں کی توجہ کب مفید ہوتی ہے 210
صرف ارادہ بھی بغیر بزرگوں کی توجہ کے کافی

نہیں 210
خالی مرید ہونا بغیر اپنی کوشش کے کافی نہیں 211
ایک مکار پیر کی حکایت 211
جب دین کا کام پیر صاحب کے بھروسہ پر چھوڑے جاتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ دنیا کے کام نہیں چھوڑے جاتے 212
اودھ کے ایک پیر کی حکایت 212
پیر کا کام صرف رستہ بتانا ہے 213
توجہ کے اثر کی مثال 213
دو بزرگوں کی حکایت 213
کامل پیر آہستہ آہستہ اصلاح کرتا ہے 214
اہل و عیال کو چھوڑ دینا کمال نہیں 214
بزرگی کی اصلی پہچان 215
بے ہوش کر دینا بزرگی نہیں 215
مدینہ کے سفر میں سراقہ کے ملنے کا قصہ 215
پہلے زمانہ میں سچائی کی صفت عام طور پر تھی 216
ایک پرانے بزرگ کے بھولے پن کی حکایت 216
نظر اور توجہ سے کیا نفع ہے 217
حضرت حافظ شیرازی رحمہ اللہ کی حکایت 217
اچھی لیاقت والوں کو تھوڑی محبت بھی کافی ہوتی ہے 218
سلطان الاولیاء رحمہ اللہ کی حکایت 218
محنت کرنے پر بھی جو کچھ ملتا ہے وہ خدا کا فضل ہے 219
وعظ کا خلاصہ 219
خوف اور امید دونوں کی ضرورت 221
آخرت کی فکر کے یہ معنی نہیں کہ دنیا کے سب کام چھوڑ دو 221
اصلاح کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں دین کا علم اور بزرگوں کی صحبت 221
دنیا کے واسطے بزرگوں سے تعلق پیدا مت کرو 222
اپنے کام کے لیے خود بھی دعا کرو 222
آخرت کی فکر ہمیشہ ہونی چاہیے 223

(۴۰) نیک کاموں کے درجے

نہ سب نیک کام برابر ہیں اور نہ سب گناہ برابر ہیں 225
افضل کی پہچان میں علماء اور عوام دونوں کی غلطی 226
عام لوگوں نے افضل کی کیا پہچان مقرر کی ہے 227

طالب علموں کی خدمت کرنے کو عام لوگ عبادت نہیں سمجھتے 227
حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو فضیلت دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم پر خدمت دین کی وجہ سے ہے 228
طالب علم کو کھانا کھلانے میں کس قدر ثواب ہے 229
بلاضرورت مسجد بنانے کی خرابیاں 230
لطیفہ 230
لوگ قرآن دینے کو ثواب سمجھتے ہیں مسئلہ کی کتاب دینے کا ثواب نہیں سمجھتے 230
افضل ہونے کی عام لوگوں کے نزدیک دوسری پہچان 231
تیسری پہچان 231
کامل کی پہچان میں عام لوگوں کی غلطی 231
عبادت کی تحقیق 232
زیادہ بھوک کے وقت کھانے سے نماز سے پہلے فراغت کرنا واجب ہے 233
افضل ہونے کی صحیح پہچان 234
حضرت حاجی صاحب کی حکایت 234
ایک حکایت 235
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ برتاؤ 235
حضور صلی اللہ علیہ وسلم آواز سے کبھی نہ ہنستے تھے 235
حضرت عیسیٰ ویحییٰ علیہما السلام کی حکایت 235
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کبھی کبھی مسکرانے کی وجہ 236
مثنوی کے ایک شعر کا مطلب 236
کھانا پینا چھوڑنے کا نام بزرگی نہیں ہے 237
بزرگی کی اصل پہچان 237
کم کھانے کی حقیقت 238
ایک مرید کی حکایت 238
بزرگوں نے جو کم کھانے اور کم سونے کا حکم فرمایا ہے اس کا مطلب 238
ایک بزرگ کی حکایت 238
مرید کو ملازمت اور اپنے کاروبار کا چھوڑنا بعض اوقات نقصان دیتا ہے 239
پیر کے اندر کیا بات ہونی چاہیے 240
کامل کی پہچان میں عام لوگوں کی غلطی دل کے جاری ہونے کی حقیقت 240
بوٹیاں تھرکنا کمال نہیں 241
پیر کے کمالات کیا ہیں؟ 241
سرحد کے ایک عابد حکایت 241
آج کل دین کی سمجھ نہیں رہی 242
ایک سرحدی کی حکایت 242
اکثر لوگوں کی عبادت حق تلفی کا ذریعہ ہوتی

ہے 243

کیفیت کی حقیقت 244

ایک بزرگ کی حکایت 244

کونسی کیفیتیں مفید ہیں 244

گناہ کے ساتھ کیفیت اگر ہو بھی تو بیکار ہے 244

محنت اور مجاہدہ سے کیا مقصود ہے؟ 245

افضل ہونے کی صحیح پہچان 245

تمام کاموں میں افضل ایمان ہے اور جو ایمان سے زیادہ تعلق رکھے 246

کافروں کو مسلمانوں پر فضیلت دینا بڑی غلطی کی بات ہے 246

مسلمان کتنا ہی عیب دار ہو کافر باکمال سے افضل ہے 247

مسلمان عیب دار کی کافر باکمال سے افضل ہونے کی مثال 247

دوسری مثال 247

افضل وہ کام ہیں جن سے اسلام کو مدد پہنچتی ہے 248

جس کام کی ضرورت ہو اس کو کرنا چاہیے خواہ وہ ادنی درجہ کا ہو 249

گناہوں میں بھی فرق ہے لیکن چھوڑنا سب کا ضروری ہے 250

اس وعظ کا تعلق پہلے وعظ سے 250

(۴۱) دنیا سے رضامندی

تعریف یا برائی صفات کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ ذات کی وجہ سے 252

جن آیتوں میں کافروں کی مذمت کی گئی ہے اس سے مسلمانوں کی عبرت پکڑنی چاہیے 253

ایک مثال 254

مایوسی کی راحت ہونے کی ایک مثال 255

کافر سے مسلمان کو تھوڑی سزا ہونا بے فکری کا سبب نہیں بلکہ زیادہ فکر کا سبب ہے 255

خلاصہ اس شبہ کے جواب کا کہ آیت کافروں کے حق میں ہے مسلمانوں کو اس سے کیا تعلق 256

دوزخ خاص کافروں کا ٹھکانا ہے مسلمان اس میں کافروں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کی وجہ سے جائیں گے کافروں کی مشابہت سے کیا مراد ہے 256

جنت خاص دینداروں کے لیے ہے 257

ابوطالب کا واقعہ 258

صحابہ رضی اللہ عنہم مولود شریف کس طرح کرتے

تھے (حضور ﷺ کا ذکر) 260
مولود شریف کی رسم کی بنیاد کیا ہے 260
رسم مولد پر عرب کے فعل سے سند پکڑنا صحیح نہیں 261
شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ کی حکایت 261
آجکل حضور ﷺ کیساتھ کیسی محبت ہے اس پر ایک حکایت 261
ابو طالب کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا 262
آیت میں کن کن باتوں پر لتاڑا گیا ہے 262
راضی ہونے اور دل لگانے میں فرق 263
دنیا کو پسند کرنے کا عیب اکثر مسلمانوں میں بھی ہے 264
مولویوں اور فقیروں میں بھی یہ مرض ہے 264
فقیروں کی بے قدری لالچ کی وجہ سے ہوئی 265
ایک جج صاحب کی حکایت 265
علم دین کی ترغیب 266
دنیا سے جی لگانے کا بیان 267
جو دنیا کی حقیقت سے واقف ہیں وہ اس سے گھبراتے ہیں 268
دنیا کی محبت زائل ہونے کی آسان ترکیب 268

(۴۲) دوسروں سے عبرت پکڑنا

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں 269
مرض دو قسم کے ہیں 269
دین کے اندر بے پروائی کی شکایت 270
شرع کی ہر بات طبیعت کے مناسب ہے 271
حضور ﷺ کی تعلیم مصلحت کے موافق ہے 272
ایک چور کی حکایت 272
اخبار کی حقیقت اور اخبار بینی میں حد سے تجاوز کرنا 273
طاعون سے ہم کو عبرت نہیں ہوتی 274
طاعون کا سبب بیان کرنے میں دنیا والوں کی غلطی 274
مولوی ظاہری اسباب کا انکار نہیں کرتے 275
ایک کافر بادشاہ کی حکایت 276
غم کے وقت توبہ کرو 277
مصیبت کے وقت خدا ہی کی طرف توجہ کرنا علاج ہے مع ایک حکایت کے 277
دنیا کی راحت بھی شرع پر چلنے میں ہے 278
طاعون کا ایک سبب وہ گناہ ہے جو قوم لوط علیہ السلام میں تھا 278

لواطت کا مرض عام ہو گیا ہے 279
نظر بازی کا مرض پرہیز گاروں میں
بھی ہے 279
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت 280
لڑکوں کی طرف توجہ کرنے کا مرض تھوڑی سی
ہمت سے چھوٹ سکتا ہے 280
حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک باہمت
مرید کی حکایت 280
بدنظر کی خرابیاں 282
ایک جھوٹے عاشق کی حکایت 282
محبت کی نشانی 282
لڑکوں سے تعلق رکھنے کی برائی 283
ایک بزرگ کے وجد کی حکایت 284
کسی عورت یا لڑکے سے گانا سننا بھی
بدکاری میں داخل ہے 285
ایک بادشاہ کی حکایت 285
واعظ کو عورتوں کے مجمع میں خوش آوازی سے
شعر نہیں پڑھنے چاہئیں 286
بدکاری گناہ کا خاص سبب ہے 286
ہر مصیبت کو گناہ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اور اس
سے عبرت پکڑنا چاہیے! 287
کسی کے مر جانے سے بھی عبرت حاصل
کرنی چاہیے 287
غفلت اور سخت دلی کا عام ہونا 288
جب مصیبت زدہ کو دیکھیں تو کیا کہنا
چاہیے 288
ایک عجیب حکایت عبرتناک 289
ہماری غفلت ظاہری اسباب پر نظر ہونے کی
وجہ سے ہے 289
تقدیر کے مقابلہ میں اسباب ظاہری کوئی چیز
نہیں 289
طاعون وغیرہ کی صحیح تدبیر 290
جواب اس شبہ کا کہ جب مطیع پر بھی مصیبت
آتی ہے تو اطاعت سے کیا فائدہ 290
مطیع مصیبت سے پریشان نہیں ہوتا مع
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکایت 290
ایک بزرگ کا حکایت 291
وعظ کا خلاصہ 292

(۴۳) علم کی طلب

بیان کی ضرورت 293
حدیث کی شرح 294
شریعت کی نظر میں علم صرف دین کا علم ہے نہ
دنیا کا 294
حدیث کا مقصود کیا ہے 295

دنیا کے طالب کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا 296
ترقی دنیا کی منع نہیں لیکن مقصود بنانا منع ہے 296
علم کا طالب بھی علم سے سیر نہیں ہوتا 297
دنیا کمانا طلب دین کے خلاف نہیں 297
آجکل طلب علم کی کوشش نہیں 298
معاملات اور اخلاق اور رہنے سہنے کے طریقے بھی دین کے جزو ہیں 298
ہر کام کے لیے شرع کا قانون موجود ہے اور اسپر عمل کرنا ضروری ہے 299
شرع میں تنگی نہیں 299
لباس اور وضع بھی شرع کے موافق ہونا ضروری ہے 300
کھانے کی چیزوں کے متعلق بھی شرع کا قانون ہے 301
قانون کی وجہ پوچھنے کا ہم کو حق نہیں اور اس پر ایک لطیفہ 302
عقل کے خلاف سمجھنے کی وجہ سے بعض مسئلوں پر عمل نہیں کرتے 302
مکان کے کرایہ میں قصاب سے سستا گوشت لینا 302
زمین کی چرائی میں بکرا لینا ناجائز ہے 303
اسلام علیکم کی جگہ بندگی اور آداب کہنا 304
علماء کے اخلاق بھی درست نہیں 305
جس چیز کو دین سمجھتے ہیں اس کی بھی تحقیق نہیں کرتے 306
لوگوں کو دین کی طلب نہیں 306
علم کی طلب سے کیا مراد ہے 306
حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت 307
اللہ تعالیٰ زبان کو نہیں دیکھتے 307
حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اسہد کہنا 307
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکایت چرواہے کے ساتھ 307
طلب علم کی ترغیب ہر مسلمان کو 309
اسلامی مدرسوں کی فضیلت 309
اللہ کے نام میں ضرور اثر ہوتا ہے مع ایک نمونہ کے 310
عورتوں کے لیے طلب علم کے طریقے 311
علم دین حاصل ہونے کے طریقے عورتوں اور مردوں کے لیے 312
خلاصہ وعظ کا 313

(۴۴) دنیا کی محبت

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو اختیار کرنے کی شکایت 315

ہر علم سے مقصود عمل ہے	315
علم وعمل دونوں کا ضروری ہونا	315
عارف کی عبادت کی فضیلت غیر عارف پر	316
علم اور خلوص ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے	317
صحابہ رضی اللہ عنہم کو علم ہی سبب اسلام کا ہوا	317
خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کا آسان طریقہ	319
تکبر نے ہماری راہ ماری	320
تکبر کی مذمت	320
بزرگوں کی سادگی کی وجہ	321
ایک بزرگ کی حکایت	321
دنیا کی بادشاہت کی حقیقت اور اس کی مثال	322
دنیا سے بے تعلق ہونے کا مطلب	323
اللہ والوں کے نزدیک بادشاہت کی بھی کچھ قدر نہیں	323
صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تعلق رکھنے کی برکت	325
عمل بغیر علم کے مفید نہیں	326
علم توحید کا کمال عمل سے ہے	326
مسئلہ تقدیر کے ماننے میں علاوہ نجات کے دنیا کی ایک بہت بڑی مصلحت ہے	327
تقدیر کے ماننے سے کیسی تسلی رہتی ہے اور اس کی ایک مثال	328
ان علموں کے فائدے پر اگر نظر ہو تو بہت سے شبہوں کا خاتمہ ہو جائے	330
خدا تعالیٰ کے پہلے آسمان پر اترنے کے متعلق شبہ اور اس کا جواب	330
لوگ کرنے کا کام تو نہیں کرتے، ناحق کے شبہے کرتے ہیں	331
خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کے اسرار دریافت کرنے کی ممانعت	332
سائنس کے مسئلے قرآن شریف میں دریافت کرنا حماقت ہے	333
علاوہ نجات کے توحید کی ایک دوسری غرض	334
اکبر بادشاہ کی حکایت بطور مثال کے	334
جس طرح ہر عمل کو علم سے تعلق ہے اسی طرح ہر علم کو بھی عمل سے تعلق ہے	335
ترقی خواہوں کے اس اعتراض کا جواب کہ مولوی ہم سے دنیا کو چھڑاتے ہیں مع ایک حکایت کے	335

امراض روحانی کے علاج کے لیے چالیس روز کافی ہونا 336
کوئی آیت خفگی کی کافروں کے حق میں ہوتو مسلمان کواس سے بےفکرنہ ہونا چاہیے 339
آیت متعلق ایک شبہ کا جواب 340
دنیا کی محبت کے کئی درجے ہیں 342
دنیا کے ساتھ انتہا درجہ کی محبت کفر ہے 342
اہل ترقی اسلام کو قومیت کے لحاظ سے مانتے ہیں نہ مذہب ہونے کے لحاظ سے 344
ترقی کے بعض طالب رسول ﷺ کے ماننے کو بھی ضروری نہیں سمجھتے 345
اہل ترقی کے کاموں میں اخلاص نہیں 345
ہمارے پرانی وضع کے امیر نئی روشنی کے امیروں سے بہت غنیمت ہیں 346
ایک کفن چور کی حکایت 347
اہل ترقی کے مرض کا آسان علاج 348
دنیا کی محبت کا دوسرا درجہ عمل میں کاہلی ہے اوراس کا علاج! 349
دینداروں کے مرض اوران کا علاج 350
اہل ظاہر اور اہل حال کے گناہوں میں بڑا فرق ہے 351
خود عمل نہ کرنے کی وجہ سے وعظ چھوڑنا بے وقوفی ہے 352
علماء ظاہر میں دنیا کی محبت کا مرض بھی ہے 352
علماء کو دنیا داروں سے بے پرواہ رہنا چاہیے 352
حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت 353
مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ 353
درویشوں میں بھی بعض باتیں اصلاح کے قابل ہیں 354
درویشوں کو خوش خلقی برتنی چاہیے 354
ذکر وشغل سے کیفیات مقصود نہ ہونی چاہئیں اوراس پر ایک حکایت 355
ایک حکایت 356
حکایت 357
ذکر سے کیفیات کا ارادہ کرنا دنیا کی محبت میں داخل ہے 357

(۴۵) مصیبت سے عبرت پکڑنا

انسان کی بے بسی 359
مصیبت کی حقیقت 360
مرید کو جو حالت پیش آئے سب خیر ہے 360
مصیبت 361
اصل روکنے والا حق کے قبول کرنے سے تکبر

ہے 362
تکبر کی مذمت 363
مصیبت پر عبرت نہ ہونا ایک مرض ہے اور اس کے کئی درجے ہیں 364
بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بزرگ اللہ میاں سے زیادہ حفاظت کرتے ہیں 364
بعض لوگ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور جب اس سے نجات ہو جاتی ہے تو آزاد ہو جاتے ہیں 365
ہم ہر طرح خدا تعالیٰ کے بس میں ہیں 366
آدمی ہر وقت خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہے 367
مصیبت کا سبب گناہ ہے 368
نمرود کی حکایت 368
خدا تعالیٰ کو ہر طرح کی قدرت ہے 368
حضرت بہلول کی حکایت 369
شاہ دولا کی حکایت 370
حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی حکایت 370
وعظ کا خلاصہ 371
شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت 371
ظاہری انتظام باطنی انتظام کے تابع ہے 372
صاحب خدمت بزرگوں کو ڈھونڈنا بیکار ہے 372
بزرگوں سے دعا کراؤ اور فضیلت دعا کی 373
وعظ کا خاتمہ اور دعا 374

(۴۶) غفلت کا دفیعہ

بیان کی ضرورت 375
جس مرض کے مرض ہونیکی خبر نہ ہو وہ زیادہ تباہ کرنے والا ہوتا ہے 376
دنیا میں کھپ جانا تمام گناہوں کی جڑ ہے 376
پہلے زمانہ میں مسلمان ایسے ہوتے تھے کہ ان کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کرتے تھے اور آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام سے نفرت ہوتی ہے 378
اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اس دعویٰ کی پاکیزہ دلیل 378
اسلام کی عدالت شعاری کی حکایت 378
اسلام کے اندر آزادی کے معنی 379
دوسری قوموں نے ترقی کرنا اسلام سے سیکھا 380
مسائل میں اختلاف ہونا اعتراض کی بات نہیں 381

حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ کی حکایت 382

دوسری جن قوموں میں تہذیب وترقی ہے وہ بھی دین ہی کی وجہ سے ہے 383

دیندار کو آج کل وحشی سمجھا جاتا ہے 385

آج کل دینداری صرف تسبیح پھیرنے کو سمجھتے ہیں اخلاق کو دین سے خارج سمجھتے ہیں 386

دنیا میں کھپ جانے کا علاج اور آیت 386

دنیا کا خلاصہ مال واولاد کی محبت ہے 387

اللہ کے ذکر سے مراد اطاعت ہے اگرچہ ایک تسبیح بھی نہ پڑھے 387

ایک مثال 387

دنیا کے کام اگر اللہ کے لیے ہوں تو وہ بھی عبادت ہیں 388

ہم لوگ صریح دین کی باتوں میں الجھتے ہیں 389

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی حکایت 389

ہم کو جو کچھ ذلت ہوئی اپنے بزرگوں کے طریقہ کو چھوڑنے سے ہوئی 390

مولوی عبدالجبار صاحب کی حکایت 391

گرے ہوئے لقمے کو اٹھا کر کھا لینے کا راز مع اس کی مثال کے 391

عقل ہم کو دشوار راستہ پر لے جانا چاہتی ہے اور شریعت آسان راستہ پر 392

اگر عبادت بھی قاعدہ کے خلاف کی جائے تو ناجائز ہے؟ 392

عملی رسوم کا جائز طریقہ 392

رسوم کے متعلق عوام کے عذر کا جواب 393

بدعت کے گناہ ہونے کا راز 393

ثواب بخشی کی رسموں میں لوگوں کے اعتقاد صحیح نہیں اور اس پر چند حکایتیں 394

خواص کے کسی جائز فعل سے اگر عوام کا عقیدہ بگڑتا ہو تو خواص کو بھی اس کا کرنا جائز نہیں 394

ثواب پہنچانے کی اگر صورت بدل دی جائے جس میں بدعت کا شبہ نہ ہو تو وہ جائز ہے 395

ثواب بخشی کی رسموں میں دکھلاوا زیادہ ہوتا ہے 396

ان رسموں کی ممانعت پہلے بھی مولوی کرتے آئے ہیں کوئی نئی بات نہیں ہے 396

دین نام اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کا ہے دنیا اللہ تعالیٰ سے غفلت کا نام ہے 397

تجارت میں شرع کے حکموں کی رعایت رکھو 397

ایک تاجر کے سچ بولنے کی برکت کی حکایت 398
ایک طالب علم کے سچے توکل کی حکایت 398
رزق اگر قسمت کا نہیں تو ملکر بھی کام نہیں آتا 398
لکھنؤ کے ایک نواب کی حکایت 398
خدا تعالیٰ کی رضامندی سے رزق میں برکت ہوتی ہے 399
فرمانبرداروں کی مفلسی صرف ظاہری ہے معہ حکایت شاہ ابوالمعالی صاحب 399
فرمانبردار کو ناداری میں وہ چین اور اطمینان ہوتا ہے جو سلطنت میں بھی نہیں ہے 400
آخرت کی ترغیب 400
آخرت کی دولت حاصل کرنے کا طریقہ 401
لوگوں کے حقوق کی زیادہ فکر ہونی چاہیے 401
ریل میں قانون سے زیادہ اسباب لے جانے کی ممانعت 402
میراث میں آج کل بہت گڑبڑ ہے 402
مولویوں سے ہر بات کے جائز کرانے کی مثالیں 404
خواہش نفسانی کو کم کرنے کا مطلب 404
دینداری اس کا نام ہے کہ ہر حال میں خدا تعالیٰ کی رضامندی کا لحاظ رکھو! 405
جواب اس شبہ کا' علماء سب کو مولوی بنانا چاہتے ہیں 405
علم کی ضرورت ہر طبقہ کو ہے اور ہر طبقہ کے لیے مقدار تعلم کی جداگانہ ہے 406
مدرسہ اسلامیہ جاری ہونے کی آسان تدبیر 407
مدرسہ کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے 407
دنیا کی محبت دل سے جانے کا ایک آسان علاج 408
خلاصہ وعظ کا 408

(۴۷) آرزو کا چھوڑنا

بیان کی ضرورت 409
قرآن مجید میں غور نہ کرنے کا مرض بھی عام ہے 409
قرآن مجید کی تلاوت بغیر سمجھنے کے بھی بے فائدہ نہیں 410
ثواب کو آجکل بہت حقیر سمجھتے ہیں 410
ثواب کو حقیر سمجھنے کا مرض مسلمانوں میں یورپ والوں سے آیا ہے۔ 411
بعض ناقص صوفی بھی جنت کی تحقیر کرتے

ہیں 411
جنت تو بڑی چیز ہے انسان تو معمولی ضرورتوں سے بھی بے پرواہ نہیں 411
دوا کے مسنون ہونے کی حکمت 412
حکایت 412
عالموں پر معاش کے چھوڑنے کا مشورہ دینے کا الزام غلط ہے 413
جن لوگوں کو عالموں پر اعتراض ہیں ان کے اطمینان کا آسان طریقہ 413
دنیاداروں کے مولویوں پر یہ الزام رکھنے کی وجہ کہ مولوی ہم سے دنیا چھڑاتے ہیں 414
صرف لفظوں...... کی تلاوت پر کفایت نہ کرنی چاہیے۔ 415
خدا تعالیٰ کے حکموں کی دو قسمیں ہیں 416
روزہ میں قمری مہینہ کے ہونے کی حکمت 417
قربانی کے متعلق ایک شخص کی غلط رائے 418
بعض ترقی پر جان دینے والے سود کے حلال ہونے کی فکر میں ہیں 419
نکاح کے متعلق جانوروں کی تقلید کرنے کا فیصلہ 419
واقعات کے متعلق بھی لوگ آجکل اپنی رائے دیا کرتے ہیں 420
کسی کے مرنے کے وقت کیا کیا آرزوئیں کی جاتی ہیں 420
شیطان سجدہ کو حکمت کے خلاف کہنے سے کافر ہوا ہے 421
انیاؤنگر کے راجہ کی حکایت 422
خدا تعالیٰ کے بے پرواہ ہونے کے معنی 423
ہم بیوقوفوں کی گستاخیوں پر تو خدا تعالیٰ درگزر فرماتے ہیں لیکن بزرگوں کی ذرا سی بات میں پکڑ ہو جاتی ہے 423
اس کلام کے معنی کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ دیوانہ رہو اور محمد ﷺ کے ساتھ ہوشیار 424
اس آیت میں آرزو کی بالکل جڑ کاٹ دی خواہ شریعت کے حکم میں ہو یا واقعات میں 425
باغ کی بہار پھلنے سے پہلے بیچنے کی ممانعت اور اس کی مصلحت 425
جواب اس شبہ کا کہ شریعت نے آمدنی کے بہت سے دروازے بند کر دیئے 427
اول شریعت کے احکام کی وقعت دل میں پیدا کرو پھر حکمتیں بھی اس کی سمجھ میں آنے لگیں گی 427
واقعات میں آرزو کرنے کی مثال 428

بڑے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید کا قصہ 429
حضرت حاجی صاحب کی ایک عجیب تحقیق 430
طاعون رحمت ہے 431
مصیبتوں پر تسلی دوسرے عنوان سے 431
ذکر و شغل کرنے والے کو اگر کیفیات حاصل نہ ہوں تو اس کو صبر کرنا چاہیے 432
کیفیات حاصل نہ ہونے میں مصلحت 432
ذکر و شغل کرنے والوں کے اس شبہ کا جواب کہ مجاہدہ سے گناہ کی خواہش دفع نہیں ہوتی 432
خلاصہ مطلب آیت کا 433
دعا کی ترغیب اور آرزو کرنے کی ممانعت 434
وعظ کا خلاصہ 435
اس وقت اس مضمون کو کس لیے اختیار کیا 435
وعظ کا خاتمہ اور دعا 437

(۴۸) اصلاح کی آسانی

بیان کی ضرورت 438
عقل کا مقتضا یہ تھا کہ ہمارے سخت مرضوں کا علاج بھی سخت ہو مگر شریعت نے آسانی کی اور یہ اس شریعت کی خاص فضیلت ہے 439
روحانی بیماریاں گناہ ہیں 439
گناہ کے روحانی بیماری ہونے کی وجہ 439
دین کے متعلق لوگوں نے دو قسم کی غلطیاں کی ہیں 440
پہلی غلطی بڑے نتیجے 440
گناہ کا اثر کے اعتبار سے مرض ہوتا ہے 441
عبادت سے نور اور گناہ سے زنگ پیدا ہوتا ہے 442
اطاعت کا نور قوت بخشتا ہے اور گناہ کی کدورت کم ہمتی پیدا کرتی ہے 442
اطاعت سے نور و قوت پیدا ہونے کی مثال 443
روحانی مرضوں کے بھی مثل جسمانی مرضوں کے علاج ہیں اور ان میں لوگ بے تدبیری کرتے ہیں 444
بعض کام اسباب پر موقوف نہیں اور بعض کام اسباب پر موقوف ہیں قسم اول میں دعا کا اثر 445
قسم ثانی میں دعا کا اثر کیا ہے؟ 445
جو کام اسباب پر موقوف ہیں ان میں بھی دعا بے اثر ہے 445

امراض روحانی کا اصلی علاج قرآن وحدیث میں ہے مگر لوگ تلاش نہیں کرتے 446
حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کی حکایت 446
جو چیز زیادہ ارزاں ہے زیادہ مفید ہے 447
علاج کی ترغیب 448
ایک سخت مرض کا بیان کہ انسان گناہ کو چھوڑنا چاہتا ہے مگر چھوڑ نہیں سکتا 448
اہل عقل نے اس مرض کے بہت سخت علاج لکھے ہیں 450
اس سخت مرض کا ایک نہایت آسان اور مجرب علاج 450
آیت کی تفسیر اور اس سے علاج کا ثبوت 451
ہر کام کے اندر دو مرتبے ہوتے ہیں 452
جو کام بغیر مہارت کے ہو گا اس میں پائیداری نہ ہوگی 453
گناہ کے زائل کرنے کی اصلی تدبیر 454
سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ اور ایک بت پرست کی حکایت 454
ایک چور کی حکایت 455
سالک کو کامل ہونے کے بعد بھی گناہ کی طرف رغبت ہوتی ہے مع دفع شبہات 455
مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کا ایک عجیب ارشاد 456
ایک بھولے نواب کی حکایت 456
ابتدائے ذکر میں گناہ کی طرف میلان نہیں رہتا 457
حضرات کاملین کی شان 457
گناہ کی طرف طبعی طور پر رغبت ہونا عیب نہیں 458
اس مرض کا علاج توبہ ہے 459
توبہ کا طریقہ 461
امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ایک شاگرد کی حکایت 462
اس علاج کے مفید ہونے کا راز 463
امام اعظم رحمہ اللہ کی حکایت 463
ایک شبہ کا جواب 464
علاج کا خلاصہ 466
وعظ کا خاتمہ 466

(۴۹) خوش تدبیری

بیان ضرورت وعظ 467
امیروں کی سنگدلی اور بے رحمی کی شکایت 468
ہمدردی اور محبت کی تعلیم و ترغیب 468

شور بازیادہ کرنے کی حدیث میں ایک عجیب فائدہ 469

آدمی ہر امر میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرتا 469

اوپر کے مضمون پر ایک شبہ اور اس کا جواب 471

شوربا والی حدیث کی حکمت کا بقیہ 472

جانوروں کے ساتھ بھی ہمدردی کا حکم ہے 472

غیر قوموں کا مسلمانوں پر بے رحمی کا اعتراض بالکل غلط ہے 473

رحم اور ہمدردی کی تعلیم 475

قحط کی تدبیر میں لوگ غلطیاں کرتے ہیں 477

آیت وَاْتُوا الْبُيُوْتَ الخ کے نازل ہونے کا واقعہ 477

بعض صوفی مباح کو حرام کر لیتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے 478

بزرگوں نے جو مجاہدے کیے ہیں وہ خلاف شریعت نہ تھے 479

بدعت کی برائی کا سبب 479

آیت کی بقیہ تفسیر اور مقصود کا ثبوت 480

اپنے نفس کو زیادہ تکلیف دینا قرب کا سبب نہیں اور ایک جاہل فقیر کی حکایت 481

ایک اور جاہل فقیر کی حکایت 482

ایک اور حکایت جاہل فقیر کی 483

ایک نفس پرست پیر کی حکایت 483

یہ مقولہ غلط ہے کہ پیر کے فعلوں سے کیا کام 483

دلیل اس کی کہ شیطان بڑا عالم ہے 484

ثواب دین کا کام طریقہ کے موافق کرنے سے ہوتا ہے 484

اہل بدعت کا حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ کو حجت میں پیش کرنا صحیح نہیں 485

شب برات میں بدعت کیا ہے اور سنت کیا ہے؟ 485

بدعات کی بندش کی ایک عمدہ تدبیر 486

میانجیوں کے عوام سے وصول کرنے کے کئی قصے 487

ان رسموں کے دین سے خارج ہونے کی ایک ظاہر علامت 488

قحط کے متعلق لوگوں کی غلط تدبیر 489

قحط کے زمانہ میں چندہ جمع کر کے کھانا تقسیم کرنے میں کیا کیا خرابیاں ہیں 490

قحط کے رفع کی صحیح تدبیر اور دستور العمل 493

بزرگوں کی تواضع و انکسار کے واقعات 494

ہمارے تقویٰ کی مثال 495
اس بات کی تعلیم کو اپنے عیبوں پر نظر ہونا چاہیے 495
دوسری تدبیر قحط کی طاعت کو اختیار کرنا ہے 496
تیسری تدبیر قحط کی دعا ہے 496
دعا کا طریقہ 496
باقی آیت کی تفسیر (وعظ ختم) 497

(۵۰) نفس کو بھولنا

حاصل آیت کا 500
آیت اتامرون الناس الخ کا حکم عام لوگوں نے صرف عالموں کے لیے سمجھا ہے 500
بعض لوگ اپنے غریب ہونے پر فخر کرتے ہیں 501
امیروں کا روپیہ پیسے پر فخر کرنا جہالت ہے اور مال کا نتیجہ اور خرابیاں 502
علم کی فضیلت 504
کون سا علم فخر کے قابل ہے اور اس علم کی علامتیں کیا ہیں 505
جناب رسول اللہ ﷺ کے علم کی حکایت 505
کامل عالم مصیبت کے وقت گھبراتا نہیں 506
سورۂ یٰسٓ اور اِنَّا لِلّٰہِ کو ہم لوگوں نے موت کے موقع کے ساتھ خاص کر لیا ہے 506
سورۂ یٰسٓ شریف کی تلاوت کا موقعہ 507
ہر ناگوار حالت پر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنا سنت ہے 507
حق تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بہت رحمت اور شفقت 507
اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنے سے مصیبت کے ہلکے ہونے کے کئی سبب 508
جاہل کا خاتمہ اکثر خراب ہوتا ہے اور جاہل سے ہماری کیا مراد ہے 509
دین کی محبت اگر دل میں رچی ہوئی نہیں تو ظاہری نماز روزہ کچھ ایسا کام کا نہیں ہے۔
ایک مثال 510
دکھلاوے کی برائی اور خلوص کی تعلیم 511
آج کل جہالت پر فخر کیا جاتا ہے 512
بعض جاہلوں کے فخر کرنے کی بناء 512
آیت اتامرون الخ کے الزام سے جاہل بھی بری نہیں ہیں اور اس الزام کی حقیقت 512
وبائی مرضوں کا اصلی سبب گناہ ہیں اگرچہ ظاہر پر نظر کرنے والے ان کی نسبت ظاہری سبب کی طرف کریں 513

جو دیندار کہلاتے ہیں وہ مصیبتوں کو نسبت دوسروں کے گناہوں کی طرف کرتے ہیں 515
بے کار اور فضول کام کے چھوڑنے کی رغبت دلانا اور حکم کرنا مع حکایتوں کے 516
آفتوں سے حفاظت نظر کے زمین پر رکھنے میں ہے 517
فضول اور لغو باتوں کی ممانعت اور مضرت 518
غیبت کرنے سے منع کرنا اور یہ کہ یہ فعل ناقص ہونے کی دلیل ہے 520
تین بزرگوں کی حکایت 521
آج کل لوگ ذرا سی بات کو بڑھا لیتے ہیں 522
ایک بزرگ کے تحمل کی حکایت 523
حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تحمل 523
امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا تحمل 523
نا اتفاقی کی جڑ زبان کی بدلگامی ہے 524
غیبت کرنے کا مرض سب قوموں میں عام ہے 524
ایک شطرنج باز کی حکایت 525
صرف ظاہر کی درستی بھی بے کار نہیں جاتی 526
دین کے پیشواؤں کو غیبت سننے سے بچنا ضروری ہے 526
آیت اتامرون الخ سے اپنے عیبوں پر نظر رکھنے کو ثابت کرنا 527
نیک بات دوسرے کو بتانا طاعت ہے خواہ خود عمل کرے یا نہ کرے 527
گناہ کرنے سے طاعت اپنی حالت پر رہے گی۔ ہاں اس کی برکت کم ہو جاتی ہے 529
آیت اَتَاْمُرُوْنَ النَّاس کا خلاصہ 529
قوم کی اصلاح کرنے کے لیے حالات کی تفتیش کرنے کے قاعدے 530
حدیث اَلْمُسْلِمُ مَرْاٰۃُ الْمُسْلِمِ کے معنی 531
برائی کرنے کے جائز ہونے کا ایک موقع 532
بقیہ آیت کی تفسیر اور وعظ کا خاتمہ 534

(۵۱) عالموں کو عمل کی ضرورت!

آیت کا خلاصہ اور بیان کی ضرورت 535
حدیث العلماء ورثۃ الانبیاء کی شرح اور معنی 536
تائب ہونے کی وجہ میں عملی کمال کو بڑا دخل ہے 537
خالی علم کسی درجہ میں شمار نہیں 538

آیت اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ کی تفسیر 539
اصل مقصود سے غافل ہو جانا اور اس کے ذریعہ کی فکر میں پڑ جانا سخت غلطی ہے 540
علم سیکھنے کے بعد عمل کی ضرورت 541
علم پر عمل نہ کرنے کی شکایت 542
بے عمل عالم کا اثر عوام پر کیا ہوتا ہے 542
اس وقت عالموں کی بدعملی کی مختلف صورتیں 543
بدعملی خود علم کے لیے بھی مضر ہے 544
علم کس چیز کا نام ہے 544
دینداری علم حاصل کرنے کے لیے بہت بڑا سبب ہے 544
گناہ کا سبب بھی گناہ ہے 545
پہلی آیت کی تفسیر 545
ہم لوگوں میں دین کی بہت کوتاہیاں ہیں 546
حدیث "لَاتَفْرِیْطَ فِی النَّوْمِ" کے معنٰی 546
بعض لوگ بدنگاہی میں مبتلا ہیں 547
بدنگاہی میں شیطان کا ایک سخت دھوکہ 548
بعض صوفیوں کو بھی گناہ کے بابت دھوکہ ہوتا ہے 550
زبان کا گناہ 551
دل کے گناہ 551
بقیہ آیت کی تفسیر 552
حضور ﷺ کے کھانا کھانے کی حالت 553
حضور ﷺ کے چلنے کی کیفیت 553
حضور ﷺ کی معاشرت کی حالت 554
سادگی کی اور تکلف اور زینت چھوڑنے کی تعلیم معہ شکایت 554
زینت اور تکلف کی مضرت 556
صفائی اور ستھرائی کی تعلیم 556
کام کا آدمی ہمیشہ سادہ دیکھا جاتا ہے 557
تکلف کرنے والوں کی حکایتیں اور بعض شبہات کا جواب اور سادگی کی تعلیم 558
خشوع کے آثار چلنے اور بولنے میں ظاہر ہوتے ہیں 560
اہل اللہ کی سی ظاہری صورت سے بھی نفع ہو جاتا ہے 561
خشوع کے حاصل کرنے کے طریقے 562
بذاذۃ یعنی سادگی کی حقیقت اور شرح 564
خلاصہ 567

(۵۲) علم و عمل کی فضیلت

شانِ نزول آیت بالا 569
آیت کا خلاصہ 570

مقصود کا ثبوت 574
خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے مضمون کو اس وقت کیوں اختیار کیا گیا 575
انگریزی تعلیم کی خرابیاں 576
انگریزی تعلیم کو اسلام کی ترقی کہنا بالکل غلط ہے 576
عزت کی ترقی اور اس سے کام لینے میں کیا خرابیاں ہیں 578
فراخی اور عزت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت میں ہے اور تنگی و ذلت معصیت میں ہے 579
دنیا کے مال و متاع کی ایک مثال 584
حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے فقر و فاقہ اور صبر کی حکایت 586
ایک بزرگ کے فقر و فاقہ کو پسند کرنے کی حکایت 586
اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والا کبھی مصیبت میں نہیں ہوتا اور اس کی جس حالت کو مصیبت سمجھا جاتا ہے وہ مصیبت نہیں 587
معاشرت میں کوتاہی کرنے کا حکایتیں اور اذیت کے اسباب کا بیان 591
بعض تعظیم و تکریم بھی تکلیف کا سبب ہوتی ہے 593
حضور ﷺ کے ایک بار رات کے وقت اٹھنے کا قصہ 595
سفر میں جانے والے کو کسی شئے کے لانے کی فرمائش کرنا بعض مرتبہ تکلیف کا سبب بن جاتا ہے 596
دستی خط بھیجنے میں بعض مرتبہ تکلیف ہوتی ہے 596
معاشرت کا مسئلہ قرآن شریف سے ثابت ہے 598
معاشرت کی اصلاح سے بھی آخرت میں ثمرہ ملتا ہے 599
نیک عمل پر ثواب کا ملنا ایمان پر موقوف ہے 600
بعض عوام ہندوؤں اور شرابی کبابی لوگوں کو بھی بزرگ سمجھتے ہیں 600
مولوی عام ایمان والوں سے افضل ہیں 602
عام مسلمانوں کو بھی ذلیل نہ سمجھنا چاہیے 602
اپنے آپ کو بڑا اور اچھا سمجھنا بہت برا ہے 604

(۳۳) عالموں کی ضرورت

منتخب از ضرورۃ العلماء وعظ اول دعوات عبدیت

جلد پنجم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ اَزْوَاجِه وَ بَارِكْ وَسَلَّم۔

اما بعد: اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَO وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَO

''ترجمہ:۔ پکارو اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ اور چھپا کر تحقیق وہ دوست نہیں رکھتا ہے۔ حد سے نکل جانے والوں کو اور مت فساد پھیلاؤ زمین کے اندر بعد اس کی درستی کے اور پکارو اس کو ڈر سے اور طمع سے تحقیق اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے نیکی کرنے والوں سے۔۱۲۔

اس وقت میں نے دو آیتیں پڑھی ہیں جن کے سننے کے بعد یہ انتظار ہوگا کہ ان دونوں کی تفسیر بیان کی جائے گی مگر اس وقت مقصود ان آیتوں میں سے صرف ایک ہی

ٹکڑے کا بیان کرنا ہے۔ لَاتُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ[1] کا کہ اس سے ایک دعویٰ کو ثابت کرنا ہے باقی اس سے پہلی اور پچھلی آیتوں کو جو تلاوت کیا ہے۔ اس سے اس دعویٰ کو پختہ اور مضبوط کرنا مقصود ہے وہ دعویٰ جس کو ثابت کرنا ہے نہایت عجیب ہوگا مگر بالکل سچا اور واقعی اور عقل کے موافق ہوگا اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ دعویٰ پہلے سے سب کے نزدیک مسلم اور مانا ہوا تھا۔ مگر غور نہ کرنے کی وجہ سے لوگ اس میں شبہ اور کلام کرنے لگے ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض کی زبانوں پر اس کے خلاف دعویٰ آنے لگا ہے۔ لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو وہ دعویٰ بالکل صاف اور عقل کے موافق ہوگا۔ مولویوں کے نزدیک تو وہ ایک صاف اور ظاہر بات ہے ہی۔ لیکن عقل کے دعویداروں کو بھی اس سے انکار نہ ہو سکے گا مگر پھر بھی اس دعویٰ کو عجیب اس لیے کہا کہ اس وقت علم کی کمی ہے لوگوں کو اس میں بہت تعجب ہونے لگا ہے چاہئے تو یہ تھا کہ اس کا عقیدہ رکھتے مگر اس وقت برعکس معاملہ ہے کہ اس کے خلاف عقیدہ کر لیا ہے تو چونکہ وہ دعویٰ عام خیالات کے خلاف ہے اور دنیا کا اکثر حصہ کم علم اور عام لوگوں کا ہی ہے۔ اس لیے وہ دعویٰ عجیب ہو گیا۔

دنیا میں سب سے زیادہ ضروری وجود کس کا ہے؟

اور وہ دعویٰ اس سوال کا جواب ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ضروری وجود کس کا ہے؟ اور ضرورت بھی صرف دنیا کے لحاظ سے جس کی لوگوں کو طلب ہے اور وہ اس کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ نہ دین کے اعتبار سے جس سے لوگ بے پرواہ ہیں بلکہ ان لفظوں سے یہ سوال عام لوگوں کی نظر میں نہایت باوقعت اور وزنی ہو جائے گا کہ وہ کون سی چیز ہے جو دنیا کی کامیابی کے واسطے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

دنیا کی کامیابی کے لیے بھی سب سے زیادہ ضروری عالموں کا وجود ہے اگر چہ لوگ اس کے خلاف کا دعویٰ کرتے ہیں

سنئے! جواب اس سوال کا یہ ہے کہ دنیا کی کامیابی اور ترقی کے واسطے بھی عالموں

[1] زمین میں فساد مت کرو۔۱۲۔

کا وجود اور ہستی سب سے زیادہ ضروری ہے اور اس دعوے کا عام خیالات کے خلاف ہونا ظاہر ہے کیونکہ اکثر لوگوں ان کو نکما سمجھتے ہیں پھر ان میں جو بالکل آزاد اور بے باک ہیں وہ تو صاف کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایسے نکمے ہیں کہ انہوں نے دوسروں کو بھی نکما کر دیا اور جو ذرا تہذیب اور تمیز سے کام لیتے ہیں وہ زبان سے تو یہ بات دوسروں کے سامنے نہیں کہتے مگر ان کے برتاؤ اور عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بھی یہ عقیدہ ضرور ہے کیونکہ انسان کا جیسا خیال اور عقیدہ ہوتا ہے اسی کے موافق عمل اور برتاؤ کیا کرتا ہے اور ان لوگوں کا برتاؤ یہ ہے کہ مولویوں سے ملتے نہیں اور نہ ان کو پسند کرتے ہیں۔ بلکہ دوسروں کو بھی ان کے پاس آنے جانے سے روکتے ہیں۔ بس یہ لوگ اپنے برتاؤ سے ثابت کرتے ہیں کہ مولوی بالکل نکمے اور ناکارہ ہوتے ہیں اور زبانی نکما کہنے کی نسبت ان لوگوں کا اپنے برتاؤ سے مولویوں کو نکما بتلانا زیادہ سخت ہے کیونکہ کہنے اور کرنے میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے دیکھئے ایک شخص تو یہ کہے کہ میں پانی پیوں گا اور ایک جا کر پانی پی ہی لے تو اگر چہ دوسرے نے زبان سے پانی پینے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن اس کا عمل پہلے کے زبانی دعویٰ سے بڑھا ہوا ہے پس جب کہ بعض تو زبان سے صاف طور پر عالموں کو نکما کہتے ہیں۔ اور بعض برتاؤ اس قسم کا کرتے ہیں اس لیے میں کہتا ہوں کہ عام طور پر لوگ اس گروہ کو نکما اور بے کا سمجھتے ہیں اس لیے میرا دعویٰ ہے کہ سب سے زیادہ ضروری وجود ان ہی کا ہے بہت عجیب معلوم ہوگا۔ اب میں اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے تقریر شروع کرتا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ کے اطمینان کے لیے یہ کہے دیتا ہوں کہ میرا مقصود اس کی کوشش کرنا نہیں ہے۔

سب مسلمانوں کو پورا عالم بنانا ضروری نہیں اور نہ یہ مولویوں کا مقصود ہے!

کہ سب لوگ مولوی ہو جائیں۔ ممکن تھا لوگوں کو یہ سن کر کہ مولویوں کا وجود سب سے زیادہ ضروری ہے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب یہ رائے دی جائے گی کہ سب لوگ مولوی ہو جائیں اور اس سے گھبرا کر تقریر کو اطمینان سے نہ سنتے پس وحشت دور کرنے کے لیے میں نے پہلے سے خبردار کر دیا کہ میرا مقصود یہ نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں

میں ایک ایسا گروہ رہنا چاہیے۔

عالموں سے تعلق اور محبت رکھنا سب کے لیے ضروری ہے:

اور دوسرے لوگوں کو اس گروہ سے محبت اور تعلق رکھنا چاہیے اب تو وحشت اور پریشانی کا کوئی موقع نہیں رہا کیونکہ سب کو مولوی نہیں بنایا جاتا صرف اتنی بات کہی جاتی ہے کہ ان لوگوں کو بے کار نہ سمجھو سو اس سے آپ کے کسی کام میں یا کسی قسم کی ترقی میں کسی نوکری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہاں ایک غلط خیال میں جو آپ پڑے ہوئے ہیں اس تقریر کے سننے سے وہ غلطی جاتی رہے گی۔ اور یہ قاعدہ بھی ہوگا کہ اس گروہ کے فیض سے اس وقت جو آپ محروم ہیں جب آپ کو ان کے ساتھ محبت ہوگی تو اس وقت آپ ان کے فیض سے مالا مال ہوں گے۔

عالموں کے ساتھ تعلق اور محبت رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟

البتہ اس حالت میں اور پہلی حالت میں ایک فرق ضرور ہوگا اس کو اگر آپ دنیا کا ضرر یا ترقی کی کمی سمجھ لیں تو ممکن ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ اس وقت جو آپ خدائی قانون کے بہت سے جرموں کے مجرم ہیں وہ اس وقت چھوٹ جائیں گے۔ اس وقت آپ گناہ کر کے خود کو تباہ کرتے ہیں۔ یہ بات اس وقت جاتی رہے گی تو اس کو آپ خواہ نفع سمجھیں یا نقصان آپ کی عادتیں بھی پہلے سے بدلیں گی۔ لیکن نہایت سہولت اور نرمی کے ساتھ دیکھیے آپ کی عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ مجرم کو اپنا جرم کا پیشہ فوراً چھوڑ دینا چاہیے لیکن شریعت کا قاعدہ بتلاتا ہے کہ بعض گناہ جو کہ شریعت کے اندر جرم ہیں ان کو چھوڑ دینے میں جلدی نہ کرو۔ پہلے کوئی دوسرا بندوبست اور انتظام کرلو اور اس زمانے تک اپنے کو گنہگار سمجھ کر توبہ اور استغفار کرتے رہو۔ پھر جب دوسرا انتظام ہو جائے اس کو چھوڑ دینا بھلا کوئی دنیا کا قانون اور قاعدہ ایسا بھی ہے جس میں یہ سہولت ہو۔

شریعت اپنے حسن میں یکتا ہے:

خدا کی قسم شریعت میں وہ حسن اور جمال ہے کہ اس کی جس بات کو دیکھو گے عقل

حیران رہ جائے گی مگر افسوس لوگوں نے کبھی شریعت اور دین کو غور سے نہیں دیکھا۔ اس لیے وہ لوگوں کو ڈراؤنا دیونظر آتا ہے۔

عزیز بھائیو! شریعت آپ کی بڑی ہمدرد اور مددگار ہے۔ بعض گناہوں تک میں جو شریعت کے اندر جرم ہیں مثلاً جیسے ناجائز نوکری میں یہ اجازت ہے کہ اگر اس وقت کوئی دوسرا انتظام نہیں ہوسکتا اور کوئی صورت نہیں نکل سکتی تو ابھی نہ چھوڑو بلکہ پہلے حلال طریقہ کا انتظام کرلو پھر چھوڑ دو۔ اور اگر اس پر بھی شریعت سے وحشت ہوتی ہے۔ اور آپ لوگ اس سے گھبراتے ہیں تو آپ جانیں ہم ذمہ دار نہیں غرض کہ علم دین اور مولویوں کے ساتھ تعلق رکھنے سے دنیا کے کاروبار اور ضرورتوں میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ صرف گناہ چھوٹ جائیں گے۔ اور وہ بھی نہایت خوبی اور نرمی کے ساتھ۔ خیر یہ تو درمیان میں ایک بات آ گئی تھی۔ اب میں اس دعویٰ کو عرض کرتا ہوں اور بطور احتیاط کے پھر کہے دیتا ہوں کہ آپ اس دعویٰ سے گھبرا نہ جائیں کہ شائد سب کو مولوی بنانا مقصود ہے میں ہرگز سب کو مولوی بنانا نہیں چاہتا البتہ آپ کے اس غلط خیال کو کہ مولویوں کو آپ نکما اور بیکار سمجھتے ہیں بدلنا چاہتا ہوں۔

واقعی ہم میں عقل کے دعویدار مولویوں کو ناکارہ سمجھتے ہیں:

واقعی آج کل عقل کے دعویداروں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ اول تو سب ہی مولوی پھر خاص کر وہ مولوی جو پڑھانے کا شغل رکھتے ہیں۔ بالکل بے کار ہیں کیونکہ وعظ کہنے والوں کو تو بعض کام کا کہتے بھی ہیں سو کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو کام سارے کاموں سے زیادہ ضروری ہوا اسی کو سب سے زیادہ بیکار کہا جائے۔

تعلیم اور معلموں کی ضرورت کس درجہ کی ہے:

صاحبو! افسوس ہے کہ آپ کے ہم وطن ہندوؤں نے تو پڑھانے اور علم سکھانے کی سخت ضرورت کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کثرت سے لوگ امتحان سے فارغ ہو کر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اسکولوں میں داخل ہو کر تعلیم اور پڑھانے کا کام

کریں کیونکہ جتنے اور کام ہیں سب اسی کی شاخیں ہیں تو اس پر قبضہ کرنا ذریعہ ہے اپنی قوم کی ترقی کا، مگر ہم کو اب تک بھی اس کی خبر نہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو عقلمند سمجھتے ہیں تعلیم کی حالت دوسرے کاموں کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے انجن کا پہیہ کہ اسی کے چکر سے تمام گاڑیاں چلتی ہیں۔ اگر وہ رک جائے تو ساری گاڑیاں چلنے سے رک جائیں گی مگر اس کی ضرورت کا علم لوگوں کو اس واسطے نہیں ہوتا کہ جو چیز دوسرے کاموں کا مدار ہوا کرتی ہے وہ اکثر باریک زیادہ ہوتی ہے۔ جیسے گھڑی کا فز اور بال کمانی۔ اور گنوار آدمی گھڑی کو دیکھ کر سب سے بڑی چیز اس کے گھنٹے کو سمجھتا ہے لیکن گھڑی کی حقیقت جاننے والے جانتے ہیں کہ گھنٹے اور سوئی چلنے کا مدار فز پر ہے۔ اگر فز رک جائے تو سوئی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اسی طرح تعلیم دینا سب کاموں کی جان ہے خواہ تقریر ہو خواہ تحریر سب اسی پر موقوف ہیں۔ اور اسی کی شاخیں ہیں مگر اس وقت سب سے زیادہ اس کو بے کار سمجھ رکھا ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ عام طور سے عالموں کی وقعت لوگوں کی نظر میں کم ہے اور اس علامت کی بڑی علامت یہ ہے کہ اپنی اولاد کے پڑھانے کے لیے دین کا علم بہت کم اختیار کیا جاتا ہے۔ پھر ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ مدرسوں میں چندہ بھی دیتے ہیں اور زبان سے دینی مدرسوں کے باقی رہنے کی ضرورت کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ تا کہ ان کو زیادہ دلچسپی ہو اور چندہ خوب دیں لیکن واقع میں ان کو دلچسپی کچھ بھی نہیں ہوتی۔

آنحضرت ﷺ کو فقر پسند تھا اپنی اولاد کے لیے بھی پسند فرمایا:

عزیز بھائیو! دلچسپی اس کو کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کو غربت اور فقر پسند تھا تو اپنی اولاد کے لیے بھی زبان سے اور عمل سے اختیار کر کے دکھلا دیا۔ زبان سے تو یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کی: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا۔

''ترجمہ: اے اللہ محمد ﷺ کی اولاد کا رزق بقدر ان کی خوراک کے دے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی چکی چلانے کا قصہ:

اور عمل سے یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو خاندان بھر میں سب سے زیادہ آپ کو عزیز

تھیں۔ جن کے لیے محبت کے جوش میں آپ سیدھے کھڑے ہو جاتے اور جن کے لیے آپ نے یہ فرمایا کہ: **سیدة نساء اهل الجنة فاطمه۔**

ترجمہ: جنت کی عورتوں کی سردار فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں' اور جن کی شان یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب دوسرا نکاح کرنا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: **يؤذيني ما انها۔**

ترجمہ: جس سے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تکلیف پہنچے گی اس سے مجھ کو بھی تکلیف پہنچے گی اتنی پیاری بیٹی نے جب ایک مرتبہ چکی چلانے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جانے کی شکایت کی جس کو آج کل اس قدر عیب سمجھا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے خاندان کی عورتوں کو یہ رائے دی کہ نئی لڑکیوں سے چکی پسواؤ تاکہ ان کی صحت درست رہے کیونکہ اکثر امیری کے لیے بیمار لازم ہوگئی اور وجہ اس کی بھی آرام طلبی ہے۔ مگر وہ امیر بھی کیا ہوا جس کے پاس صحت جیسی خدا کی نعمت نہ ہو۔ اس لیے میں نے جو کہا کہ تم ایسا کرو تو ان میں سے بعض کہنے لگیں کہ خدا نہ کرے تم ایسی فال کیوں نکالتے ہو۔ اور یہاں تک ہم لوگوں کی شان بڑھ گئی ہے کہ اکثر عورتوں نے چرخہ کا تنا چھوڑ دیا ہمارے وطن میں ایک عورت کا قصہ ہے کہ وہ چرخہ کات رہی تھی اور اس زمانے میں ان کس ساس مرگئی تھیں تو کوئی عورت جو ان کے یہاں ماتم پرسی کے لیے آئی تو آہٹ پاتے ہی چرخہ کو اٹھا کر اندھے باؤلوں کی طرح ایک کوٹھری میں پھینک دیا آگے سے کواڑ بند کر دیئے تاکہ مہمان کو معلوم نہ ہو۔ غرض حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں۔ اپنی راحت کے لیے یا شوہر کے کہنے سے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما نہ تھے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہہ کر چلی آئیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے معلوم ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بیٹھی ہوئی تھیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اٹھنے لگیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیٹھی رہو غرض اس وقت پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کہو تو لونڈی غلام دے دوں اور کہو تو اس سے بھی اچھی چیز دے دوں یہ سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ اچھی چیز کیا ہے فوراً عرض کیا کہ اچھی ہی چیز

دے دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سوتے وقت سبحان اللہ تینتیس ۳۳ بار اور الحمد للہ تینتیس ۳۳ بار اور اللہ اکبر چونتیس ۳۴ بار پڑھ لیا کرو، بس یہ غلام لونڈی سے بھی بہتر ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دنیا سے بے رغبتی:

اس خدا کی بندی نے خوشی خوشی اس کو قبول کر لیا تو دیکھیے حضور ﷺ کو فقیری پسند تھی تو اپنی اولاد کے لیے بھی آپ ﷺ نے اس کو اختیار کر کے دکھلا دیا۔ اور لیجئے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہماری اولاد کے لیے زکوٰۃ حلال نہیں۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ایسے قاعدے مقرر ہوتے کہ سب روپیہ انہی کو ملتا مگر ایسا نہیں ہوا تو دلچسپی اس کو کہتے ہیں۔

قرآن اور دین کی تعلیم کو آجکل لوگ وقت کا ضائع کرنا کہتے ہیں

اب میں پوچھتا ہوں کہ جو لوگ چندہ دیتے ہیں کیا انہوں نے اپنے لڑکوں کے لیے بھی اس تعلیم کو پسند کیا ہے؟ اب تو یہ حالت ہے کہ ریاست رامپور میں ایک صاحب نے اپنے دوست کو جن کا لڑکا قرآن شریف پڑھتا تھا انگریزی پڑھنے کی رائے دی انہوں نے پوچھا کتنا قرآن شریف ختم ہو جائے تو انگریزی میں لگایا جائے انہوں نے پوچھا کتنا قرآن شریف ہوا ہے اور کتنے روز میں ہوا ہے انہوں نے کہا کہ دو سال میں آدھا ہوا ہے کہ میاں دو ۲ تو کھوئے اور دو ۳ برس بھی کیوں خراب کرتے ہو۔ صاحبو! غضب تو یہ ہے کہ خدا کے ماننے والے' آخرت کے ماننے والے اور پھر یہ خیالات اور یہ باتیں واہیات' جو آخرت کو نہ مانے اور یہ زبان سے نکالے تو کچھ تعجب نہیں۔ مگر جو شخص آخرت کو مانتا ہو اس کی زبان سے ایسا نکلنا کہ قرآن شریف کا پڑھنا بالکل بے کار ہے' وقت کو برباد کرنا ہے۔ سخت تعجب ہے۔ کیا آخرت میں اس کا عذاب نہ ہوگا۔ صاحبو! خدا تعالیٰ نے آدمی کو عقل اس واسطے دی ہے کہ اس سے انجام سوچے اور جیسا یہ انجام سوچنے کے قابل ہے کہ ہم آج پڑھ لیں گے تو کل ڈپٹی کلکٹر ہو جائیں گے۔ ایسا ہی اس سے آگے کا انجام بھی تو سوچنے کے قابل ہے کہ آخرت میں کیا ہوگا۔ اور اگر کہو کہ آگے کوئی انجام ہی نہیں تو پھر تم سے ہمارا کلام ہی نہیں۔ لیکن جب تم اگلے انجام کو بھی مانتے ہو تو تم سے پوچھا جاتا ہے کہ

وہاں کسی سامان اور ذخیرہ کی ضرورت نہ ہوگی اور اگر ہوگی تو پھر قرآن شریف کے پڑھنے پڑھانے کو وقت کا برباد کرنا کس منہ سے کہا جاتا ہے۔ افسوس کہ دنیا میں تھوڑی مدت تک رہنا ہے اور وہ بھی محض خیالی اس کے لیے تو یہ کوشش اور آخرت میں جانا یقینی اور ضروری اور وہاں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔ اس کے لیے سامان کی ضرورت نہ ہو اور اس کے لیے سامان کرنے کو وقت کا خراب کرنا کہا جائے۔

آج کل آخرت سے بہت غفلت ہے اس کی نظیریں موجود ہیں:

اصل یہ ہے کہ آج کل خود آخرت ہی سے اس درجہ غفلت اور لاپرواہی ہوگئی ہے کہ وہ یاد ہی نہیں آتی۔ ایک مرتبہ میں سہارن پور سے کانپور کو جاتا تھا میرے ساتھ کچھ پونڈے بھی تھے۔ میں نے تلوا کر محصول دینا چاہا جو لوگ رخصت کرنے اور پہنچانے آئے تھے۔ انہوں نے تو منع کیا ہی مگر خود اسٹیشن والوں نے بھی کہا کہ آپ لے جائیں محصول کی ضرورت نہیں ہم گاڈ سے کہہ دیں گے کوئی روک ٹوک نہ کرے گا۔ میں نے پوچھا کہ یہ گاڈ کہاں تک جائے گا۔ جواب ملا کہ غازی آباد تک۔ میں نے کہا آگے کیا ہوگا۔ جواب ملا کہ آگے وہ گاڈ دوسرے گاڈ سے کہہ دے گا۔ میں نے کہا آگے کیا ہوگا۔ جواب ملا کہ بس آگے کانپور آجائے گا اور سفر ختم ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ نہیں اس سے آگے آخرت ہوگی اور وہاں جانا پڑے گا تو وہاں کی روک ٹوک اور پکڑ دھکڑ سے گاڈ صاحب بچائیں گے اس پر سب چپ ہوگئے۔ اور اسٹیشن ماسٹر پر اس کا بڑا اثر ہوا اور محصول لے لیا گیا۔ غرض آخرت ان عقلمندوں کو یاد نہ آئی یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر کرنے کی ہے۔ وہ یہ کہ اس قصہ میں باوجود ریل والوں کے رعایت کرنے اور محصول چھوڑنے کے بھی اس رعایت کو جو میں نے قبول نہیں کیا اس کا سبب سوائے شریعت کی تعلیم کے اور کیا تھا؟ کیا آج کل تہذیب کے دعویٰ کرنے والوں میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے کہ اگر کسی کو اپنے حق کی اطلاع اور خبر بھی نہ ہوتب بھی اس کا حق ادا کردے۔ لیکن شریعت اس کو ضروری بتلاتی ہے۔ اب شریعت اور اپنی گھڑی ہوئی تہذیب کا مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے۔ خدا کی قسم ہم نے

دیکھا ہے کہ غریب دیندار لوگ جن کو کم عقل سمجھا جاتا ہے وہ تو ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں مگر ہمارے بڑے لوگ جو عقلمند کہلاتے ہیں۔ ذرا بھی خیال ان باتوں کا نہیں کرتے۔

سمجھدار وہ ہے کہ جس کی انجام پر نظر ہو:

صاحبو! عقلمند وہی ہے جو انجام اور نتیجہ پر نظر کرے بس جس میں دین نہیں وہ کیا عقلمند ہو سکتا ہے۔ آج کل عقل اور دین میں مخالفت سمجھی جاتی ہے حالانکہ ہمارے تمام بزرگ دنیا کی عقل بھی رکھتے تھے اور ان کا دین بھی کامل ہوتا تھا ہرقل ایک عیسائی بادشا ہے اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت مسلمانوں کے قاصد سے دریافت کیا تھا کہ وہ کیسے شخص ہیں اس نے جواب دیا تھا کہ ان کی حالت یہ ہے کہ نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں نہ ان کو کوئی دھوکہ دے سکتا ہے۔ ہرقل نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہیں تو ان پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ کیونکہ جس میں عقل اور دین دونوں کامل درجہ کے موجود ہوں اس کی طاقت اور قوت کا مقابلہ دوسرا کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ یہ بات ختم ہوئی۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ آخرت سے بے خبری اور لاپرواہی بے حد ہوگئی ہے اور اس بے خبری کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ جو لوگ باخبر ہو کر اس کوشش اور فکر کرتے ہیں ان کو بے وقوف اور احمق سمجھا جاتا ہے۔ میرے ایک دوست جو بی۔ اے تک تعلیم پائے ہوئے ہیں مگر بہت دیندار ہیں اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک بار وقت کی تنگی کی وجہ سے بغیر اسباب تلوائے ریل میں سوار ہو گئے' جہاں جانا تھا وہاں پہنچ کر ٹکٹ کلکٹر کو اس کی خبر کی اور سامان وزن کرا کر ریل کا محصول دینا چاہا۔ ٹکٹ کلکٹر نے کہا لے بھی جاؤ محصول کی کچھ ضرورت نہیں۔ انہوں نے کہا آپ کو معاف کرنے کا حق نہیں۔ آپ ریل کے مالک نہیں۔ اس کو تعجب ہوا اور ان کو اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گیا۔ انہوں نے وہاں جا کر بھی یہی تقریر کی تو وہ دونوں آپس میں انگریزی میں یوں کہنے لگے تھے کہ اس شخص نے معلوم ہوتا ہے شراب پی رکھی ہے گویا دوسرے کا حق ادا کرنا ایسا عجیب کام ہے کہ حق ادا کرنے والے پر نشہ پینے کا شبہ ہوا لیکن ہاں واقع میں وہ خدا کی محبت کی شراب میں مدہوش تھے اور اسی کا نشہ ان کو چور کئے ہوئے

تھا۔ آخر انہوں نے کہا کہ جناب میں شراب پیئے ہوئے نہیں ہوں۔ لیکن اسٹیشن والوں نے ہرگز محصول نہ لیا مجبور ہو کر دوسرے طریقہ سے انہوں نے ادا کیا اور وہ طریقہ یہ ہے اگر کسی ریل کا ہمارے ذمہ کچھ رہ جائے تو اسی لین کا اتنی قیمت کا ٹکٹ لے کر پھاڑ دیں اور اس ٹکٹ سے سفر نہ کریں۔ اس قصہ کو میں نے اس واسطے بیان کیا کہ انجام کو بھی دیکھنا چاہیے خاص کر جب کہ دنیا کے کاموں میں انجام پر نظر کرتے ہو تو آخرت کے انجام پر تو بہت ہی ضرور ہے۔

صاحبو! کیا موت کے انجام کا انکار ہو سکتا ہے یہ تو وہ انجام ہے کہ اس سے کافروں کو بھی انکار نہیں' البتہ کافروں میں کچھ تھوڑے سے لوگ جن کا کچھ مذہب ہی نہیں آخرت کا انکار کرتے ہیں اور ایسوں کا اعتبار ہی کیا۔

جب علم دین اور اسکی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہو تو یہ وقت کا ضائع کرنا نہیں:

غرض جب آخرت حق ہے اور اس کے سامان کے لیے عمل کی ضرورت اور اس کے عمل کے لیے علم کی ضرورت پھر اس کے سیکھنے اور حاصل کرنے کو وقت کی بربادی کہنا اس کے کیا معنی؟ مگر بہت لوگ پھر بھی اس کو وقت کی بربادی سمجھتے ہیں اور اگر یہ اعتقاد بھی نہ ہو تو عمل تو اسی کے موافق ہے جس سے آخرت کے عقیدے میں ایک طرح کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ ورنہ اگر آخرت کا عقیدہ پکا ہے اور دین کے علم سے رغبت اور دلچسپی ہے تو عالموں کی بے وقعتی اور بے عزتی کرنے کی کیا وجہ اور اگر ان کی وقعت اور عزت بھی کی جائے تو اولاد کو دین کا علم نہ پڑھانے کی کیا وجہ۔ یہ علامتیں تو برے ہی عقیدے کی ہیں۔

عالموں سے الگ رہنے کا کمزور عذر اور اس کا جواب مثال کے ساتھ:

مولویوں کی بے وقعتی کے بارے میں بعض یہ عذر کرتے ہیں کہ صاحب ہم نے وعظ سنا اور معتقد بھی ہوئے مگر اخیر میں جو مولوی صاحب نے چندے کا سوال کر دیا تو سارا اعتقاد ڈھل گیا' مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص حکیم عبدالعزیز صاحب اور حکیم عبدالمجید خاں صاحب وغیرہ سب کو اس وجہ سے چھوڑ دے کہ اس نے

عطائی حکیموں کو دھوکہ دیتے ہوئے دیکھا تھا تو کیا آپ لوگ اس کی رائے کو درست اور اچھا کہیں گے اور کیا آپ نے بھی سب ہی ماہر حکیموں کو دھوکہ دیتے ہوئے دیکھا تھا تو کیا آپ لوگ اس کی رائے کو درست اور اچھا کہیں گے اور کیا آپ نے بھی سب ہی ماہر حکیموں اور اچھے طبیبوں کو چھوڑ دیا ہے تو جن کی آپ نے حکائتیں یاد کر رکھی ہیں وہ واقع میں اناڑی عطائی ہیں۔ افسوس عطائیوں کے پھیل جانے سے آپ نے لائق حکیموں کو تو نہ چھوڑا۔ مگر کچھ چندہ کرنے والے مولویوں کی وجہ سے بڑے بڑے ماہر اور سچے مولویوں کو چھوڑ دیا۔ مگر مولویوں کو نہ چھوڑنے سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان کے خالی معتقد رہو اور ان کے ہاتھ چوم لو۔ ہاتھ تو ہم خود تمہارے چوم لیں گے۔

عالموں سے صرف اعتقاد مفید نہیں ان سے دین کا فائدہ حاصل کرنا چاہیے اور خالی اعتقاد رکھنے کی ایک مثال:

مطلب یہ ہے کہ عالموں سے دین کا نفع حاصل کرو۔ اس وقت جو بعض مولویوں کے ساتھ تمہارا خشک اعتقاد ہے اس کی ایسی مثال ہے' کہ جیسے مشہور ہے کہ دو کنجوس تھے ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ تم کھانا کیونکر کھاتے ہو۔ اس نے کہا کہ بھائی ہر مہینہ ایک پیسہ کا گھی لے آتے ہیں اور سامنے رکھ کر اس سے یہ کہہ کر کہ میں تجھ کو کھا جاؤں گا پورا مہینہ یوں ہی کاٹ دیتے ہیں۔ پھر اخیر میں اس کو کھا لیتے ہیں وہ بولا تم بڑے فضول خرچ ہو ہم تو روٹی پکا کر جس گلی میں گوشت بھننے کی خوشبو آتی ہو۔ وہاں کھڑے ہو کر خشبو سونگھتے جاتے ہیں اور روٹی کھا لیتے ہیں۔ تو یہ دونوں بھی گھی کے معتقد تھے اور دونوں کو گھی سے ایک طرح کا تعلق بھی تھا لیکن ان کو اس گھی سے کیا فائدہ پہنچا۔ ایسے ہی آپ کو نرے اعتقاد اور خالی ادب اور تعظیم کرنے سے کیا نفع ہوگا۔

برتاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ عالموں کو نکما سمجھتے ہیں:

غرض یہ علامتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عالموں کو بے کار چیز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مجھ سے ایک شخص کی گفتگو ہوئی وہ کہنے لگے کہ آپ نے اپنے بھیجتے کے لیے

کیا تجویز کیا اور اس کو کس کام میں لگایا۔ میں نے کہا کہ عربی پڑھتا ہے تا کہ دین کی خدمت کرے کہنے لگے کہ دیوبند کے مدرسہ میں ہمیشہ سو ڈیڑھ سو آدمی فارغ ہو کر نکلتے ہیں وہ دین کی خدمت کے لیے کافی ہیں۔ آپ نے ان کے لیے انگریزی کیوں پسند نہ کی کہ دنیا کی ترقی کرتا اور خوب روپیہ کماتا۔ میں نے کہا کہ جناب دین کی خدمت کرنا اگر خسارہ اور ٹوٹے کی بات ہے تب تو کیا وجہ کہ مدرسہ دیوبند کے طالب علموں کے واسطے یہ گری ہوئی حالت پسند کی جائے۔ بلکہ چلو اور سب کو مشورہ دو کہ سب عربی چھوڑ کر انگریزی میں لگ جائیں' آخر وہ بھی مسلمانوں ہی کے بچے ہیں اگر دینی خدمت کچھ فائدہ کی چیز ہے تو کیا وجہ ہے کہ میرے بھتیجے کے لیے اس کو تجویز اور پسند نہ کیا جائے۔ اس جواب سے وہ بالکل خاموش رہ گئے۔ افسوس کی بات ہے کہ دیوبند کے طالب علم تو ایسے ذلیل کہ جس شغل اور کام کو آپ بالکل بے کار سمجھ رہے ہیں وہ تو ان کے لیے تجویز کیا جائے اور آپ کی اولاد ایسی عزیز اور لائق کہ اس کے لیے ڈپٹی کلکٹری اور تحصیلدازی تجویز کی جائے۔

صاحبو! میں ڈپٹی کلکٹری وغیرہ سے منع نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ آپ نے اولاد کے لیے دین کی کیا فکر کی ہے۔ آپ کو یہ اطمینانِ اور بھروسہ ہے کہ آپ کی اولاد آخرت میں نہ جائے گی۔ اور اگر جائیں گے تو ان کا کیا حشر ہوگا۔ اسی طرح یہ سوچئے کہ کیا دین کی خدمت اور کام کرنے والوں کی ضروریات نہیں اور اگر ضرورت ہے تو کیا سب مسلمانوں پر اس کا اہتمام اور کوشش ضروری نہیں تو بتلایئے آپ نے کیا فکر کی اس موقع پر ممکن ہے کہ بعض لوگ خوش ہوں کہ ہم اس الزام سے بری ہیں کیونکہ ہم نے اپنے ایک بچے کو عربی مدرسہ میں داخل کر دیا ہے لیکن یہ کوئی خوشی کی بات نہیں کیونکہ آپ نے جس قاعدے اور طریقے پر اس بچہ کو عربی کے لیے پسند کیا ہے اس طرز پر وہ بچہ خود اس کام کا نہیں جو عربی پڑھانے سے مقصود ہے کیونکہ آج کل طریقہ یہ ہے کہ جو سب سے زیادہ غبی اور کم عقل اور کند ذہن ہوتا ہے اس کو عربی کے لیے پسند کیا جاتا ہے۔

دنیا کمانے کے لیے بڑے عالی دماغ ہونے کی ضرورت نہیں اور دینی علم کے حاصل کرنے کے لیے بڑے عالی دماغ کی ضرورت ہے:

حالانکہ دنیا کمانے کے لیے بڑے عالی دماغ اور سمجھدار ہونے کی ضرورت نہیں یہ تو چکی پیسنا ہے جس کو بھی تھوڑی سی سمجھ اور عقل ہوگی وہ بھی اچھی طرح کما سکتا ہے۔ دماغ اور عقل کی ضرورت زیادہ اس کام کے لیے ہے جس کے سکھانے کے واسطے بڑے بڑے پیغمبر اور نبی بھیجے گئے۔ اللہ اکبر! کتنی حالت بدل گئی ہے آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبروں کی کیا شان ہے اور وہ کیا چیز ہیں۔

صاحبو! دنیا کی عقل بھی ان کے برابر کسی کو نہیں ہوتی۔ ان حضرات کو ہر قسم کا شرف دیا جاتا ہے اور ہر طرح کی عزت دی جاتی ہے۔ اب بتلایئے کہ اولاد میں کسی کو مولوی بنانے کے لیے پسند کرنا قاعدے پر ہونا چاہیے اور وجہ لوگوں کے اس خیال کی کہ کارآمد اور ہوشیار بچوں کو دینی علم کے واسطے پسند نہیں کرتے یہ ہے کہ سمجھتے ہیں کہ عربی پڑھ کر لڑکا کھانے کمانے کے لائق نہیں رہے گا' کسی مسجد کا ملا بن جائے گا۔

جواب اس شبہ کا جو مولوی بن کر کھانے کمانے سے رہ جاتے ہیں' کمانا کھانا ایک معمولی حاجت ہے:

سو اول تو ہم اس کو مانتے ہی نہیں کیونکہ کھانا کمانا تو ایک معمولی حاجت ہے تو اپنی حاجت اور ضرورت کے لائق سب ہی کر لیتے ہیں اور اگر بہت ہی کمایا تو خاص اس کے کام میں تو تھوڑا ہی سا آئے گا بلکہ جو اصلی غرض ہے کھانے کمانے سے کہ جان کو لگے اس میں اکثر غریب لوگ امیروں سے بڑھے ہوئے ہیں۔

ایک امیر اور غریب کی حکایت:

میں ایک امیر اور غریب کی حکایت سناتا ہوں کہ وہ دونوں آپس میں دوست تھے مگر غریب تو بہت موٹا تازہ اور امیر صاحب نہایت دبلے پتلے ایک روز اس نے اپنے غریب دوست سے پوچھا کہ یار تم کیا چیز کھاتے ہو کہ اس قدر موٹے تازے ہو رہے ہو

اس نے کہا کہ میں کھانا تم سے زیادہ لذیذ اور اچھا کھاتا ہوں۔ امیر بولا کہ بھائی وہ کھانا ہم کو بھی کھلاؤ۔ اس غریب نے اس کی دعوت کردی۔ وقت پر اس کے مکان پر پہنچے۔ آپس میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور کھانے پینے کا کوئی ذکر نہیں۔ آخر دیر ہوگئی اور بھوک لگی تو بے تکلفی کی وجہ سے کھانے کا تقاضا کیا' اس نے وعدہ کیا کہ ابھی آتا ہے پھر اور دیر ہوئی اور زیادہ بھوک لگی زیادہ تقاضا کیا۔ اور وہ یوں ہی ٹالتا رہا۔ آخر جب وہ امیر بہت ہی بے چین اور بے تاب ہوا اور بہت تقاضا کیا تو اس غریب نے کہا بھائی کھانا تو ابھی تیار نہیں' لیکن دن کی باسی روٹیاں موجود ہیں۔ اگر کہو تو لے آؤں اس نے کہا خدا کے لیے تم باسی ہی لے آؤ' خیر وہ تھوڑے سے باسی ٹکڑے اور کچھ ساگ وغیرہ لایا۔ ان کی تو بھوک کے مارے بری حالت تھی۔ بس انہی باسی ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑے اور نہایت مزے سے پیٹ بھر کر کھائے۔ وہ غریب منع کرتا جاتا تھا کہ صاحب نہ کھایئے نہایت مزیدار کھانا پک رہا ہے۔ اس نے کہا کہ بھائی! اب تو یہی نہایت مزہ دار معلوم ہوتا ہے۔ تب اس غریب نے کہا کہ صاحب جو مزہ دار کھانا میں ہر روز کھاتا ہوں وہ یہی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ میں اسی وقت کھانا کھاتا ہوں جب سخت بھوک لگتی ہے۔ اس لیے جو کچھ کھاتا ہوں وہ جان کو لگتا ہے بدن کا جزو بنتا ہے اور تم خالی ضابطہ پوری کرتے ہو کہ نوکر نے آ کر عرض کیا حضور کھانا تیار ہے تم نے سنا اور کھانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ خواہ اس وقت تم کو بھوک بھی نہ ہو غرض اگر کسی نے بارہ ۱۲۰۰ سو تیرہ ۱۳۰۰ سو روپیہ ماہواری کمائے بھی تو کھانا پینا تو اس کا بھی جو کہ اصلی غرض سے حد سے زیادہ نہ ہوگا' ہاں کمانا حد سے باہر ہوگا۔ مگر جب کمانے کی غرض حد سے زیادہ نہیں تو کمائی حد سے زیادہ کیا کار آمد ہوئی۔ جب اصلی غرض کم ہے تو زیادہ سامان سے کیا فائدہ۔ سو اول تو یہی بات لچر ہے کہ مولوی ہو کر کما کھا نہ سکیں گے کیونکہ ضرورت کے موافق تو سب ہی کما کھا لیتے ہیں اور اگر مان بھی لیا جائے تو اس کو بھی ثابت کیجیے کہ وہ کمانا جو آپ لوگوں کے ذہن میں ہے یعنی نوکری تجارت وغیرہ۔ آیا وہ ضروری بھی ہے۔ اس کے غیر ضروری ہونے کا اندازہ آپ کو اس طرح ہو جائے گا کوئی دینی خدمت کرنے والا بھوکا اور ننگا نہیں۔ کہ آپ کسی دین کی خدمت کرنے والے کو بھوکا ننگا

دکھلا دیجئے۔ خواہ وہ پڑھاتا ہو یا وعظ کہتا ہو یا ان میں سے کسی کو ذلیل اور خوار دکھا دیجئے۔ پھر جب یہ بھوکے ننگے بھی نہیں ذلیل وخوار بھی نہیں۔

وہ کون سی چیز ہے جو دینی خدمت کرنے والوں میں نہیں ہے:

تو وہ کون سی چیز ہے جس کی کمی ان لوگوں میں ہے اگر وہ کوئی چیز ہے تو آپ کی صرف ہوسیں ہیں۔ جو بے کار اور بے سود ہیں۔ ذرا آپ ہی گھر میں جا کر اسباب کو شمار کیجیے تو آدھے سے زیادہ وہ سامان نکلے گا جن کے استعمال اور برتنے کی کبھی نوبت بھی نہیں آتی اور چوتھائی سے زیادہ وہ نکلے گا کہ اس کی نسبت آپ کو آج تک یہ بھی خبر نہیں کہ وہ گھر میں موجود بھی ہے تو ایسے سامان اور اسباب کے جمع کرنے کی آپ ہی بتلایئے کیا ضرورت ہے۔

دنیا کی ترقی مقصود نہیں بلکہ اس کا خلاف مقصود ہے:

اور اگر مطلب آپ کا بے کار ہونے سے یہ ہے کہ وہ لڑکا مولوی ہو کر دنیا کی ترقی نہیں کر سکتا تو حضرت ایسا نکما اور ناکارہ ہونا تو عین مقصد ہے۔ اس کو آپ اپنی ہی ایک مثال سے سمجھئے کہ آپ کا ایک نوکر ہے اس کو آپ دس روپیہ ماہوار دیتے ہیں اور آپ کو اس پر ہر طرح اعتماد اور بھروسہ ہے اتفاق سے کہیں باہر کا ایک شخص اس کو ملا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو اور تم کو کیا عوض ملتا ہے اس نے کہا کہ نوکر ہوں اور دس ۱۰ روپیہ ملتے ہیں۔ اس کو سن کر مسافر نے کہا کہ تم میرے ساتھ چلو میں تم کو بیس روپیہ دوں گا اور اس سے آدھا کام تم سے لوں گا۔ اب دل میں ٹٹول کر بتلایئے کہ اس نوکر کے لیے خوبی اور فخر کی کیا بات ہے آیا یہ ترقی کا نام سن کر پھسل جائے یا یہ کہ صاف جواب دیدے اور کہہ دے کہ آپ مجھے بھگانے آئے ہیں۔ یقیناً آپ اس دوسری صورت کو اس کے لیے خوبی سمجھیں گے اور پسند کریں گے۔ اب آپ انصاف سے بتلایئے کہ اگر کوئی خدا کا نوکر ہے اور پانچ روپیہ میں گزر کرتا ہے اور اس حالت میں وہ دو ہزار روپے پر اس طرح لات مار دے کہ کمانے کی قدرت ہوتے ہوئے قدرت سے کام نہ لے تو اس کو کم حوصلہ ناکارہ

ترقی سے محروم کیوں کہا جاتا ہے۔

صاحبو! اس کی قدر تو اور زیادہ ہونی چاہیے نہ یہ کہ اس کو بے وقوف اور خشک دماغ بتلایا جائے۔ صاحبو! جس کا نام آپ نے ترقی رکھا ہے اس کا خلاصہ خدا کی قسم صرف خود غرضی ہے چاہے اس کے پیچھے عقل کے خلاف کرنا پڑے اور چاہے دین چھوڑنا پڑے مگر اپنے فائدے کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

جس کو جس شئے سے رغبت نہیں ہوتی اس میں ترقی نہیں کرتا:

صاحبو! جس کام سے دلچسپی نہیں ہوتی اس میں ترقی نہیں کرسکتا تو دینی خدمت کرنے والے جن کو دنیا سے رغبت نہیں ہے۔ کس طرح دنیا کی ترقی کرسکتے ہیں ہاں جس کام سے ان کو دلچسپی ہے اور ہونی چاہیے اس میں ترقی کرتے ہیں۔

دین دار اور دنیا دار دونوں چست بھی ہیں اور سست بھی:

غرض کہ وہ سب سست بھی ہیں اور چست بھی ہیں۔ جس طرح دنیا دار بھی سست اور چست ہیں۔ مگر جس کو جس سے رغبت اور شوق ہے اس میں چستی کرتا ہے اور جس کام سے دلچسپی نہیں اس میں سستی کرتا ہے۔ غالباً آپ کی تسلی نوکر کی مثال سے ہوگئی ہوگی اور آپ نے فیصلہ کرلیا ہوگا۔

قیامت میں فیصلہ سمجھ میں آئے گا:

اگر نہ کیا ہو تو سمجھ لیجیے اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْم○

"یعنی تم اگر ہم سے تمسخر اور مذاق کرتے ہو تو ہم بھی تم سے ٹھٹھا کرتے ہیں جس طرح تم ٹھٹھا کرتے ہو سو عنقریب معلوم کرلو گے کہ رسوا کرنے والا عذاب کس پر آتا ہے اور ہمیشہ کا عذاب کس پر اترتا ہے۔"

صاحبو! ہماری اور آپ کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص گدھے پر سوار ہے اور دوسرا

اس کو کہتا ہے کہ تو گدھے پر سوار ہے مگر غبار کی وجہ سے اس کا پتہ نہیں چلتا اور کہتا ہے کہ میں تو گھوڑے پر سوار ہوں۔ پہلا شخص کہتا ہے کہ اچھا ذرا غبار بیٹھ جائے تو پھر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری ران کے نیچے گدھا ہے یا گھوڑا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں۔ اگر اس پر راضی نہیں تو ذرا صبر کیجیے۔ **سیعلمون غدا من الکذاب الاشر** کل قیامت کے دن معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا اترانے والا تھا۔ صاحبو! جب آپ کے نوکر کے لیے تو ترقی نہ چاہنا خوبی اور وفاداری ہے پھر خدا کے نوکر کے لیے کیوں یہ خوبی اور وفاداری نہیں ہے تو صاحب یہ ہے وہ نکما ہونا۔ جس کی حقیقت آپ نے اعتراض کر کے خود کھلوائی۔

دنیا سے نکما ہونا عالموں کا فخر ہے اور یہی ان کا جوہر ہے:

میں پھر کہتا ہوں کہ وہ نکما کہنے سے برا نہیں مانتا' بلکہ خود اس پر فخر کرتا ہے اور خوش ہو کر کہتا ہے ۔

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا
اور جو خود نا کام ہو اس کو کسی سے کام کیا

صاحبو! ہمارے بزرگ وہی نکمے تھے کہ اگر ان کی جوتیاں مل جاتی ہیں تو سر پر رکھی جاتی ہیں۔ بس یہ بنا تھی علم دین سے بے رغبتی کی کہ لوگ عالموں کو بے کار اور ناکارہ سمجھتے ہیں اور اس لیے اس سے بالکل تعلق اور دلچسپی نہیں ہے۔ ورنہ دلچسپی کی علامت تو یہ ہے کہ اس کو اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے بھی تجویز اور پسند کرتے۔

عالمگیر کی علم اور مولویوں سے دلچسپی کی حکایت:

مجھے ایک حکایت عالمگیر کی یاد آئی یہ حکایت کتابوں میں دیکھی ہوئی نہیں' زبانی سنی ہوئی ہے کہ ایک روز انہوں نے جامع مسجد میں طالب علموں کو دیکھا کہ سخت پریشان پھرتے ہیں کھانے پینے تک کا کوئی انتظام اور بندوبست نہیں سمجھے کہ اس کا سبب امیروں کی بے توجہی اور لاپرواہی ہے۔ چاہا کہ اس کی کچھ اصلاح ہو بس وضو کرتے ہوئے وزیراعظم سے ایک مسئلہ پوچھا کہ اگر نماز میں فلاں شبہ ہو جائے تو کیا کرے۔ وزیر

صاحب اس کا جواب نہ دے سکے۔ عالمگیر نے ذرا غضبناک نظر سے وزیر کی طرف دیکھا اور کہا کہ تم کو توفیق نہیں ہوتی کہ نماز روزہ وغیرہ کے ضروری ضروری مسئلے یاد کرلو یہ سن کر وزیر وغیرہ سب تھرا گئے اور فوراً ہی مولویوں اور طالب علموں کی تلاش شروع ہوگئی اور روزانہ ان سے سیکھنے لگے اور اس طرح سے وہ سب اطمینان کی حالت میں ہوگئے پھر تو یہ حالت تھی کہ طالب علم ڈھونڈھے نہ ملتے تھے۔ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب ؒ فرماتے تھے کہ عالمگیر کو بارہ ہزار حدیثیں یاد تھیں۔

امیروں کو عالموں سے دلچسپی ہونے کا فائدہ:

دیکھئے جب امیروں کو اس جماعت سے دلچسپی ہوئی گو اپنی ضرورت سے ہوئی تو اس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ مولویوں سے فائدہ اور نفع اٹھانے لگے اگر آپ کو بھی رغبت ہوتی تو کم ازکم ہفتہ میں ایک ہی دن کسی عالم سے مسئلے پوچھ لیا کرتے اگر خود ان کے پاس بلا لیتے۔ کیونکہ آج وہ رئیس کہاں رہے جو خود پوچھنے کے لیے حاضر ہوں۔

ہارون رشید کی درخواست کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ شہزادوں کو پڑھائیں

پہلے یہ حالت تھی کہ خلیفہ ہارون رشید نے امام مالک ؒ سے درخواست کی کہ شہزادوں کو حدیث پڑھا جایا کیجئے۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ ہی کے خاندان سے علم دین کی عزت ہوئی ہے اور آپ ہی بے عزتی کرتے ہیں۔ ہارون رشید نے کہا کے اچھا شہزادے آپ کے مکان پر حاضر ہوں گے۔ لیکن اس وقت عام رعایا کے لوگ الگ کر دیئے جایا کریں۔

بعض رئیس جماعت میں شریک نہیں ہوتے' اس عذر سے کہ ہمارا رعب جاتا رہے گا۔ اس کا جواب:

جیسا آج بھی بعض رئیس مسجدوں میں جماعت سے نماز اس لیے نہیں پڑھتے کہ لوگوں کے ساتھ مل کر کھڑا ہونے سے ہمارا رعب اور دبدبہ جاتا رہے گا۔ صاحبو! ذرا سنبھلو اور ہوش میں آؤ یہ تو درپردہ شریعت کے حکم پر اعتراض ہے کہ ایسا مضر قانون بنایا دوسرے

یہ بالکل غلط ہے کہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے سے رعب جاتا رہے گا۔ رعب تو اس وقت بھی ہوگا لیکن محبت اور الفت کے ساتھ ہوگا۔ اب وحشت اور اجنبیت کے ساتھ ہے۔ خدا تعالیٰ کے قانون ایسے بے ڈھنگے نہیں ہیں کہ ان سے کسی قسم کا نقصان اور ضرر ہو۔

آنحضرت ﷺ کے خلیفوں رضی اللہ عنہم کا رعب:

دیکھئے حضور ﷺ کے خلیفوں کا جو حضور ﷺ کے طریقہ پر تھے کس قدر رعب رعایا پر تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دیکھ لیجیے ان کو تواضع کی کیا حالت تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تواضع کا قصہ:

حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا **اسمعوا واطیعوا** یعنی سنو اور اطاعت کرو۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ **لانسمع والا نطیع:** یعنی ہم نہ آپ کا حکم سنیں اور نہ اطاعت کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی وجہ پوچھی تو اس شخص نے کہا کہ غنیمت کے چادرے جو آج تقسیم ہوئے ہیں سب کو تو ایک ایک چادر ملا ہے اور آپ کے بدن پر دو۲ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تقسیم میں عدل وانصاف نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا بھائی تو نے اعتراض میں بہت جلدی کی' بات یہ ہے کہ میرے پاس کرتا نہیں تھا تو میں نے اپنے چادرے کو تہبند کی جگہ باندھا اور اپنے بیٹے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ان کا چادرہ مانگ کر اس کو کرتے کی جگہ اوڑھا ہے۔ اس واقعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان حضرات میں بڑے چھوٹے سب برابر حصے کے حق دار سمجھے جاتے تھے آج بڑوں کا دوہرا حصہ ہونا گویا لازمی بات ہے۔ البتہ اگر مالک ہی دوہرا حصہ دے دے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ غرض کہ تواضع اور نرمی کی یہ کیفیت تھی اور باوجود اس نرمی کے رعب کی یہ حالت تھی کہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیبت اور رعب کا قصہ:

- ایک مرتبہ آپ بہت سے صحابیوں رضی اللہ عنہم کے ہمراہ جارہے تھے اتفاقاً پشت کی طرف

جو آپ نے نظر کی تو جس جس پر نظر پڑی سب گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ سچ ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس سے سب ڈرتے ہیں اور اگر کسی کے رعب اور ہیبت میں کمی ہے تو تقویٰ اور دینداری کی کمی کی وجہ سے ہے ورنہ ضرور ہیبت ہوتی ہے۔ ہاں وحشت اور نفرت نہیں ہوتی۔

الگ تھلک رہنے کے ساتھ جو رعب ہوتا ہے اس کی مثال:

اور خلط ملط نہ کرنے کے ساتھ جو رعب ہوتا ہے وہ ایسا ہے جیسے لوگ بھیڑیئے سے ڈرتے ہیں کہ اگر اس جگہ بھیڑیا آ جائے تو ابھی سب کھڑے ہو جائیں تو جیسے آج کل رئیسوں کا خیال ہے ایسا ہی ہارون رشید کو یہ خیال ہوا کہ اگر شہزادے سب سے الگ پڑھیں گے تو ان کا رعب باقی رہے گا' اس لیے امام مالک رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ شہزادوں کے ساتھ کسی کو نہ بٹھلایئے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ آخر کار شہزادے ہی حاضر ہوا کرتے اور سب کے ساتھ مل کر پڑھا کرتے اور حدیث سنا کرتے اس وقت کے بادشاہ بھی ایسے تھے کہ ایک عالم نے ان کو ٹکا سا جواب دے دیا اور بادشاہ نے قبول کر لیا لیکن آج وہ حالت نہیں ہے۔

آج کل عالموں کو امیروں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے:

اس وقت بھی عالموں کو یہ چاہیے کہ امیروں کے سامنے اپنے کو ذلیل وخوار نہ کریں لیکن بہت زیادہ الگ بھی نہ رہیں کیونکہ دنیا دار اس وقت بالکل ہی محروم رہیں گے یعنی اگر کوئی شخص دین کا فائدہ حاصل کرنے کے لیے عالموں کو قدر کے ساتھ بلالے تو چلا جانا مناسب ہے اور میرا یہ مطلب نہیں کہ عالموں کو بلا کر آپ ان سے عربی پڑھیے اس میں تو آپ کو پھر عذر سوجھیں گے۔

اُردو کی دینی کتابوں کا کافی ہونا:

سو میرا یہ مطلب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُردو میں بھی ایسا کافی ذخیرہ مذہب کا جمع ہو گیا ہے کہ آپ کو عربی کی ضرورت نہ پڑے گی۔

دینی کتابیں وہ ہیں جو باعمل عالموں کی لکھی ہوئی ہیں تردید دین نیچریوں کی

لیکن یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ مذہبی کتابوں سے مراد شریعت کے پابند عالموں کی کتابیں ہیں۔ انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کو خرافات اور بے ہودہ کتابیں مراد نہیں اگرچہ لقب ان کا مولوی ہو۔ مجھ سے ایک نائب تحصیلدار صاحب نے کہا کہ میں مذہبی کتابیں دیکھا کرتا ہوں دریافت جو کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نیچروں[1] اور بے دینوں کی کتابیں دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ صاحب اگر آپ انگریزی قانون یاد نہ کریں اور اخبار ہی دیکھا کریں تو کیا آپ انگریزی عملداری میں رہ کر کام چلا سکتے ہیں' ہرگز نہیں کیونکہ جو کتابیں سرکار نے تجویز کی تھیں آپ نے ان کو نہیں دیکھا بلکہ اپنی طرف سے نئی کتابیں مقرر کرلیں تو اسی طرح مذہب میں بھی وہ کتابیں دیکھئے جو مذہب کی طرف سے مقرر ہیں۔

اس وقت مردوں اور عورتوں نے پڑھنے کے لیے کتابیں اپنی رائے سے تجویز کرلی ہیں اور وہ مضر ہیں

اس وقت لوگوں نے پڑھنے کے لیے کتابیں اپنی طرف سے تجویز کرلی ہیں چنانچہ مردوں نے تو یہی بددینوں کی لکھی ہوئی کتابیں تجویز کیں اور عورتوں نے جھوٹے گھڑے ہوئے قصے کہانیوں کی کتابیں پسند کیں۔ جیسے معجزہ آل نبی جس کا مہمل اور بے معنی ہونا نام ہی سے ظاہر ہے کیونکہ اس کا معنی ہیں نبی کی اولاد کا معجزہ' حالانکہ معجزہ نبی کا ہوتا ہے اور کسی کا نہیں ہوتا دوسرے اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کسی فقیر کو بخش دیا تھا اور اس نے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور ایسے قصے پڑھنے والے تو جاہل ہیں ہی۔ ان جاہلوں سے بڑھ کر بعض مولویوں نے غضب کیا کہ تجارت اور دکانداری کے فائدے کے لیے وہ قصہ چھاپا۔ اور چونکہ جھوٹی بات کا رواج دنیا ناجائز ہے اس واسطے اپنے کو اس الزام سے بری کرنے کے لیے اخیر میں یہ لکھ دیا کہ یہ قصہ موضوع چھپا۔ میں ان مولوی صاحب سے دریافت کرتا ہوں کہ اول تو آپ کو اس کے

---

[1] نیچری وہ لوگ ہیں جن کے انگریزی پڑھ کر عقیدے خراب ہوجاتے ہیں۔

چھاپنے کی کونسی دینی ضرورت تھی، پھر یہ کہ عام لوگ تو موضوع کے معنی بھی نہیں سمجھتے۔ اگر لکھنا تھا تو یہ لکھتے کہ یہ قصہ بالکل لغو اور جھوٹ ہے اس کا پڑھنا جائز نہیں۔ لیکن اگر یہ لکھتے تو بکتا کہاں، خدا بچائے ایسے دین فروشوں سے مشکل ہوا تو واقعی تم کو یہ کام مشکل ہے۔ مگر کسی دین دار عالم سے یہ کام لیجئے۔ یہ تو تعلیم میں گفتگو تھی۔

اولاد کیلئے تعلیم سے زیادہ ضرورت نیک صحبت کی ہے اور ایسی صحبت کی فضیلت:

مگر اس کے ساتھ ہی یہ اس سے زیادہ ضروری ہے کہ ابتداء ہی سے اپنی اولاد کو کسی بزرگ کی صحبت میں وقتاً فوقتاً رکھیے اور خود بھی رہیے۔ اس کی صحبت میں اللہ تعالیٰ نے اصلاح و درستی کا اثر رکھا ہے۔ مگر صحبت کا ہم لوگوں میں بالکل ہی انتظام نہیں۔ میں نے ایک موقع پر اس کو ایک پورے وعظ میں بیان کیا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ جہاں اور تمام ضروریات کا اپنی اولاد کے لیے انتظام کیا جاتا ہے چند روز کے لیے اس کا بھی انتظام کر لیجئے کہ اس کو کسی بزرگ کے سپرد اور حوالے کر دیجیے اور کم از کم ایک سال تک ان کے پاس ضرور رکھیے اگر کہیے کہ اس میں تو ان کی تعلیم کا بڑا حرج اور نقصان ہوگا۔

خلاصہ درستی کے طریقے کا

تو میں کہتا ہوں کہ اس کی یہ صورت کیجیے کہ ہر چھٹی میں چند روز رکھا کیجئے، اس طرح چند بار میں مدت پوری ہو جائے گی۔

عربی علم اگر دین کے لیے نہ پڑھایا جائے تو دنیا ہی کے لیے پڑھاؤ وہ بھی بیکار نہ جائیگا:

غرض صحبت کا بھی انتظام ہو اور باعمل عالموں کو تجویز کی ہوئی کتابوں کی تعلیم ہو اس طرح دین کی درستی ہو سکتی ہے۔ اگر فرصت کم ہو تو اردو سہی ورنہ وقت ملے تو عربی سے بھی نہ چوکیے کہ کمال کے پیدا ہونے کا یہی طریقہ ہے اور میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ عربی کا علم اگر دین کے لیے نہ پڑھایا جائے تو دنیا ہی کی لیاقت اور قابلیت کے لیے پڑھایئے میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ انگریزی میں ایم اے[1] تک کی تعلیم پائے ہوئے ہیں۔ مگر

---

[1] انگریزی کے بڑے اونچے درجہ کا نام ہے۔ ۱۲۔

عربی کی استعداد اور لیاقت نہیں رکھتے ان سے لیاقت میں عربی خواں جو انٹرنس[1] بھی پاس نہیں زیادہ بڑھے ہوئے ہوتے ہیں تو اگر عربی کی تعلیم دین کی تعلیم دین کے لیے نہ ہو تو کم از کم دنیا ہی کے لیے ہو۔ لیکن اس سے کوئی یوں نہ سمجھے کہ میں دین کے علم کو دنیا کے لیے حاصل کرنے کی رائے دیتا ہوں بات یہ ہے کہ اس علم کی خاصیت ہے کہ کبھی نہ کبھی اپنا اثر ضرور کرتا ہے اور حاصل کرنے والے کو دیندار بنا کر رہتا ہے یہ سمجھ کر میں نے کہہ دیا ہے کہ خواہ دنیا ہی کے لیے حاصل کرو غرض جس طرح ہو علم دین کا اہتمام وقت تو اسلام اور دین کے ہی لالے پڑ رہے ہیں آخر اس کو بھی سنبھالنے کی ضرورت ہے یا نہیں بس اس کی رائے دے رہا ہوں اور یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ دنیا کے سنبھالنے کے لیے بھی دین ہی کی ضرورت ہے اس لیے میں نے پہلے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سب سے زیادہ ضروری مولویوں کی جماعت ہے۔

پہلی آیت کی تفسیر اور مولویوں کی ضرورت کو اس سے ثابت کرنا:

اب ان آیتوں سے اس کو ثابت کرتا ہوں تو سمجھئے کہ ان دو آیتوں میں ایک ارشاد یہ بھی ہے کہ: لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اور صرف اسی کا اس وقت بیان کرنا مقصود ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ اصلاح اور درستی کے بعد زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ اب یہ دیکھئے کہ فساد کیا ہے اور درستی کیا ہے اسی کے فیصلہ کے لیے میں نے یہ دونوں آئتیں پوری پڑھ دی ہیں تاکہ اول و آخر کو دیکھ کر یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے تو پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (ترجمہ) دعا کرو اپنے رب سے عاجزی کے ساتھ اور پوشیدہ طور پر ۱۲۔ اور بعد میں یہ فرمایا کہ: وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (ترجمہ) اور دعا کرو اس کے خوف اور امید کے ساتھ ۱۲۔ ان دونوں جگہ میں دعا کا حکم فرمایا ہے اور دعا میں دو احتمال ہیں یا تو دعا کے وہی معنی ہوں جس کو عرف میں دعا کہتے ہیں۔ یا دعا کے معنی عبادت کے ہوں کیونکہ قرآن میں دعا کے معنی عبادت کے بھی آئے ہیں تو اس آیت میں اگر عبادت کے معنی لیے جائیں تو خلاصہ یہ ہوگا کہ اول بھی عبادت کا

[1] انٹرنس انگریزی کے درمیانی درجہ کا نام ہے۔

حکم ہے اور بعد میں بھی اور درمیان میں بھی فساد کی ممانعت ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبادت نہ کرنا فساد ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اصلاح کیا چیز ہے پس مطلب اس آیت کا یہ ہوا کہ عبادت کے انتظام کے بعد عبادت مت چھوڑو۔ اگر دعا کے معنی عبادت کے نہ لیے جائیں۔ بلکہ اپنے عرفی اور ظاہری معنی پر رکھا جائے تو اگرچہ اس وقت ظاہر میں یہ آیت اس دعویٰ کے ثابت کرنے کے لیے مفید نہ ہوگی غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس صورت میں بہت زیادہ مفید ہے کیونکہ عبادت دو قسم کی ہے ایک تو وہ عبادت جس سے مقصود دین ہی ہے اور ایک وہ عبادت جس سے کبھی دنیا بھی مقصود ہوتی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی عبادت اپنی عبادت ہونے میں زیادہ قوی ہے۔ اب سمجھئے کہ دعا ایسی عبادت ہے کہ اس سے دنیا کی بھی طلب ہو سکتی ہے تو اس اعتبار سے دعا دوسرے درجے کی عبادت ہو گی تو جب اس آیت میں اس کے چھوڑنے کو بھی فساد فرمایا گیا ہے تو جو خالص عبادت ہے اس کا چھوڑنا تو کیوں فساد نہ ہو گا۔ بہر حال قرآن پاک اس کا دعویٰ کر رہا ہے کہ عبادت کا چھوڑنا زمین میں فساد پھیلانے کا سبب ہے اور عبادت کا انتظام زمین میں اصلاح اور امن قائم کرنا ہے۔ باقی یہ بات کہ جس وقت یہ حکم نازل ہوا تھا اس وقت ہر طرح کی اصلاح کہاں تھی جس کے بعد فساد کرنے سے منع فرمایا گیا کیونکہ کافروں کی کثرت تھی جو ہر وقت فساد ہی میں لگے رہتے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اصلاح سے اس کا سامان اور انتظام ہے یعنی نبی کریم ﷺ کو دنیا میں بھیجنا کہ وہ سامان تھا زمین میں اصلاح کا تو معنی یہ ہوئے کہ ہم نے یہ اصلاح کہ نبی کریم ﷺ کو بھیج کر اصلاح کا سامان کر دیا۔ اگر تم ان کو چھوڑو گے تو تم فساد کرو گے یہ تو آیت کا مطلب ہوا۔

دین کا نہ ہونا فساد کا سبب ہے اور اس دعویٰ کو ثابت کرنا:

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عبادت یعنی دین نہ ہونا سبب فساد کا ہے۔ اب میں اس کو مشاہدہ سے ثابت کرتا ہوں۔ لیکن اول اس کو سمجھئے کہ دین کیا چیز ہے تاکہ آپ لوگوں کو پھر آیت کے مطلب میں تعجب نہ ہو۔

دین حقیقت میں پانچ چیزوں کے مجموعے کا نام ہے:

تو سنیے دین حقیقت میں چند چیزوں کے مجموعے کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے اس وقت دین کا یہ ست نکالا ہے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لی اور بس۔ اور بعض نے یہ بھی نہیں رکھا بلکہ صرف کلمہ پڑھ لینے کو کافی سمجھ لیا اور مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ کی اپنی رائے سے یہ تفسیر کر کے کہ صرف کلمہ پڑھ لینا جنت میں جانے کے لیے کافی ہے اس کو اپنا مذہب بنا لیا اور اس پر غضب یہ ہے کہ بعض نے کلمہ میں سے محمد رسول اللہ ﷺ کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ میں نے ان لوگوں کے کلام میں اس کی بھی تصریح دیکھی ہے کہ (خدا کی پناہ) بدون رسول کے ماننے کے کیسے نجات ہو سکتی ہے۔

صاحبو! مولوی اسی کو روکتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے لیکن آپ کو خبر نہیں۔ صاحبو! غضب ہے کہ غیر قومیں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی جاتی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے۔ اس لیے میں بتلاتا ہوں کہ دین اصل میں چند چیزوں کے مجموعے کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں یہ ہیں: (۱) عقیدے (۲) عبادتیں (۳) معاملے (۴) معاشرت یعنی طرز زندگی، (۵) اخلاق یعنی عادتیں یعنی تکبر نہ ہو، دکھلاوہ نہ ہو، تواضع ہو خلوص ہو، قناعت ہو، شکر ہو، صبر ہو، وغیرہ وغیرہ پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے۔

دین کی چیزوں میں لوگوں نے تفریق کر دی:

مگر اس وقت کسی نے کسی چیز کو اور کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے کسی نے عباد کو چھوڑا کسی نے معاملو کو، کسی نے معاشرت[1] کو اس طرح سے چھوڑا کہ اپنے طرز کو چھوڑ کر غیروں کے طرز کو اختیار کر لیا ہے اور بعض نے باطنی اخلاق یعنی عمدہ عادتوں کو چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ ان اخیر کی دو چیزوں[2] کو تو قریب قریب سب نے ہی چھوڑ دیا ہے۔ اس کی تفصیل کے بعد آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ دین یعنی ان پانچ چیزوں پر عمل کرنے سے زمین میں اصلاح قائم

---

[1] معاشرت زندگی بسر کرنے کا طریقہ

[2] یعنی معاشرت اور اخلاق کو۔۱۲۔

ہوتی ہے اور ان میں خلل ڈالنے سے زمین میں فساد پھیلتا ہے۔

دین کی پانچوں چیزوں کو جدا جدا امن قائم کرنے اور فساد کے مٹانے میں دخل ہے

بس اب مشاہدہ کر کے دیکھ لیجئے کہ امن قائم رکھنے میں جدا جدا ہر ایک کو کیا دخل ہے سو بعض کا دخل تو ظاہر ہے۔

اخلاق اور معاملوں کا دخل تو ظاہر ہے!

مثلاً خلاق یعنی عمدہ عادتیں کہ ان کا اثر سب لوگوں کے امن میں ظاہر ہے اور ذرا سے غور سے معاملات کا اثر بھی امن عام میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ معاملہ کے متعلق جتنے حکم ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ کسی کا حق ضائع اور تلف نہ کیا جائے پس معاملے اگر شریعت کے قاعدے کے موافق کیے جائیں تو بڑا اتفاق پیدا ہو۔ کیونکہ آپ کی عقل اور سمجھ ان مصلحتوں کی رعایت نہیں کر سکتی جن کی شریعت نے کی ہے۔ جیسے باغ کے پھل فروخت کرنا کہ اپنے وقت سے پہلے پھل فروخت کیے تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے کیونکہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے میں ایسی چیز بیچنا ہے جس کا اس وقت کوئی وجود نہیں اور اس کے اندر کسی نہ کسی کا ضرر اور نقصان ضرور ہوتا ہے۔ بیچنے والے کا یا مول لینے والے کا اور شریعت کے قاعدے سے فروخت کرنے میں کسی کا ضرر نہیں اور جب کسی کا ضرر نہیں تو امن قائم ہوگا تو ان دونوں کا اثر دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے باقی پہلی تینوں چیزوں کا دخل عام امن میں ہونا سو یہ کم ظاہر ہے اس کو بھی ثابت کرنا ضروری ہے کہ تین چیزیں بھی امن عام میں دخل اور اثر رکھتی ہے۔

عقیدوں کا عام طور پر امن میں دخل ہے:

سو اول یعنی عقیدے تو ان میں یہ تین عقیدے۔ (۱) خدا کو ایک ماننا۔ (۲) رسول کو ماننا۔ (۳) قیامت کو ماننا سب عقیدوں کی جڑ ہیں۔ اور ان تینوں کا امن عام میں بڑا دخل اور اثر ہے۔ آپ نے اخلاق اور معاملوں کا تو امن عام میں دخل مان ہی لیا ہے اور اسی

کے تسلیم کرنے سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائے گا۔ پہلے ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا، سچ بولنا ہمدردی کرنا، خودغرضی نہ کرنا سب داخل ہیں اور دنیوی انتظام کے قانون میں بہت بڑی چیزیں ہیں جن پر تمام کا مدار ہے۔ لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق دو شخصوں میں پائے جائیں جن میں ایک تو خدا اور رسول کا قائل ہو۔ اور دوسرا اس کا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہو گا۔ یعنی خدا کے ایک نہ ماننے والے میں یہ اخلاق ایک خاص وقت تک پائے جائیں گے۔ جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اس کا دنیا کا فائدہ اور نفع فوت نہ ہو۔ یا ان کے خلاف عمل کرنے میں دوسروں کو خبر ہو کر رسوائی اور بدنامی کا اندیشہ ہو اس وقت تک وہ ان اخلاق پر عمل کرے گا اور اگر کوئی ایسا موقع آ پڑے کہ ان اخلاق پر عمل کرنے سے دنیا کا ضرر ہوتا ہو۔ اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو جس سے اندیشہ بدنامی کا ہو تو اس وقت خدا اور رسول کے نہ ماننے والے کو کبھی ان اخلاق کے چھوڑنے کی پرواہ نہ ہوگی ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین بادشاہوں کے آپس میں عہد و پیمان ہوتا ہے تو اس کی پابندی اسی وقت تک کی جاتی ہے جب تک اس میں اپنا نفع سمجھتے ہیں یا عہد کے خلاف کرنے میں اپنا ضرر اور نقصان ہوتا ہو۔ اور اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو تو عہد کے توڑنے میں ذرا بھی پس وپیش اور تامل نہیں ہوتا یا فرض کرو کہ دو شخص ساتھ سفر کریں جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپے کے نوٹ ہوں اور دوسرے پر فاقے گزرتے ہوں اور اتفاق سے وہ مالدار انتقال کر جائے اور غریب ساتھی کو ان نوٹوں کے لے لینے کا موقع مل اور چالاک بھی اتنا بڑا ہو کہ بے تکلف ان کو چلا سکے اور اس مرحوم کے وارثوں میں بھی صرف ایک کمسن نابالغ بچہ کو دے دینا چاہیے اور نفس کا تقاضا یہ ہوگا کہ جب روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی نہیں کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر ان کو کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ اس کشاکشی اور اختلاف میں میں یہ نہیں سمجھتا کہ انسان کو صرف اخلاقی طاقت اس بڑی ہلاکت اور خیانت سے بچائے گی۔ جب تک اس کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو۔ بس جس شخص کو صرف اخلاقی تعلیم ہوئی ہے وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا۔ البتہ جو

اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے وہ اس سے بچ سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور مجھے دنیا میں خیانت کا خمیازہ بھگتنا نہ پڑا تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگتنا پڑے گا۔ اسی طرح مجھے ایک بات اور یاد آئی کہ میرے پاس اکثر ایسے ٹکٹ آجاتے ہیں جو ڈاکخانہ کی مہر سے بالکل بچے ہوئے ہوتے ہیں اگر میں اس کو استعمال کرلوں تو کوئی بھی باز پرس نہیں کرسکتا کیونکہ اس وقت میرے پاس نہ ڈاکخانے والے ہوتے ہیں نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے۔ لیکن محض خدا کے خوف اور ڈر سے میں سب سے پہلے ان ہی کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں اس کے بعد خط پڑھتا ہوں۔ ایسے ہی روز مرہ کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت اور رعایت جب ہی ہوسکتی ہے جب دل میں خدا کا خوف ہو۔ یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی ورنہ غور سے معلوم ہوگا کہ تمدن[1] کے تمام قاعدوں میں اس کی ضرورت ہے کہ خدا تعالیٰ رسول ﷺ اور قیامت کو مانتا ہو۔ رسالہ مآل التہذیب میں اس کو مفصل بیان کیا ہے وہ رسالہ دیکھنے کے قابل ہے۔ اس میں دکھلا دیا ہے کہ اس نئی بیہودہ تہذیب کا خراب نتیجہ دنیا ہی میں نظر آنے والا ہے اور ایک خرابی کو لکھا ہے اور ختم پر ہر جگہ یہ کہہ دیتے ہیں: فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُهَذِّبِيْنَ یعنی پس سخت عذاب ہوگا قیامت میں نئی تہذیب والوں کو۔ غرض امن عام اور تمدن اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اخلاق اور عادتیں درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی جب ہوسکتی ہے جب عقیدے درست ہوں۔ پس امن اور اصلاح کے واسطے بھی عقیدوں کی درستی ضروری ہوئی۔

شریعت کے اعمال کا امن قائم کرنے میں دخل:

اب اعمال کا دخل امن عام میں سمجھئے یہ بھی انشاء اللہ اخلاق کی ضرورت مان لینے سے ثابت ہو جائے گا سب کو معلوم ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے کیونکہ فساد کی بناء اور وجہ نا اتفاقی اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے کیونکہ فساد کی بناء اور وجہ نا اتفاقی تکبر اور بڑائی سے پیدا

[1] دنیا کی آسائش کے انتظام کو کہتے ہیں۔۱۲۔ یہ آیت نہیں ہے۔

ہوتی ہے کیونکہ اگر تکبر نہ ہو اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نا اتفاقی کی کوئی وجہ نہیں تو اتفاق اور اتحاد کے لیے تواضع اور عاجزی کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے۔ اور اس تواضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے۔ نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر اس کو ذلت نہ سکھلائی جائے تو اس میں فرعونیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نماز میں اول ہی سے اللہ اکبر یعنی خدا سب سے بڑا ہے سکھایا جاتا ہے تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہے گا اور اعضائے ظاہری سے رکوع سجدہ بھی کرے گا زمین پر ناک اور پیشانی رکھے گا' وہ کیونکر اپنے کو بڑا سمجھے گا۔ اگر کہو کہ اس سے تو یہ ہوگا کہ اپنے کو خدا سے بڑا نہ سمجھے گا' لیکن دوسروں سے بڑا نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں تو جواب یہ ہے کہ یہ نا تجربہ کاری کا اعتراض ہے۔ دیکھو اگر تحصیلدار اپنے حکومت کے جوش میں تحصیلداری کر رہا ہو اور اچانک لیفٹیننٹ گورنر اس کے اجلاس میں آ جائے تو اس وقت تحصیلدار کے ذہن سے تحصیلداری کا خیال بالکل نکل جاتا ہے۔ اگر کوئی اس وقت اس کو حضور بھی کہہ دے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کسی نے گولی ماردی۔ اب سمجھو کہ جس کے دل میں خدا کی عظمت اور بڑائی ہوگی وہ اپنے کو چیونٹی سے بھی کمزور اور حقیر سمجھے گا۔ کیونکہ بڑوں کے سامنے چھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی تو اللہ اکبر تعلیم وہ ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور اس کے بعد نااتفاقی کا جاتا رہنا ضروری اور لازمی ہے۔ اسی طرح حیوانی خواہشات سے سینکڑوں فساد لڑائی جھگڑے دنیا میں ہوتے ہیں۔

روزہ اور زکوٰۃ:

اور روزے سے حیوانیت کی قوت ٹوٹتی ہے اسی طرح زکوٰۃ کہ اس سے زکوٰۃ لینے والے کے علاوہ اور دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔ دیکھو حاتم طائی سے بوجہ سخاوت کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کی بناء اور وجہ یہی محبت ہے تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے۔

حج:

اسی طرح حج میں غور کیجیے کہ اسی میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں ایک زمانہ

میں ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں اور تمام تکبر اور بڑائی کے سامان سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان اور بڑے دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق اور اتحاد میں بڑا دخل ہے۔ جیسا اوپر ذکر ہوا۔ اور اسی اتفاق کا اثر ہے کہ حاجیوں کے مجمع میں واردات بہت کم ہوتے ہیں اور دوسرے مجمعوں میں جو حاجیوں کے مجمع سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے حادثے بہت ہو جاتے ہیں' البتہ کسی کو شائد بدوؤں کی شکایت ہوگی۔ سو اصل میں ان کا مقصود لوٹ مار نہیں ہے بلکہ وہ ایک درجہ میں حاجیوں کی بے پرواہی کا بدلہ لیتے ہیں۔ ان کی حالت بالکل یہاں کے گاڑی بانوں کی سی ہے کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دے دیا اور نرم برتاؤ کیا تو خوش ہیں ورنہ پھر دیکھئے کیسے پاؤں پھیلاتے ہیں۔ ایسے ہی اگر بدوؤں کی خاطر مدارت کی جائے ان کو انعام کے طور پر کچھ زیادہ دے دیا جائے تو وہ بہت زیادہ آرام پہنچاتے ہیں اور یہ جو سننے میں آیا ہے کہ بدو پتھر مار کر مال چھین لیتے ہیں تو اول تو ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا ہے بھی تو ایسے بدوؤں کے ہاتھ جو اس قافلہ میں نہیں ہوتے' بلکہ اس وقت جنگلوں میں باہر کے ڈاکو دیہات کے لوگ پھیلے رہتے ہیں وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ حاجی خود اپنی حفاظت نہ کرے کہیں قافلے سے آگے پیچھے رہ جائے۔ غرض حج کو اتفاق اور امن میں بہت بڑا دخل ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حج کا ایک عمل تواضع سے پر ہے۔

شریعت کے تجویز کیے ہوئے طرز زندگی کو عام امن میں دخل ہے:

اب رہی معاشرت یعنی طرز زندگی سو تامل اور غور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبر ٹپکتا ہے مثلاً ناجائز وضع اور لباس سے شریعت نے منع کیا ہے سو جتنے ناجائز لباس ہیں ان سب میں تکبر اور بڑائی ہے جو لوگ شریعت کے خلف وضع رکھتے ہیں' وہ غور کریں کہ اس وقت ان کے دل کی حالت کیا ہے اور اس حالت کو یاد رکھیں اور پھر ایک ہفتہ شریعت کے موافق وضع اور لباس اختیار کر کے اس کا اثر دیکھیں تو زمین اور آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ پس شریعت کے موافق لباس اختیار کرنے سے تواضع پیدا ہوگی اور اس سے اتفاق اور امن حاصل ہوگا یہ تو سمجھ

میں آنے والی تقریر ہے۔

عقیدے اور عبادتیں اور معاشرت کے لیے عام امن میں دخل ہونیکی ایک وجہ جوان تینوں میں پائی جاتی ہے:

اب دوسری تقریر اور ہے جو ان تینوں میں پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے اس کو ہر شخص جانتا ہے پس اسی طرح اعمال میں بھی ایک خاصیت ہے اور عقائد میں بھی اور معاشرت میں بھی اور وہ یہ ہے کہ ان سب سے دل میں ایک نور پیدا ہوتا ہے اور اس نور سے اس کی وہ حالت ہو جاتی ہے جس کو ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے وہ حدیث یہ ہے: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان تکلیف نہ پائیں۔

دین کی درستی کا دنیا کی درستی میں دخل ہونے کی تیسری تقریر:

اب میں ایک بات اور کہتا ہوں جو دین کی تمام چیزوں کو شامل ہے وہ یہ کہ دین کی یہ غرض نہیں کہ اس سے دنیا کا نفع حاصل ہو گو دین کے کاموں سے دنیا کا نفع بھی ہو جائے بلکہ اصلی مقصود اس سے خدا تعالیٰ کی خوشنودی ہے اور جب خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی اس کی ساری دنیا کی ضرورتیں پوری فرمائیں گے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں وعدہ فرمایا ہے کہ: مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ اس کو دونوں جہان کی آفتوں سے بچاتا ہے اور ایسی جگہ سے روزی پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہ ہو۔ پس دین کی درستی کو دنیا کی درستی میں اس طرح دخل ہوا۔

دین کا کام دنیا کی نیت سے کرنا نہایت بے تمیزی اور کمینہ پن ہے:

مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی ہو گا تو دنیا کے کام بنیں گے۔ بلکہ صرف خدا کی خوشی اور رضا مندی کے لیے ہمیں دنیا کے فائدہ کا کیا کرنا لیکن ہاں حاصل ضرور ہوں گے۔ دیکھو وفادار نوکر وہی ہے جو آقا کی خوشی اور رضامندی کو اپنی

مصلحت اور ضرورت پر مقدم رکھے اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اس کو خودغرض اور خود کام کہا جائے گا۔ پھر آقا اپنی عنایت اور کرم سے خود ہی اس کی ضرورتوں کو پورا کرے گا۔ اور اگر دیکھا جائے تو آرام اور راحت بھی اسی میں ہے کہ کسی کے حکم کا تابع بن کر رہے چاہے اس کے حکم کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور اگر ہر کام میں مصلحت اور فائدہ سوچتا رہے گا تو کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ چنانچہ اگر کوئی اہل مد کچہری کا کام کرنے کی حالت میں ہر وقت اپنی تنخواہ کے آمد و خرچ کے حساب کتاب میں لگا رہے تو یقیناً کچہری کا سارا کام برباد ہو جائے گا۔ ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ بیوی کو خط لکھ رہے تھے کہ اس وقت کہ اس وقت ایک چڑیا نے ہگ دیا تو آپ نے اس چڑیا کو ایک گندی گالی دی اور گالی کا خیال دماغ میں ایسا غالب ہوا کہ بے خبر میں وہی گالی بیوی کے خط میں لکھی گئی وہاں جو خط پہنچا تو بیوی کو سخت تعجب ہوا کہ اچھے خاصے مہذب تعلیم یافتہ ہو کر بے تہذیب کیوں بن گئے کہ گالیاں دینے لگے۔ اس نے ان سے وجہ پوچھی کہ مجھ سے کیا قصور ہوا' جو ایسی گندی گالی لکھی۔ آخر اس کو سارا ماجرا لکھا تو یہی حال ہوگا مصلحت سوچنے والے کا کہ ضروری کاموں کا ستیاناس ہو جائے گا اور تعجب نہیں کہ سرکاری کاغذ میں گھر کے آٹا دال کا حساب لکھ دے۔

کام کے وقت فائدوں پر نظر نہ کرنا چاہیے ورنہ وہ کام خراب ہوگا!

خلاصہ یہ کہ آدمی اگر کام کے وقت فائدوں پر نظر رکھے تو وہی کام میں آڑ ہو جاتے ہیں۔ حضرت! سڑک کوٹنے والا مزدور اگر کوٹتے وقت پیسوں کی فکر میں رہے تو ضرور کہیں چوٹ کھائے گا۔ اگر چوٹ سے بچنا ہے تو اس وقت مزدوری پر بالکل نظر نہ کرے بلکہ کام پر نظر اور دھیان رکھے مگر دنیا کے کاموں میں تو لوگ ان قاعدوں کو ضروری سمجھتے ہیں اور دین کے کاموں میں سے ان سے کچھ کام نہیں لیا جاتا۔ حالانکہ اس کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں نے تین تقریریں کی ہیں۔ اور ہر تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ دین کو یعنی خدا کی عبادت کو دنیا کے اندر امن قائم رکھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور یہ تین تقریریں اس لیے کیں کہ لوگوں کی سمجھ جدا جدا پسند جدا جدا ہے جس کی جو پسند آئے اس سے تسلی حاصل کر

لے یہ دین کے قاعدوں کی خوبی ہے کہ ہر شخص اپنی عقل کے موافق دین کی خوبیوں کو سمجھ سکتا ہے۔

الحمدللہ یہ بات ہر طرح ثابت ہوگئی کہ امن عام کی صورت اور اس کا طریقہ اگر کچھ ہے تو خدائی قانون اور احکام کی پابندی ہے اگر کہو کہ دنیا میں بہت قومیں مسلمان نہیں اور خدائی احکام کی پابندی نہیں کرتیں تو ان میں امن کیسے قائم ہے تو مختصر جواب اس کا پہلے دے چکا ہوں کہ امن جس چیز کا نام ہے وہ بغیر احکام کی پابندی کے نہیں ہو سکتی۔ امن کی روح اور جان اور بے دین قوموں میں نہیں اس کی تصویر ہے جو بے جان ہونے کی وجہ سے بے کار ہے۔ اور اس کا مفصل جواب رسالہ "مال التهذيب" میں دیا گیا ہے اس کو منگا کر دیکھئے۔ پتہ اس کا "مطبع نظامی کانپور" ہے وہ اس قابل ہے کو بچوں کو پڑھائی جائے۔ غرض یہ بات بلاشبہ ثابت ہوگئی کہ امن عام کی بقا محض دین پر ہے۔

حدیث لايقوم الساعة حتى لايقال فى الارض الله الله کا بیان اور اس کی شرح:

اور اس سے اس حدیث کا مطلب بھی سمجھ میں اچھی طرح آ جائے گا کہ **لا تقوم الساعة حتىٰ لايقال فى الارض الله الله** (ترجمہ) جب تک کوئی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے قیامت نہ آئے گی اور مختصر وجہ اس کی یہ ہے کہ دین اور اسلام طاعت ہے اور کفر و شرک بغاوت ہے۔ دنیا کی حکومتوں کا تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی شہر میں باغی زیادہ ہوں شہر پر اسی وقت توپ خانہ لگا دیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ بھی اگر یہی کرتے تو کافروں کی کثرت کی سبب سے اکثر اوقات توپ لگا کرتی۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ جب تک ایک بھی اللہ کا ماننے والا دنیا میں ہے اس بدولت تمام جہان محفوظ رہے گا۔ ہاں جب سب ہی باغی ہو جائیں کہ ایک بھی وفادار نہ ہو تو اس وقت سب کو فنا کر دیا جائے گا اور یہیں سے اور ایک بات سمجھ میں آ گئی کہ بہت سے لوگ جن کو آپ حقیر ذلیل سمجھتے ہیں۔ جیسے اللہ اللہ کہنے والے غریب وہ دراصل آپ کی بقا کے سبب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی رعایت سے آپ کو ہلاک نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کی اس عادت کی

ہم کو بھی تقلید کرنی چاہیے کہ ایک کے لئے سب کی رعایت فرمائی تو ہم کو بھی ایسے لوگوں کی وجہ سے بہت سوں کی رعایت کرنا چاہئے اور ان لوگوں کیلئے مشقتیں اٹھانا چاہئیں۔ غرض جب ان میں سے ایک بھی نہ رہے گا اس وقت توپ لگ جائے گی کہ گھر کا گھر گر پڑے گا اور سارا جہان فنا اور برباد ہو جائے گا تو دنیا کا انتظام اور امن اطاعت ہی سے ہے۔

یہ نتیجہ نکالنا کہ سب سے زیادہ عالموں کا وجود ضروری ہے:

اب یہ بھی سمجھو کو اطاعت ایک عمل ہے اور عقل سے ثابت ہے کہ عمل بغیر علم کے نہیں ہوسکتا تو امن عام کے واسطے دینی علم کی ضرورت ہوئی اور اس کا خزانہ عالموں کے پاس ہے تو اب بتلاؤ کہ یہ لوگ دنیا میں سب سے زیادہ ضروری ہوئے یا سب سے زیادہ بے کار۔ صاحبو! مولویوں کی ضرورت اس تقریر سے بلاشبہ ثابت ہوگئی اور اگر کسی صاحب کو اس تقریر میں کسی بات پر شبہ ہو تو بسم اللہ! میں جواب کے لیے ہر وقت حاضر ہوں میں نے شاعروں کے طرز پر کوئی خیالی بات نہیں کی اور نہ کسی کی طرفداری کی بلکہ صاف کہہ دیا کہ ان میں بعض بدنام کرنے والے بھی ہیں جو ہماری گفتگو سے الگ ہیں لیکن وہ بھی اگر توبہ کر کے اور اپنی حالت درست کر کے اس جماعت میں داخل ہونا چاہیں تو سر اور آنکھوں پر آئیں۔ صاحبو! امید ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اس بیان سے حقیقت کھل گئی ہوگی۔

طالب علموں کو اپنی درستی کی تعلیم:

اب میں نہایت ادب سے ایک مختصر بات طالب علموں سے کہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی ضرورت اور حاجت صرف علم اور عمل کی وجہ سے ہوئی ورنہ آپ کوئی چیز نہیں۔ اور یاد رکھو کہ آپ کی مثال عمدہ اور لطیف کھانے کی ہے۔ اگر اس کی حفاظت نہ کی جائے تو اس میں زیادہ اور جلدی بدبو آجاتی ہے۔ پھر اس کو پھینک دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب تک آپ درست رہیں گے کہ علم سیکھنے میں کوشش کرتے رہیں اور اس سے زیادہ عمل کی کوشش کریں۔ اس وقت تک آپ کا وجود مفید ہوگا۔ ورنہ آپ کے لیے مضر اور دوسروں کے

لیے بھی خرابی کا سبب ہوگا۔ اس لیے آپ کو بھی اپنی درستی کرنا ضروری ہے اور آپ کی درستی کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ پڑھنے کے زمانہ میں دین دار استاد ڈھونڈھیے بد دین کو ہرگز ہرگز استاد نہ بنایئے۔ استاد کا بڑا اثر ہوتا ہے اور بیج ڈالنے کا یہی زمانہ ہے۔ طالب علمی کا زمانہ اس وقت دل میں اچھا بیج بونا چاہیے۔ جس کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ استاد دیندار ہو' دوسرے یہ کہ پڑھ چکنے کے بعد کسی بزرگ کی خدمت میں چند روز رہ کر اپنے اخلاق کو درست کرو تب البتہ تم دین کی خدمت کر سکو گے پھر لوگ تمہارے قدم دھوئیں گے۔

عام لوگوں سے کہنا کہ بدعمل اور بے عمل مولویوں کی اتباع نہ کرو' مگر خدمت ان کی کرتے رہو

اور پھر عام لوگوں سے کہتا ہوں کہ کوئی عالم اگر ایسا نہ ہو تو اس کو چھوڑ دو اور اس کو نہ دیکھو وہ سرکاری آدمی نہیں ہے مگر یہ یاد رہے کہ کام کا آدمی بھی ان ہی ناکاروں میں ملا جلا ہے اس کی تلاش کے لیے ان سب کی خدمت کرو۔ کیونکہ بعض دفعہ ایک پھول کی خاطر کانٹے کھانا پڑتے ہیں۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حکایت لکھی ہے کہ وہ بغیر مہمان کے کھانا نہ کھاتے تھے۔ ایک دن ایک مجوسی[1] آپ کا مہمان ہوا جس نے کھانے سے پہلے بسم اللہ نہ کہی۔ آپ نے ناراض ہو کر اس کو اٹھا دیا تو فوراً وحی آئی کہ اگر وہ آگ کو پوجتا ہے تو اپنا ہی نقصان کرتا ہے تم نے کھانے سے کیوں اٹھا دیا۔ ہم نے تو نوے ۹۰ برس تک اس کو رزق دیا تم ایک ہی دن میں گھبرا گئے۔ سب کو کھانا کھلاتے رہو۔ خواہ مسلم ہو یا کافر خدا کا کوئی خاص بندہ بھی کسی دن ان ہی لوگوں میں سے ہاتھ لگ جائے گا۔ دیکھو ہما کے شکار کے لیے دانہ ڈالا جاتا ہے' اس پر چڑیا کبوتر کوے سب ہی گرتے ہیں۔ شکاری کسی کو نہیں اڑاتا کیونکہ ان ہی کے ساتھ ہما بھی پھنس جاتا ہے۔

دینی علم کو جو طلب کرے اس کو تعلیم دینا چاہیے چھانٹنا درست نہیں!

اسی طرح اگر ہم یوں چاہیں کہ عربی صرف ایسے آدمی کو پڑھائیں جو فارغ ہو کر

بخاری اور رازی ہوتو اس کی صورت یہی ہے کہ جو آئے سب کو پڑھانا شروع کر دو۔ ان ہی میں سے کوئی رازی غزالی بھی نکل آئے گا اور عوام کو چاہیے کہ ہر عالم کی ہر وقت عزت کیا کریں۔ ان ہی میں سے کوئی کامل بھی مل جائے گا اور اگر آپ چھانٹ چھانٹ کر کسی ایک عالم کی عزت کرنا چاہیں اور دوسرے عالموں میں عیب نکالیں جیسا کہ آج کل لوگ طالب علموں میں عیب نکالتے ہیں تو خدا کی قسم بہت سے اچھے اچھے علماء سے آپ محروم رہ جائیں گے۔ اسی طرح ہم اگر چھانٹ کر طلباء جمع کریں تو بہت سے قابل لوگ علم کی دولت سے محروم رہ جائیں گے کیونکہ بہت لوگوں کو دیکھا ہے کہ اول اول ان میں قابلیت نظر نہیں آتی۔ مگر اخیر میں ان کا جوہر کھلتا ہے۔ حکایت مشہور ہے ایک شہزادے کا لعل رات کو جنگل میں گر پڑا تھا تو اس نے حکم دیا کہ اس جگہ کے سب کنکروں کو جمع کرلو۔ روشنی میں چھانٹ لیں گے۔ چنانچہ انہیں کنکروں میں سے وہ لعل مل گیا۔ تو آپ اپنی اس چھانٹ سے ہم کو معاف کیجیے۔ لیکن پڑھانے والوں کے لیے یہ ضرور ہے کہ جس طالب علم کو دستار اور سند کے درجہ تک پڑھانا دین کے لیے مضر ہو اس کو وہاں تک ہرگز نہ پڑھائیں۔ ہاں اس کے عمل کے لیے جتنے علم کی ضرورت ہو اتنا پڑھائیں میں پھر کہتا ہوں کہ آپ طالب علموں پر اعتراض نہ کیجیے۔ البتہ آپ لوگ اگر ان کے ساتھ اولاد کا سا برتاؤ کریں اور ان کو اپنی اولاد سمجھیں پھر شفقت اور ہمدردی سے ان کو کوتاہی اور بے تمیزی پر متنبہ کریں تو کچھ حرج نہیں۔ بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے۔

وعظ کا خلاصہ

بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں عالموں کے وجود کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ دین کی سخت ضرورت ہے جو علماء ہی سے مل سکتا ہے۔ پس مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کے ساتھ میل پیدا کریں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مدرسہ میں چندہ دے کر بے فکر ہو جاؤ کہ ہم کو دیوبند اور سہارنپور کے علماء سے تعلق ہے میاں روپیہ تو خدا دے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے کھل کر ملو اور ان سے مسئلے پوچھتے رہو تاکہ تم کو دین اور دین داروں کی محبت بڑھے اور اس محبت کی وجہ سے تم ان کے ساتھ قیامت میں رہو کیونکہ حدیث میں آیا ہے

کہ: **المرء مع من احب** (ترجمہ) آدمی اپنے دوست کے ساتھ ہوگا اور اگر تم کو ان سے محبت ہوگئی تو انشاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سے بھی سچی محبت پیدا ہو جائے گی۔ بعض لوگ خود تو عالموں کی طرف رخ کرتے نہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ مولوی ہماری خبر نہیں لیتے۔ تو صاحبو! سب جانتے ہیں کہ مریض حکیم کے پاس جایا کرتا ہے حکیم مریض کے پاس ازخود نہیں جایا کرتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ سول سرجن کی یہ شکایت نہیں کی جاتی کہ ہماری خبر نہیں لیتا صاحبو! سول سرجن کا شکایت تو نہ ہو اور مولویوں کی شکایت ہو۔ صاحبو! تم نے عالموں کو اپنی خبر کیا دی۔ اگر تم دو دفعہ جا کر ان کو اپنے مرض کی خبر دو گے تو وہ ایسے رحمدل ہیں کہ چار دفعہ خود آئیں گے اب تو مولوی اس لیے بھی بچتے ہیں کہ ان کا اپنی طرف سے میل پیدا کرنا خودغرضی سمجھا جائے گا۔ مشہور مقولہ ہے کہ **انعم الامیر علی باب الفقیر وبئس الفقیر باب الامیر**۔ (ترجمہ) وہ امیر اچھا ہے جو فقیر کے دروازے پر حاضر ہو اور وہ فقیر برا ہے جو امیر کے دروازے پر جائے تو یہ مطلب ہے میل پیدا کرنے کا۔ اس طرح میل پیدا کیجئے اور جب آپ ان سے مل جائیں گے تو وہ بھی آپ سے زیادہ آپ کی طرف توجہ کریں گے اور اس سے ملاپ پیدا ہوگا۔ مگر ابتداء اس کی دنیاداروں کی طرف سے ہونی چاہیے اور ساتھ ہی اس کے اپنے بچوں کو بھی علم دین پڑھائیے۔

خاتمہ اور دعا:

غرض یہ چیزیں ضروری ہیں ان کی فکر کیجئے۔ دنیا ختم ہونے والی ہے۔ مرنے کے بعد دین اور دین دار دوست ہی کام آئیں گے۔ دنیا اور دنیا کے دوست کام نہ آئیں گے۔ ابھی وقت ہے کہ مسلمان ہوشیار ہو جائیں ورنہ ایک دن آنے والا ہے کہ بہت سے لوگ حسرت کے ساتھ کہیں گے **يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا** کاش میں نے رسول کا راستہ اختیار کیا ہوتا: **ویلتی لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا** ہائے افسوس کاش میں نے فلاں فلاں آدمیوں کو دوست نہ بنایا ہوتا جنہوں نے ساری عمر مجھ کو دنیا کے دھندوں میں لگائے رکھا۔ اور خدا سے دور رکھا۔

اب ختم کرتا ہوں خدا تعالیٰ سے علم وعمل کی توفیق کی دعا کیجئے۔

(۳۴) نجات کا طریقہ

منتخب از طریق النجات وعظ دوم دعوات عبدیت

جلد پنجم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ ماثورہ:

اَمَّابَعۡد! فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ فرمایا اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں: وَقَالُوۡا لَوۡکُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡنَعۡقِلُ وَمَا کُنَّافِیۡ اَصۡحَابِ السَّعِیۡرِ۔ یہ ایک آیت ہے سورہ ملک کی اس میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے کافروں کی ایک حکایت نقل فرمائی ہے۔ یعنی ان کا یہ ایک قول ہے جس کو وہ قیامت میں کہیں گے۔ مگر خدا تعالیٰ کا مقصود حکایتوں سے خود وہ حکائتیں نہیں ہوتیں خواہ پچھلے زمانے کی وہ حکائتیں ہوں یا آئندہ زمانہ کی بلکہ ان سے مقصود کسی قسم کی نصیحت اور عبرت دلانا یا کسی بات کا جتانا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کو ایک آیت میں صاف طور پر ارشاد فرمایا ہے: لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی لا الباب کہ ہم نے جو قرآن شریف میں اگلی قوموں کے قصے بیان کیے ہیں۔ ان سے عقلمندوں کو عبرت ہوتی ہے۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ قصوں کے نقل کرنے سے عبرت دلانا مقصود ہے۔

عبرت کے معنی:

اور عبرت حقیقت میں ایک قسم کا قیاس ہے یعنی پہلی قوموں کے حالات پر اپنے حالات کو ایک سا ہونے کی وجہ سے قیاس کرنا اور جو انجام ان کا ہوا ہے وہی اپنے لیے سمجھنا۔ اس جگہ بھی اس حکایت کو نقل کرنے سے یہی مقصود ہے کہ اس حکایت کو سن کر ہم

غور کریں اور جانچیں کہ ان کافروں کو جس کام پر عذاب کی خبر دی جارہی ہے۔ ہمارے اندر بھی وہ پایا جاتا ہے یا نہیں اور ہماری حالت ان کی حالت کے مطابق ہے یا نہیں اور اس سے نجات کا کیا ذریعہ اور طریقہ ہے تاکہ ہم اس کے موافق عمل کریں اور اس کے پابند رہیں۔ یہ خلاصہ ہے اس آیت کا جیسا کہ ترجمے سے آپ کو معلوم ہوگا۔ اور تفصیل اس کی آگے بیان سے معلوم ہو جائے گی ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ قیامت کے دن کافر لوگ یوں کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو آج ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے۔ اس ترجمہ سے معلوم ہوا کہ کافر اپنی بدحالی اور ابتری کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ ہم بہت چوکے کہ دنیا میں جو کام کرنے کا تھا وہ نہ کیا اور کرنے کا کام خدا تعالیٰ نے اس حکایت میں صرف دو۲ ہی باتوں کو فرمایا ہے۔ ایک تو سننے کو اور ایک سمجھنے کو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حق بات پر عمل کرنے کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حق بات کسی سے سنی ہو۔ دوسرے یہ کہ خود اس کو سمجھا ہو۔ کافروں نے چونکہ حق بات کو نہ کسی سے سنا تھا اور نہ خود سمجھا تھا۔ اس وجہ سے ان کو قیامت کے دن یہ افسوس اور حسرت کرنے کی نوبت آئی۔ اس بیان سے آپ لوگوں کو آیت کا حاصل اور خلاصہ مختصر طور پر معلوم ہو گیا ہوگا۔ اس کے بعد اب میں اصل مقصود کو بیان کرتا ہوں۔ اور اس آیت سے انشاء اللہ ثابت کردوں گا۔ کیونکہ وہ مضمون اس آیت کا مقصود ہے۔

ضرورت کا بیان:

اور اس کی ضرورت نہایت عام ہے ہر وقت ہر جگہ ہر مسلمان کو اس کی ضرورت عام ہے ایسا ہی ان کا فائدہ بھی عام ہے۔ یعنی اس مضمون کے موافق عمل کرنے میں یقینی اور لازمی فائدہ ہے۔ نیز یہ مضمون بہت آسان اور سہل ہے تو ان تینوں باتوں پر نظر کر کے اس مضمون کی ضرورت میں ذرا بھی شبہ اور کلام نہیں رہتا۔

طب یونانی میں مرض جس قدر سخت ہوتا ہے اسی قدر علاج بھی سخت ہوتا ہے:

دیکھئے عقلی قاعدہ ہے کہ مرض جس قدر سخت ہوتا ہے اس کا علاج بھی اسی قدر سخت ہوتا ہے مثلاً اگر کسی شخص کو کوئی سخت مرض لگ جائے یا کسی جماعت یا کسی ایک شہر میں کوئی

سخت مرض وبائی پھیل جائے تو عقلمند طبیب اس کو دفع کرنے کے لیے سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل تدبیریں تجویز کرتے ہیں اور چونکہ یہ قاعدہ سب کے نزدیک مسلم ہے اور سب اس کو سمجھتے ہیں اس لیے ان سخت تدبیروں اور مشکل علاجوں کو برداشت بھی کیا جاتا ہے اور اگر برداشت کی تاب نہیں ہوتی۔ تو علاج اور صحت سے مایوس ہونا پڑتا ہے چنانچہ بعض مرتبہ طبیب لوگ مجبور ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ تمہارا مرض امیرانہ ہے جیسے کسی غریب آدمی کو جنون ہو جائے اور کوئی حکیم اس کا علاج شروع کرے اور کسی طرح اس کو فائدہ نہ ہو تو پریشان ہو کر حکیم کو کہنا پڑتا ہے کہ بھائی تمہارا مرض تو امیرانہ ہے اور تم دو۲ چار۴ پیسے کی دوا میں اس کا علاج کرانا چاہتے ہو یہ کیونکر ہو سکتا ہے اس کے لیے تو بہت سخت اور مشکل علاج اور قیمتی دواؤں کی ضرورت ہے۔ جن کی وسعت اور گنجائش تم میں نہیں ہے لہٰذا تم اچھے نہیں ہو سکتے تو عقلی قاعدہ سے ہر سخت مرض کا علاج بھی سخت ہوتا ہے اور بعض وقت مریض کو مایوسی کی نوبت آتی ہے۔

طب ایمانی میں ہر مرض کا علاج اور نسخہ بہت آسان ہے:

لیکن اس طب میں جس کا نام ایمانی طب ہے کسی مرض کا کوئی درجہ بھی ایسا نہیں کہ وہاں پہنچ کر مریض کو مایوس کر دیا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ اب تمہارا مرض لاعلاج ہو گیا بلکہ ہر مرض کا اس طب میں علاج موجود ہے اور نہایت آسان اور بہت سہل علاج موجود ہے۔ میں انشاء اللہ دلیل سے ثابت کر دوں گا سخت سے سخت مرض میں بھی اس ایمانی طب میں آسان سے آسان نسخہ تجویز کیا ہے اور یہ دلیل ہے خدا تعالیٰ کی کامل رحمت کی اپنے بندے کے ساتھ کہ اتنا بڑا مرض اور اس کا علاج اس قدر سہل اور آسان تجویز کیا ہے اور اس سے اس آیت کے معنی بھی ظاہر ہو جائیں گے کہ: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ اور مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ حَرَجٌ (ترجمہ) ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا اور نہیں ارادہ کرتا تمہارے ساتھ سختی کا۔ اور خدا تعالیٰ نے دین میں تم پر کچھ تنگی نہیں کی۔

آیت ماجعل علیکم فی الدین حرج اور یرید اللہ بکم الیسر پر اس شبہ کا جواب کہ دین میں تنگی ہے:

درمیان میں ایک مفید اور کام کی بات عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ شائد کسی کو یہ شبہ ہو کہ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں کچھ تنگی اور دشواری نہیں ہے حالانکہ مشاہدے سے بالکل اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے اکثر دینداروں کو شریعت پر عمل کرنے میں بہت تنگی اور دشواری پیش آتی ہے۔ اور جو لوگ مذہب سے آزاد ہیں وہ نہایت مزے اور چین میں ہیں کہ جو جی میں آیا کر لیا ان کو کسی کام اور کاروائی میں تنگی نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین پر عمل کرنے میں تنگی ہے اور آزاد رہنے میں سہولت اور آسانی کیونکہ دین دار آدمی کو قدم قدم پر حرام کا خوف اور اندیشہ لگا رہتا ہے۔ بلکہ جس بات کو ان سے پوچھئے اس کو حرام ہی بتلاتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کو بہت پریشانی اور تنگی ہوتی ہے۔ دیکھئے اب آموں کی بہار آرہی ہے جو لوگ آزاد ہیں اور شریعت کا خیال نہیں رکھتے وہ تو نہایت چین اور مزے میں رہیں گے کہ فصل شروع ہوتے ہی بہار کو فروخت کر دیں گے۔ اگر چہ ابھی تک نہ پھول ہی ہو اور اس وقت ان کے باغ کے نہایت اچھے دام اٹھیں گے۔ اور جو لوگ دیندار ہیں وہ اس فکر میں لگے رہیں گے کہ پھول فروخت کرنا حرام ہے لہٰذا اس وقت فروخت کرنا چاہیے جب پھل آجائیں اور پھل بڑھ بھی جائیں' اس فکر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ باغ کی حفاظت کے لیے کم از کم پانچ روپیہ ماہوار کا نوکر رکھیں گے یا خود حفاظت کریں گے پھر آندھیوں میں جو کچھ آم گریں گے سب ان کے گریں گے۔ اور کمی کی وجہ سے قیمت کم اٹھے گی۔ اسی طرح اگر یہ دیندار لوگ تجارت کریں تو شریعت پر عمل کرتے ہیں تجارت کی کوئی قسم جوئے میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے اور کسی لین دین میں سود لازم آ گیا وہ اس وجہ سے حرام ہے۔

غرض شریعت پر عمل کرنے میں ہر طرح تنگی اور مصیبت ہے اور جب شریعت کی کوئی چیز بھی تنگی سے خالی نہیں تو خدا کی پناہ یہ تو قرآن کی سچائی میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے تو

یہ شبہ بعض لوگوں کو پیدا ہونا ممکن ہے میں نے کئی جگہ وعظ میں اس شبہ کا جواب عرض کیا ہے اس وقت بھی وہی جواب دیتا ہوں مگر وضاحت کی غرض سے پہلے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ فرض کرو کہ ایک شخص بیمار ہو اور وہ کسی حکیم کے پاس گیا اور نسخہ دریافت کیا اور حکیم صاحب نے نسخہ لکھا لیکن اتفاق سے بیمار ایسی جگہ رہتا ہے کہ اس جگہ کوئی دوا دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے پرہیز بتلایا اور اتفاق سے اس گاؤں میں صرف وہی چیز کھانے کو ملتی ہے جن کو حکیم صاحب نے منع کیا تھا اور جن چیزوں کی اجازت دی ہے ان سے میں ایک چیز بھی نہیں ملتی پس اگر یہ مریض حکیم صاحب کے نسخہ کو دیکھ کر اور اس پرہیز کو سن کر یہ کہنے لگے کہ علاج میں نہایت ہی تنگی ہے کیونکہ دوائیں وہ بتلائیں جن میں سے ایک بھی میسر نہیں کھانے کے لیے وہ چیزیں تجویز کیں جو کبھی گاؤں بھر میں بھی نہیں آتیں۔ اور جتنی چیزیں کھانے کی گاؤں میں ہیں وہ سب منع کر دیں۔ نہ بینگن کھانا نہ آلو کھانا نہ بھینس کا گوشت کھانا اور اس کے ساتھ ہی اپنی جہالت کی وجہ سے حکیم صاحب کو بھی برا بھلا کہنے لگے تو ایسے شخص کے عقلمند کیا جواب دیں گے یہی جواب دیں گے کہ علاج میں تو ذرا بھی تنگی نہیں اس شخص کے گاؤں میں ہی تنگی ہے۔ کیونکہ علاج میں تو اس وقت تنگی سمجھی جاتی جب کہ طبیب نے دو چار چیزوں کی جازت دی ہوتی اور باقی سب چیزوں کو منع کیا ہوتا۔ اور جب کہ بیس ۲۰ کھانے کی چیزوں کی اجازت ہے اور صرف چار چیزوں کی ممانعت اور رکاوٹ ہے تو علاج میں تنگی اور دشواری ہرگز نہیں بلکہ اس شخص کے گاؤں میں تنگی ہے کہ اس میں صرف وہی چیزیں چھانٹ کر لائی جاتی ہیں جو کہ سراسر مریض کے لیے مضر ہیں تو علاج اس کا یہ نہیں ہے کہ حکیم صاحب کا نسخہ ردی اور بے کار کر دیا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے' بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے گاؤں کی درستی کی جائے وہاں کی تجارت کو ترقی دی جائے لوگوں کو کھانے کی چیزیں مفید فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے' دوکان ہر قسم کی دوائیوں کی کھلوائی جائے پھر دیکھئے علاج کس سہولت اور آسانی سے ہوتا ہے اور اس وقت علاج میں تنگی اور دشواری کا نہ ہونا بھی صاف طور پر معلوم ہو جائے گا۔ جب یہ مثال خوب سمجھ میں آ گئی تو اب غور اور انصاف سے دیکھئے کہ تنگی اور دشواری

شریعت میں ہے یا یہ تنگی آپ کے معاملوں میں ہے۔

صاحبو! شریعت کو اس وقت تنگ کہا جاسکتا تھا کہ جب تجارت اور لین دین کے صرف دو۲ چار۴ صورتیں شریعت نے جائز بتلائی ہوں اور ان صورتوں کے علاوہ ساری صورتیں تجارت کی حرام کر دی ہوں اور جب کہ شریعت نے تجارت کے دو چار طریقوں کو حرام کر کے باقی سب طریقوں کو جائز کر دیا ہے تو شریعت کو تنگ اور دشوار ہرگز نہیں کہا جاسکتا لیکن شریعت اس کا کیا علاج کرے کہ آپ کے تاجروں نے بدقسمتی سے تجارت کے ان ہی طریقوں کو اختیار کر رکھا ہے جو شریعت میں حرام کر دیئے ہیں۔ آپ کو تنگی معلوم ہونے کی یہ وجہ ہے پس اس تنگی سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ آپ سب متفق ہو کر اپنی تجارت کو درست کریں اور اپنے لین دین کو شریعت کے قاعدے کے موافق کریں اور ان چار مروجہ صورتوں کو جو حرام ہیں سب اتفاق کر کے چھوڑ دیں اور اس سینکڑوں طریقوں کو جن کو شریعت نے جائز بتلایا ہے۔ نہ یہ کہ شریعت کو تنگ اور دشوار کہہ کر اس پر عمل کرنا چھوڑ دیں اور بے نکیل اونٹ کی طرح آزاد ہو جائیں' تو اس وقت آپ لوگوں کا شریعت پر تنگی کا اعتراض کرنا واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے کہ سینکڑوں لین دین کے طریقوں کو چھوڑ کر دو چار صورتیں جو شریعت نے حرام کی تھیں انہیں کو اختیار کیا تھا ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک حبشی چلا جا رہا تھا رستہ میں ایک آئینہ پڑا ملا' اس کو آئینہ میں کبھی اپنی صورت دیکھنے کا اتفاق ہوا نہیں تھا' اس آئینہ کو جو اٹھا کر دیکھا تو اپنی کالی صورت کو آئینہ کی صورت سمجھ کر کہنے لگا کہ ایسا بدصورت تھا۔ جب ہی تو کسی نے پھینک دیا۔ یہی ہو بہو حالت ہم لوگوں کی ہے کہ عیب خود ہم میں ہیں اور اس کو شریعت میں بتلاتے ہیں۔

صاحبو! اگر شریعت نے کسی معاملے کی دس صورتوں میں سے نو صورتوں کو حرام اور ایک صورت کو حلال کہا ہوتا تو بے شک شریعت کو تنگ کہہ سکتے تھے اور جب کہ شریعت میں اس معاملے کی دس صورتوں میں سے آٹھ صورتیں حلال ہیں اور دو صورتیں حرام ہیں تو شریعت کو تنگ کیسے کہیں گے۔ البتہ اپنے کو مجرم اور ملازم کہیں گے کہ ہم نے ساری حلال صورتوں کو چھوڑ کر صرف ان دو کو اختیار کر لیا جو حرام تھیں اگر آپ عالموں سے اپنے سارے

معاملوں کو دریافت کر کے کیا کرتے اور پھر بھی کوئی جواز کی صورت نہ نکلتی تو شریعت پر تنگی کا الزام تھا۔ غضب ہے کہ ہم اپنی خواہش اور ہوس سے حرام معاملوں کو اختیار کریں اور پھر عالموں کو اس پر مجبور کریں کہ ان معاملوں کو جائز کہیں گویا شریعت ہماری محتاج یا نوکر ہے کہ جو کچھ ہم کیا کریں شریعت اس کو جائز کر دیا کرے تو یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے کہ مشہور ہے کہ ایک رئیس کو بے ہودہ بولنے کی عادت بہت تھی اور اکثر بے تکی باتیں ہانکا کرتے تھے اس وجہ سے لوگ ان پر ہنسا کرتے تھے۔ آخر انہوں نے ایک شخص کو اس لیے نوکر رکھا کہ جو کچھ ہم کہا کریں تم ہماری بات کو بنا دیا کرو۔ چنانچہ رئیس ایک مرتبہ کسی مجلس میں تھا کہنے لگا کہ ہم شکار میں گئے۔ ہرن کے جو گولی ماری تو وہ اس کے کھر کو توڑ کر اور ماتھا پھوڑ کر نکل گئی یہ بے تکی بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے کہ کھر کو ماتھے سے کیا تعلق اور کیا جوڑ۔ فوراً اس نوکر نے کہا کہ حضور درست اور بجا فرماتے ہیں وہ ہرن اس وقت کھر سے ماتھے کو کھجلا رہا تھا۔ تو ایسے ہی ہمارے خواہش پرست اور دنیا پرست بھائی چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے منہ سے نکل جائے اس نوکر کی طرح شریعت اس کو جائز ہی کر دے تو گویا شریعت آپ کی لونڈی اور غلام ہوئی۔

صاحبو! شریعت آپ کی لونڈی غلام نہیں بن سکتی۔ بلکہ آپ خود شریعت کے غلام بن جائیے پھر دیکھئے کہ کس قدر سہولتیں اور آسانیاں شریعت میں موجود ہیں' اور موجودہ حالت میں دینداروں کو جو تنگی اور دقت معاملات میں پیش آتی رہتی ہیں تو وہ تنگی شریعت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کا سبب زیادہ تر یہ بددین لوگ ہیں جو دین سے بالکل آزاد ہیں۔ جنہوں نے سب اپنے معاملے بگاڑ رکھے ہیں۔ تو ایک آدمی شریعت کے موافق معاملہ کرنا چاہے تو اس کو بے شک تنگی اور دشواری پیش آنی چاہیے۔ مگر یہ تنگی قوم کے معاملوں میں تنگی ہونے کی وجہ سے ہوئی نہ کہ شریعت میں تنگی ہونے کی وجہ سے۔ پس آپ لوگ دو طرح اپنی درستی کیجیے ایک تو اس طرح کہ شریعت پر کبھی کسی قسم کا الزام نہ لگایئے دوسرے یہ کہ عالموں سے اس بات کی امید نہ رکھئے کہ وہ ناجائز کام کو آپ کی خاطر جائز کہہ دیں۔ یا جائز کر دیں۔

قانون کو سوائے قانون کے بنانے والے کے کوئی نہیں بدل سکتا:

صاحبو! شریعت خدا تعالیٰ کا قانون ہے اور سب جانتے ہیں کہ قانون کسی شخص کی رائے اور خواہش سے نہیں بدل سکتا۔ البتہ قانون بنانے والا خود ہی بدل دے تو دوسری بات ہے اور اسی طرح اگر سب لوگ قانون پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو ان کے عمل چھوڑ دینے سے قانون نہیں بدل سکتا۔ خاص کر خدا تعالیٰ کا قانون کیونکہ خدا تعالیٰ کی حکومت کا دار ومدار بندوں کی فرمانبرداری اور اطاعت پر نہیں اس کی فرمانبرداری کوئی کرے یا نہ کرے ہر حال میں وہ سب کا بادشاہ ہے تو پھر اس کا قانون کس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شبہ کرے کہ وحی نازل ہونے کے وقت خدا تعالیٰ خود ہی ہمارے اس زمانے کی مصلحتوں کا لحاظ کر کے کوئی دوسرا قانون مقرر فرما دیئے کیونکہ شریعت میں ہر زمانے کے لوگوں کی مصلحتوں کا لحاظ ہونا چاہئے۔ تو جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ قانون بنانے میں عام لوگوں کی مصلحت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ خاص خاص شخصوں کی شخصیت کا لحاظ اس میں نہیں ہوسکتا اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ گورنمنٹ کا قانون کو سن کر اگر کوئی شخص بغیر لائیسنس بندوق کی بارود اور چھرے نہیں بیچ سکتا۔ اس قانون کو سن کر اگر کوئی بے وقوف اور احمق یہ کہنے لگے کہ گورنمنٹ کے قانون میں بڑی تنگی اور سختی ہے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم بارود اور چھرے خوب فروخت کیا کریں۔ لیکن انگریزی قانون لائسنس کی بیچ لگاتا ہے جس کی وجہ سے ہم بارود چھرے آزادی سے نہیں فروخت کر سکتے تو عقلمند اس کو یہ ہی جواب دیں گے۔ قانون عام لوگوں کی مصلحت اور فائدے کا لحاظ کر کے مقرر ہوا کرتا ہے نہ کہ کسی خاص شخص کی مصلحت کے لحاظ سے کیونکہ اگر کسی خاص شخص کی مصلحت کی رعایت کی جائے اور ہر شخص کو بندوق اور بارود رکھنے کی اجازت دی جائے تو عام لوگوں کے امن میں خلل پڑ جائے اور جس کا جو جی چاہے کر ڈالے بیسیوں خون روزانہ ہوا کریں تو امن اور آرام کا تقاضا یہ ہی تھا کہ ایسا جکڑ بند کر دیا جائے کہ عام طور پر اس کی اجازت نہ ہو۔ اگرچہ خاص خاص شخصوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں اگر کسی شخص کا چال چلن اچھا ہو اور اس سے

کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو اور وہ لائیسنس بھی حاصل کرے تو اس کو بارود اور چھرے کی اجازت ہو جائے گی۔ تو اس مثال سے معلوم ہوا کہ قانون عام لوگوں کی مصلحت کا لحاظ کر کے بنائے جاتے ہیں۔ اب جو لوگ شریعت پر اعتراض کرتے ہیں وہ غور کر کے دیکھیں کہ شریعت کا کوئی ایک قانون بھی عام مصلحت کی رعایت سے خالی ہے۔ ہاں بعض قانون میں خاص مصلحت کے رعایت کرنے سے عام مصلحتوں میں خلل پڑنے والا ہوتا ہے اور اسی پر نظر کر کے لوگ شریعت پر اعتراض کرتے ہیں جیسے اب آموں کی فصل آ رہی ہے اس میں باغ والوں کو یہ وہم ہوتا ہے کہ شریعت نے بہت تنگی کی ہے کہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور سبب اس وہم کا یہی ہے کہ شریعت کے قانون پر عمل کرنے میں اپنا ذاتی فائدہ مٹتا ہے۔ حالانکہ شریعت نے عام مصلحت کی وجہ سے یہ قانون مقرر کیا تھا۔ اور وہ عام مصلحت یہ ہے کہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے میں احتمال ہے۔ خریدار کو آئندہ خسارہ اور نقصان پہنچے گا۔ اس واسطے کہ اگر پھل نہ آیا تو اس کا روپیہ مفت ہی بے کار گیا' گو کسی ایک کا نفع اس میں زیادہ ہو جائے اور پھل آنے کے بعد فروخت کرنے میں عام لوگ اس مصیبت سے بچے رہتے ہیں۔ اگرچہ کسی ایک کے تھوڑے سے داموں کا نقصان اور خسارہ ہو اور پھر غضب یہ ہے کہ بعض لوگ تو اس قانون میں تنگی کا وہم کر کے خود اس بات کا انکار کر دیتے ہیں کہ یہ شریعت کا قانون ہے اور کہتے ہیں کہ یہ سب مولویوں کی گھڑت ہے۔ حالانکہ ان لوگوں کا یہ کہنا مولویوں پر محض الزام اور نرا بہتان ہے۔ اور اس کی وجہ علم کی کمی اور جہالت کی کثرت ہے۔ کیونکہ جس شخص نے حضور پر نور ﷺ کی حدیث یا ترجمے کو پڑھا ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ یہ سب حکم جن کو مولوی بیان کرتے ہیں جناب رسول مقبول ﷺ کے فرمائے ہوئے ہیں اور بعض لوگ اس حکم کو شریعت کا حکم ہونے سے تو انکار نہیں کرتے۔ لیکن یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم دنیا دار لوگ ہیں ہم سے شریعت پر کیسے عمل ہو سکتا ہے۔ مولوی لوگ ہی شریعت پر عمل کر سکتے ہیں' میں خاص ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے حکموں پر عمل کرنا نہیں چاہتے تو خدا کا دیا ہوا رزق بھی مولویوں کے واسطے چھوڑ دو' یہ کیا انصاف ہے کہ شریعت پر عمل تو کریں تنہا

مولوی اور خدا کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو تم۔

جواب کا بقیہ: شریعت میں تنگی نظر آنے کا راز:

غرض کی شریعت میں تنگی نظر آنے کا راز یہ ہے کہ لوگ خاص اپنی اپنی مصلحتوں پر نظر کرتے ہیں اور جب شریعت کے قانون پر عمل کرنے میں اپنا فائدہ پورا ہوتا ہوا نہیں دیکھتے تو شریعت کو تنگ سمجھتے ہیں حالانکہ شریعت کا قانون یا کوئی دنیا کا قانون خاص مصلحتوں کے پورا کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوتا اور نہ ذمہ دار ہو سکتا ہے کیونکہ ہر شخص کی خاص مصلحتیں دوسرے شخص کی مصلحتوں کے خلاف ہوتی ہیں جن کا جمع ہو سکنا بھی محال ہے۔ پھر وہ سب کس قانون سے کس طرح پوری ہو سکتی ہیں۔ بلکہ قانون عام لوگوں کی مصلحتوں کی حفاظت کرتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ شریعت کا قانون عام مصلحت کے خلاف نہیں ہے۔

جواب کا بقیہ: ایک مثال:

مثلاً اسی آموں کی صورت میں آپ گو کہتے ہیں کہ پھل آنے اور بڑے ہونے سے پہلے فروخت کرنے کی اجازت نہ دینا ہماری مصلحت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اکثر آندھی وغیرہ سے پھول یا چھوٹے آم گر جاتے ہیں اور دام کم اٹھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نقصان ہو جاتا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ نقصان خاص خاص لوگوں کا ہے یا عام لوگوں کا ظاہر ہے کہ یہ نصان خاص خاص لوگوں کا ہے کیونکہ اگر کسی جگہ دس ہزار کی مردم شماری ہے تو مشکل سے وہاں سو آدمی ایسے نکلیں گے جو کہ باغ رکھتے ہوں گے۔ باقی نو ہزار نو سو وہ ہوں گے کہ جو باغ نہیں رکھتے۔ پس شریعت نے یہ قانون مقرر کر کے ان سو آدمیوں کی خاص خاص مصلحتوں کے مقابلہ میں نو ہزار نو سو آدمیوں کی مصلحتوں کو مقدم رکھا۔ اور ان کا لحاظ کیا۔ کیونکہ پھل آنے سے پہلے فروخت ہونے میں کسی ایک کا فائدہ ہے لیکن اور باقی سب لوگوں کے نقصان کا خوف ہے اور اگر مولوی کو شبہ کرے کہ ان بقیہ لوگوں کی اگرچہ وہ تعداد میں زیادہ ہوں رعایت کرنا ضروری نہ تھا۔ کیونکہ یہ لوگ جب اپنی

خوشی سے پھل آنے سے پہلے خریدتے ہیں تو نقصان خود گوارا کرتے ہیں پھر ان کی رعایت کرنا کیا ضرور تھی۔ تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کو اپنے پیٹ اور اپنی ہوس کے دوزخ بھرنے کے سوا کوئی کام ہی نہ ہو اور دنیا میں اس کو کسی سے بھی محبت اور تعلق نہ ہو یہ تو بالکل ایسی بات ہے کہ اگر کوئی بچہ آگ میں گرنے لگے اور مہربان باپ دوڑ کر اس کو پکڑ لے اور باپ کی یہ شفقت دیکھ کر کوئی شخص کہے کہ آپ نے ناحق تکلیف اٹھائی آپ کو دوڑنے اور پکڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بچہ اپنے اختیار اور خوشی سے آگ میں گرتا تھا۔ سو گرنے دیا ہوتا۔ تو بتلایئے عقلمند اس شخص کی بابت کیا فتویٰ دیں گے۔ ظاہر ہے اس کو نہایت درجہ سنگدل اور بے رحم کہا جائے گا۔ تو اسی طرح حضور ﷺ اور خداوند عالم جو شفیق باپ سے بھی بدر جہا زیادہ مہربان ہیں کیونکہ وہ گوارا کرتے ہیں کہ ہم کو ضرر اور نقصان اٹھانے کی اجازت دے دیتے غرض وہ شبہ کہ شریعت میں تنگی اور دشواری ہے بالکل جاتا رہتا اور یہ بات ثابت رہی کہ دین میں نہایت سہولت اور آسانی ہے۔

عقل کی تجویزیں سخت ہیں اور دین سہولت کی تعلیم کرتا ہے۔

البتہ عقل کی بعض تجویزیں سخت ہیں جیسے یہی بات ہے جس کا اوپر ذکر تھا کہ عقل سخت مرض کے واسطے علاج بھی سخت تجویز کرتی ہے اور شریعت سخت مرض کے لیے سہل اور آسان علاج تجویز کرتی ہے کتنا بڑا فرق ہے۔ اسلام اور شریعت کے قاعدے اور عقل کے۔ کہ عقل تو سخت مرض کے واسطے تدبیر اور علاج بھی سخت تجویز کرتی ہے اور اسلام اور شریعت سے سخت مرض کے واسطے بھی نہایت سہل اور آسان نسخہ تجویز کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں کیا مرض ہے اور کس قدر سخت ہے؟

اس کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں میں وہ کیا مرض ہے جس کے لیے اس آیت میں علاج بتلایا گیا ہے اور مسلمانوں کو خصوصیت اس وجہ سے نہیں کہ دوسروں میں وہ مرض نہیں ہیں۔ دوسروں میں تو ایسے ایسے سخت مرض ہیں کہ خدا کا شکر ہے مسلمان ان سے

بالکل بچے ہوئے ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کی خصوصیت اس واسطے کی گئی ہے کہ دوسروں سے ہمیں کیا غرض نیز دوسرے قرآن کی باتوں پر کان ہی کب دھرتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کے اندر اس مرض کے دریافت کرنے کے بعد ان امراض کے سبب کو دریافت کیجیے تو مرض کی نسبت تو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ایک مرض ہو تو بتلایا جائے ہماری قوم کی تو یہ کیفیت ہے۔ کہ اس کی کوئی حالت بھی درست نہیں۔

ہمارے دین اور دنیا دونوں تباہ ہو رہے ہیں:

کیونکہ ہماری دو حالتیں ہیں ایک دنیا دوسرا دین اور پھر ان دونوں میں سے یہ ایک کے کئی کئی جز ہیں اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ دین کی ضرورتوں کے ساتھ دنیا کی ضرورتوں کی بھی ایک بہت بڑی فہرست بتلائی جاتی۔

لیڈروں کا خیال کہ دنیا کی اصلاح سے دین کی درستی ہوتی ہے اس کی تردید:

خاص کر اس وقت لیڈروں کی رائے یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی اصلاح اور درستی نہ کی جائے گی تو دین کی اصلاح اور درستی ہو سکتی ہے۔ افسوس ان اصلاح کرنے والوں نے جتنی اصلاح کی کوشش کی اسی قدر مسلمانوں میں مرض بڑھتا گیا کیونکہ مرض اور بیماری کچھ اور ہے اور علاج کیا گیا کچھ اور جس میں مرض کا بڑھنا لازمی ہے۔ اس وقت کے لیڈر مسلمانوں میں سب سے بڑا مرض روپے کے نہ ہونے کو سمجھتے ہیں کہ اگر روپیہ ہوتا تو یہ ہو جاتا وہ ہو جاتا۔

صاحبو! جہاں روپیہ بہت سا ہے وہاں کیا نور برس رہا ہے۔ ذرا امیروں کی حالت کو دیکھ لیجئے اگر روپیہ کا نہ ہونا دین کی کمزوری کا سبب ہے تو امیروں میں دین زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ ان کے پاس روپیہ زیادہ ہے۔ آج کل تو مشاہدہ کی بڑی پرستش ہوتی ہے سو آپ مشاہدہ کر لیجئے کہ روپیہ والوں میں دین زیادہ ہے یا غریبوں میں اور طریقہ اس کے یہ ہے کہ ایک طرف سے چند غریبوں کو اور چند امیروں کو لے لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ زیادہ دین دار کون ہے۔ خود اللہ تعالیٰ اس کے متعلق فیصلہ فرمارہے ہیں کہ: كَلَّآ اِنَّ

الْاِنْسَان لَیَطْغٰی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی (ترجمہ) واقعی البتہ انسان ضرور گمراہ ہو جاتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو مالدار دیکھتا ہے۔ پس اس وقت ہم کو تو یہ کہنے کا حق ہے کہ دنیا کی ترقی دین کی ترقی کو روکتی ہے جیسا کہ مشاہدہ اور اس آیت کا مضمون دونوں اس کی شہادت دے رہے ہیں لیکن ہم اپنے بھائیوں کی خاطر سے یہ کہتے ہیں کہ روپیہ بذات خود نہ مضر ہے اور نہ مفید ہے۔ اگر ہمارے بھائیوں کے پاس اس قسم کی کوئی دلیل اور شہادت ہوتی تو وہ ہرگز بھی ہماری رعایت نہ کرتے تو ہم اپنے اس دعویٰ سے کہ روپیہ دین کی ترقی کو روکتا ہے دست بردار ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ بھی ثابت نہیں کرسکتا کہ روپیہ بذات خود دین کے لیے مفید ہے۔

دین کے اندر نافع اچھا دل ہے اور اچھے دل کی مثال:

پس معلوم ہوا کہ واقع میں مفید دین کے لیے کوئی دوسری چیز ہے اور وہ دوسری چیز اچھا دل ہے اگر دل اچھا ہے تو روپیہ کا ہونا اور نہ ہونا تو کم مضر ہوتا ہے روپیہ کا ہونا زیادہ مضر ہو جاتا ہے۔ روپیہ اور اچھے دل کی مثال بالکل تلوار اور ہاتھ کی سی ہے۔ کہ تلوار کاٹتی ہے لیکن اسی وقت کہ جب ہاتھ بھی ہو اور اس میں قوت بھی ہو اور تلوار چلانی بھی آتی ہو۔ اور اگر ہاتھ نہیں یا ہاتھ تو ہے لیکن اس میں قوت نہیں یا تلوار چلانی نہیں آتی تو خالی تلوار کیا کام دے سکتی ہے بلکہ بعض اوقات خود اپنے ہی زخم لگ جاتا ہے اسی طرح اگر دل اچھا نہیں تو ہزار روپیہ کیا کام دے سکتا ہے اصلی چیز اچھا دل ہے۔

مال کے لیے نافع ہے؟

اگر ایسے شخص کے پاس مال ہے تو بے شک یہ مال اس کے دین کے لیے مفید ہے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے: نعم المال الصالح عند الرجل الصالح یعنی اچھا ہے حلال مال دیندار آدمی کے پاس۔ مال اور اچھے دل کی مثال کشتی اور پانی کی سی ہے کہ اگر کشتی کے اندر پانی بھر جائے تو اس کے ڈوبنے کا سبب ہوتا ہے اور اگر کشتی کے باہر اور نیچے رہے تو اس کے لیے مددگار ہوتا ہے اسی طرح اگر مال دل کے اندر گھس جائے تو وہ

دل کے لیے ہلاک کرنے والا ہے اور اگر دل کے باہر رہے تو وہ اس کے لیے مددگار ہے۔ اور یہ ایسی وقت ہوتا ہے جب اچھے دل والے کے پاس روپیہ ہو۔ غرض روپیہ کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہی ہوئے۔ لہٰذا یہ دعویٰ غلط ہے کہ دنیا کی ترقی مدار ہے دین کی ترقی کا۔

صاحبو! اپنے بزرگوں کو دیکھ لیجئے کہ ان کے پاس اس قدر روپیہ کہاں تھا اور پھر دینداری میں ان کی کیا حالت تھی۔ غرض ہماری ایک ضرورت کی چیز تو دنیا تھی۔ اول تو اس کے جاننے والے آپ لوگ مجھ سے زیادہ ہیں۔ میں اس کو کیا بتلاؤں دوسرے یہ کہ دنیا کے بارے میں کچھ بتلانا آپ لوگوں کے وہمیات آپ کو مدد کرنا ہے۔ تیسرے ہم لوگ طالب علم ہیں ہمارا یہ بھی کام نہیں ہے۔ اس کو آپ خود ہی کریں۔ البتہ مولویوں سے پوچھ کر اور حلال حرام کو دریافت کر کے کریں۔

آمدنی کی بہت سی ناجائز گھڑی ہوئی صورتیں:

آج کل آپ نے دنیا کمانے کی بہت سی ایسی صورتیں ایجاد کر لی ہیں کہ وہ بالکل ناجائز ہیں۔ جیسے شادی فنڈ' موت فنڈ[1] کہ اس قسم کی سب صورتیں جوئے میں داخل ہیں اور شریعت نے ان کو حرام بتلایا ہے۔ افسوس ہے لوگ دنیا کی ترقی کی صورتیں تجویز کر کے ان پر خود ہی عمل کر لیتے ہیں ان کو یہ شبہ تک نہیں ہوتا کہ ممکن ہے کہ یہ صورتیں جائز نہ ہوں۔ صاحبو! جو چاہو کرو لیکن خدا کے لیے مولویوں سے اس کے حلال حرام ہونے کو دریافت کر لیا کرو۔

عالموں سے مسئلوں کو دریافت کرنا یہ کوئی عار کی بات نہیں:

اور یہ دریافت کرنا کوئی عار اور شرم کی بات نہیں دیکھو تم بہت سی دنیا کی ضرورتوں میں مختلف لوگوں سے پوچھتے ہو اور مدد لیتے ہو مثلاً اگر تجارت کرنا چاہو تو قانون جاننے والے لوگوں سے اس تجارت کی قانونی اجازت کے پہلو دریافت کرتے ہو اسی طرح اپنی

[1] شادی فنڈ اور موت فنڈ ایک کمیٹی ہوتی ہے جس کو ماہواری کچھ روپیہ دیا جاتا ہے اور اس سے یہ طے ہوتا ہے کہ دینے والے کے یہاں جو شادی ہو تو کمیٹی اتنی رقم دے یا وہ مرجائے تو اس کے وارثوں کو اتنی رقم دی جائے چاہے کمیٹی کے پاس اس کا روپیہ کم پہنچا ہو یا زیادہ۔۱۲

اور ضرورتوں میں اور لوگوں سے دریافت کرتے ہو تو اگر شریعت کے حکموں کو مولویوں سے پوچھنا بکھیڑا اور دردسری ہے تو گورنمنٹ کے قانون پوچھنا کیوں دردسر نہیں' جو آزادی شریعت کے قانون پر عمل کرنے میں فوت ہوتی ہیں تو سب سے بڑی آزادی تو اس میں ہے کہ کسی کے قانون پر عمل نہ کیا جائے۔ اور ڈکیتی ڈالنی شروع کر دی جائے۔ پھر کیا کوئی عقلمند اور سمجھدار آدمی اس کو آزادی کہے گا اور اگر کچھ بے وقوف اور احمق ڈکیتی ڈالنی تجویز کریں اور کوئی عقلمند آدمی ان سے کہے کہ یہ قانون کے خلاف ہے تو کیا اس کو صرف اس وجہ سے کہ یہ قانون آزادی کیخلاف ہے اس قانون پر عمل کرنا ضروری نہ ہوگا تو معلوم ہوا کہ جس گورنمنٹ کے ملک میں رہواں کے قانونوں پر عمل کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے پس موافق اس قاعدے کے یا تو خدا تعالیٰ کے ملک سے نکل جاؤ اور کوئی دوسرا ملک تلاش کرلو اور اگر خدا کے ملک میں رہنا چاہتے ہو تو حیرت کی بات ہے کہ دنیا کی ساری گورنمنٹوں کے قانون پر عمل کرو مگر خدا کے قانون پر عمل نہ کرو۔ غرض دنیا کے کام آپ لوگ خود ہی کریں اور عالموں سے پوچھ کر کریں۔

مولوی دین کی باتیں سکھلانے والے ہیں دنیا کے کام کے نہیں اور یہی ان کا کمال ہے:

باقی مولویوں سے اس کی امید نہ رکھیں کہ وہ دنیا کے کاموں میں آپ کی مدد کریں اور ان کاموں کی تدبیریں آپ کو بتلائیں۔ دنیا کا کام کرنا آپ کا کام ہے عالموں کا نہیں۔ عالموں سے اس کی امید رکھنا ایسا ہے کہ جیسے کوئی چمار حکیم عبدالمجید[1] صاحب سے جوتے گٹھوانے میں مدد چاہنے لگے، مثلاً اگر حکیم عبدالمجید صاحب کے پاس کوئی دق کا مریض جائے اور وہ نسخہ لکھ دیں یہ شخص نسخہ لے کر جب مطلب[2] سے باہر آئے تو ایک چمار ملے اور وہ اس مریض سے پوچھے کہ تم کہاں گئے تھے اور وہ بتلائے اس پر چمار کہنے لگے کہ حکیم عبدالمجید صاحب بھی عجیب بے خبر آدمی ہیں کہ ان سے اتنا نہ ہوا کی اس نسخہ میں

---

[1] یہ دہلی کے ایک بڑے حکیم کا نام ہے۔۱۲

[2] مطلب اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں حکیم صاحب بیٹھ کر مریضوں کو نسخہ لکھا کرتے ہیں۱۲۔

جوتی گٹھوانے کو لکھ دیتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کی حالت سے بالکل بے خبر ہیں تو ساری دنیا اس چمار کو احمق اور الو بنائے گی اور کہے گی کہ حکیم عبدالمجید صاحب کا یہ کام نہیں کہ وہ جوتی گانٹھنے کی ترکیب بتلائیں۔ یا اس کام کے چلنے میں مدد دیا کریں حکیم عبدالمجید صاحب کا کام امراض کے لیے دواؤں کا تجویز کرنا ہے۔ تو صاحبو! عالموں کو بھی مثل حکیم عبدالمجید صاحب کے سمجھنا چاہیے کیونکہ ان کا کام امراض کے لیے نسخہ تجویز کرنا ہے نہ کہ دنیا کے کاموں میں تجویزیں بتلانے کا' اگر حکیم صاحب پر جوتی سلوانے کو نہ بتلانے کا الزام اور اعتراض صحیح ہے تو عالموں پر بھی سہی۔ البتہ حکیم صاحب کے ذمہ ضروری ہے کہ اگر جوتی پہننے سے کسی پہننے والے کے پیر میں زخم نہ پڑے اور پیر کے سڑنے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کو جوتی پہننے سے منع نہ کریں ورنہ منع کرنا ضرور ہو گا مثلاً کسی شخص نے تنگ جوتا پہنا جس سے پیر زخمی ہو گیا تو حکیم صاحب کو خبر پانے پر اس سے منع کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح مولویوں کے ذمہ بھی ہے کہ اگر دنیا کے کام کرنے سے دل میں بددینی کا زخم نہ پڑے تو ان کاموں سے نہ روکیں اور اگر دل زخمی ہونے لگے تو پھر ان کو ضرور ہے اور اگر پیر کے زخمی ہونے سے حکیم صاحب روکنے میں بڑے مہربان اور شفیق ہیں تو دل کو زخم سے بچانے کے لیے دنیا سے مولوی بھی بڑے ہمدرد اور شفیق ہیں۔ اور اگر ان دونوں میں آپ کے نزدیک کچھ بھی فرق ہے تو وہ فرق بتلایئے میں آپ کو دس برس کی مہلت دیتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ جب کسی حکیم پر یہ ضروری نہیں کہ وہ جوتی سینے کی ترکیب بتلایا کرے یا اس میں مدد کرے تو عالموں کو بھی جو کہ طبیب روحانی ہیں پورا حق ہے کہ وہ دنیا سے آپ کو منع نہ کریں یہ تو آپ کے شبہات اور اعتراضات کے جواب دینے کی گفتگو تھی۔

دین کی درستی کیساتھ دنیا کی درستی بھی ہوتی ورنہ پریشانی ہے:

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مولوی دنیا بھی سکھلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ مسلمانوں کی دنیا دین کے ساتھ درست ہوتی ہے یعنی جب ان کے دین میں ترقی ہوتی ہے تو دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے اور جب ان کے دین میں کوتاہی اور کمی ہوتی ہے تو دنیا

بھی خراب ہو جاتی ہے تو جب ہم دین سکھلاتے ہیں۔ آپس کے معاملے اور معاشرت یعنی طرز زندگی اور عادتوں کو درست کرتے ہیں تو گویا ہم دنیا کی ترقی کی تدبیریں بھی بتلاتے ہیں۔ البتہ ہماری بتلائی ہوئی تدبیریں اور دوسروں کی تدبیروں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ دوسروں کی تدبیر میں پریشانی زیادہ ہوتی ہے۔ سوتے جاگتے ہر وقت دنیا کی فکر ہی ان کو دامن گیر رہتی ہے۔ خدا کی قسم جو لوگ بظاہر نہایت آرام و آسائش میں معلوم ہوتے ہیں ان کی اندرونی حالت اگر دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ساری پریشانیوں کا نشانہ یہی ہیں۔

ایک لطیفہ بطور مثال:

ان لوگوں کی حالت پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا وہ یہ کہ میرے ایک استاد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک شخص نے دعا کی کہ مجھے خواجہ خضر علیہ السلام مل جائیں۔ چنانچہ ایک دن خواجہ خضر علیہ السلام اس کو مل گئے اس نے کہا کہ حضرت یہ دعا کر دیجیے کہ خدا تعالیٰ مجھ کو اس قدر دنیا دیں کہ میں بالکل بے فکر ہو جاؤں۔ خواجہ خضر علیہ السلام نے کہا کہ بے فکری اور راحت دنیا داری میں نہیں ہو سکتی اس نے پھر اصرار کیا انہوں نے فرمایا کہ اچھا تو کسی ایسے شخص کو چھانٹ لے جو تیرے نزدیک بالکل بے فکر اور نہایت آرام میں ہو۔ میں یہ دعا کروں گا کہ تو بھی اسی جیسا ہو جائے اور تین دن کی مہلت اس کو دی آخر اس نے لوگوں کی حالت کو دیکھنا شروع کیا۔ جس کو دیکھا کسی نہ کسی تکلیف یا شکایت اور پریشانی میں پڑا پایا بہت سی تلاش کے بعد اس کو ایک جوہری نظر پڑا جس کے پاس نوکر چاکر بھی بہت کچھ تھے۔ اولاد والا بھی تھا اور اس کو بظاہر کوئی فکر اور پریشانی نہ معلوم ہوتی تھی اس کو خیال ہوا کہ اس جیسا ہونے کی دعا کراؤں گا۔ لیکن ساتھ یہ بھی خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو یہ بھی کسی بلا اور مصیبت میں گرفتار ہو۔ اور میں بھی دعا کی وجہ سے اس بلا اور مصیبت میں گرفتار ہو۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اول اس جوہری سے اس کی اندر روحانی حالت دریافت کرلوں۔ چنانچہ اس جوہری کے پاس گیا اور اپنا پورا ماجرا اس کو کہہ سنایا۔ جوہری نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا خدا کے لیے مجھ جیسا ہونے کی

دعا ہرگز نہ کرانا۔ میں تو ایک ایسی مصیبت میں گرفتار ہوں کہ خدا نہ کرے کوئی دشمن بھی گرفتار ہو بات یہ ہے کہ ایک مرتبہ میری بیوی بیمار ہوئی اور بالکل مرنے کے قریب ہوگئی میں اس کو مرتے دیکھ کر رونے لگا اس نے کہا کہ تم کیوں روتے ہو میں مرجاؤں گی تم دوسری کرلو گے میں نے کہا کہ نہیں اب میں ہرگز نکاح نہیں کروں گا کہنے لگی کہ سب کہا ہی کرتے میں پورا کوئی بھی نہیں کرتا میں چونکہ اس کی محبت میں مغلوب تھا اور اس وقت اس کے مرنے کا نہایت سخت رنج دل پر تھا میں نے استرالے کر اپنا اندام نہانی یعنی پیشاب کا مقام فوراً کاٹ ڈالا اور اس سے کہا کہ اب تو تجھ کو بالکل اطمینان ہوگیا کہا ہاں ہوگیا۔ وہ اپنے مرض سے بچ گئی اب چونکہ میں بالکل بے کار ہو چکا تھا اس لئے اس نے میرے نوکروں سے سازباز کرلیا۔ یہ جس قدر اولاد ہے تم دیکھتے ہو سب میرے نوکروں کی عنایت ہے میں اپنی آنکھوں سے اس حرکت کو دیکھتا ہوں لیکن اپنی بدنامی کے خیال سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس لیے تم مجھ جیسے ہونے کی دعا ہرگز نہ کرانا۔ آخر اس شخص کو یقین ہو گیا کہ دنیا میں کوئی آرام سے نہیں جب تیسرے دن حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ کیا رائے ہے اس نے کہا کہ حضرت یہ دعا کر دیجیے کہ خدا مجھے اپنی کامل محبت اور کامل دین عطا فرمائے چنانچہ آپ نے دعا فرمادی اور وہ شخص کامل دیندار ہوگیا تو حقیقت میں دنیا داروں میں کوئی بھی آرام سے نہیں ہے اندرونی حالت سب کی پریشان ہے اس واسطے کہ دنیا کی حالت یہ ہے کہ ایک آرزو ختم نہیں ہوتی دوسری شروع ہو جاتی ہے اور تقدیر پر راضی ہے نہیں تو ہر کام میں یوں دل چاہتا ہے کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے اور سب امیدوں کا پورا ہونا دشوار ہے۔ اس لیے نتیجہ اس کا پریشانی ہی پریشانی ہے گو ظاہر میں اولاد اور مال سب کچھ ہے۔

مال اور اولاد یعنی دین سے دنیا میں بھی عذاب کا آلہ ہے چنانچہ اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے:

مگر یہ چیزیں ان کے لیے عذاب اور تکلیف کا آلہ اور ذریعہ ہیں اسی کو خدا تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں: **فلا تعجبك اموالهم او لادهم** کہ بظاہر ان دنیا داروں

کے پاس گو مال و دولت لولاد سب کچھ ہے لیکن وہ ان کے لیے عذاب ہے۔ میں نے کانپور میں ایک مالدار عورت کو دیکھا ہے کہ ان کو اپنی اولاد سے اس قدر محبت تھی کہ اولاد کی بدولت کبھی چار پائی پر سونا نصیب نہیں ہوا' کیونکہ بچے کئی تھے سب ایک چار پائی پر کیسے سمائیں اور سب کو اپنے پاس لے کر سوتی تھیں کسی پر ایک ہاتھ رکھ لیا۔ کسی پر دوسرا ہاتھ رکھ لیا کسی پر پیر رکھ لیا پھر غضب یہ کہ رات کو اٹھ اٹھ کر ٹٹولتی تھیں کہ سب ہیں بھی یا نہیں۔ تمام رات ان کو اس مصیبت میں گزرتی تھی اتفاق سے ان کا ایک بچہ مرگیا تو وہ اس قدر پریشان ہوئیں کہ اس کے کفن دفن میں بھی شریک نہیں ہوئیں اور کانپور کو چھوڑ کر لکھنؤ یا اور کہیں چل دیں اسی طرح مال بھی اکثر لوگوں کو عذاب جان ہوتا ہے اور بھی اس کا بھی یہ ہی ہے کہ دنیا کے واقعات تو اپنے اختیار اور قدرت میں ہوتے نہیں اور ہوس زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے ہمیشہ مصیبت میں گزرتی ہے۔

دین دار کو پریشانی نہیں ہوتی گو کسی مصیبت سے طبعی رنج ہو:

برخلاف اس شخص کے جس کے پاس دین ہو کہ اس کو دنیا کے واقعات میں پریشانی نہیں ہوتی' کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور محبت کی وجہ سے یہ حالت ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ان کو پیش آتا ہے وہ شیریں اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ بڑے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ ان کو کسی نے ایک آئینہ چینی کا نہایت بیش قیمت لا کر دیا۔ آپ نے وہ آئینہ خادم کے سپرد کر دیا کہ جب ہم مانگا کریں تو ہم کو دے دیا کرو۔ ایک دن اتفاق سے خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا خادم ڈرا اور آ کر عرض کیا کہ حضرت خدا کے حکم سے وہ چینی کا آئینہ ٹوٹ گیا آپ نے نہایت خوش ہو کر فرمایا کہ بہت اچھا ہوا۔ اپنے پر نظر کرنے کا سامان ٹوٹ گیا۔ مال تو کیا چیز ہے یہ حضرات اولاد کے مرجانے پر بھی پریشان نہیں ہوتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ طبعی طور پر رنج ہو سو یہ کوئی بری حالت نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کو بھی رنج طبعی ہوا ہے۔ غرض دین کے ساتھ اگر دنیا ہوگی تو وہ دنیا بھی مزیدار ہوگی۔

بزرگانِ دین فقر وفاقہ کے اندر بھی مزے میں ہیں

ایک حکایت شاہ ابوالمعالی صاحب کی:

بلکہ اگر دینداروں کے پاس نرا دین ہو اور دنیا نہ ہو تب بھی ان کی زندگی نہایت مزیدار ہے اس لیے کہ خدا تعالیٰ کا قرآن میں وعدہ ہے کہ: مَنْ عَمِلَ عَمَلاً صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (ترجمہ) جو ایماندار مرد عورت اچھا کام کرے پس ہم اس کو عمدہ اور مزے دار زندگی دیں گے ان حضرات کو کچھ نہ ہونے میں بھی پورا لطف آتا ہے۔ حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ گھر پر موجود نہ تھے اچانک آپ کے پیرومرشد تشریف لائے۔ اتفاق سے اس روز گھر میں فاقہ تھا گھر والوں نے دیکھا کہ حضرت پیر صاحب تشریف لائے ہیں آپ کے کھانے کا کچھ انتظام ہونا چاہیے۔ آخر نوکرانی کو محلے میں بھیجا کہ اگر قرض مل جائے تو کچھ بازار سے لے آئے۔ نوکرانی دو تین جگہ جا کر واپس چلی آئی اور کچھ نہ ملا بار بار آنے جانے سے حضرت کو شبہ ہوا اور گھر کی حالت دریافت فرمائی معلوم ہوا کہ آج گھر میں فاقہ ہے۔ آپ کو بہت صدمہ ہوا آپ نے اپنے پاس سے ایک روپیہ نکال کر دیا۔ اور فرمایا کہ اس کا اناج لاؤ۔ چنانچہ اناج آیا پھر آپ نے ایک تعویذ لکھ کر اس میں رکھ دیا اور فرمایا کہ اس اناج کو مع تعویذ کے کسی برتن میں رکھ دو اور اس میں سے نکال کر خرچ کرتے رہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اس اناج میں خوب برکت ہوئی حضرت پیر صاحب تو تشریف لے گئے چند روز کے بعد جو شاہ ابوالمعالی صاحب آئے تو کئی وقت برابر کھانے کو ملا آپ نے ایک روز تعجب سے پوچھا کہ کئی دن سے فاقہ نہیں ہوا گھر والوں سے معلوم ہوا کہ اس طرح سے حضرت پیر صاحب ایک تعویذ دے گئے تھے۔ اب اس موقع پر آپ لوگ شاہ ابوالمعالی صاحب کی خداداد سمجھ کو ملاحظہ فرمائیے کہ توکل کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور پیر صاحب کے ادب کا بھی لحاظ رکھا۔ فرمانے لگے کہ اس اناج کو ہمارے پاس لاؤ۔ چنانچہ لایا گیا۔ آپ نے اس میں سے تعویذ کو نکال کر تو اپنے سر پر باندھا اور فرمایا کہ حضرت کا تعویذ تو میرے سر پر رہنا چاہیے اور اناج کی بابت حکم دیا کہ سب فقیروں کو تقسیم کر دو چنانچہ سب

تقسیم کر دیا گیا اور اسی وقت سے پھر فاقہ شروع ہو گیا۔ اب حضرات کا فاقہ اختیاری فاقہ تھا کیونکہ اس کو سنت سمجھتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے فقر وفاقہ کی حکایت:

حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ پر تین تین دن فاقہ کے گزر جاتے تھے۔ اور جب بیوی پریشان ہو کر عرض کرتیں کہ حضرت اب تو فاقہ کی تاب نہیں رہی تو فرماتے کہ تھوڑا اور صبر کرو جنت میں ہمارے لیے عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں۔ لیکن بیوی بھی ایسی نیک ملی تھیں کہ وہ نہایت خوشی سے اس پر صبر کرتیں

بزرگوں کی حالتوں کو انکار کی نظر سے دیکھنے والے کی مثال اور اس کا شافی جواب:

صاحبو! آپ کو ان بزرگوں کی اس حات پر تعجب نہیں کرنا چاہیے اور اگر تعجب ہے تو ایسا ہی تعجب ہے جیسے کوئی نامرد اس پر تعجب کرنے لگے کہ صحبت میں ہی لطف ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ذرا سا بھی صحبت کا چسکا ہو تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت کا کیا عالم ہوتا ہے محبت تو خواہ کسی کی ہو اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر محبوب کو ایک ہزار روپیہ دو اور وہ لات مار دے تو تمہارے دل میں بھی اس روپیہ کی قدر نہیں رہتی اور محبت مجازی میں جب یہ حالت ہے تو حقیقی کا کیا پوچھنا۔ دیکھیئے اگر کوئی دنیا کا محبوب اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دیدے اور اس درمیان میں کھانے کا وقت آ جائے اور محبوب کہے کہ اگر بھوک لگی ہو تو جا کر کھالو۔ کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ عاشق اس وقت اٹھنے اور کھانا کھانے کو گوارا کرے گا۔ ہرگز نہیں تو جب محبت مجازی کی یہ حالت ہوتی ہے تو شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے فاقہ پر کیا تعجب ہے وہ حضرت حق محبوب حقیقی سے معیت اور قرب رکھتے تھے۔ غرض دنیا دار آپ کو بے مزہ دنیا سکھلاتے ہیں اور ہم مزہ دار دنیا سکھلاتے ہیں۔ اور وہی دنیا ہے جو کہ دین کے ساتھ ہو اس واسطے کہ وہ نہایت پر لطف اور مزے دار ہوتی ہے اور اگر یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے تو ضابطہ کا جواب وہی ہے کہ دنیا کا بتلانا ہی میرے ذمہ نہیں ہے یہ بیان تو دنیا کے متعلق تھا۔

جس طرح دنیا تباہ ہے اسی طرح ہماری دین کے اعتبار سے بھی حالت خراب ہے:

اب وہ گیا دین سو اس کی یہ حالت ہے کہ اس کے پانچ جزو ہیں۔ عقیدے عبادتیں باہمی معاملے۔ معاشرت[1] اخلاق۔ ان میں سے ہر جزو کے لحاظ سے ہماری حالت بیحد خراب ہے اور بیان کے قابل نہیں ہے۔ عقیدوں میں تو صبر اور رسالت کے متعلق جو گڑبڑ کر رکھی ہے سبھی جانتے ہیں کہ کہیں محض خیالی فلسفہ کی وجہ سے اس پر اعتراض کیے جاتے ہیں کہیں بے اصل اور باطل تصوف کی وجہ سے اس میں شک پیدا ہوتے ہیں۔

عقیدوں اور توحید کے اندر ہم نے کیا گڑبڑ کر رکھی ہے:

اولیاء اللہ کو پیغمبروں کے درجہ سے آگے بڑھا دیا۔ اور پیغمبروں کو خدا کے درجہ سے آگے بڑھا دیا۔ اور وہ حالت ہے کہ جس شخص کو شریعت سے جتنا بعد اور دُوری ہے اسی قدر اس شخص کو خدا تعالیٰ کا زیادہ مقرب کہا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فاسق اور بد دین اولیاء اللہ میں شمار ہونے لگے ہیں۔

عبادتوں کی کیا گت ہے:

شریعت کا دوسرا جزو عبادتیں ہیں۔ ان کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ نماز کتنے آدمی پڑھتے ہیں۔ روزہ کتنے لوگ رکھتے ہیں زکوٰۃ کتنے ادا کرتے ہیں۔

معاملوں کو بھی دین سے بالکل خارج سمجھتے ہیں:

حج کتنوں نے ادا کیا۔ تیسرا جزو باہمی معاملوں کا ہے ان کو لوگوں نے شریعت سے الگ ہی سمجھ رکھا ہے۔ ان کے یہاں نہ معدوم[2] کی خرید فروخت حرام ہے نہ سود کے معاملے حرام ہیں۔ ان کا اصلی مقصد یہ ہے کہ جس طرح ہو سکے بہت سا روپیہ سمیٹ لیا جائے کھانے میں گھی خوب زیادہ ہو کسی کی زمین ان کے پاس دبی ہے تو کچھ پرواہ نہیں

---

[1] یعنی زندگی بسر کرنے کا طریقہ۔ ۱۲ توحید خدا کو ایک ماننا اور رسالت رسول اللہ ﷺ کو رسول ماننا۔ ۱۲ منہ

[2] یعنی جو چیز بیچنے کے وقت موجود نہ ہو۔ ۱۲۔

ڈگریاں سود سمیت کرائی جاتی ہیں تو کچھ غم نہیں۔

ہماری معاشرت کی کیا حالت ہے؟

چوتھا جزو معاشرت ہے اس کی جو گت بنا رکھی ہے۔ سب ہی واقف ہیں۔ شادی غمی میں جس طرح جی چاہتا ہے کرتے ہیں نہ ان کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ فتویٰ لینے کی حاجت جو کچھ بیوی صاحبہ نے کہہ دیا وہ کر لیا۔ گویا وہی شریعت کی فتویٰ دینے والی ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ قوم ہرگز کامیاب نہ ہوگی جن کی سردار عورت ہوگی۔

ہماری وضع اور لباس کی کیا کیفیت ہے:

اسی طرح وضع اور شکل کو دیکھئے تو اس کی یہ حالت ہے کہ صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ مسلمان ہیں یا کافر۔ داڑھی بالکل صاف سر پر وحشیوں کے سے بال بڑھے ہوئے۔

داڑھی رکھنا مسلمانوں کی علامت ہے اور اس کی اس وقت پرواہ نہیں:

صاحبو! آج قوم قوم پکارا جاتا ہے اور اس لفظ قوم کی بہت پرستش کی جاتی ہے۔ اور اس کا بڑا وظیفہ پڑھا جاتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ کو قومی امتیاز کی بھی پرواہ نہیں۔ اگر آپ پر داڑھی رکھنا فرض بھی نہ ہوتا تب بھی قومی علامت ہی سمجھ کر اس کو رکھنا چاہئے تھا۔ آخر قومی علامت بھی تو کوئی چیز ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان تو ہندوؤں کی علامت اختیار کریں اور ہندو مسلمانوں کی۔

حکایت:

میرے بھائی کے پاس دو شخص عہدہ دار آئے ایک ان میں سے ہندو تھا مسلمان کی شکل میں اور ایک مسلمان صاحب ہندو کی شکل میں تھے۔ مسلمان صاحب کے واسطے گھر میں سے پان آیا نوکر چونکہ دونوں سے ناواقف تھا۔ اس لیے اس نے ہندو کے سامنے پیش کیا اس پر وہ دونوں ہنسے اس وقت خدمت گار سمجھا کہ مسلمان یہ ہیں جن کی داڑھی منڈی ہوئی ہے اس پر بھائی نے مسلمان صاحب سے کہا کہ میرے نوکر کی خطا نہیں بلکہ

آپ کی خطا ہے آپ نے قومی نشان کو بالکل ہی برباد کر دیا۔

صاحبو! اگرچہ گناہ باعتبار گناہ ہونے کے تو سب ہی برے ہیں۔ لیکن تاہم بعض گناہ ایسے ہیں کہ انسان اس کے کرنے میں اپنی مجبوری اور عذر بیان کر سکتا ہے گو یہ عذر وہم ہی کے درجے میں ہو۔ مثلاً رشوت کا لینا کہ اس کی جس قدر مجبوریاں بیان کی جاتی ہیں گو وہ سب کی سب وہمی ہیں۔ لیکن تاہم ہیں تو' بھلا داڑھی منڈانے کی نازیبا جاتی ہیں گو وہ سب کی سب وہی ہیں۔ لیکن تاہم ہیں تو' بھلا داڑھی منڈانے کی نازیبا حرکت میں کیا مجبوری اور عذر ہے۔ اس پر کون سا کام اٹکا ہے۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ اس سے حسن بڑھتا ہے تو میں کہوں کہ یہ بالکل غلط ہے ایک عمر کے دو آدمیوں کو پیش کیا جائے جن میں ایک کی داڑھی منڈی اور دوسرے کے چہرے پر داڑھی ہو اس کے بعد مقابلہ کر کے دیکھ لیا جائے کہ کس کے چہرے پر حسن برستا ہے اور کس پر پھٹکار برتی ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک جماعت فرشتوں کی ایسی ہے جو ہر وقت یہ ہی تسبیح پڑھتے ہیں: سبحان من زین الرجال باللحی والنساء بالذء اب (ترجمہ) پاک ہے وہ ذات جس نے زینت دی مردوں کو داڑھیوں سے اور عورتوں کو سر کے بالوں سے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد کے لیے سر کے بال تو اگر مردوں کو اس زینت کے رکھنے کی ضرورت نہیں تو عورتوں کا سر بھی منڈانا چاہیے ان کے لیے بھی کیا ضرورت ہے۔ غرض داڑھی منڈانے کا سبب حسن اور جمال تو ہو نہیں سکتا۔ کلکتہ میں ایک ملحد اور بے دین نے مولانا شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا تھا کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی فطرت کے خلاف ہے کیونکہ اگر فطرت کے موافق ہوتی تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت بھی ہوتی۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ اگر فطرت کے خلاف ہونے کی یہ ہی وجہ ہے تو دانت بھی فطرت کے خلاف ہیں ان کو بھی توڑ ڈالو کیونکہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت دانت بھی نہیں تھے۔ غرض داڑھی کا منڈانا نہایت بُری اور لغو حرکت ہے۔ اور میں نے اس وقت قصداً داڑھی کا تذکرہ نہیں کیا لیکن میں چونکہ اپنے عیبوں اور مرضوں کو بتلا رہا ہوں۔ اسی کے درمیان میں اس کا بھی تذکرہ آ گیا۔

صاحبو! خدا کی قسم بعض دفعہ داڑھی کے تذکرے سے شرم آتی ہے کہ شاید کسی کوناگوار گزرے۔ مگر منڈانے والوں کو اتنا حجاب بھی نہیں ہوتا۔ اور اب تو غضب یہ ہے کہ بعض لوگ داڑھی منڈانے کو حلال بھی سمجھنے لگے ہیں۔ اور جب اس کی بابت ان سے گفتگو کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں اس کی حرمت دکھلایئے۔

ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب کرنا:

اور یہ سوال آج کل ایسا عام ہوا ہے کہ ہر شخص ہر بات کو قرآن شریف سے مانگنے لگا ہے۔ میں اس سوال کا ایک فیصلہ کرنے والا عمی جواب دیتا ہوں یہ کوئی لطیفہ نہ ہوگا۔ بلکہ تحقیقی جواب ہوگا قابل غور کرنے کے لیکن اول ایک شریعت کا قاعدہ اور ایک تمدن کا قاعدہ بیان کرتا ہوں۔ تمدن[1] کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عدالت میں ایک ہزار روپیہ کا دعویٰ پیش کرے اور اس کی شہادت میں دو۲ گواہ ایسے پیش کر دے جن میں مدعا علیہ کوئی برائی اور عیب نہ نکال سکے تو مدعا علیہ پر ڈگری ہو جاتی ہے اور اس کے بعد مدعا علیہ کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ ان گواہوں کو نہ مانے اور یہ کہے کہ میں تو دعویٰ کو اس وقت تک مان نہیں سکتا جب تلک خود صاحب جج اور صاحب کلکٹر آ کر گواہی نہ دیں اور اگر مدعا علیہ ایسا کرے تو عدالت اس کو کہے گی کہ دعوے کے ثابت کرنے کے لیے دو۲ معتبر گواہوں کی ضرورت ہے خواہ وہ کوئی بھی ہوں کسی خاص گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ پس یا تو ان گواہوں میں کچھ کلام کر دو یا دعویٰ کو مانو۔ یہ قاعدہ تمام دنیا کی حکومتوں کا ہے اور شریعت کا بھی۔ دوسرا قاعدہ شریعت کا یہ ہے کہ شریعت کے مسئلوں کی چار دلیلیں ہیں۔ (۱) قرآن (۲) حدیث (۳) اجماع (۴) قیاس، تو گویا یہ چار گواہ میں شریعت کے حکموں کے۔ پس جو شخص دعویٰ کرے کہ یہ شریعت کا حکم ہے تو مطلب اس کا ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ان چاروں دلیلوں سے کسی ایک دلیل سے ثابت ہے اور یہ دعویٰ ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کوئی ایک ہزار روپیہ کا دعویٰ کرے پس اسی شخص کی طرح اس کو بھی اختیار ہے کہ جس دلیل سے چاہے ثابت کر دے چاہے حدیث پڑھ دے چاہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کر دے۔ ان

[1] تمدن دنیا کے انتظام کو کہتے ہیں۔ ۱۲

دونوں قاعدوں کے معلوم کرنے کے بعد اب اس سوال کا جواب سنئے کہ داڑھی کٹانے یا منڈانے کا حرام ہونا حدیث سے ثابت ہے اور حدیث بھی شریعت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے۔ اگرچہ قرآن شریف اس سے بڑا ہے تو قرآن شریف سے دلیل کا مانگنا ایسا ہے جیسا کوئی شخص خاص مجسٹریٹ کی گواہی پر دعوے کے ثبوت کا مدار رکھے۔ البتہ یہ حق ہر شخص کو حاصل ہے کہ اگر ممکن ہو حدیث[1] میں کلام کرے لیکن اگر حدیث میں کلام نہ کر سکے تو آگے گنجائش باقی نہیں رہتی اور میں سب جواب دینے والوں کو یہی کہتا ہوں کہ آپ اتنی خوش اخلاقی نہ کیا کیجیے کہ جس کسی نے جس قید کے ساتھ کوئی بات پوچھی آپ اسی قید کے ساتھ جواب دینے کی فکر میں پڑ گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی بداخلاق اور سخت ہوتے ہیں۔ حالانکہ مولوی اس قدر خوش اخلاق اور نرم ہوتے ہیں کہ ان کو خوش اخلاقی کی بدولت آپ خراب ہو گئے غرض قرآن شریف سے داڑھی منڈانے کے حرام ہونے کو تلاش کرنا اور حدیث وغیرہ کو دلیل نہ سمجھنا بڑی غلطی ہے اسی طرح جواب دینے والوں سے عرض ہے کہ آپ جو اس کے حرام ہونے کو قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ داڑھی کے منڈانے کے حرام ہونے کو قرآن سے ثابت کر بھی دیا تو ہر ہر مسئلہ کو کہاں تک قرآن سے ثابت کیجیے گا۔ مثلاً مغرب کی تین رکعتیں، وتر کا واجب ہونا اور اس کی تین رکعتیں قرآن کی کس آیت سے ثابت کرو گے۔

ہمارے اخلاق کی حالت:

رہے اخلاق اور یہ شریعت کا پانچواں جزو ہے سو اس کی بابت سب ہی جانتے ہیں کہ اخلاق کی خرابی سے ہمارے مولوی اور طالب علم بھی بہت ہی کم بچتے ہیں اکثر دینداروں کو اس کی تو فکر ہوتی ہے کہ داڑھی بھی ہو ٹخنے کے اوپر پاجامہ بھی ہو لباس سارا شریعت کے موافق ہو لیکن اخلاق اور عادتوں کو دیکھئے تو اس قدر خراب کہ گویا کبھی شریعت کی ہوا بھی نہیں لگی بہت لوگ ہماری پارسایانہ صورت کو دیکھ کر دھوکے میں آ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے خاص مقبول بندوں میں سے ہیں۔ حالانکہ ہم میں

[1] یعنی حدیث کے ثبوت میں اور اس کے روایت کرنے والوں میں۔۱۲۔

اخلاقی جزو کا جو کہ دین کی چیزوں میں سے ایک بڑی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے ہم میں نشان تک نہیں ہوتا۔ ہماری ساری حرکتیں اور سارے کام بناوٹ اور تکلف سے ہوتے ہیں تو یہ امراض اور عیب ہم میں ہیں جن کا علاج نہایت ضروری ہے اور جن کی وجہ سے ہماری حالت نہایت ہی خراب ہے۔

ہمارے مرض کا علاج اور اس کی دو قسمیں:

سو میں ان کا علاج بتلاتا ہوں۔ ہر مرض کا علاج دو قسم سے ہوتا ہے۔ ایک[1] علاج جزئی اور ایک علاج کلی' علاج جزئی تو اس کو کہتے ہیں کہ ہر ہر شکایت اور ہر ہر مرض کا علاج جدا جدا کیا جائے اور علاج کلی اس کو کہتے ہیں کہ تمام مرضوں کی جڑ یعنی ایک ایسی شئے جو مرضوں کا سبب ہے اس کا علاج کر دیا جائے کہ اس سے ہر شکایت خود بخود جاتی رہے شریعت میں پہلی قسم کے علاج بھی ہیں اور دوسری قسم کے بھی لیکن پہلی قسم کے علاج کی آج کل لوگوں میں ہمت نہیں رہی۔ البتہ پہلے لوگ اسی طرح کرتے تھے کہ ریا عجب حسد، تکبر، بغض وغیرہ سب کا علاج علیحدہ علیحدہ کرتے تھے اور علاج کرنے والے کے لیے یہ ہی سہل بھی ہے گو مریض کے لیے اس میں دشواری ہے مثلاً اگر ایک شخص سر سے پیر تک بیماریوں میں گرفتار ہو تو اس کے لیے بہت اچھا یہی ہے کہ کوئی ایسا نسخہ تجویز کیا جائے کہ اسی ایک نسخہ سے سب مرض جاتے رہیں مگر یہ کام علاج کرنے والے کو نہایت دشوار ہے اور شریعت سے قربان جایئے کہ اس نے ایسا علاج بتلا دیا کہ ایک علاج میں ہر مرض سے رہائی ہو جاتی ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ بعض شکایتوں میں اصلی مرض ایک ہوتا ہے اور باقی سب مرض عارضی ہوتے ہیں۔ جو کہ اس مرض سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک شخص کا قصہ ہے کہ اس نے ایک حکیم صاحب سے شکایت کی کہ مجھے نیند نہیں آتی۔ اس نے کہا بڑھاپے کے سبب پھر اس نے کہا کہ میرے سر میں درد بھی رہتا ہے حکیم نے کہا یہ بھی بڑھاپے کے سبب اسی طرح اس نے بہت سی شکائتیں بتلائیں اور حکیم نے سب کا یہی جواب دیا کہ یہ سب بڑھاپے کی بدولت ہے تو اصل مرض ان شکایتوں میں بڑھاپا تھا اور

[1] ریا دکھلاوہ اور عجب اپنی اچھائی پر نظر ہونا۔۱۲۔

باقی سب اسی سے پیدا ہوئے تھے۔ ایک اور نظیر لیجئے۔ رات کے وقت آپ نے چراغ گل کر دیا اور چوہے چھچھوندر چھپکلی وغیرہ نکلنے شروع ہوئے تو بظاہر یہ بہت سے موذیوں کا ہجوم ہے اور اس واسطے ہر ایک کا الگ الگ بھگانا دشوار ہے لیکن سبب ان سب کا ایک چیز ہے یعنی ظلمت اور اندھیرا جب اس کو دور کر دیا جائے گا تو سارے موذی خود بخود بھاگ جائیں گے۔ اسی طرح ہماری پاک شریعت کی خوبی یہ ہے کہ اس نے تمام شکایتوں سے اصلی مرض کو چھانٹ کر کے بتلا دیا اور اس کی تدبیر بتلا دی۔

اصلی مرض دو ہیں علم دین کی تعلیم نہ ہونا اور نیک صحبت نہ ہونا:

تو اصلی مرض ہم میں دو ہیں کہ ان سے ہم کبھی خالی نہیں ہوتے کبھی تو وہ دونوں ہوتے ہیں۔ اور کبھی ایک ہوتا ہے اور دوسرا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس میں سے ایک بھی نہ ہو میں اس کو ذرا مفصل اس لیے بیان کرتا ہوں کہ ہماری حالت کچھ اصلاح کی محتاج ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہماری اصلاح اور درستی ممکن ہی نہیں کیونکہ اصلاح اس وقت ہو کہ ہم ساری دنیا کو آگ لگا دیں۔ بیوی کو چھوڑیں بچوں کو چھوڑیں۔ غرض سب کو ترک کر کے بیٹھیں تب ہمارا علاج ہو اور جب تک یہ نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ علاج ممکن نہیں۔ حالانکہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے۔

صاحبو! اگر دین ایسا تنگ ہوتا تو قرآن شریف میں یہ ارشاد نہ ہوتا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً البتہ بھیجا ہم نے آپ سے پہلے رسولوں کو اور کر دیا ہم نے ان کے لیے بیویاں اور اولاد کو۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو خلافت اور سلطنت نہ دی جاتی۔ پس یہ سمجھنا کہ حالت کی اصلاح کے لیے دنیا کے سارے تعلقات کو چھوڑ دینا ضروری ہے محض غلطی ہے وہ اصلی مرض ایک تو یہ ہے کہ لوگ دین کا علم پڑھتے نہیں اور اس سے ناواقف ہیں۔ دوسرے یہ کہ بزرگوں کی صحبت نصیب نہیں' حالانکہ اس کی سخت ضرورت ہے کہ یا تو پورا مولوی بنایا جائے یا بزرگوں کی صحبت ہو اور میری اس بات سے عقلمندوں کو اس بیان کی اصلی غرض کا پتہ چل گیا ہو گا اور بڑا شبہ بھی حل ہو گیا ہو گا...... کیونکہ بعض لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مولویوں کا مقصود دینی علم کی رغبت دلانے

سے پورا مولوی بنانا ہے اور بغیر اس کے ان کے نزدیک مقصود حاصل نہیں ہوتا تو میری اس بات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ مولویوں کے نزدیک ہر شخص کو پورا عالم بنانا ضروری نہیں بلکہ یا تو پورا مولوی بنایا جائے اور یا بزرگوں کی صحبت ہو اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ یوں سمجھئے کہ ایک تو بقدر ضرورت دینی علم کو حاصل کرنا ہے۔ یہ تو سب کے لیے نہایت ضروری ہے اور ایک ہے عربی پڑھ کر پورا مولوی اور ماہر عالم بننا یہ سب کے لیے ضروری نہیں۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے گورنمنٹ کا قانون کہ بقدر ضرورت قانون کا جاننا رعایا میں سے ہر شخص کے لیے ضروری ہے اور قانون میں پاس حاصل کرنا ساری رعایا کے لیے ضروری نہیں اور اگر کوئی گورنمنٹ اس پر سب کو مجبور کرے۔ تو بے شک یہ تنگی اور سختی ہے تو پورے مولوی سب نہیں بن سکتے۔ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ہم سب کا پورا مولوی بنانا مناسب ہی نہیں سمجھتے اب تو آپ کے شبہ کرنے کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر سب کے سب مولوی بن جائیں اور مولویت لگ جائیں تو معاش اور روزی کے طریقے بالکل گم ہو جائیں۔ اور ان طریقوں کا باقی رکھنا خود شریعت کو مقصود ہے۔

سب کا مولوی بنانا عالموں کا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ جائز بھی نہیں:

اب میں اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ سب کا مولوی بنانا بھی جائز نہیں ہے اس پر شائد لوگوں کو تعجب ہو لیکن بات یہ ہے کہ مولوی ہونے سے مراد مقتداء اور پیشوا ہونا ہے اور مقتداء ہونے کے لیے کچھ شرطیں ہیں جن میں سے بڑی شرط یہ ہے کہ اس شخص میں حق پرستی ہو۔ نفس پرستی نہ ہو طمع اور لالچ نہ ہو کہ اپنی طمع کی وجہ سے مسئلہ کو بدل دے۔ بنی سرائیل[1] جو ایک پہلی امت ہے اس کے مولویوں کے اندر یہی بات تھی جس کی وجہ سے وہ گمراہ ہو گئے بزرگوں نے کہا ہے کہ نااہل کو دین کا علم سکھانا ایسا ہے جیسا کہ ڈاکہ ڈالنے والوں کو ہتھیار دیدینا اور آج کل اس بات کا مشاہدہ ہے کہ اکثر لوگوں کی طبیعت میں طمع اور لالچ ہے جب یہ ہے تو فرض کیجیے کہ ایک شخص میں طمع اور نفس پرستی ہے اور اس کو مقتداء اور پیشوا بنا دیا گیا تو وہ کیا کرے گا ظاہر ہے کہ بجائے قوم کی درستی کے قوم کو تباہ اور برباد

---

[1] بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں ۱۲۔

کرے گا اور اپنی طرف سے تراش کر مسئلے لکھے گا۔ میں نے ایک شخص کا فتویٰ دیکھا ہے کہ اس نے ایک ہزار روپیہ لے کر ساس سے نکاح کرنے کو حلال کر دیا تھا۔ دہلی کے ایک بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کو ایک مرتبہ ریشمی لباس پہننے کی طرف رغبت ہوئی بعض تنخواہ دار مولویوں نے اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دیدیا اور بہت سی دلیلیں جائز ہونے کی لکھ دیں۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر ملاجیون بھی اس پر دستخط کر دیں تو میں پہن لوں گا۔ ملا جی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس فتویٰ گیا۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ میں دہلی آ کر جواب دوں گا اور جامع مسجد میں جواب دوں گا۔ چنانچہ آپ دہلی تشریف لائے اور جامع مسجد میں ممبر پر جا کر بعد نقل کرنے سوال اور جواب کے بطور زجر تنبیہ کے فرمایا کہ: ''مفتی و مستفتی ہر دو کافر اند۔'' یعنی فتویٰ دینے والا اور فتویٰ لینے والا دونوں کافر ہیں۔ بادشاہ یہ سن کر نہایت غضبناک ہوا اور اس نے قتل کا حکم دے دیا۔ بادشاہ کے ایک فرزند کو جو خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے ملاجی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے کہنے لگے کہ آپ کے قتل کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ ملاجی رحمۃ اللہ علیہ نے جو سنا تو بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ میں نے کیا ایسا قصور کیا ہے اور فرمایا کہ وضو کے لیے پانی لاؤ کہ میں بھی ہتھیار باندھ لوں کیونکہ وضو مسلمان کا ہتھیار ہے۔ حقیقت میں ان حضرات کو تنہا نہ سمجھنا چاہیے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: **من عادی لی ولیًا فقد اذنته بالحرب** (ترجمہ) جس کسی نے میرے دوست سے عداوت کی تو بے شک میں اس کو لڑائی کا اعلان دیتا ہوں۔ شہزادہ نے جو آپ کے جلال کی حالت دیکھی تو دوڑا ہوا باپ کے پاس گیا کہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔ ملاجی آپ کے مقابلے کے لیے وضو کر رہے ہیں اور خدائی ہتھیار درست کر رہے ہیں اور ان سے بچ رہے ہیں۔ بادشاہ یہ سن کر تھرا گیا کہنے لگا اب کیا کروں؟ میں تو حکم دے چکا ہوں۔ شہزادہ نے کہا کہ سب کے سامنے میرے ہاتھ ایک خلعت بھیج دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تب ملاجی کا غصہ دبا۔ اس قسم کے لوگ البتہ مقتدا ہونے کے قابل ہیں اور ایسے بہت لوگ گزرے ہیں۔ برخلاف ان لالچی لوگوں کے کہ یہ سوا فساد پھیلانے کے اور کیا کریں گے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی بزرگوار کا قصہ ہے اور میں نے ان کو دیکھا بھی ہے کہ ان سے ایک عورت نے

جس کا دوسرے شخص سے تعلق اور ساز باز تھا کہا کہ میں اپنے شوہر کے پاس رہنا نہیں چاہتی اور وہ مجھے طلاق نہیں دیتا۔ انہوں نے کہا کہ تو کافر ہو جا (خدا کی پناہ) اس سے نکاح ٹوٹ جائے گا۔ فرمایئے جب ایسے لوگ مقتدا اور پیشوا ہوں گے تو قوم کی کیا حالت ہوگی اور عجب نہیں کہ ایسے لوگوں کی وجہ سے ان کے پڑھانے والوں سے قیامت میں پوچھ گچھ ہو۔ جب کہ ان کو قرینوں سے ہو کہ یہ ایسے مفسد ہوں گے اور یہی وجہ تھی کہ ہمارے بزرگ طلبہ کو چھانٹ چھانٹ کر پڑھاتے تھے۔ ہر کس و ناکس کو دینی علم کا مقتدا ہونے کے درجے تک نہ سکھلاتے تھے۔ اس مقام پر شاید متکبر لوگ خوش ہوں کہ ہم کہا کرتے تھے کہ جلاہوں اور تیلیوں کو نہ پڑھایا جائے وہی بات ثابت ہوگئی۔ سو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے بزرگ نسب کو نہیں دیکھا کرتے تھے۔ بلکہ اخلاق اور عادتوں کو دیکھا کرتے تھے یعنی جس شخص میں عمدہ خصلتیں دیکھتے تھے اس کو علم دین کی پوری تعلیم دیتے تھے اور جس شخص میں بری خصلتیں پاتے تھے اس کو بقدر ضرورت علم دین سکھا کر کسی دوسرے کام میں لگ جانے کی رائے دیتے تھے۔ اگر پہلا شخص کسی ادنیٰ معمولی گھرانے کا ہو اور دوسرا کسی بڑے عالی خاندان کا اور اگر آپ کو ان جلاہے تیلیوں سے اس قدر عار آتی ہے تو ان کی جنت میں بھی نہ جایئے گا۔ بلکہ فرعون اور ہامان کے ساتھ چلے جایئے گا۔ کیونکہ وہ بہت بڑے لوگوں میں تھے۔

صاحبو! نسب کا اونچا اور نیچا ہونا کسی کی اختیاری چیز نہیں ہے اور خصلت اور عادت کے موافق کام کرنا ہر کسی کی اختیاری چیز ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ غیر اختیاری چیزوں میں عزت یا ذلت نہیں ہوا کرتی۔ انسان کی عزت یا ذلت کا مدار اس کے اختیاری کام ہوا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے قیامت میں کسی نسب کا کچھ اعتبار نہ ہوگا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے: **فلا انساب بینهم یومئذٍ ولایتساء لون** (ترجمہ) پس قیامت کے دن نہ نسب ہوگا لوگوں کے درمیان اور نہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔ پھر یہ کہ شریف تو پڑھیں نہیں اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو پڑھنے نہ دیں یہ کیسا ظلم ہے؟ خدائی مذہب کا پھیلنا اور لوگوں کو پہنچنا یہ بات تو ضرور ہونے والی ہے اور اس کے لیے ہر زمانے میں غیب سے

سامان ہوتا ہی رہا جب تک شرفاء کی توجہ علم کی طرف رہی خدا تعالیٰ ان میں بڑے بڑے عالم پیدا کرتا رہا جن کی کوشش سے دین کا رواج ہوا جب انہوں نے سستی کی اور علم دین کی طرف سے منہ موڑا خدا تعالیٰ نے یہ دولت دوسری قوموں کو دے دی غرض نسب کو نہ دیکھئے خصلتوں کو دیکھنا چاہیے۔ میں مدرسے والوں کو یہ رائے دیتا ہوں کہ وہ اپنی خانہ پری اور کار روائی دکھانے کی غرض سے بدطینت اور مفسد لوگوں کو مدرسے میں داخل نہ کریں طالب علموں کی کمی بیشی کی ذرا پرواہ نہ کریں۔ بلکہ جس شخص کی حالت مقتدا ہونے کے مناسب نہ دیکھیں اس کو فورا مدرسے سے خارج کر دیں۔ میں جب کانپور میں تھا تو ایک مرتبہ تقریبا آٹھ طالب علموں کو جو فارغ ہونے کے قریب تھے مدرسہ سے خارج کر دیا تھا اہل مدرسہ نے بہت کچھ کہا سنا کہ ان کے نکلنے سے مدرسے کی کارگزراری میں بڑی کمی واقع ہوگی۔ اور اس سال جلسے میں بالکل کار روائی نہ دکھلائی جا سکے گی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو کارروائی دکھلانے کا تو اس قدر خیال ہے اور اس کا خیال نہیں کہ یہ لوگ دین کے مقتداء ہوں گے لوگ ان کی پیروی کریں گے اور حالت ان کی یہ ہے تو بجز گمراہ کرنے کے ان سے کیا ہو سکے گا۔ تب ان لوگوں کی سمجھ میں آیا غرض آپ لوگ ہرگز اس کا اندیشہ نہ کریں کہ ہم سب کو مولوی بنانے کی فکر میں ہیں کیونکہ ہم بہت سوں کو مولوی بنانا جائز بھی نہیں سمجھتے۔ آج جو مولویوں کا گروہ بدنام ہے تو انہیں لالچیوں کی بدولت ہے۔

عالموں کو مستغنی ہونے کی تعلیم:

خدا کی قسم اگر آج مولوی ہاتھ کھینچ لیں۔[1] اور لوگوں سے بے نیاز ہو جائیں جیسا کہ اہل حق بفضلہ تعالیٰ ہیں تو یہ بڑے بڑے متکبر ان کے سامنے سر جھکا دیں بلکہ عالموں کے لیے تو یہ مناسب ہے کہ اگر کوئی دنیا دار ان کے سامنے کوئی چیز پیش بھی کرے تو لینے سے انکار کر دیں۔ صاحبو! عالموں کی تو وہ اعلیٰ درجہ کی شان تھی کہ اگر کسی کے گھر چلے جاتے تو اس دن عید ہونی چاہیے تھی۔ حالانکہ آج وہ دن مصیبت کا دن ہو جاتا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان لالچیوں کی بدولت ہر عالم کی صورت دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ

[1] یعنی قناعت کو اختیار کر لیں۔ ۱۲

یہ کچھ مانگنے آئے ہوں گے۔

صاحبو! استغنا[1] اور آزادی میں مولویوں کا تو یہ مذہب اور شان ہونی چاہیے کہ مال اور عزت دونوں کو آگ لگادیں اگر تم ان امیروں کے دروازے پر جانا چھوڑ دو تو یہ خود تمہارے دروازے پر آئیں گے تو ایسے لوگوں کے موجود ہوتے ہوئے ہم کامل تعلیم کو عام کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ بقدر ضرورت علم سکھانا ہر شخص کو ضروری ہے۔

بزرگوں کی صحبت کی ضرورت:

اور کامل تعلیم کا بدل ایک دوسری چیز ہے۔ یعنی بزرگوں کی صحبت کہ اس سے بھی وہی فائدہ ہوتا ہے بلکہ یہ ایسی چیز ہے کہ تعلیم کامل کے بعد بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ دیکھئے بہت سے صحابی رضی اللہ عنہم ایسے تھے کہ وہ بالکل بھی پڑھے ہوئے نہ تھے۔

اور اسی حالت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فخر فرماتے ہیں کہ: **نحن امه امیه لا نکتب ولا نحسب** (ترجمہ) ہم بے پڑھے لوگ ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب سے واقف ہیں۔ لیکن چونکہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور ہمراہی حاصل تھی وہی بالکل کافی ہوگئی اور ایسی کافی ہوئی کہ آج دنیا میں ان کی مثال نہیں مل سکتی یہ تو دینی پہلو سے گفتگو تھی۔

محنت کی ضرورت کو تمدنی پہلو سے ثابت کرنا:

اب میں تمدنی[2] پہلو سے نیک صحبت کی ضرورت اور بدون نیک صحبت کے کامل تعلیم کی خرابیاں بتلاتا ہوں یہ تو سب کو معلوم ہے کہ تمدن کی ساری مصلحتیں امن وامان کے ساتھ کامل طور پر اس وقت پوری ہوسکتی ہیں۔ جب تمام لوگوں کی زندگی میں نہایت سادگی اور معاشرت[3] بالکل بے تکلفی ہو بناوٹ اور چالاکی کے ساتھ تمام مصلحتوں کا نہایت پورا ہونا ممکن نہیں۔ پھر یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اگر کسی کو علم کامل حاصل ہو اور اس کی تربیت اور اصلاح نہ ہوئی ہو تو اس میں چالاکی اور دھوکہ دینے کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح اگر

---

[1] دنیا دنیاداروں سے لالچ کا ہونا

[2] تمدن دنیا کے انتظام کو کہتے ہیں۔

[3] معاشرت طرز زندگی کو کہتے ہیں ۱۲۔

بالکل جاہل ہو اور تربیت نہ ہو تب بھی یہ ہی حالت ہوتی ہے اور تربیت اور اصلاح جب تک ضرورت کے لائق علم نہ ہو ممکن نہیں۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ تمدن کی مصلحتوں کے پورا ہونے کے لیے زندگی کا سادہ ہونا ضروری ہے اور سادگی پیدا ہونے کے لیے تربیت اور قدر ضرورت علم کا ہونا ضروری ہے۔ پس تمدن کی مصلحتوں کے لیے بھی علم بقدر ضرورت اور تربیت کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ علم بغیر تربیت کے عیاری اور چالاکی پیدا کرتا ہے اور عیاری تمدن کی مصلحتوں کے لیے مضر ہے اس لیے علم کامل بغیر تربیت کے مضر ہے اور چونکہ ہر شخص تربیت حاصل کرنے کا انتظام کرتا نہیں لہٰذا ہر شخص کو کامل علم پڑھانا مفید نہیں بلکہ مضر ہے لیکن اس پر ناخواندہ لوگ خوش نہ ہوں کہ ہمارا نہ پڑھنا ایک درجے میں بہتر ثابت ہوا۔ پس اچھا ہوا کہ ہم نے علم حاصل نہ کیا بات یہ ہے کہ آپ کی بے علمی تو حد سے بھی زیادہ گزری ہوئی ہے کہ صحبت سے بھی محروم ہو اور علم سے بھی۔ لہٰذا یہ کسی طرح بھی بہتر نہیں ہوسکتی۔ پس یا تو کامل تعلیم صحبت کے ساتھ ہو یا نری صحبت ہی ہو۔ کیونکہ نری تعلیم کافی نہیں اور نری صحبت کافی ہے مگر ایک شرط کے ساتھ کہ جس بزرگ کے پاس جائے اس کو اپنے دنیا کے قصوں میں نہ لگائے اور اپنے تمام دل کے امراض ٹھیک ٹھیک اس کے سامنے ذکر کردے۔ اور وہ بزرگ جو کچھ کہے اس پر کاربند رہے ہم نے ایسا ایک آدمی بھی نہیں دیکھا کہ پورا عالم ہو۔ اور صحبت یافتہ نہ ہو اور پھر اس سے لوگوں کو ہدایت ہوئی ہو۔ اور ایسے بہت سے دیکھے ہیں کہ شین اور قاف بھی درست نہیں لیکن دین کی خدمت کرتے ہیں۔ پس نرا علم شیطان اور بلعم[1] باعور کا سا علم ہے۔ لیکن پھر بھی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے کہ وہ ان سب کے لیے مقتداء اور پیشوا ہو یعنی سب تو پورے عالم نہ ہوں مگر چند لوگ ایسے ہوں کہ ضرورت کے وقت یہ سب لوگ ان کی طرف رجوع کرسکیں اور دین کے مسئلے معلوم کرسکیں۔

---

[1] یہ ایک بہت بڑے عالم کا نام ہے جو پہلی امتوں میں گزرا ہے۔ دنیا کے لالچ میں آن کر اس نے اپنے زمانے کے نبی کی مخالفت کی تھی۔

اصلاح کے لیے کامل علم بقدر ضرورت علم اور نیک صحبت کی ضرورت ہے اور ہر ایک کے حاصل کرنے کا طریقہ:

حاصل یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ایک تو ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو کہ عالم کہلائیں دوسرے یہ ضرورت ہے کہ ہر شخص کو عمل کرنے کے لائق علم حاصل ہو تیسرے اس کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو بزرگوں کی صحبت حاصل ہو۔ اب میں ہر ایک کو تدبیر بتلاتا ہوں سوان کی تدبیر تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ بچے ایسے لیے جائیں جو ذکی اور ذہین ہوں طبیعت اور سمجھ میں سلامتی ہو۔ اور ان کو با قاعدہ تعلیم دی جائے اور ان کے لیے ہر شہر میں ایک ابتدائی تعلیم کا مدرسہ ہو مثلاً ایسی بستی میں ایک ابتدائی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا جائے کہ اس میں شرح وقایہ نورالانوار تک تعلیم دی جائے اور یہاں تک پڑھ لینے کے بعد کسی بڑے مدرسہ میں ان بچوں کو بھیج دیا جائے کہ وہاں ان کی باقی کتابیں پوری ہو جائیں اس کی فکر ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے خاص کر امیروں پر اس کا حق زیادہ ہے کیونکہ ان کو خدا تعالیٰ نے فراغت دی ہے اور ان چھوٹے مدرسوں کو کسی بڑے مدرسے سے ملا دیا جائے کہ وہاں کی سند ان لوگوں کے لیے حجت ہو اور وہ بڑا مدرسہ ان چھوٹے مدرسوں کے لیے دارالعلوم[1] کے طور پر ہو۔ پھر ایسے لوگوں کے فتوی اور تعلیمیں پوری طرح قابل اطمینان ہوں گی۔

جاہل واعظوں کی حکائتیں اور یہ کہ وعظ معتبر عالم سے سننا چاہیے:

بلکہ بہتر یہ ہے کہ جو لوگ وعظ کہنے کے لیے آئیں ان کی نسبت بھی تحقیق کر لیں کہ وہ کسی مدرسہ کے سند یافتہ بھی ہیں؟ کیونکہ آج کل کے واعظوں سے نفع کے بجائے بہت زیادہ نقصان ہوا ہے۔ میں نے دیو بند میں ایک واعظ صاحب کو وعظ کہتے سنا اول اس نے یہ آیت پڑھی: ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون اس کے بعد ترجمہ[2] اس آیت کا اس طرح کیا کہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم تالا لگا کر جمعہ کی نماز کو جایا کرو۔ یہ خرابی کی

---

[1] دارالعلوم وہ مدرسہ ہوتا ہے کہ جس میں ہر قسم کے علم کی تعلیم دی جاتی ہو۔

[2] موند بند کرنے کو کہتے ہیں۔

تعلمون کی یعنی تالاموانہ۔ اس زمانے میں مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ زندہ تھے انہوں اس واعظ کو بہت ڈانٹا ایک واعظ کانپور میں آئے تھے۔ مدرسہ جامع العلوم میں انہوں نے وعظ کہا یہ آیت پڑھی: وَلِمَنْ خَافَ مقام ربه جنتٰن اور ترجمہ[1] کیا کہ جنت میں ایک تخت ہوگا جس کا ایک پایہ ایک ایک ہزار کوس کا ہوگا۔ اور طرہ یہ کیا کہ کوس کی تفسیر بھی کی کہ بڑے کوس کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے ایسے واعظ بھی دیکھے ہیں کہ وہ وعظ کہتے ہیں اور لوگوں سے معلوم ہوا کہ شراب پیتے ہیں آج کل مقتدا بننا بھی ایسا سستا ہوگیا ہے کہ جس کا جی چاہے وہی مقتداء بن جاتا ہے۔

واعظوں اور عالموں کا ایک مرکز ہونا چاہیے:

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ کسی ایک بڑی جگہ اور بڑی جماعت کے تابع نہیں اس سے سب خود مختار ہیں' لہٰذا بہت ضروری ہے کہ سب کے سب کسی ایسی جگہ اور ایسی جماعت کے تابع ہوں کہ ان کا ہر کام وہاں کی اجازت اور سند کے بعد ہو بغیر خاص انتظام کرنے کے یہ عالموں کی جماعت قائم نہیں ہوسکتی اس لیے اس کا انتظام کرنا نہایت ضروری ہے۔

مدرسوں کا سارا انتظام مولویوں پر نہیں رکھنا چاہیے بلکہ مولوی اپنا کام کریں اور رئیس چندہ دیں اور وصول کریں:

مگر اس کا تمام تر انتظام مولویوں پر نہ رکھو کیونکہ اس میں بعض کام ایسے بھی ہوں گے کہ اس کو مولوی نہیں کرسکتے ہیں نہ ان کے لیے مناسب ہے۔ مثلاً مدرسے قائم کرنے کے لیے چندہ کی ضرورت ہوگی۔ سو عالموں کو مناسب نہیں کہ وہ چندہ کی تحریک کرنے میں حصہ لیں۔ اس سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عام لوگ ان کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنی الاد کو پڑھایا تو وہ بھی مانگنے کا کام کریں گے۔ پس مولوی پڑھانے کا کام کریں اور

[1] صحیح ترجمہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے رب کے سامنے قیامت کے دن کھڑے ہونے سے ڈرے اس کے لیے دو دو جنتیں ہیں۔۱۲۔

رئیس چندہ وصول کریں کیونکہ ان پر یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ خود کھا جائیں گے۔ دوسرے جب مولوی پڑھانے کا کام کرتے ہیں تو کھانے کمانے کا کام بھی ان ہی کے سر کیوں ڈالے جائیں۔ آج کل عام لوگ مولویوں کو بھانڈ کا ہاتھی سمجھتے ہیں۔

ایک بھانڈ کی حکایت:

مشہور ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی بھانڈ کو خوش ہو کر ایک ہاتھی دے دیا تھا۔ بھانڈ نے ہاتھی تو لے لیا۔ لیکن اس کو خیال ہوا کہ میں غریب آدمی اس ہاتھی کو کھلاؤں گا کہاں سے اس کی تو چار خوراکوں میں میرا سارا گھر بھی ختم ہو جائے گا۔ آخر اس کو معلوم ہوا کہ آج اکبر کی سواری فلاں طرف سے فلاں وقت گزرے گی۔ جب وہ وقت آیا تو اس نے ہاتھی کے گلے میں ایک ڈھول ڈال کر اس کو اسی طرف چھوڑ دیا اکبر کی سواری جب گزری تو اس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک ہاتھ چلا آ رہا ہے اور گلے میں ڈھول پڑا ہوا ہے۔ غور کیا تو معلوم ہو کہ شاہی سواری کا ہاتھی ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ ہاتھی اس حالت میں کیوں پھرتا ہے لوگوں نے کہا کہ حضور نے اپنے بھانڈ کو یہ ہاتھی دے دیا تھا۔ اکبر نے بھانڈ کو طلب کیا اور پوچھا کہ تم نے ہاتھی کو اس حالت میں کیوں چھوڑا ہے کہنے لگا کہ حضور نے ہاتھی تو مجھے عنایت فرمایا مگر میرے پاس کھلانے پلانے کو کیا دھرا تھا۔ آخر یہ سمجھ میں آیا کہ جو میرا پیشہ ہے وہی اس کو بھی سکھلاؤں اس لیے میں نے گلے میں ڈھول ڈال کر چھوڑ دیا کہ مانگو اور کھاؤ۔ اکبر کو یہ لطیفہ پسند آیا اور اس نے ایک گاؤں بھی انعام میں دے دیا۔ تو آج کل لوگوں نے مولویوں کے لیے بھی یہی تجویز کر رکھا ہے کہ کام بھی کرو اور مانگو بھی۔ صاحبو! ان کو کیا غرض پڑی ہے۔ خدا تعالیٰ نے ان کو علم کی دولت دی ہے ان کو کیا مصیبت پڑی کہ وہ تم سے بھیک مانگیں۔

عالموں کو توکل اور مستغنی رہنے کی تعلیم:

اور میں مولویوں کو بھی کہتا ہوں کہ آپ کو پورا توکل کرنا چاہیے پھر مولویوں کے مانگنے میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ لوگ ان پر اعتراض کریں گے کہ یہ لوگ دوسروں سے

تو مانگتے ہیں۔ لیکن خود کبھی نہیں دیتے اور جو چندہ کرنے والا خود نہ دے اس کے چندہ کرنے میں شبہات پیدا ہوتے ہیں اور اگر رئیس دوسروں سے پچاس ۵۰ مانگیں گے تو کم سے کم بیس ۲۰ تو خود بھی دیں گے اس لیے ان پر اعتراض کرنے کا موقع کسی کو نہیں ہے۔

اسلامی مدرسہ قائم کرنے کی ترغیب دینا اور اس کا طریقہ:

تو یہ طریقہ ہے کام کرنے کا اس طور پر مدرسے کا قائم ہونا نہایت ضروری ہے خاص کر اس شہر میں اس لیے کہ یہاں کے لوگوں کو دین کی طرف بہت ہی کم رغبت ہے۔ سراسر دنیا ہی میں کھپے ہوئے ہیں اور زیادہ تر وجہ اس کی یہی ہے کہ ان لوگوں کو عالموں کی صحبت بہت ہی کم ہے جس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خود عالموں کو یہاں بلاؤ اور ان سے فیض حاصل کرو عالم کی مثال آفتاب کی سی ہے اس کے طلوع ہوتے ہی آدھا حصہ زمین کا روشن ہو جاتا ہے اور ظلمت بالکل جاتی رہتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ دیندار عالم ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے تابع بن جائے اس کی شان یہ ہو: لایخافون فی اللہ لومۃ لائم (ترجمہ) نہیں ڈرتے خدا تعالیٰ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے اور اس کے لیے کم از کم بیس پچیس روپیہ ماہوار کا انتظام کردو۔ آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عالم تو بہت بڑا ہو۔ لیکن دس بارہ روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ دینے پڑیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ؒ کے پاس ایک عالم کی طلب میں ایک خط آیا تھا۔ جس میں اس عالم کے لیے بہت سی شرطیں لکھی تھیں کہ وہ ایسے ہوں اور ایسے ہوں اور کل دس روپیہ تنخواہ لکھی تھی۔ مولانا فرمانے لگے کہ بھلے مانسوں فی صفت ایک روپیہ تو رکھا ہوتا۔ صاحبو! خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو وسعت دی ہے کچھ مشکل نہیں کہ آپ بیس پچیس روپیہ ماہوار کا ایک مولوی کے لیے انتظام کردیں۔ شہر کے بڑے بڑے لوگ اگر اس کی طرف توجہ کریں تو بہت آسانی سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ تو عالموں کی بقاء کی صورت تھی۔

عمل کرنے کے لیے بقدر ضرورت علم حاصل کرنے کا طریقہ:

دوسرے دین پر عمل کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مدرسے میں جو عالم ہوں ان سے

مسئلے دریافت کر کے اور حلال حرام کو معلوم کر کے ان کے فتوے کے موافق عمل کیا جائے۔ اور جس وقت تک مدد سے کا انتظام نہ ہو اس وقت تک یہ کیجیے کہ عالم کو وعظ کے لیے نوکر رکھ لیجئے اس کا کام یہ ہو کہ محلوں میں جا کر وعظ کہے اور جنت کی رغبت اور دوزخ کے خوف کے مضمون کو اور شریعت کے آسان آسان مسئلوں کو بیان کرلے آپ لوگ اس طریقہ پر عمل کر کے دیکھئے انشاء اللہ تعالیٰ ایک سال ہی میں کتنی حالت درست ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کیجیے کہ ہر محلے کے لوگوں کو ہفتے بھر میں ایک دفعہ کسی جگہ جمع کر کے ایک آدمی مسئلوں کی کتابیں خرید کر اپنے پاس رکھ لیں۔ اور روزانہ ان کو دیکھا کریں اور جہاں شبہ رہے کسی عالم سے حل کر لیں غرض اس کو عمر بھر کا شغل رکھیں اور عورتوں کے لیے یہ صورت ہے کہ جو پڑھی لکھی ہیں وہ تو یہ کریں کہ کتابیں خرید کر ان کو تھوڑا تھوڑا پڑھ لیں اور جو بے پڑھی لکھی ہیں وہ پڑھی لکھی عورتوں سے سن لیا کریں۔

نیک صحبت کی ضرورت اور اس کے فائدے اور اس کی ترغیب دینا اور اس کا طریقہ اور بری صحبت کی مضرتیں:

رہی تیسری چیز یعنی بزرگوں کی صحبت کہ بغیر اس کے اعلیٰ درجے کی تعلیم بھی کافی نہیں اور نہ ادنیٰ درجے کی اور اسی وجہ سے عالموں اور طالب علموں سب کے ذمہ اس کا انتظام کرنا ضروری ہے۔ پہلے زمانہ میں جو سب لوگ اچھے ہوتے تھے اس کی بڑی وجہ یہ ہی تھی کہ وہ سب اس صحبت کا انتظام کرتے تھے۔ اس وقت یہ حالت ہے کہ تعلیم کا انتظام تو کسی قدر ہے بھی کہ اس پر ہزاروں روپیہ صرف کیا جاتا اور اس کو بہت سا وقت دیا جاتا ہے مگر بزرگوں کی صحبت کے واسطے فی سال ایک ماہ بھی کسی نے نہیں دیا۔ خدا کی قسم اگر نیک صحبت کی طرف ذرا بھی توجہ کرتے تو ساری تباہیوں سے مسلمان بچ جاتے اور اگر کسی کو اس میں شبہ ہو تو وہ اب امتحان کر کے دیکھے اور خود کو بھی اور اپنی اولاد کو بھی بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب کرے میں انشاء اللہ پانچ برس کے بعد دکھلاؤں گا کہ سب کے قول فعل عمل کس قدر درست ہوئے۔ اس وقت شائستگی کے عام ہونے سے کسی کو کسی سے

تکلیف نہ پہنچے گی اور یہ دنیا مثل جنت کے ہو جائے گی اور راز اس کا یہ ہے کہ علم کے سیکھنے سے نیک باتیں معلوم ہوں گی اور اچھی صحبت سے بری عادتیں دور ہوں گی اور یہی وہ چیزیں یعنی جہالت اور بدخلقی ساری خرابیوں کی جڑ ہیں۔ کیونکہ اگر کسی میں تکبر ہو اور اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا تکبر حق بات کو قبول کرنے اور اقرار کرنے کی کبھی اجازت نہیں دے گا۔ بلکہ وہ اپنی غلطی پر قائم رہے گا اور ہزاروں آدمی اس غلطی سے گمراہ ہوں گے اور جب تکبر کی اصلاح ہو جائے گی تو یہ بات نہ رہے اور اثر اس کا یہ ہوگا کہ اپنی ہر غلطی کو مان لے گا۔ سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے عشاء کے وقت ایک مسئلہ پوچھا' آپ نے اس کا جواب دے دیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک شاگرد نے عرض کیا کہ مجھے مسئلہ یوں یاد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو اور پوچھنے والے کو تلاش کرنا شروع کیا لوگوں نے عرض کیا کہ اس وقت رات زیادہ ہوگئی ہے آپ آرام فرمایئے ہم لوگ صبح ہونے پر اس کو بتلا دیں گے۔ لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا اور اس کے مکان پر تشریف لے گئے گھر میں سے اس کو بلایا اور فرمایا کہ ہم نے اس وقت مسئلہ غلط بتلا دیا تھا۔ تمہارے آنے کے بعد ایک شخص نے ہم کو صحیح مسئلہ بتلایا۔ اور وہ اس طرح ہے۔ جب یہ فرما چکے۔ تب چین آیا اور واپس آ کر آرام فرمایا تو اس بے چینی کا سبب کیا نرا علم تھا۔ ہرگز نہیں یہ صرف اس حال کا اثر تھا جو بزرگوں کی صحبت سے پیدا ہوا تھا۔ بعض لوگ جن کی تربیت اور اصلاح نہیں ہوتی اور مقتدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے اخلاق نہایت خراب ہوتے ہیں اور وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ چھوٹا بننے سے پہلے بڑے بن جاتے ہیں۔

صاحبو! بیٹا بننے سے پہلے باپ بن جانا بہت ہی خرابیوں کا سبب ہے۔ اس لیے سخت ضرورت ہے کہ اول چھوٹا بن کر اخلاق کی درستی کی جائے۔ اس واسطے کہ اس سے اعمال کی درستی ہو جائے گی اور تدبیر اس کی یہ ہے کہ جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے فراغت دی ہے وہ تو کم سے کم چھ ماہ تک کسی بزرگ کی خدمت میں رہیں۔ لیکن اس طرح کہ اپنا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے پیش کر دیں اور پھر جس طرح وہ کہیں اس طرح عمل کریں اگر وہ

ذکراور شغل تجویز کردیں تو ذکراور شغل میں مصروف ہو جائیں۔ اگر وہ اس سے منع کر کے دوسرے کام میں لگا دیں اس میں لگ جائے اور ان کے ساتھ محبت بڑھائے اور ان کی حالت اور طرز کو دیکھتا رہے کہ کسی سے کسی چیز کے لینے کے وقت یہ کیا برتاؤ کرتے ہیں اور دینے کے وقت کس طرح پیش آتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہو گا کہ اچھی عادتیں اس میں پیدا ہو جائیں گی اور پھر اس کی ذات سے دوسروں کو سراسر نفع ہی پہنچے گا اور جن لوگوں کو فراغت نہیں ہے وہ یہ کریں کہ وقتاً فوقتاً جب کبھی ان کو دو چار دن کی مہلت ہوا کرے اس وقت کسی بزرگ کے پاس رہ آیا کریں۔ اور اپنی اولاد کے لیے یہ کرو کہ روز مرہ جیسا ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے ایسا ہی اس کے لیے بھی ایک وقت مقرر کر دو کہ فلاں مسجد میں فلاں بزرگ کے پاس جا کر کچھ دیر بیٹھا کریں۔ صاحبو! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ فٹ بال کے لیے وقت ہو اور اخلاق کی درستی کے لیے وقت نہ نکل سکے اور اگر اس شہر میں کوئی ایسا شخص نہ ہو تو چھٹی کے زمانے میں کس بزرگ کی خدمت میں بھیج دیا کریں۔ اس زمانے میں تو ان کو کوئی کام بھی نہیں ہوتا کمبخت دن رات مارے مارے پھرتے ہیں۔ نہ نماز کے نہ روزے کے۔ ماں باپ خوش ہیں کہ ہم نماز کے بہت پابند ہیں۔ حالانکہ ان کو یہ خبر نہیں کہ قیامت میں وہ اولاد کے سبب ان کے ساتھ دوزخ میں جائیں گے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: **کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیة** (ترجمہ) ہر شخص تم میں سے نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال ہو گا۔ آج کل لوگ اپنی اولاد کی ایسی پرورش کرتے ہیں جیسا قصائی گائے کی پرورش کرتا ہے کہ اس کو کھلاتا ہے پلاتا ہے یہاں تک کہ خوب موٹی تازی ہو جاتی ہے۔ لیکن نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اپنی اولاد کو خوب زیب وزینت اور عیش کے ساتھ پرورش کرتے ہیں اور انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوزخ کا لقمہ ہوتے ہیں اور ان کے بدولت ماں باپ کی بھی گردن ناپی جاتی ہے کیونکہ اس عیش کی بدولت اولاد کو نہ نماز کی خبر ہوتی ہے نہ روزے کی بعض نامعقول تو حد سے اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کو اسلام کی کسی بات کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ ایک نوجوان کی نسبت میں نے سنا ہے کہ وہ

بیرسٹری پاس کر کے آ رہے تھے۔ ان کے باپ نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ میرا لڑکا لندن سے آ رہا ہے۔ تمہارے شہر سے اس کا گزر ہوگا اگر تم اس سے اسٹیشن پر مل لو تو بہتر ہو تا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ ان کے لکھنے کے موافق یہ صاحب اسٹیشن پر گئے اور جا کر ان بیرسٹر صاحب سے ملے اس وقت بیرسٹر صاحب کھانا کھا رہے تھے چونکہ رمضان شریف تھا۔ اس لیے ان کو تعجب ہوا اور انہوں نے دریافت کیا کہ صاحب آج کل رمضان شریف ہے کیا آپ نے روزہ نہیں رکھا۔ بیرسٹر صاحب پوچھتے ہیں کہ رمضان کیا چیز ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رمضان ایک مہینے کا نام ہے۔ وہ جنوری فروری مارچ آخر تک شمار کر کے کہنے لگا کہ ان میں تو رمضان کہیں نہیں آیا۔ آخر اس کی یہ حالت دیکھ ان کو سخت صدمہ ہوا اور سمجھے کہ لندن میں رہ کر جو کفر کی کان ہے اس کا دل مسخ ہو گیا ہے اس کی حالت بدل نہیں سکتی اور اناللہ پڑھ کر چلے آئے۔ اب آپ غور کیجیے کہ یہ مسلمانوں کے بچے ہیں مسلمان عورتوں کی گودوں کی پرورش کیے ہوئے اور دوزخ کی گود میں دیئے جا رہے ہیں۔

صاحبو! اگر یہ ہی رنگ رہا تو عجب نہیں کہ بچاس برس کے بعد یہ لوگ اپنے کو مسلمان کہنا بھی ننگ و عار سمجھیں۔ اتنا اثر تو اب بھی آ گیا ہے کہ اسلامی نام پسند نہیں آپ خوش ہیں کہ ہم نے اپنی اولاد کو بی۔ اے[1] تک پڑھا دیا۔ ایم۔ اے تک پڑھا دیا۔ حالانکہ آپ نے ان کو جہنم کی پگڈنڈی پر چھوڑ دیا ہے اور ان کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھ دی ہے کہ جنت کا صاف راستہ نظر ہی نہ آ سکے۔

صاحبو! اب کہتے ہیں کہ مولوی انگریزی پڑھانے سے منع کرتے ہیں خدا کی قسم ہم اس سے منع نہیں کرتے بلکہ کافر بنانے سے منع کرتے ہیں۔ اگر کوئی اپنی اولاد کو مسلمان رکھ کر انگریزی پڑھا سکے پڑھائے مگر خدا کے لیے ان کا دین تو خراب نہ ہونے دے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت میں بھیجنے کا اہتمام کرو۔ خیر اگر چھ مہینے دوزخ میں جانے کا کام کریں گے تو چھ۶ مہینے جنت میں جانے کے کام بھی تو کر لیں گے اور ان کی

[1] یہ دونوں انگریزی درجوں میں سے بڑے درجے کے نام ہیں۔ ۱۲۔

صحبت میں وہ اثر ہے جو سو ۱۰۰ سال کی عبادت میں نہیں۔ صاحبو! صحبت سے وہ بات حاصل ہوگی کہ اس کی بدولت اسلام دل میں رچ جائے گا۔ اور یہی مذہب کی روح اور جان ہے کہ دین کی عظمت دل میں رچ جائے۔ کسی وقت نماز اور روزے میں کوتاہی ہو جائے تو اس میں اتنا بڑا ضرر نہیں جتنا کہ اس کا کہ یہ حالت دل میں نہ رہے گی اگرچہ یہ بات میرے منہ سے کہنے کی نہیں ہے کیونکہ اندیشہ ہے کہ کوئی شخص نماز اور روزے کو معمولی بات سمجھ جائے مگر مطلب میرا جو کچھ ہے ظاہر ہے۔ غرض ضرورت اس کی ہے کہ مذہب دل میں رچا ہو اور اگر دل میں یہ حالت نہیں ہے تو یہ ظاہری نماز[1] کچھ ایسے کام کی اور نہ روزہ کی یہ حالت ایسی ہے جیسے طوطے کو سورتیں رٹائیں کہ وہ محض اس کی زبان پر ہوتا ہے۔ ایک شاعر نے طوطے کی وفات کی تاریخ کہی ہے کہتا ہے

میاں مٹھو جوڑا کر حق تھے
رات دن ذکر حق رٹا کرتے
گربہ موت نے جو آ دابا
کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے

اس میں سے ۱۲۳۰ھ موت کی تاریخ نقش ہے یہ تاریخ اگرچہ ہے تو مسخرہ پن لیکن اگر غور کیا جائے تو اس نے ایک بڑی حکمت کی بات کہی ہے۔ یعنی یہ بتلا دیا ہے کہ جس تعلیم کا اثر دل پر نہیں ہوتا۔ مصیبت کے وقت کچھ کام نہیں دیتی تو اگر دین کی محبت دل میں رچی ہوئی نہ ہو تو قرآن کا حافظ بھی ہوگا تب بھی آٹے دال ہی کا بھاؤ دل میں لے کر مرے گا۔ جیسا اس وقت غالب حالت ہے کہ دل میں سے اسلام کا اثر کم ہوتا جاتا ہے اور صاحبو! اسی کو دیکھ کر میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں سے اسلام نکلا جاتا ہے خدا کے لیے اپنی اولاد پر رحم کرو اور ان کو اسلام کے سیدھے ڈگر پر لگاؤ۔ اب میں اپنے بیان کو ایک ضروری بات پر ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ نیک صحبت کے لیے جس شخص کو تجویز کیا جائے وہ کیسا ہوا اور

---

[1] مقصد یہ نہیں ہے کہ ایسی نماز بالکل بے کار ہے۔ بلکہ یہ کہ نماز کا پورا فائدہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ دل کی حالت بھی درست ہو۔

اس کے کامل ہونے کی علامتیں کیا ہیں؟ علامتیں اس کی یہ ہیں کہ ایک تو بقدر ضرورت علم دین جانتا ہو۔ دوسرے شریعت کا پوری طرح پابند ہو۔ تیسرے اس میں یہ بات ہو کہ جس بات کو خود نہ جانتا ہو عالموں سے دریافت کر لیتا ہو۔ چوتھے یہ کہ اس کو عالموں سے وحشت اور نفرت نہ ہو۔ پانچویں یہ کہ اس میں روک ٹوک کی عادت ہو۔ مریدوں کو اور تعلق رکھنے والوں کو ان کی حالت پر نہ چھوڑ دیتا ہو۔ چھٹے یہ کہ اس کی صحبت میں یہ برکت ہو کہ اس کے پاس بیٹھنے سے دنیا کی محبت کم ہوتی جائے۔ ساتویں یہ کہ اس کی طرف دین دار اور دین کے سمجھنے والے لوگ زیادہ متوجہ ہوں اور یہ بڑی علامت کمال کی ہے۔ جس میں یہ علامتیں ہوں وہ مقبول ہے اور کامل ہے۔ اس کے پاس جایئے۔ اور اس کی صحبت سے فیض حاصل کیجئے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ آپ اس کے مرید ہو جائیں کیونکہ پیری مریدی کی حقیقت مقصود ہے اور وہ یہ ہی ہے جو ابھی ذکر کی گئی۔ یعنی فیض حاصل کرنا اس کی صورت یعنی ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دینا مقصود نہیں ہے۔ جیسے آج کل سمجھا جاتا ہے کہ وہ محض رسم کے طور پر رہ گئی ہے۔ جیسے بعض جگہ نکاح ایک رسم سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ چاہے شوہر نامرد ہی کیوں نہ ہو ایسے ہی بطور رسم کے مرید بھی ہوتے ہیں۔ ہاں اگر دل بہت ہی چاہنے لگے مرید ہونے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن کسی سے مرید ہونے کے لیے سخت جانچ اور پرکھ کی ضرورت ہے۔ ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے۔ یہ سات علامتیں جو اوپر بیان ہوئیں اس میں ضرور دیکھ لے۔

نیک صحبت میں رہنے کے قاعدے:

البتہ صحبت میں رہنے کے قاعدے بھی ہیں کہ بدون ان کے صحبت مفید نہیں۔ منجملہ ان قاعدوں کے ایک یہ بھی ہے کہ اس بزرگ کے پاس جا کر دنیا کی باتیں نہ بنائے جیسا اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر بھی دنیا کے قصے جھگڑے اخبار کے واقعات ذکر کرنا شروع کر دیتے ہیں دوسرے یہ کہ حتی الوسع بزرگوں کو تعویذ گنڈوں کی بھی تکلیف نہیں دینی چاہئے۔ ان حضرات سے تعویذ گنڈے لینا ایسا ہے جیسا لوہار کے پاس جال کر کھرپایا کلہاڑی بنوانا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص ہاتھ میں ہاتھ لیتا ہے

وہ اللہ میاں کا (خدا کی پناہ) رشتہ دار ہو جاتا ہے کہ جو کام بھی اس سے کہا جائے۔ وہ اللہ میاں سے ضرور پورا کر دیتا ہے۔ حالانکہ ایسا با اختیار اس بزرگ کو سمجھنا ایمان کے خلاف ہے۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ سوا عرض معروض اور دعا کرنے کے اللہ میاں کے سامنے ذرا بھی کچھ دخل دے سکے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میرا مقدمہ ہے۔ فرمایا کہ دعا کروں گا۔ اس نے کہا کہ دعا کرانے نہیں آیا یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یوں کر دیجیے کہ میں نے یہ کام پورا کر دیا۔ مولانا بہت ناخوش ہوئے۔ پہلی بھیت میں ایک بزرگ کے پاس ایک بڑھیا آئی اور کچھ عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے۔ اس نے سنا نہیں۔ ایک شخص اور بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے نقل کرنے کے طور پر اس سے کہا کہ یوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا وہ بزرگ سخت برہم ہوئے۔ اور کہا کہ مجھ کو کیا خبر کہ فضل کرے گا یا نہ کرے گا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے۔ تم نے اپنی طرف سے ''گا'' کیسے بڑھا دیا۔ اسی طرح تعویذوں کی فرمائش بھی ان حضرات کی طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔ بھلا جس نے عمر بھر طالب علمی اور اللہ اللہ کیا ہو۔ وہ کیا جانے کہ تعویذ کیا ہوتا ہے اور ان کو کس طرح لکھا جاتا ہے۔ پھر لطف یہ کہ تعویذ بھی دنیا سے نرالے کاموں کے لیے بمبئی سے ایک پہلوان کا خط آیا کہ میری کشتی ہونے والی ہے۔ مجھے ایک تعویذ لکھ دو کہ میں جیت جاؤں' میں نے لکھا کہ اگر تمہارا مقابل بھی کسی سے تعویذ لکھا لے تو کیا ہو گا۔ پھر تعویذ تعویذ میں کشتی ہو گی۔ عجب نہیں کہ لوگ چند روز میں مردوں کے بچہ پیدا ہونے کے لیے بھی تعویذ ہی لکھوا لیا کریں۔ جس میں نکاح ہی کی ضرورت نہ رہے کیونکہ جب تعویذ میں ایسا اثر ہے کہ وہ ہر چیز میں کام کر سکتا ہے تو مردوں کے بچہ ہونے میں بھی ضرور کام آنا چاہیے۔ صاحبو! بزرگوں کے پاس اللہ کا نام دریافت کرنے کے لیے جاؤ۔ خلاصہ اس سب تقریر کا یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے بزرگوں کی طویل صحبت کو تجویز کرو یہ تو مردوں اور تندرستوں کے لیے ہے۔

نیک صحبت کا بدل:

اور جو اپاہج ہوں یا عورتیں تو ان کے لیے نیک صحبت کا بدل یہ ہے کہ ایسے بزرگوں

کے ملفوظات[1] کی کتابیں دیکھا کریں یا سنا کریں۔ ان کے لیے توکل' صبر اور شکر طہارت کی حکائتیں دیکھنا سننا بھی صحبت کا فائدہ دیتا ہے۔ مگر یہ وصیت کرتا ہوں کہ مثنوی شریف اور دیوان حافظ نہ دیکھیں کیونکہ اکثر ناواقف لوگ ان کی بدولت ہلاک اور خراب ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی باریک باتیں عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔

ابتدائی حالت میں تصوف کی کونسی کتاب قابل دیکھنے کے ہے اور کونسی نہیں ہے:

اور جب اہل حال کی کتابوں کے دیکھنے میں اس قدر مضرت اور نقصان کا خوف ہے تو جو جاہل بے شرع بدلگام ہیں ان کی کتابیں تو کس درجہ مضر ہوں گی۔ اسی طرح جو لوگ بزرگوں کی باتوں کو نری نقل بے سمجھے کیا کرتے ہیں ان کی تحریر اور تقریر سے بھی بوجہ اس کے کہ وہ اصل سے بدلی ہوئی ہوتی ہے کچھ نفع نہیں ہوتا۔ ہاں کتاب احیاء العلوم کا ترجمہ دیکھو انشاء اللہ ہر طرح کا فائدہ ہوگا یہ بیان ختم ہو چکا ہے۔ اس بیان میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے وہ نسخہ بتلایا ہے کہ اس کے استعمال کرنے میں نہ روزی کمانے کا حرج ہے نہ اور کوئی نقصان ہے اور مسلمانوں کو اس کی بڑی ضرورت ہے۔

وعظ کا حاصل:

اس آیت میں اسی کے متعلق ارشاد نَسْمَعُ میں دوسرے تقلید کرنے کو اور نَعْقِلُ میں اپنی عقل سے سمجھنے کو ذکر فرمایا ہے۔

خاتمہ اور دعا:

پس معلوم ہوا کہ دوزخ سے بچنے کے دو۲ طریقے ہیں یا دوسرے کی تقلید ہو یا اپنی تحقیق ہو۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ عمل کی توفیق دے۔ یہ بھی دعا کیجیے کہ یہاں مدرسہ قائم ہو جائے کہ اس بہانے پھر آنا ہو۔

ملتـ

---

[1] ملفوظات ان باتوں کو کہتے ہیں جو بزرگوں کی زبان سے مریدوں کی اصلاح کے لیے نکلتی ہیں۔۱۲۔

(۳۵) محبت کے آثار

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

خطبہ ماثورہ:

اَمَّابَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں سب مضبوط ہیں۔ یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایک ضروری مضمون جس کے جاننے کی سب کو ضرورت ہے بیان فرمایا ہے۔ اور چونکہ ضرورت عام ہے تمام مسلمانوں کو۔ اور پھر ہر وقت ضروری ہے لہٰذا یہ بیان بہت سے بیانوں کا کام دے گا۔ جن کے لیے مختلف وقتوں میں کتنے جلسوں کی ضرورت پڑتی۔ چونکہ اس وقت یہاں بیان کرنے کا پہلا موقع ہے اور پھر خدا جانے کب موقع ہو اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ایسا مضمون اختیار کیا جائے جو کہ عام ہو چنانچہ یہ مضمون اسی قسم کا ہے اور قرآن شریف میں اس قسم کے اکثر مضمون ہیں پھر یہ بھی ارادہ ہے کہ نہایت سہل اور آسان طریقے سے اس کو بیان کیا جائے کیونکہ یہاں اکثر لوگوں کو یہ پہلا موقع وعظ سننے کا ہوگا۔ اور باریک مضمون سمجھنے کے لیے اکثر پہلے مناسبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص کر اس لیے بھی کہ اس وعظ میں عورتوں کا مجمع بھی ہے اور باریک مضمون ان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ اس لیے باریک مضمون کو بیان نہ کیا جائے گا۔ بلکہ بہت آسان مضمون ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں بلاتخصیص سب مسلمانوں کی ایک شان اور حالت کو بیان فرمایا ہے اور اس حالت کو بیان کرنے سے محض اس کا بیان کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ مقصود ہے حکم کرنا یعنی ہر مسلمان کو چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی محبت میں نہایت مضبوط ہو اور خدا تعالیٰ کے برابر کسی کی محبت اس کے دل میں نہ ہو۔

دیکھنے کے قابل یہ ہے کہ جو شان مسلمان کی خدا تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وہ ہم میں پائی جاتی ہے یا نہیں یعنی ہم خدا تعالیٰ کی محبت میں پورے طور پر مضبوط ہیں یا نہیں۔ اگر پورے طور سے مضبوط ہیں تو ہم میں کامل ایمان ہوگا۔ ورنہ جس درجہ کی محبت ہوگی درجہ کا ایمان بھی ہوگا۔ یعنی یہ تو کہہ بھی نہیں سکتے کہ کسی مسلمان کو خدائے تعالیٰ سے بالکل ہی محبت نہیں۔ تھوڑی بہت تو سب کو ہی ہے۔ کیونکہ یہ اس آیت کی رو سے ایمان کے لیے لازم ہے۔ پس اگر محبت کی بالکل نفی کی جائے گی تو اس کے ساتھ ہی ایمان کی نفی کر دینی پڑے گی۔ حالانکہ ایمان اللہ کا شکر ہے ہم سب میں پایا جاتا ہے تو معلوم ہوا محبت سب میں ہے۔ بلکہ محبت کے ساتھ اس کی مضبوطی بھی ہر مسلمان میں پائی جاتی ہے اسی آیت کی رو سے اسی آیت کی رو سے لیکن خود مضبوطی کے اندر مختلف درجے ہیں کہ کسی میں بہت مضبوطی ہے اور کسی میں اس سے کم اور اسی طرح ایمان کے اندر بھی درجے مختلف ہوں گے۔ باقی محبت میں کمزوری کسی مسلمان میں پائی ہیں ہی نہیں جاتی اور نہ پائی جاسکتی ہے۔ کیونکہ محبت کی مضبوطی کی نفی کرنے سے بھی ایمان کی نفی ہو جائے گی تو اس وقت محبت کے درجوں کا اختلاف اس کی مضبوطی ہی میں رہا۔ یعنی کسی کو محبت مضبوط ہے۔ اور کسی کو مضبوط سے بھی مضبوط تو اس سے معلم ہوا کہ محبت میں مضبوطی ہر مسلمان کے لیے لازم ہے۔ اب اپنی حالت کو دیکھئے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو محبت ہونے میں کس درجہ کی مضبوطی ہے اور اس میں کلام ہی نہیں کہ آپ کو محبت کی مضبوطی حاصل ہے۔ اور یہ بالکل نئی بات ہے۔ ورنہ سب وعظ کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں تو گویا میں نے آپ کو نئی خوشخبری دی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص فاسق گنہگار شرابی بھی ہے تو اس کی محبت میں بھی مضبوطی ہے، لیکن باوجود اس شرکت کے پھر بھی مضبوطی کے درجے مختلف ہیں۔ کیونکہ ہر ایک کی مضبوطی برابر نہیں ہوتی اور مضبوطی میں شرکت اگرچہ اس وقت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن امتحان کے موقع پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی مسلمان کے سامنے کوئی شخص خدا تعالیٰ کی شان میں یا اس کے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو اگرچہ اس مسلمان کا یہ ایمان نہایت کمزور ہو۔ لیکن اس گستاخی کو سن کر اس قدر بے چین ہو جاتا ہے

کہ ماں کی گالی سننے سے بھی اس قدر بے چین نہیں ہوتا۔ اور اس درجہ کی بے چینی بغیر محبت کی مضبوطی کے نہیں ہوسکتی۔ پس معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ سے محبت مضبوط ہے اگر کمزور محبت ہوتی تو اس قدر بے چین نہ ہوتا بے چینی کسی نہ کسی درجے میں اس وقت بھی ہوتی ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی شخص کا ایک پیسہ گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا ہے اور اگر کسی کا ایک روپیہ گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا ہے۔ اور کسی کی گنی گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا ہے۔ اور دس گنی گم ہو جائیں تو اس کا بھی قلق ہوتا ہے لیکن پیسے کے گم ہونے کا قلق کم ہوتا ہے۔ روپیہ کے گم ہونے کا قلق زیادہ اور گنی کے گم ہونے کا بہت زیادہ اور دس گنی بہت زیادہ سے بھی بہت زیادہ۔ غرض کوئی فاسق بھی محبت کی مضبوطی سے خالی نہیں ہے لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں فسق کی اجازت دیتا ہوں۔ بلکہ جو بات واقعی ہے اس کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

جو شخص محبت کی شدت سے خالی ہے اور دین کی باتوں سے مسخرہ پن کرتا ہے وہ مسلمان نہیں:

اور اگر کوئی کہے کہ ہم تو خود اسلام کے ساتھ مسخرہ پن کیا کرتے ہیں۔ اور ہنسا کرتے ہیں۔ اور ہمیں ذرا بھی بے چینی نہیں ہوتی تو ایمان کے لیے محبت کی مضبوطی کہاں لازم ہوئی۔ تو میں کہوں گا کہ خدا کی قسم اگر کسی شخص کی یہ حالت ہے تو وہ ہرگز مسلمان نہیں اگرچہ وہ اپنی زبان سے اپنے کو مسلمان کہے۔ اور وہ اگرچہ کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہو۔ اور اس وقت بہت سے لوگ ہیں کہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ لیکن ان کو ذرا بھی پرواہ اس بات کی نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ ہمارے وطن میں ایک ماسٹر عارضی طور آئے ہوئے ہیں اور داڑھی منڈاتے ہیں ان سے جب داڑھی رکھنے کو کسی نے کہا تو کہنے لگے کہ داڑھی تو بکرے کی ہوا کرتی ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ مولویوں کو کفر کا فتویٰ دینے میں متعصب اور سخت بتلاتے ہیں۔ لیکن ان کو انصاف کرنا چاہئے کہ کیا یہ بات کفر کی نہیں۔ آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ ایسا شخص جس کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے داڑھی

رکھی اور تمام پیغمبر داڑھی رکھتے تھے۔ صحابیوں ﷺ نے سب نے رکھی۔ اور پھر وہ کہے کہ داڑھی تو بکرے کی ہوتی ہے۔ کیا آپ لوگ انصاف کی رو سے اس کو مسلمان کہیں گے دیکھو اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرنے لگے تو کتنا بڑا مجرم سمجھا جاتا ہے تو کیا یہ توہین عدالت کی توہین کے برابر نہیں۔ ہر عقلمند جانتا ہے کہ عدالت کی توہین سلطنت کی توہین ہے اسی طرح شریعت کے کسی حکم کی توہین رسول اللہ ﷺ کی اور اللہ تعالیٰ کی توہین ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ کی توہین کرنے کے بعد بھی ایمان نہیں جاتا تو گویا ایمان سریش اور گوند ہوا کہ وہ ایسا چپکا ہے جو کسی طرح چھوٹتا ہی نہیں۔ صاحبو! ایمان ایسا سستا اور اتنا بے غیرت نہیں ہے کہ اس کو کوئی دھکے بھی دے اور وہ نہ ٹلے۔ آج اکثر مسلمان روزے نماز کو فاقہ اور اٹھک بیٹھک کہتے ہیں۔ اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں حالانکہ: کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم وان یقولون الا کذبا ط بڑا ہے۔ وہ کلمہ جو کہ ان کے مونہوں سے نکلتا ہے وہ سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں کہتے۔ آخر ضابطہ اور حد بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ یہ اچھا اسلام ہے کہ مسخرہ پن اور اہانت کرنے سے بھی نہیں جاتا۔ افسوس ہے کہ اپنی ماں کے متعلق تو دوسروں سے بے موقع الفاظ نہ سن سکیں اور اسلام کے متعلق خود خرافات اور مسخرہ پن پر آمادہ ہوں سمجھ لینا چاہئے کہ ایسے لوگوں کا نکاح اگر کسی مسلمان عورت سے ہوا ہے تو اس قسم کے مسخرہ پن سے وہ نکاح فوراً ٹوٹ گیا اور جو اولاد ان سے اس کے بعد پیدا ہوگی۔ وہ سب حرامی ہوگی۔ صاحبو! کھلی ہوئی بات ہے مگر لوگوں کو اس پر ذرا توجہ نہیں ہے اور نظیر اس کی وہی ہے کہ اگر عدالت کی توہین کی جائے تو وہ سلطنت اور گورنمنٹ کی توہین کی جاتی ہے۔ سو کیا وجہ کہ اسلام کی دفعات میں سے کسی دفعہ کی توہین یا کسی نبی کی توہین خدا تعالیٰ کی توہین نہ سمجھی جائے پس یہ شبہ جاتا رہا کہ مسخرہ پن کے بعد بھی ہم تو مسلمان ہیں اور جواب اس طرح ہوا کہ وہ مسلمان نہیں اگرچہ کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے اور یہ مسئلہ بلاغبار ثابت رہا کہ جو مسلمان ہوگا اس کو خدا کی محبت ضرور مضبوط ہوگی۔

محبت کی مضبوطی کے درجے مختلف ہیں:

لیکن اس میں درجے مختلف ہوں گے۔ مثلاً ایک مضبوطی کا درجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے متعلق گستاخی سن کر بے چین ہو جائے دوسرا درجہ یہ ہے کہ محض خدا تعالیٰ کا ذکر ہی سن کر دل میں ایک ولولہ اور جوش پیدا ہو اور نافرمانی کے چھوڑنے کی فکر ہو جائے اور یہ سوچے کہ خدا تعالیٰ کے یہ انعامات مجھ پر ہیں اور اس قدر فضل وکرم ہے حالانکہ اگر دنیا میں کوئی چار پیسے ہم کو دیتا ہے تو اس کی کس قدر اطاعت کی جاتی ہے تو جب چار پیسے دینے والے کی اتنی اطاعت ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ کی اطاعت تو اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیے اور اس کی نافرمانی کا تو وسوسہ بھی دل میں نہ آنا چاہیے غرض خدا تعالیٰ کا نام اور اس کے حکم سن کر یہ خیالات اطاعت کرنے کے پیدا ہوئے۔ مگر چند روز کے بعد پھر ذہن سے نکل گئے۔ ایک درجہ یہ تھا۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس خیال کے ساتھ ہی اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ یعنی جس قدر نافرمانی کا سامان تھا سب کو الگ کر دیا۔ اگر اپنے پاس تصویریں تھیں' ان کو چاک کر ڈالا اور اگر حرام کی کمائی تھی تو اس کے مالک کو واپس کر دیا۔ اگر مالک نہ مل سکے تو مالک کی طرف سے صدقہ کر دیا۔ اگر نماز نہ پڑھتے تھے تو نماز شروع کر دی۔ پاجامہ اگر ٹخنوں سے نیچا تھا' اس کو کاٹ کر ٹخنوں سے اونچا کر لیا اور یہ پختہ قصد کر لیا کہ اب کوئی حرکت حکم کے خلاف نہ کریں گے اور اس قصد کو نباہ دیا یہ درجہ سب میں بڑھ کر ہے اور اس کے بہت سے درجے نکل سکتے ہیں لیکن میں نے اختصار کے لیے مثال میں کم سے کم کر دیئے۔ اس واسطے کہ عقلمند خود ہی سب درجوں کو سمجھ لے گا۔ حاصل یہ ہوا کہ محبت کی پختگی۔ ایمان کے لیے لازم اور اس کے درجے مختلف اور جس درجہ کی مضبوطی ہو اسی درجہ کا ایمان ہو گا۔ اور یہی بات خدا تعالیٰ کو اس آیت میں بتلانا ہے اور مقصود اس بتلانے سے یاد دلانا ہے کہ تم محبت پکی اختیار کرو۔ جس کی علامت کامل فرمانبرداری ہے۔ اور اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنے نوکروں سے یہ کہنے لگے کہ جو ہمارا وفادار نوکر ہو گا۔ وہ ہماری اطاعت کرے گا تو ہر عقلمند اس سے یہی سمجھتا ہے کہ اطاعت اختیار کرو اور جس قدر

اطاعت میں کمی ہوگی اسی قدر وفاداری میں بھی کمی سمجھی جائے گی۔تو خداتعالیٰ نے بھی اسی بات کے ذریعہ سے ہم کو اطلاع کی ہے کہ تم مضبوط محبت اختیار کرو۔ ورنہ اسی کمزور درجے کا تمہارا ایمان بھی ہوگا۔

ہر شخص کو علامتوں سے غور کرنا چاہیے کہ مجھ میں اللہ تعالیٰ کی محبت کس درجہ کی ہے:

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آپ اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھئے کہ آپ میں کس درجہ کی محبت ہے۔ سو اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے کیونکہ اس کے کچھ آثار ہوتے ہیں کہ وہ آثار جس درجے کے پائے جائیں محبت بھی اسی درجے کی ہوگی اور یہ گویا محبت کے پرکھنے کی کسوٹی ہے کہ جس طرح چاندی کا کھرا کھوٹا ہونا کسوٹی سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح محبت کا کم اور زیادہ ہونا ان آثار سے معلوم ہوگا اور یہی کسوٹی ہے جس کو حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ تجربہ کی کسوٹی پر ہم سب کو کس لیا جائے تا کہ جس میں کھوٹ ہو وہ نادم اور شرمندہ ہو جائے حقیقت یہ ہے کہ بغیر امتحان کے پتہ نہیں چل سکتا۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہم نے اپنے کو جانچا ہے یا نہیں۔ اور اگر نہیں جانچا تو اب جانچنا چاہئے اور اپنے ہر فعل اور ہر قول کو غور سے دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اندر مضبوط محبت کے آثار ہیں یا نہیں۔ اور اگر آثار یوں سمجھ میں نہ آئیں تو دنیا کی محبت کے آثار پر قیاس کر کے دیکھئے۔

محبت کی علامتیں اور وہ ہم میں موجود ہیں یا نہیں!

یعنی اگر دنیا میں کسی مرد یا عورت سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے کیا آثار ہوتے ہیں کہ اول تو ہر وقت کی یاد کہ کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا جس میں محبوب کی یاد سے دل پر نہ ہو۔ دوسرے نہایت خوشی سے اطاعت کرنا اس میں ذرا بھی تکلف نہ ہونا یہاں تک کہ اگر وہ گھر بھی مانگ لے تو اس میں کچھ بھی دریغ نہیں ہوتا پس جب یہ دو چیزیں محبت کے آثار میں سے ہیں تو انہیں کو پیش نظر رکھ کر اپنے کو جانچ لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ چوبیس گھنٹے

میں کتنی دیر آپ خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ خاص کر جبکہ ہر وقت اس کی نعمتوں میں دیر
آپ خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ خاص کر جبکہ ہر وقت اس کی نعمتوں میں سر سے پاؤں تک غرق بھی رہتے ہو جن سے ہر وقت اللہ کا یاد آ جانا طبیعت کی ضروریات میں سے ہے۔

صاحبو! یہ باتیں بھولنے کی نہیں ہیں۔ تم خدا کے دیئے ہوئے مکانوں میں رہتے ہو' اس کا دیا ہوا کھانا کھاتے ہو' اس کی دی ہوئی اولاد سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ لیکن اس کو یاد نہیں کرتے۔ دیکھو اگر کوئی دوست تم کو دو آم بھیج دے تو ان کو کھاتے وقت دل میں اس کا تصور اور خیال ضرور ہی رہتا ہے ذرا انصاف سے بتلایئے خدا تعالیٰ کا دیا ہوا کھانا دونوں وقت تمہارے سامنے آتا ہے' لیکن تم نے کسی دن بھی کھاتے وقت خدا تعالیٰ کو یاد کیا ہے۔ سارا کھا جائیں گے لیکن کسی لقمہ پر یہ خیال نہ ہو گا کہ یہ خدا کی دی ہوئی نعمت ہے یہ دوسری بات ہے کہ عقیدہ درست ہونے کے سبب کسی کے پوچھنے پر ہم کہہ دیں کہ یہ خدا تعالیٰ نے ہم کو دیا ہے۔ کیوں؟ صاحبو! پھر کیا اسی منہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے پکی محبت ان کی طلب کے موافق ہے اور ہم کامل ایمان دار ہیں دیکھ لیجئے کہ اس کی خاصیتیں ہم میں کس حد تک پائی جاتی ہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ ہم میں محبت کی وہ خاصیتیں تو ضرور موجود ہیں جو کہ ادنیٰ مسلمانوں تک میں بھی پائی جاتی ہے۔ جیسے یہی کہ اس کی گستاخی کو سن کر بے چین ہو جانا تو میں کہوں گا کہ کیا آپ کو ان ہی خاصیتوں پر قناعت ہے۔ صاحبو! ذرا غور کر کے دیکھو کہ تمہارے پاس سوائے ایمان کی دولت کے اور دھرا کیا ہے؟ پھر اگر اس کے بھی ادنیٰ درجہ پر قناعت کر لو تو غضب ہے۔ اور اگر کسی کو دنیا کی دولت پر ناز ہو اور اس لیے کامل ایمان کی دولت کا طالب نہ ہو تو۔

دنیا کی دولت بہت جلد چھوٹ جانے والی ہے:

یاد رکھو کہ یہ دولت بہت جلد تم سے چھوٹ جانے والی ہے۔ مثلاً چوری ہو گئی آگ لگ گئی اور یا تم اس سے بہت جلد چھوٹ جانے والے ہو۔ اگر وہ مرنے تک تمہارے پاس رہی۔ دنیا میں سب سے بڑا خوش قسمت وہ شخص سمجھا جاتا ہے کہ مرتے دم تک دولت اس کے پاس رہے لیکن پھر بھی مرتے وقت آخر چھوڑنا ہی پڑے گی۔ اور اس وقت دس ۱۰

منٹ بلکہ ایک سیکنڈ کی بھی مہلت نہیں ملتی۔

صاحبو! کیا کوئی عقلمند آدمی ایسے سرمایہ[1] کو جو اتنے جلد چھوٹ جانے والا ہو۔ اور بعد کو ایسے لوگوں کے پاس جانے والا ہو جو کہ آپ کے دشمن ہوں اور آپ اپنا سرمایہ ان کو دینا پسند نہ کرتے ہوں۔ سرمایہ کہہ سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ جب یہ سرمایہ اعتبار کے قابل نہیں تو اب بتلایئے کہ ہمیشہ ہمیشہ تک کام آنے والا اور ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے والا سرمایہ سوائے ایمان کے اور کیا ہے؟ اور چونکہ یہ جلسہ مسلمانوں کا ہے۔ اس لیے اس کے منوانے کے ملیے دلیلیں قائم کرنے کی ضرورت نہیں یہ تو سب کی مانی ہوئی بات ہے۔

ایمان کی دولت ہی ساتھ رہنے والی ہے:

تو معلوم ہوا کہ ایمان ہی ایسی دولت ہے کہ چند روز کے بعد یہ قبر میں ساتھ کا پیدا ہونا عادتاً ضروری ہے اور ایسے کاموں میں خدا تعالیٰ نے ہر کام کی تدبیر بتلائی ہے

خدا کی محبت کے پیدا ہونے کی تدبیر:

سو وہ تدبیر یہ ہے کہ تم چند باتوں کی پابندی کرلو ایک تو یہ کہ تھوڑی دیر تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرلیا کرو۔ اگرچہ پندرہ بیس منٹ ہی ہو۔ لیکن اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعے سے خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو دوسرے یہ کیا کرو کہ کسی وقت تنہائی میں بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچا کرو اور پھر اپنے برتاؤ کو غور کیا کرو کہ ان انعامات پر خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کیا معاملہ کر رہے ہیں۔ اور ہمارے اس معاملے کے باوجود بھی خدا تعالیٰ ہم سے کس طرح پیش آ رہے ہیں تیسرے یہ کرو کہ جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں ان سے تعلق پیدا کرلو۔ اگر ان کے پاس آنا جانا دشوار ہو تو خط و کتابت ہی جاری رکھو۔ لیکن اس خیال کا رکھنا ضروری ہے کہ بزرگوں کے پاس اپنے دنیا کے جھگڑے مت لے جاؤ نہ دنیا پوری ہونے کی نیت سے ان سے ملو بلکہ خدا کا رستہ ان سے دریافت کرو۔ اپنی بری عادتوں کا ان سے علاج کراؤ۔ اور ان سے دعا کراؤ۔ چھوتھے یہ کرو کہ خدا تعالیٰ کے حکموں کی پوری

[1] پونجی۔۱۲۔

پوری اطاعت کیا کرو کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے اس سے ضرور محبت بڑھ جاتی ہے۔ وقت میں گنجائش نہیں ہے ورنہ میں اس کو مفصل طور پر بتلاتا۔ پانچویں یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ وہ اپنی محبت عطا فرمائیں۔ یہ پانچ جزو کا نسخہ ہے اس کو استعمال کر کے دیکھئے انشاء اللہ تعالیٰ بہت تھوڑے دنوں میں خدا تعالیٰ سے کامل محبت ہو جائے گی۔ اور ساری بری عادتوں سے نجات حاصل ہو جائے گی اور آپ ان لوگوں میں پورے طور سے داخل ہو جائیں گے۔ جن کی علامت: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ میں بیان فرمائی ہے مگر اس نسخہ میں جو ایک جزو ہے اطاعت وہ اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب خدا کے حکموں کا علم ہو اور حکموں کا علم اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب ان کو سیکھا جائے۔ پس ایک چھٹے جز کی اور ضرورت ہوگی۔

محبت کے حاصل کرنے کا طریقہ موقوف ہے علم دین پر اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ:

وہ یہ ہے کہ دین کا علم سیکھا جائے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص مولوی بنے عالم بننے کے لیے تو صرف وہ لوگ مناسب ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے فراغت اور فرصت دی ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اردو کے چھوٹے چھوٹے رسالے جو اسی غرض سے لکھے گئے ہیں کسی سے پڑھ لیں اور اگر پڑھنے کے لیے وقت نہ ہو یا عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے یہ دشوار معلوم ہو تو کسی سے سن لیں۔ سو اس کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہر شہر میں ایک دو عالم ایسے رہیں کہ جن سے یہ وہ کام یعنی پڑھنے اور سننے کے لیے جائیں اور ان دونوں کام لینے کی چار صورتیں ہوں گی۔ اول تو یہ کہ اگر ان سے کوئی پڑھنے جائے تو پڑھائیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو وہ بتلا سکیں۔ تیسرے ہر ہفتے میں ایک دن ایسا نکالیں کہ لوگوں کو جمع کر کے کوئی کتاب مسئلوں کی لے کر خود اس کے مسئلے پڑھا کریں اور عام لوگ ان کو سنا کریں اور مسئلوں میں نماز روزہ حج زکوٰۃ معاشرت[1] معاملات وغیرہ سب کے حکم داخل

[1] معاشرت راحت اور امن کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا طریقہ معاملات لین دین۔۱۲

ہیں چوتھا کام ان کا یہ ہو کہ ہر ہفتہ یا پندرھویں دن شوق اور خوف ہونے کا وعظ کیا کریں اور وعظ کی مجلس کو مسئلوں کے بیان کی مجلس سے علیحدہ کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ یہ تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ وعظ میں فقہ کے مسئلوں کا زیادہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اکثر یاد میں بھی غلطی ہو جاتی ہے اور خاص کر اس لیے بھی کہ وعظ میں اکثر لوگ مزیدار مضمون سننے کی غرض سے آتے ہیں اس لیے وعظ میں زیادہ صرف شوق اور خوف پیدا کرنے کے مضمون ہوں۔ یہ چار کام ان کے سپرد ہوں اور ان کی تنخواہ شہر والے خود اپنے ذمہ لیں اور یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ دیکھیے جس مقام پر حکیم نہیں ہوتا تو شہر والے چندہ کر کے کسی حکیم کو بلاتے ہیں اور تنخواہ دیتے ہیں تو کیا دل کے دے گا۔ اور اس کے بعد پل صراط پر کام آئے گا۔ اس کے بعد میزان کے تولنے پر کام آئے گا تو اگر اس کے کمال کی طلب نہ ہو تو ستم ہے۔ اس لیے یہ دیکھنا ضرور ہوا کہ اس کا کمال ہم کو حاصل ہے یا نہیں مثلاً یہی دیکھ لو کہ جو ایمان ہمارے پاس ہے آیا وہ اس قابل ہے کہ ان موقعوں میں ساتھ دے سکے یا نہیں۔ اگر ہمارا ایمان ایسا ہے اور ہم کو امید ہے کہ اس کی بدولت پل صراط وغیرہ پر اول ہی مرتبہ سرخرو ہو جائیں گے تو نہایت خوشی کی بات ہے اور اس کا اس قابل ہونا اس کے آثار سے معلوم ہو گا اور اگر ہمارا ایمان ایسا نہیں ہے تو کیا کسی کو دوزخ کے سانپ بچھو اور طرح طرح کی تکلیفوں کی برداشت ہے اگر کوئی اس کا دعویٰ کرے تو ذرا ہمت کر کے ہمارے سامنے ایک معمولی چراغ میں اپنی ایک انگلی جلا کر دکھا دے اور اگر اس کی تاب نہیں تو دوزخ کی آگ کی تاب کیونکر ہو گی اور جب اس کی تاب نہ ہو گی تو اس سے بچنے کا کیا سامان آپ نے جمع کیا اور کیا کیا تدبیریں اس کے لیے اختیار کیں۔ صاحبو! اگر کوئی شخص درد گردے میں گرفتار ہو جائے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور وہ اس کے زائل کرنے کی کتنی تدبیریں کرتا ہے۔ حالانکہ درد گردہ کا انجام اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ زندگانی کا خاتمہ کر دے۔ اس کے بعد پھر ہمیشہ ہمیشہ تک کے لیے اس سے نجات خود بخود ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس تکلیف کے کہ اگر یہ شروع ہو گئی تو یا تو بالکل ختم نہ ہو گی یا اگر

کرشمہ ایمان کی وجہ سے ختم بھی ہوئی تو خدا جانے کتنی مدت کے بعد جہاں کا ایک ایک دن ہزار برس کے برابر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: **وان یوما عند ربك کا لفوسنة مما تعبدون** ترجمہ: تحقیق ایک دن اللہ کے نزدیک مانند ایک ہزار برس کے ہے جن کو تم شمار کرتے ہو۔ تو چار برس بھی سزا ہوگی تو چار ہزار برس ہوئے۔

بعض لوگ آخرت کے عذاب کو سن کر کہا کرتے ہیں کہ اللہ غفور رحیم ہے:

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہیں وہ سب تکلیفوں سے نجات دے دیں گے لیکن اگر یہ ہوس کافی ہے تو تھوڑا سا سنکھیا بھی کھا لینا چاہیے کیونکہ خدا تعالیٰ غفور الرحیم ہونے کے منافی نہیں تو گناہ کر کے دوزخ میں جانا بھی اس کے غفورا الرحیم ہونے کے خلاف نہیں۔

دوزخ سے بچاؤ ایمان اور محبت کی تکمیل سے ہوتا ہے:

پس اس کا بچاؤ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ایمان اور محبت کو اس کے آثار کے ذریعے سے کامل کیا جائے جس کا حاصل یہ ہے کہ اطاعت پوری کی جائے اور گناہوں کو چھوڑا جائے۔ صاحبو! کس قدر افسوس ہے کہ دنیا کے مکان کی تکمیل کرنے میں تو اس قدر انہاک کہ اگر ایک پرنالہ بھی رہ جائے تو چین نہ آئے اور ایمان کے محل کی بنیاد تک کمزور ہونے کی بھی پرواہ تک نہیں اور کچھ خیال نہیں کیا جاتا ایسے ہی اگر کسی کپڑے کی آستین ناقص رہ جائیں تو اس کے لیے دس جگہ سے کپڑا تلاش کریں گے اور ایمان کی کسی بات میں کمی ہو جانے پر بھی غم نہیں غرض آپ صاحبوں کے نزدیک ہر چیز کی تکمیل کی ضرورت ہے مگر ایمان کی تکمیل گویا محض بے سود ہے حالانکہ اس کی تکمیل سب سے اول ضروری ہے۔

دونوں جہان کی راحت ایمان سے ہے:

اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ وہ سرمایہ ہے کہ دونوں جہان میں ساتھ رہنے کے علاوہ دو جہان کی راحت بھی اسی سے ہے آخرت کی راحت تو سب ہی جانتے ہیں کیونکہ ایمان ہی کی بدولت دوزخ سے نجات ہوگی۔ لیکن ایمان کے کامل ہونے سے دنیا کی بھی

راحت ہوتی ہے یہ بات شائد ابھی سمجھ میں نہ آئی ہو کیونکہ ظاہر میں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس قدر علم وعمل والے لوگ ہیں اور زیادہ پکے ایماندار کہلاتے ہیں دنیا کی مصیبت میں وہی گرفتار نظر آتے ہیں کوئی تو افلاس میں گرفتار ہے کسی پر مخالفین کا دھاوا ہے ایسے ہی بڑے بڑے متقی پرہیز گار فقر وفاقہ میں اکثر مبتلا رہتے ہیں تو ان کو کیا خاک راحت ہوئی۔

راحت کس چیز کا نام ہے:

لیکن آپ نے غور نہیں کیا کہ راحت کس چیز کا نام ہے اگر آپ دنیا کے حالات اور واقعات میں غور کریں تو اس کا پتہ چل جائے گا۔ اول میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ راحت کی حقیقت کیا ہے؟ آیا ظاہری ٹیپ ٹاپ چہل پہل یا کہ دل کا اطمینان سو ظاہر ہے کہ محض ٹیپ ٹاپ کا نام راحت نہیں کیونکہ اگر کسی شخص کے پاس دس گاؤں بھی ہوں بڑے عالی شان محل بھی رہنے کے لیے ہوں نوکر چاکر بھی ہوں لیکن سلطنت کی طرف سے اس کو یہ حکم ہو جائے کہ ایک ماہ کے بعد تم کو پھانسی دی جائے گی کیا کوئی عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ساز وسامان اس خبر کے سننے کے بعد کچھ بھی اس شخص کے لیے راحت کا سبب ہو سکتا ہے بلکہ اگر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت میں یہ سامان اور زیادہ کلفت اور حسرت کا سبب ہوگا تو معلوم ہوا کہ یہ سامان راحت کا سبب نہیں بلکہ کبھی کلفت کا سبب ہے اس کے مقابلے میں ایک مزدور کو لیجئے جو کہ دو آنے روز کماتا ہے لیکن اس پر نہ کوئی جرم کی دفعہ ہے نہ اس کو کوئی دوسرا غم ہے۔ اب اگر اس رئیس سے کہا جائے کہ تم اپنی ساری جائداد اس مزدور کو دیدو۔ اور دو آنے روز لینا گوارا کر لو تو تم کو پھانسی سے نجات ہو جائے گی تو کیا وہ اس پر راضی نہ ہوگا ضرور ہوگا اور اگر اس مزدور سے پوچھا جائے کہ تم کو اس شخص کی ساری جائداد دی جاتی ہے لیکن اس کے لینے کے بعد تم کو پھانسی دے دی جائے گی تو کیا یہ مزدور اس جائداد کو لینا گوارا کرے گا ہرگز نہیں پس مزدور کا انکار اور اس رئیس کی رضا مندی صاف بتلا رہی ہے کہ راحت اصل میں دل کے اطمینان کا نام ہے نہ کہ ظاہری چہل پہل اور بھڑک کا۔

بزرگوں کی مصیبتوں سے طبعی رنج ہوتا ہے پریشانی نہیں ہوتی:

اب اس کے بعد آپ دیکھ لیجئے کہ بزرگوں پر اگر ظاہری کوئی مصیبت بھی آتی ہے تو اگرچہ طبیعت پر کچھ اثر ہو لیکن پریشان نہیں ہوتی نہ وہ گھبراتے ہیں بلکہ اندر سے نہایت خوش ہوتے ہیں برخلاف اس کے کہ اگر دنیا دار پر ایک مصیبت بھی آ جائے تو کھانا پینا اور آرام سب چھوٹ جاتا ہے اور یہ صرف ایمان کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے تو وہ شبہ جاتا رہا کہ ایمان والے بھی تکلیف میں ہوتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ کامل ایمان دنیا میں بھی راحت کا سامان ہے تو پھر غضب ہے کہ ایسے نایاب اور عجیب وغریب سرمایہ کی تکمیل کی طرف سے اس طرح بے پرواہی کی جائے۔

خدا تعالیٰ کی محبت کی علامتیں اور ہر وقت یاد کرنے اور اطاعت کرنیکی رغبت دلانا

صاحبو! آپ کو اس کی تکمیل کی طرف توجہ کرنی چاہیے اس طرح کہ اس کے آثار یعنی ہر وقت خدا کی یاد اور اس کی اطاعت اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن یاد اس کو نہیں کہتے کہ محض زبان سے رٹ لیا اور دل میں وہی دنیا کی خرافات بھری ہیں ایسی یاد سے کچھ فائدہ نہیں یہ یاد تو ایسی ہے جیسے کوئی طوطے کو نبی جی بھیجو یاد کرائے کہ وہ ہر وقت اسی کو رٹا کرے مگر جب بلی مکر دبائے گی تو سوائے ٹاں ٹاں کے کچھ بھی یاد نہ آئے گا یہ ذکر بھی ایسا ہی ہے ذکر تو وہ ہے کہ دل اور زبان سب اسی میں محو ہو جائیں۔ کم سے کم ایسی حالت تو ہو جو ایک مرد اور بازاری عورت کے ساتھ ہوتی ہے۔ گو یہ حالت رفتہ رفتہ حاصل ہو مگر اس کا قصد تو رہنا چاہیے۔ پس ایک اثر ایمان اور محبت کے کمال کا یہ ہے دوسرا اثر اس کا اطاعت اور بندگی کی آسانی ہے۔ سو اس کو بھی دیکھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ و رسول ﷺ کا حکم سن کر ہماری کیا حالت ہوتی ہے۔ کیا اکثر لوگوں کو اس کی فرمانبرداری گراں نہیں ہوتی۔ خدا کی قسم بعض کی تو یہ حالت ہوتی ہے جیسے کسی نے گولی مار دی ہو اس سے زیادہ اس کا ثبوت کیا ہوگا۔

ہر عمل اور ہر خلق میں ہم نے شریعت کے خلاف نیا طریقہ اختیار کیا ہے:

کہ ہر عمل اور ہر خلق میں ہم نے شریعت کے خلاف ایک نرالا طریقہ اختیار کر رکھا

ہے گویا اسلامی شریعت کے مقابلے میں ایک دوسری شریعت بنائی ہے اور اس کو اپنے لیے فخر اور ہنر سمجھا جاتا ہے اس کے متعلق اگر ایک ایک بات کو بیان کیا جائے تو بہت سا وقت صرف ہو لیکن میں مختصر طور پر بیان کرتا ہوں۔

شادی اور غمی کی رسموں کو چھوڑنا ضروری ہے:

مثلاً شادی اور غمی کی رسمیں ہیں کیا آج کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اس میں شریعت کے خلاف نہیں ہیں اور اگر واقعی کسی کو معلوم نہیں ت اس کو چاہیے کہ اس قسم کی کتابیں دیکھے جو اس کے بیان کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں یا جو لوگ اس مجمع میں موجود ہیں وہ اسی وقت کچھ سن لیں۔

سنئے! شادی غمی کی رسمیں دو۲ قسم کی ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جن کا قبیح اور خراب ہونا نہایت ہی ظاہر ہے اور شریفوں اور دینداروں نے ان کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اب رذیل اور فاسق اس میں گرفتار ہیں۔ جیسے ناچ گانا وغیرہ اور بعض وہ رسمیں ہیں کہ ان کی قباحت اتنی ظاہر نہیں ان میں عام اور خاص لوگ قریب قریب سب گرفتار ہیں اور ان کو بالکل جائز سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات تقویٰ بگھارنے کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم نے شادی میں کونسی رسم کی ہے۔ نہ ہمارے ہاں ناچ ہوا اور نہ باجا سنایا گیا۔ پھر ہم نے کیا گناہ کیا۔ سو میں بتلاتا ہوں کہ آپ نے کیا گناہ کیا ہے لیکن آپ پہلے مجھے یہ بتلا دیجیے کہ گناہ کہتے کس کو ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو کام شریعت میں منع ہو وہ گناہ کہلاتا ہے۔ چاہے وہ ناچ ہو یا اور دوسرا کام ہو کیونکہ ناچ بھی تو اسی لیے حرام ہوا کہ شریعت نے اس کو حرام اور جرم قرار دیا ہے یا نہیں۔ اس پر مفصل گفتگو تو رسالہ اصلاح الرسوم میں ملے گی۔

تمام رسموں کے ناجائز اور بڑی ہونے کی مختصر دلیل:

میں مختصر طور پر اس وقت ضرورت کے موافق بیان کیے دیتا ہوں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اور حضور ﷺ نے حدیث شریف میں تکبر کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ

(ترجمہ) تحقیق اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتے ہر اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو......
حدیث شیف میں ہے: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ (ترجمہ) نہیں داخل ہوگا جنت میں وہ شخص کہ جس کے دل میں رائی برابر تکبر ہو اور دوسری حدیث میں ہے: مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (ترجمہ) جو شخص کپڑا پہنے گا شہرت اور فخر حاصل کرنے کے لیے تو قیامت میں اس کو پہنائیں گے اللہ تعالیٰ ذلت اور خواری کا کپڑا۔ اس آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ فخر کے لیے کوئی کام کرنا حرام ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے: مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنْ رَآارای اللّٰه بِهٖ (ترجمہ) جو شخص شہرت کے لیے کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کو سزا دیں گے اس سے معلوم ہوا کہ دکھلائے اور شہرت کا کام کرنا حرام ہے۔ اب غور کر کے دیکھیے کہ شادیوں میں جو کام ہم کرتے ہیں اور جن کے لیے ہم نے نہایت خوبصورت الفاظ تراش رکھے ہیں کہ بھات دیا ہے اور بھائیوں کو کھلایا ہے اور بیٹی کو دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں ہماری نیت کیا ہوتی ہے صاحبو! محض الفاظ کے خوبصورت ہونے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل سکتی سب سے بڑی چیز نیت ہے۔ پس نیت کو دیکھنا چاہیے کیا ہم لوگ یہ تمام رسمیں محض رسم و نمود کے لیے نہیں کرتے۔ بہنوں کو بڑا بڑا بھات دیا جاتا ہے اور اس کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے۔ کیوں صاحبو! آج سے آٹھ دن پہلے بھی تو بہن آپ ہی کی بہت تھی۔ پھر کیا آپ نے کبھی اس کی خبر لی ہے۔ کبھی بہن کے فقر و فاقہ پر آپ کو رحم آیا ہے۔ دوسرے اگر یہ صلہ رحمی ہے تمام برادری کو دکھلانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا کبھی اپنی لڑکی کے لیے کپڑا خریدتے وقت یا اس کو کھلاتے پلاتے وقت بھی آپ نے برادری کو جمع کیا ہے۔ اگر نہیں کیا تو بھات اور جہیز دیتے وقت برادری کو کیوں جمع کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ محض فخر اور نمود کے لیے ایسا کیا جاتا ہے بس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ سب رسمیں محض شہرت کے لیے ہیں اور شہرت کے لیے جو کام کیا جاتا ہے وہ حدیث کو رو سے حرام ہوتا ہے تو یہ سب رسمیں بھی حرام ہی ہوئیں۔ خاص کر ایک رسم تو ایسی گندی ہے کہ وہ توبہ سے بھی معاف ہونا مشکل ہے۔ کیونکہ اس کی توبہ بھی مشکل ہے اور لطف یہ

کہ اس کو ظاہر میں عبادت سمجھا جاتا ہے اور اس پر فخر سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ رسم نیوتہ لینا دینا ہے۔ لوگ اس کو قرض حسنہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی بھائی کی مدد کرتا ہے اور مدد کرنا عبادت ہے تو گویا نیوتہ دینا عبادت ہوا حالانکہ نیوتہ دینا اس قدر بری رسم ہے کہ سب رسموں سے گندی ہے۔ اس کو شاید آپ نے آج تک نہ سنا ہوگا۔ مگر میں اس وقت انشاء اللہ اس کی حقیقت بیان کروں گا۔ اور وہ کوئی نئی اور عجیب نہ ہوگی بلکہ پرانی بات ہے لیکن توجہ نہ ہونے کے سبب اس میں غلطی کر رکھی ہے۔ جن قاعدوں سے اس کو ثابت کیا جائے گا وہ سب کے نزدیک مسلم اور مانے ہوئے ہیں۔ صرف نتیجے میں آ کر غلطی ہو رہی ہے۔ جیسے کسی شخص نے تبت کے ہجے کیے تھے ت ب زبر تب ب ت زیر بت اور رواں پڑھا تھا بطخ تو آپ نے بھی ہجے تو صحیح کیے ہیں۔ صرف رواں میں غلطی کر رکھی ہے۔ جس میں بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ بات تو سب کو مسلم ہے اور کسی شخص کو ان سے انکار نہیں کہ نیوتہ ایک قرض ہے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض کا ادا کرنا واجب ہوتا ہے۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض خواہ کی موت کے بعد اسی کا کل ترکہ اس کے وارثوں کی ملکیت ہوتا ہے چاہے وہ ترکہ اس وقت موجود ہو یا کسی کے ذمہ قرض ہو مثلاً اگر کوئی شخص مرے اور سو روپیہ اس کے گھر میں موجود ہوں اور سو ۱۰۰ روپیہ ادھار میں تو اس کا کل ترکہ دوسو ۲۰۰ روپیہ سمجھا جائے گا اور یہ دوسو ملا کر سب وارثوں کو تقسیم کیے جائیں گے۔ ان تینوں مسئلوں کے معلوم ہونے کے بعد دیکھئے کہ نیوتہ میں کیا ہوتا ہے سو نیوتہ میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے پچیس جگہ دو دو روپے دیئے اور اس طرح پچاس روپے اس کے قرض میں پھیل گئے اور اس کے بعد یہ شخص مرا اور دو بیٹے اس نے وارث چھوڑے جن میں ایک بالغ اور دوسرا نابالغ تو موجودہ ترکہ میں سے تو ان دونوں نے نصفا نصف لے لیا وہ بھی جب کہ بڑا بھائی ایماندار ہو لیکن جو نیوتے میں قرض ہے اس کو کوئی بھی تقسیم نہیں کرتا۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر چند روز کے بعد اس بالغ لڑکے کی کسی اولاد کی شادی ہونے لگے تو لوگ نیوتہ اسی کو لا کر دیں گے اور یہ بلا تامل نیوتہ خود ہی خرچ کرے گا اور اپنے کو ہی مالک سمجھے گا حالانکہ ان پچاس میں سے پچیس روپے اس کا حق ہے اور پچیس روپے چھوٹے نابالغ بھائی کا حق ہے اسی طرح عام

طور سے تمام نیوتوں میں یہی کیا جاتا ہے۔ کیا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ کسی نیوتہ کو فرائض کی رو سے تقسیم کیا گیا ہو۔ میرے خیال میں ایک مثال بھی اس کی نہیں بتلائی جا سکتی تو اس میں سے ایک گناہ تو بالغ بھائی کو ہوا کہ اس نے یتیم کا مال کھایا۔ قرآن شریف میں ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا تحقیق جو لوگ ناحق کھاتے ہیں یتیموں کے مالوں کو تو سوائے آگ کے اور کچھ اپنے پیٹوں میں نہیں کھاتے اور عنقریب خوب جلیں گے آگ میں اور ایک گناہ نیوتہ واپس کرنے والوں پر ہوا کہ انہوں نے شرکت کا مال ایک شریک کو دے دیا اور لطف یہ کہ نیوتہ دینے والے سمجھتے ہیں کہ ہم قرض سے سبکدوش ہو گئے۔ حالانکہ پچیس روپیہ یتیم کے ان کے ذمہ باقی ہیں۔ اور درمختار میں روایت لکھی ہے کہ اگر کسی کے تین پیسے قرض کے رہ جائیں گے تو قیامت میں اس کی سات سو نمازیں قرض خواہ کو دلائی جائیں گی۔ اور یہ اس وقت ہے کہ جب مالک کے بیٹے کو ہی وصول ہو گیا اور اگر بلا وصول دو تین پشتیں گزر گئیں اور ایک کے بعد دوسرا وارث ہوتا گیا اور پھر خدا جانے دور تک کس کس کا حق متعلق ہو گیا جس کا پہنچانا سخت ہی دشوار ہے اور اگر کوئی کہے کہ یہ تو باپ دادا کے وقت سے چلا آتا ہے تو میں کہوں گا یہ عذر ہرگز سننے کے قابل نہیں کیونکہ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو آج ہم لوگ مسلمان نہ ہوتے آخر ہم کو اسلام تو اسی لیے نصیب ہوا کہ ہمارے باپ دادا نے اپنے باپ دادا کے رسم ورواج کو چھوڑ دیا۔ پس یہ عذر نہایت بیہودہ ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ پچھلے قرض کو تحقیق کر کے ادا کیا جائے اور آئندہ کو یہ رسم بالکل چھوڑی جائے۔ کوئی عربی خواں یا انگریزی داں اس کے سوا کوئی دوسرا علاج مجھے بتلائیں۔ غرض نیوتہ کی رسم نہایت گندی اور خراب ہے۔ اگرچہ ظاہر میں یہ ثواب کا کام نظر آتا ہے اور جب یہ اس قدر خراب رسم ہے جس میں ایک طرح غریب کی مدد کرنے کی مصلحت بھی ہے تو دوسری رسمیں تو جس میں کوئی مصلحت بھی نہیں بالکل ہی چھوڑنے کے قابل ہوں گی اسی طرح ہم نے ہر ہر قدم پر ایک ایک رسم بنا رکھی ہے کہ جب تک وہ نہ ہو تو گویا شادی ہی نہیں ہو سکتی اور ان رسموں میں جو دنیا کی مضرتیں ہیں ان کا بیان کرنا گو میرا منصب نہیں

ہے لیکن ایک مختصر سی بات جس میں ایک طرح غریب کی مصلحت کی بھی رعایت ہے ان کو ہی بیان کیے دیتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں پر جس قدر تباہی آئی ہے زیادہ تر انہیں رسموں کی بدولت آئی ہے کیونکہ آمدنی ہر مسلمان کی جتنی ہے سب پر ظاہر ہے اور خرچ ان رسموں کی بدولت جیسا کچھ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے انجام ان سب کا سوا اس کے اور کیا ہوگا کہ آج زمین رہن ہو رہی ہے اور کل مکان پر قرقی ہے۔ پرسوں زیور اور گھر کا سامان نیلا ہو رہا ہے چوتھا دن نہیں آیا کہ میاں رسموں کے پابند ایک ناک اور دو کان کے ساتھ رہ گئے بعض لوگ اس کا یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم میں گنجائش ہے اور ہم کو قرض لینا نہیں نہیں پڑتا سو اول تو یہ جواب ماننے کے قابل نہیں کیونکہ رحیثیت کا آدمی اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا چاہتا ہے اور اس میں قرض لینا لازمی ہے۔ دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ ان کو قرض نہ لینا پڑے گا تو کم از کم ان کو اپنے غریب بھائیوں کا خیال تو ضرور کرنا ہی چاہئے کہ ہم کریں گے تو حرص کے مارے وہ بھی کریں گے۔ اور تباہ ہوں گے تو اس سے ہم بھی نہ کریں۔ تیسرے جب یہ گناہ ہے اس لیے بھی اس کو چھوڑ دینا چاہیے گو دنیا کا ضرر بھی نہ ہو۔ اسی طرح غمی کی رسمیں ہیں کہ ان میں بھی جو کچھ کیا جاتا ہے وہ محض شہرت کے لیے کیا جاتا ہے نہ کہ خدا کے لئے۔ کیونکہ اگر خدا کے لیے کیا جاتا تو پوشیدہ طور پر کرنا بھی گوارا کیا جاتا اس کے دکھلانے اور سب پر ظاہر کرنے کی کوشش کیوں ہوتی۔ معلوم ہوا محض شہرت ہی مقصود ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اگر کسی رسموں کے پابند سے یہ کہا جائے اس ڈھونک کے تم پچاس روپے دس مسکینوں کو دے دو اور کسی کو خبر نہ کرو تو ہرگز راضی نہ ہوگا بلکہ یوں سمجھے گا کہ اس طرح کرنے سے یہ پچاس روپے بے کار ہی جائیں گے اور کہے گا اچھی مولوی صاحب نے رائے دی کہ پچاس روپے بھی خرچ کروں اور کسی کو خبر بھی نہ ہو۔

صاحبو! یہ تو آپ لوگوں کی حالتیں ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ مولوی ثواب بخشنے سے روکتے ہیں یہ تو بتلاؤ کہ خود آپ ہی کو کب ثواب ہوا تھا کہ دوسرے کو بخشتے میں سچ کہتا ہوں کہ مولوی تو آپ کو ثواب ملنے اور ثواب بخشنے کی ترکیب بتلاتے ہیں۔ ثواب سے منع نہیں کرتے۔

ثواب بخشنے کا طریقہ:

اور وہ ثواب بخشنے کی ترکیب یہ ہے کہ داہنے ہاتھ دو اور بائیں کہ خبر نہ ہو۔ دوسرے اپنے خاص حصے سے دو۔ مردے کے وہ کپڑے جن میں سب وارثوں بالغ نابالغ کا حق متعلق ہوگیا وہ نہ دے دو اور اگر دو تو ان کو تقسیم کرلو اور جو تمہارے حصے میں آئے وہ دو۔ شرکت کے کپڑے ہرگز نہ دو۔ تو ثواب کا طریقہ یہ ہے۔ نہ وہ آپ نے تراش رکھا ہے لوگ چاہتے ہیں کہ نام بھی ہو اور ثواب بھی ہاتھ سے نہ جائے سود کھلائے میں ثواب کہاں اور الٹا عذاب ہے۔ شیخ رحمہ اللہ اس کی بابت فرماتے ہیں کہ جو نماز لوگوں کے دکھلانے کے لیے دیر تک پڑھی جائے وہ دوزخ کے دروازے کی کنجی ہے۔ یہ نمونہ کے طور پر میں نے بیان کر دیا ہے۔ دوسری رسموں کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہئے یہ تو خدا اور رسول ﷺ کی زبانی بیان کی ہوئی دلیلیں تھیں

شادی اور غمی کی رسموں کے بے اصل ہونے کو حضور ﷺ کے فعل سے ثابت کرنا

اب رسول مقبول ﷺ کا فعل بھی سنو کہ حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی کر کے دکھلا دیا ہے کہ شادی اس طرح کرنی چاہیے ایسے ہی اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی غمی کر کے بتلا دیا ہے کہ غمی یوں ہونی چاہیے پھر جب ہم نے اس کے موافق نہ کیا اور ہر کام میں اپنی ٹانگ اڑالی اور اس کا خلاف گراں ہوا تو اطاعت میں آسانی کہاں ہوئی۔ پھر کامل محبت کہاں ہوئی اس محبت کا اثر تو یہ ہے کہ اطاعت میں سہولت پیدا ہو اور جب کہ ہم نے بالکل شریعت کے خلاف کیا کہ وضع وہ اختیار کی کہ جو شریعت کے بالکل خلاف طرز زندگی وہ پسند ہوا کہ جس کو شریعت سے کچھ بھی لگاؤ نہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم کو کامل محبت خدا اور رسول ﷺ سے ہے۔

کامل محبت کے دو اثر ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ کامل محبت کے دو اثر ہیں ایک ہر وقت کی یاد اور دوسرے اطاعت میں سہولت اور یہی علامت کامل ایمان کی ہے۔ اگر ہم میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی

جاتیں تو ہم کو اپنی حالت پر افسوس کرنا چاہیے۔ صاحبو! یہ تو بفضلہٖ تعالیٰ بیلا غبار ثابت ہوگیا کہ خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ بغیر ہر وقت کی یاد اور اطاعت میں سہولت کے غلط ہے۔

خدا تعالیٰ ہی کامل محبت کے مستحق ہیں:

اب یہ بات باقی رہی کہ آیا خدا تعالیٰ اس کامل محبت کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ سو اس کو بھی سمجھ لو کہ حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی محبت کے مستحق ہیں اور یہ ایسی ظاہر بات ہے کہ شریعت کے علاوہ عقل بھی اس کا فتویٰ دیتی ہے۔

محبت کے اسباب:

اس لیے کہ محبت کے تین سبب ہوا کرتے ہیں۔ یا تو یہ کہ کوئی شخص ہم پر احسان کرتا ہو اور اس کے احسان کو وجہ سے اس سے محبت ہو یا یہ کہ وہ خود حسین وخوبصورت ہو اور اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کی طرف دل کا میلان ہو یا یہ کہ اس میں کوئی کمال پایا جاتا ہو اور وکمال محبت کا سبب ہو۔ جیسے حاتم طائی سے اس کی سخاوت کے سبب اور رستم سے اس کی قوت کے سبب یا کسی عالم فاضل سے اس کے علم وفضل کے سبب محبت ہوتی ہے۔ اب غور کیجیے کہ ان تینوں محبت کی وجھوں سے سے کوئی وجہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ میں نہ پائی جاتی ہو۔ انعام کرنے والے وہ اتنے بڑے ہیں کہ کوئی ان کی برابر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ سب چیزیں اس کی پیدا کی ہوئیں اور اس کی ملک اور اس کی محتاج ہیں۔ جمال ان کا اس حد تک ہے کہ کسی کو حاصل ہونا ممکن ہی نہیں۔ بڑے بڑے حسین وجمیل ان ہی کے حسن و جمال کے فیض سے حسین وجمیل بنے بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی با کمال تنے بڑے ہیں کہ علم کامل ان ہی کو ہے دوسرے ہر کامل صفت کامل طور پر ان ہی میں پائی جاتی ہے تو یہ محبت کے تینوں سبب ہر طرح عقل اور شریعت کے نزدیک ان ہی میں موجود ہیں۔ پس وہی محبت کے مستحق ہیں۔

محبت کے حاصل کرنے کی ترغیب دینا:

بس اب اپنے دلوں کو ٹٹولو کہ خدا تعالیٰ سے محبت کامل ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو

اس کے حاصل کرنے کی تدبیر کرو اور تدبیر بھی میں بتلاتا ہوں۔ اور اسی پر انشاء اللہ بیان کو ختم کردوں گا۔ لیکن یہ نہ سمجھ لیجو کہ محبت فعل غیر اختیاری ہے اس کا پیدا کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ پھر اس کی تدبیر کیا ہو۔ کیونکہ یہ گمان غلط ہے۔ محبت گو خود غیر اختیاری ہو۔ مگر اس کا طریقہ اختیار ہے جس پر محبت مرضوں کا زائل کرنا بدن کے مرضوں کے برابر بھی ضروری نہیں۔ اس طریقہ کے موافق تو مردوں کو عمل کرنا چاہیے۔ رہیں عورتیں ان کے لیے آسان یہ ہے کہ جو عورتیں پڑھی لکھی ہیں وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر بہشتی زیور وغیرہ پڑھا کریں اور جو پڑھی ہوئی نہیں ہیں وہ اپنے لڑکوں، بچوں سے کسی وقت بہشتی زیور کے مسئلے سن لیا کریں اور یہ بھی نہ ہو تو لڑکیوں کو پڑھوا کر تیار کرلیں اور ان سے اسی کام کو جاری کریں یہ ہے مختصر کام کرنے کا طریقہ اس سے انشاء اللہ ہر شخص کو دین کا علم حاصل ہو جائے گا اور محبت بھی بڑھے گی اور دین کی تکمیل بھی ہوگی۔ خلاصہ سارے بیان کا یہ ہوا کہ ایمان والوں کے لیے کامل محبت لازم ہے۔ اور کامل محبت کے لیے اطاعت کرنے میں سہولت لازم اور اس کی مضبوطی کے لیے کچھ وقت اللہ کے ذکر کے لیے مقرر کرنا مناسب اور پھر اطاعت کے لیے ضروری ہے واقفیت اور واقفیت حاصل کرنے کے طریقے یہ ہیں تو ان طریقوں پر عمل کیا جائے تاکہ علم حاصل ہو اور اس سے طاعت میں سہولت ہو اور اس سے محبت بڑھے اور ایمان کی تکمیل ہو۔ اور یہ تدبیریں اختیار کرے۔

دعا بھی محبت کے حاصل کرنے کے طریقے میں بڑی چیز ہے:

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دعا کی جائے کیونکہ ہر کام اس کے حکم پر موقوف ہیں۔ اس کا حکم نہ ہو تو یہ تدبیریں سب بے سود ہیں۔ لیکن نری دعا پر بھی نہ رہنا چاہیے۔ جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں سے دعا کی التجاء کرتے ہیں لیکن خود کچھ نہیں کرتے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ایک تاجر نے بمبئی میں کہا کہ حضرت دعا کیجیے کہ خدا تعالیٰ مجھے حج نصیب کریں۔ آپ نے فرمایا کہ اس شرط پر دعا کروں گا کہ جس روز جہاز چلے اس روز کامل اختیار تم مجھے اپنے اوپر دے دینا۔ کہنے لگے کہ حضرت اس میں کیا مصلحت ہے اس پر فرمایا کہ مصلحت یہ ہے کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر

جہاز میں بٹھلا دوں گا اور پھر خدا تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ تمہیں صحیح سالم پہنچا کر حج ادا کرا دے۔ ورنہ میری خالی دعا کرنے سے کیا ہوگا۔ جب کہ تم بمبئی سے باہر نکلنے کا قصد ہی نہ کرو۔ غرض محض دعا کرانے سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ اول کوشش کی جائے اور اس کے ساتھ خدا تعالیٰ سے دعا کی جائے البتہ جو کام ایسے ہیں کہ ان میں تدبیر کو بالکل دخل نہیں وہاں نری دعا ہی کافی ہے۔ جیسے بارش کا ہونا کہ وہ محض خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ہم اس کے لیے کوئی تدبیر کر ہی نہیں سکتے لیکن جو کام ہمارے اختیار میں ہیں جیسے خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنا ان میں نہ تو نری تدبیر کو کافی سمجھا جائے اس لیے وہ بسا اوقات اترانے اور خود پسندی کا سبب ہو جاتی ہے اور نہ نری دعا پر بس کیا جائے۔ اس لیے کہ وہ کچھ مفید نہیں۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہماری تدبیروں میں برکت عطا فرمائیں اور ہم کو رکاوٹوں سے محفوظ رکھیں اور اپنی طاعت کی توفیق عطا فرمائیں۔

امین یارب العلمین

✿✿✿

(۳۶) دنیا کی پونجی

منتخب از متاع الدنیا وعظ نہم جلد پنجم دعوات عبدیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خطبہ ماثورہ:

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَالَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ○

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو (یعنی اٹھتے اور چلتے نہیں) کیا تم نے آخرت کے عوض دنیا کی زندگی پر قناعت کر لی۔ سو دنیوی زندگی کا تمتع آخرت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں بہت قلیل ہے۔''

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے دین کے ایک خاص کام میں سستی کرنے پر مسلمانوں کو ملامت فرمائی ہے۔ جیسا ترجمہ سے معلوم ہوا کہ وہ جہاد ہے مگر اس وقت اس خاص کام ہی کا بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس ملامت کی جو اصل علت اور وجہ ہے۔ یعنی دنیا کی زندگی پر قناعت کر لینا جس کا ذکر ارضیتم سے شروع ہوا ہے۔ اس وقت اس کا بیان کرنا مقصود ہے تاکہ یہ مضمون عام ہو جائے اور پھر عمل کی کوتاہی اور سستی کو شامل ہو جائے۔ فرماتے ہیں تم جو دین کے کام میں سستی کرتے ہو۔ کیا حیات دنیا پر راضی ہو گئے ہو اور یہ سستی جو تم میں آ گئی ہے تو کیا آخرت کی ضرورت اور خیال تم کو نہیں رہا۔ پھر فرماتے ہیں

کہ آخرت کے مقابلہ میں حیات دنیا کا تمتع تو بالکل ہی قلیل ہے کچھ بھی نہیں اور باوجود اس کے تم پھر دنیا پر راضی ہو۔ یعنی اس سے اتنی محبت ہے کہ اس کو اپنا قرار گاہ سمجھتے ہو۔ اور اسی لیے اس دینی کام سے گھبراتے ہو کے کہیں دنیوی زندگی اس کے سبب ہاتھ سے نہ جاتی رہے۔ سو یہ تو ایسی چیز نہیں کہ آدمی اس کی حیات پر راضی ہو جائے۔ یہ ہے مضمون اس علت کا اور اسی کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے۔ اس کا حاصل ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ خدا تعالیٰ ان لوگوں پر ملامت کر رہے ہیں جنہوں نے دنیا پر قناعت کر لی ہے اور آخرت کو بھول گئے ہیں اور دنیا کو محبوب اور قرار گاہ سمجھتے ہیں۔ اور آخرت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ مسلمان ایسا تو کوئی نہیں ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہو کہ آخرت کوئی چیز نہیں یا قابل توجہ نہیں۔

آج کل مسلمانوں کا برتاؤ ان کو آخرت کا منکر بتا رہا ہے:

مگر حالت ضرور ایسی ہے کہ ان کے برتاؤ اور معاملات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی آخرت کا منکر ہو کیونکہ جتنی محنت اور رغبت دنیا کی ہے آخرت کی وہ محبت اور اس کا اتنا شوق نہیں ہے۔ دلو کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ ہم یوں رہیں گے یوں بسیں گے بہو آئے گی اولاد ہو گی۔ جائداد ہو گی یوں ملازم ہوں تحصیلدار ہوں گے۔ ڈپٹی کلکٹر ہوں گے۔ مکان بنائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اب انصاف سے دیکھ لو کہ کیا آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوتی ہیں کہ مر جائیں گے تو خدا تعالیٰ کے سامنے جائیں گے یوں جنت ہو گی۔ اور اس میں باغات اور مکانات ہوں گے ایسے محل ہوں گے یوں حوریں ہوں گی غالبا کبھی بھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں بلکہ امنگیں تو درکنار ان باتوں کا خیال بھی بہت ہی کم آتا ہے۔ تو دنیا کی جس قدر محبت ہے نہ آخرت کی وہ محبت نہ وہاں جانے کا اتنا شوق اور اگر محبت ہوتی تو جیسے یہاں کی زندگی کے متعلق دل میں خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہاں کی زندگی کے متعلق بھی تو ہوتے اور جیسے دنیا کی کاروبار میں مشغول رہتے ہیں اور یہاں کی خوشیوں میں کھپے رہتے

ہیں ایسا ہی آخرت کے کاموں کے متعلق جو کچھ شوق ہوتا۔ سو بعض لوگ تو ایسے ہیں کہ وہ دنیا کی خوشیاں مناتے ہیں اور آخرت کی امنگ ان کو کبھی خواب میں بھی نظر نہیں آتی۔ اور بعض ایسے ہیں کہ جن کے پاس دنیا میں خوشی کا سامان نہیں اس لیے وہ ہمیشہ مضمحل اور غمزدہ رہتے ہیں۔ اور ان کو کبھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ شاید میرے جواب میں یوں کہیں کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیاں نہیں مناتے بلکہ ہم تو یہ سوچا کرتے ہیں۔ اور ہمیں تو یہ غم رہتا ہے کہ کوئی والی نہیں وارث نہیں کچھ ایسا روپیہ پیسا نہیں۔ پھر دنیا کی زندگی آرام سے کیسے کٹے گی تو میں جواب میں کہوں گا کہ مجھ کو ان لوگوں کی یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کی زندگی کو بھی سوچا اور وہاں کی مصیبت کا بھی خیال کیا کرو کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی' دوزخ میں جانا پڑا تو وہ مصیبت کیونکر سہی جائے گی۔ پھر جیسے یہاں کی تکلیف کو سوچ کر تدبیر سوچتے ہو کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ مصیبت کو بھی سوچا ہے کہ اس تدبیر سے وہ مصیبت دور ہو۔ حالانکہ دنیا کی مصیبتیں تو بعضی ایسی بھی ہیں کہ ان کی کوئی ایسی تدبیر ہی نہیں ہے اور اس لیے ان کو سوچنا عبث اور بے کار ہے۔ مگر پھر سوچتے ہے اور آخرت کی تو کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں ہے جو لا علاج ہو۔ بلکہ اس کو ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے۔ مگر پھر بھی اس کا نہ ذکر نہ فکر۔

آخرت خالی ذکر سے درست نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے تدبیر کرنا چاہیے:

اور اگر بعض ایسے لوگ ہوئے بھی کہ وہ کبھی کبھی اتفاقاً آخرت کا ذکر کر لیتے ہوں اور اس لیے سمجھتے ہو کہ ہم کو دین اور آخرت کی فکر ہے لیکن محض اس سے کیا ہوتا ہے دیکھو اگر کسی کے پاس آٹا بھی ہو اور تو ابھی ہو اور لکڑیاں بھی اور پکائے نہیں مگر ان سب سامانوں کا ذکر کرتا رہے اور سوچتا رہے تو اس ذکر سے اور اس سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ تدبیر تو یہ ہے کہ ہمت کر کے اٹھے اور پکانا شروع کر دے اور جب بھوک لگے کھالے تو آخرت کی فکر اور تدبیر یہ ہے کہ یوں سوچے کہ میں مروں گا' خدا کا سامنا ہوگا' یوں عذاب ہوگا۔ اور یہ سوچ کر عذاب کے کاموں سے بچے اور نجات حاصل کرنے کے لیے تدابیر

شروع کردے کی شریعت نے جن کاموں سے منع کیا ہے ان سے بچے اور جن کا حکم کیا ہے ان کو کرے۔ یہ ہے مفید طریقہ نہ کہ گاہ گاہ آخرت کا صرف ذکر کرلیا اور بڑی ترقی کی تو کسی مولوی صاحب کے پاس جا کر جھگڑے کے دو چار مسئلے پوچھ لیے اور بس۔ باقی عمل کے نام کا صفر شیطان نے بہت لوگوں کو بہکا رکھا ہے کہ کبھی کبھی ان کو اس قسم کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ دل میں ڈال دیتا ہے کہ تم کو دین کی بہت فکر ہے۔ حالانکہ وہ لوگ عمل سے کورے ہیں۔ صاحبو! اگر تمہارے پاس آخرت کا سامان نہ ہوتا تو اتنا ہی غنیمت تھا۔ لیکن جب خدا تعالیٰ نے ارادہ دیا' ہمت دی' اچھے برے کی پہچان دی پھر کیا وجہ کہ دنیا کے معاملات میں تو نری فکر پر بس نہیں کیا جاتا اور دین کے کام میں خالی فکر کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب خالی باتیں ہی باتیں ہیں واقع میں آخرت کا خیال ہی نہیں۔

دنیا کی خوشی اور رنج قابل التفات نہیں اور آخرت کی دونوں چیزیں قابل اہتمام ہیں:

بہر حال اگر کوئی دنیا کی خوشیاں مناتا ہے تو یہ شکایت ہے کہ آخرت کی خوشیاں کیوں نہیں منائی جاتیں اور اگر دنیا کے غم میں رہتا ہے تو اس کی یہ شکایت ہے کہ آخرت کا غم کیوں نہیں کیا جاتا۔ اور اگر کوئی خوشی منانے والا کہے کہ آخرت کی خوشی کہاں سے منائیں اس کی ہمیں امید ہی کہاں ہے ہم تو گنہگار ہیں اور دنیا کی خوشی تو ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کو کیسے نہ منائیں' تو یہ شیطان کا دھوکہ ہے اس میں دو دعویٰ ہیں اور دونوں غلط ہیں اول بھی غلط کہ آخرت کی خوشی کہاں ہے دوسرا بھی غلط کہ دنیا کی خوشی ہمارے سامنے موجود ہے پہلا تو اس لیے غلط ہے کہ آخرت کی خوشی کا حاصل ہونا اور خدائی وعدوں کا پورا ہونا بالکل تمہارے اختیار میں ہے

دنیا کی خوشی اختیاری نہیں آخرت کی اختیاری ہے:

دنیا کی خوشی تو کبھی کبھی حاصل بھی نہیں ہوتی کہ ساری عمر چاہو اور پوری نہ ہو اور

آخرت کی کوئی راحت بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ اختیار میں نہ ہو۔ خدا کی یہ رحمت ہے کہ آخرت کی کتنی ہی بڑی سے بڑی تمنا ہو علاوہ ان باتوں کے جن کی حاصل نہ ہونے کی قرآن وحدیث میں خبر دے دی ہے۔ جیسے نبوت کا مرتبہ۔ مگر وہ اس کے اسباب و ذرائع اختیار کرنے سے ہر شخص کے لیے ضرور پوری ہوتی ہے۔ مثلاً اگر چھوٹے درجہ کا آدمی جیسے عاصی گنہگار بڑے درجہ میں جانا چاہے۔ مثلاً حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے درجے میں تو جاسکتا ہے اس طرح سے کہ اپنے نیک اعمال میں ترقی کرے تو بس وہاں تو خوشی ہی خوشی ہے جو بالکل اپنے اختیار میں ہے تو اس کی فکر کرو اور اس کی امنگیں پیدا رو۔ اور اس کی تدبیر کرو کہ مصیبت اور گناہ کو چھوڑ دو نمازیں پڑھیں، جواب تک چھوٹ گئی ہیں ان کی قضا کرو، زکوۃ دو، روزے رکھو، حج کر، اس کے بعد سب خوشی تمہارے ہی لیے ہے۔ اس کے بعد حق ہے کہ خوشی مناؤ۔ اور دوسری بات کہ دنیا کی خوشی ہمارے سامنے موجود ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یوں بیٹا ہوگا، یوں چین کریں گے تو یہ تمہارے قبضہ میں کہاں ہے۔ ہزاروں آدمی ایسے ہیں کہ وہ سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے۔ پھر اگر کسی کو خوشی ہوتی ہے تو اس کے ساتھ سوغم ہوتے ہیں۔ کیونکہ تجربہ ہے کہ انسان کی تمنائیں ہمیشہ زیادہ ہوتی ہیں اور حاصل کم ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تمنا کے پورا نہ ہونے سے غم ہوتا ہی ہے تو جس کی تمنا جس قدر زیادہ ہوگی وہ ہمیشہ اسی قدر زیادہ غم میں رہے گا۔

اللہ والے ہمیشہ خوش رہتے ہیں:

اللہ والے البتہ خوش رہتے ہیں اس لیے کہ وہ دنیا کی کچھ تمنا ہی نہیں کرتے۔ اولاد ہوئی اس پر خوش ہیں نہ ہوئی اس پر خوش ہیں ہر حال میں راضی ہیں۔ اور دنیا داروں کو خوشی کہاں۔ ظاہر میں خوشی کا سامان تو ان کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے۔ اگر راحت جس چیز کا نام ہے۔ اگر وہ حاصل نہ ہوئی تو پھر اس کا جتنا سامان ہوگا۔ زیادہ تکلیف دہ اور باعث حسرت ہوگا۔

راحت روپے پیسے کا نام نہیں:

لوگ روپے پیسے کو راحت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ راحت روپے پیسے کا نام نہیں ہے۔

ورنہ چاہئے تھا کہ صندوق کو جس میں روپیہ رکھا ہو زیادہ راحت اور لذت ہوتی مگر یہ لوگ صندوق سے بھی زیادہ بدتر ہیں کیونکہ اس کو کسی تکلیف والم کا احساس تو نہیں ہے اور یہ لوگ طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں تو معلوم ہوا کہ دنیا دار بہت ہی کم آرام میں ہیں۔ غرض دنیا میں کہیں خوشی نہیں جس کا حاصل کرنا بالکل اپنے اختیار میں ہو اور آخرت کی خوشی بالکل اپنے اختیار میں ہے کہ تدبیر سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ یہ تو آخرت کی خوشی کے متعلق شبہ کا جواب تھا۔

دنیا کی مصیبت قابل اہتمام نہیں:

اسی طرح اگر کوئی مصیبت زدہ کہے کہ یہاں کی مصیبت تو ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس لیے اس کا فکر اور اہتمام ہے اور وہاں تو اللہ غفور رحیم ہے پھر کیوں غم کریں تو سمجھ لو کہ یہ بھی شیطانی دھوکہ ہے۔ غفور رحیم نے یہ وعدہ کہاں کیا ہے کہ خواہ تم کچھ ہی کرو میں تم کو جنت میں بلا عذاب اول ہی بار داخل کر دوں گا۔ غرض نہ آخرت کی نعمت کو کوئی سوچتا ہے نہ وہاں کی مصیبت کو جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دنیا ہی کو گھر بنا رکھا ہے۔

آخرت کی ترغیب اور دنیا کا ترک:

اے مسلمانو! تمہارا وطن آخرت ہے مگر تم نے اپنے لیے دنیا کو وطن بنا رکھا ہے اور اپنے لیے اور اپنے ہر عزیز و قریب کے لیے دنیا ہی دنیا ہی دنیا چاہتے ہو میرے خاندان کی ایک بڑی بی نے مجھ کو ایک بار یہ دعا دی تھی کہ اللہ کرے اس کا بھی دنیا میں ساجھا ہو۔ کیسے برے طریقہ سے دعا کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب تو اس کے پاس دین ہی دین ہے خدا کرے دنیا میں پھنسے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں دنیا ہی بڑی چیز تھی۔ اس لیے یہ چاہا کہ ہمارے پیارے بھی اس میں پھنسیں۔ لاحول ولاقوۃ کیسے غضب کی بات اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ سارے غم اس سے ہیں کہ ہم نے دنیا کو گھر بنا رکھا ہے ورنہ اگر اس کو گھر نہ سمجھتے تو کوئی بھی غم نہ ہوتا۔

دنیا کی مثال اور آخرت کی ترغیب:

دیکھو جب کسی سفر میں جاتے ہیں اور کسی سرائے میں قیام ہوتا ہے تو وہاں کی چار پائی میں کیسے کھٹمل ہوتے ہیں۔ کبھی چار پائی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے۔ مگر سوچتے ہو کہ ایک رات تو رہنا ہی ہے جس طرح ہو گزار دو ایک رات کی تکلیف ہی کیا پھر تو گھر پہنچ جائیں گے غرض سرائے کی تکلیف اس لیے تکلیف معلوم نہیں ہوئی کہ اس کو گھر نہیں سمجھا۔ یہی حال دنیا کی تکلیفوں کا ہے۔ سو اگر آپ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھتے تو اسی طرح اس کے ساتھ بھی برتاؤ ہوتا ہرگز اس کے متعلق ہر وقت تذکرہ نہ ہوتا نہ اس کا اس قدر سلسلہ بڑھاتے نہ اس کا غم ہوتا۔ بلکہ ہر بات میں زبان پر یہ ہوتا کہ ہمارا گھر آخرت ہے وہاں پہنچ کر چین و آرام کریں گے یہاں کی ذرا سی تکلیف کیا ہے ہے مرتے ہی ختم ہو جائے گی اور اپنے اصلی وطن میں ہمیشہ راحت اور خوشی کے ساتھ رہیں گے ہماری حالت یہ ہونی چاہیے تھی حالانکہ ہم کو کبھی بھی یہ خیال نہیں ہوتا۔ خاص کر عورتیں اگر کوئی غم ان پر آ جائے تو وہ حالت ہوتی ہے کہ گویا کبھی خدا تعالیٰ کی کوئی نعمت ہی ان پر نہیں ہوئی اور اس وقت ان کو بجز اس مصیبت کے تذکرے کے کوئی کام کوئی قصہ نہیں ہوتا گویا یہی ان کا دین ہے۔ یہی دنیا ہے اور کم وبیش مرد بھی اس میں مبتلا ہیں کہ ان کو بھی مصیبت کے وقت آخرت یاد نہیں رہتی۔ ورنہ اگر آخرت یاد ہو تو دنیا کی کوئی تکلیف بھی سرائے کی دو روزہ تکلیف سے زیادہ نہیں ستا سکتی تھی اور اپنے اصلی وطن کو یاد کر کے راحت ہو جایا کرتی۔ خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت ہوتی اور کتنی ہی سخت بلا سر پر آتی جیسے اس شخص کا کوئی پیارا بچہ مر جاتا تب بھی اس کو پریشانی نہ ہوتی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص سفر میں ہو اور اس کا کوئی بچہ اس کے پاس سے گم ہو جائے اور اس کو یہ معلوم ہو کہ میرا بچہ وہاں چلا گیا ہے جہاں میرا گھر ہے اور جہاں میں بھی جا رہا ہوں اور اب ایک دو دن میں وہاں پہنچنے والا ہوں تو کیا وہ روئے گا' پیٹے گا' کہ ہائے میرا بچہ گم ہو گیا ہائے میں تباہ ہو گیا' مٹ گیا۔ ہرگز نہیں بلکہ اس کو یہ سن کر اطمینان ہو جائے گا اور سمجھے گا کہ اب کوئی دن میں میں بھی اس سے جا کر مل لوں گا۔ تو اگر ہم آخرت کو اپنا وطن سمجھتے تو اولاد کے جاتے رہنے پر اتنا بڑا قصہ لے کر نہ بیٹھا

کرتے۔ ہاں جدائی کا غم ہوتا ہے۔ سو اس کا کچھ مضائقہ نہیں اس کی اجازت ہے لیکن جیسے جدائی کا غم ہوتا ہے۔ تسلی بھی تو ہونی چاہیے کہ وہ اپنی راحت کی جگہ پہنچ گیا ہے۔ ہم بھی وہیں جائیں گے اور مل لیں گے۔

خدا تعالیٰ نے یہی مضمون اس آیت میں سکھلایا ہے: انا للہ وانا الیہ راجعون یعنی جو چیز گئی وہ خدا کے پاس گئی اور ہم بھی خدا کے پاس جائیں گے۔ اور سب کے سب وہیں جمع ہو جائیں گے اور پھر جدا نہ ہوں گے تو اس کو سوچ کر تسلی ہونی چاہیے تھی اگر آخرت کو گھر سمجھتے۔ لیکن اب تو وہ مار دھاڑ ہوتی ہے کہ گویا خدا تعالیٰ نے ان کی جائداد چھین لی۔ غرض یوں ہونا چاہیے جیسے دنیا کی مثال میں سمجھا دیا مگر جب ایسا نہیں ہوتا۔

دنیا داروں کو موت سے بہت خوف ہے اور اللہ والے اس سے خوش ہوتے ہیں:

تو اس سے سمجھ میں آیا ہوگا کہ اولاد کے مرنے کا ایسا غم بھی اس لیے ہوتا ہے کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ بس بڑی بھاری غلطی ہماری یہ ثابت ہوئی کہ ہم نے دنیا کے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ اسی لیے یہاں سے جدا ہونے کا رنج و غم ہوتا ہے ورنہ جب آدمی سفر میں جاتا ہے تو جتنا گھر سے قریب ہوتا جاتا ہے خوشی بڑھتی جاتی ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ جوں جوں مرنے کے دن قریب آتے ہیں روح فنا ہوتی ہے۔ اور یہ حالت دنیا داروں ہی کی ہے کیونکہ وہ دنیا ہی کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ بخلاف اللہ والوں کے کہ ان کو اس کا ذرا بھی غم نہیں ہوتا اور نہ ان کو اپنے مرنے کی پرواہ ہوتی ہے نہ اولاد کے مرنے کی پرواہ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ تو جاہلوں کو ان کے سنگدل ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ان سے زیادہ تو کوئی رحمدل ہی نہیں ہوتا۔ مگر اس پریشانی نہ ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اس لیے ان کو اولاد کے مرنے کا غم اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ سفر میں سرائے سے لڑکے کے گھر چلے جانے پر مسافر باپ کو ہوتا ہے کہ ایک طرح کی جدائی سے قلق ہوا بس زیادہ نہیں کیونکہ وہ آخرت کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں۔ جس طرح عادت ہے کہ سفر سے واپس آتے ہوئے گھر کے قریب پہنچ کر خوشیاں مناتے ہیں' جس طرح عادت

ہے کہ دنیا کا غم نہیں ہوتا حضرت مولانا مظفر حسین صاحب قدس سرہٗ کاندھلوی کا واقعہ ہے کہ ان سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت اب تو آپ بوڑھے ہوگئے آپ نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ الحمدللہ اب وقت قریب آیا۔ مگر اس قسم کے واقعات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ والوں کو اپنے اعمال پر یا ان کے مقبول ہونے پر ناز ہوتا ہے۔ اس لیے مواخذہ کا خوف نہ ہونے سے خوش رہتے ہیں۔ استغفراللہ ناز کی مجال کس کو ہے۔ بلکہ وہ خوشی صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کو داروگیر کا اندیشہ ہوتا ہے یا نہیں تو سمجھو کہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے بلکہ دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی رحمت خداوندی سے امید بھی ہوتی ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ پھر چھوٹ جائیں گے۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کسی کا گھر ٹوٹا پھوٹا پڑا ہو اور سرائے نہایت پختہ ہو تو وہ اپنے گھر ہی کو پسند کرے گا اور سوچے گا کہ اگرچہ اس وقت میرا گھر ٹوٹا پھوٹا ہے لیکن میں انشاء اللہ تعالیٰ پھر اس کو پختہ کرلوں گا۔

اسی طرح اگرچہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے مگر جانتے ہیں کہ ایمان کی سلامتی ہے تو ضرور رحمت ہوگی۔ غرض وطن کے طبعی محبت ہوتی ہے گو وہاں کچھ تکلیف بھی ہو تو کوئی یہ شبہ نہیں کرسکتا کہ ان کو اپنے اعمال پر ناز ہوتا ہے اس لیے خوف نہیں ہوتا۔

دنیا کی حقیت سمجھنے کے بعد بہت غم کم ہوجاتے ہیں:

غرض دنیا کی حقیقت واقعی یہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی اس کو اگر کوئی سمجھ جائے تو ہزاروں غم کم ہوجائیں اور دنیا کی تمام ہوسیں فنا ہوجائیں۔ ہم جو دنیا میں چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہوجائے وہ بھی ہوجائے یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ اور فانوس سب لگا دیئے جائیں۔ اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دے تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے خاص کر جب کہ یہ بھی حکم ہو کہ مثلاً چار دن سے زیادہ کوئی اس سرائے میں قیام نہیں کرسکے گا۔ اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی آرائش میں لگانا پورا خلل دماغ ہے اور دنیا بھی ایک سرائے ایسی ہی ہے کہ اس میں قیام ایک حد تک ہے کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا۔ اول تو سرائے میں اگر قیام اپنے اختیار میں

بھی ہوتب بھی ی ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ گھر سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیار بھی نہ ہوتب تو ہرگز اس میں دل نہ لگانا چاہیے بلکہ اس سے وحشت اور نفرت ہی چاہیے۔ اور یہی مطلب ہے میرے نزدیک اس حدیث کا۔ **الدنیا سجن المومن** (ترجمہ) دنیا جیل خانہ ہے مومن کے واسطے۔ لوگوں نے اس حدیث کے مختلف مطلب بیان کیے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ دنیا کو جیل خانہ تکلیف نہیں ہوئی بلکہ اس لیے فرمایا کہ جیل خانہ میں کبھی جی نہیں لگا کرتا چاہے وہاں کیسا ہی عیش ہو تو مسلمان کو شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے چاہے اس میں کیسا ہی عیس وآرام ہو

دل لگانے کے قابل یہ دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

کیونکہ جی لگنے کا گھر ہوتا ہے اور وہ گھر نہیں ہے۔ پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں ہوسیں ہوں گی اور کیوں سوچے گا کہ یوں ہو اور یہ ہو اور وہ ہو بلکہ اب یہ سوچے گا کہ دنیا تو پردیس ہے یہاں جس طرح سے بھی ہو دن گزر جائیں اور دنیا کے سوچ کی بجائے اب یہ ہوگا کہ آخرت کی سوچ ہوگی کہ اس کے لیے یہ سامان ہونا چاہئے اور یہ فکر ہونا چاہیے اپنے نفس کی اصلاح ہونی چاہیے اور یہ سوچے کہ اگر یہ سامان ہو گیا تو پھر آخرت میں یوں بہار ہوگی اور یوں لطف آئے گا اور یوں عیش ہوگا' ورنہ یوں مصیبت ہوگی یوں پریشانی ہوگی۔

غرض مسلمان کی تو یہ شان ہونی چاہیے جو مذکور ہوئی۔ لیکن اب غور کر کے دیکھ لو کہ کتنے آدمی ہیں جو یہ سوچتے ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ دنیا دار تو الگ رہے دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق کبھی نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ نہ اندیشے۔ حالانکہ مسلمان کو اس کی سوچ اور فکر ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ خدا تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں: **يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ** (ترجمہ) ''اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور ہر نفس سوچے کہ اس نے پہلے سے کیا (سامان) تیار کیا ہے۔ کل کے دن (یعنی آخرت) کے واسطے اور (پھر تاکید کے لیے مکرر فرماتے ہیں کہ) اللہ سے ڈرو۔''

دیکھو ایک دن کا سفر ہوتا ہے تو اس میں ناشتہ بھی ہمراہ لیا جاتا ہے اور سامان بھی ہوتا ہے۔ آخرت کا اتنا بڑا سفر درپیش ہے۔ اس کے لیے کیا زاد راہ اور سامان تیار کر رکھا ہے۔ خاص کر جب کہ وہ وطن اور گھر بھی ہے کہ اس صورت میں تو اس کے لیے بہت کچھ سامان کرنا چاہیے تھا۔ یعنی راستہ کے لیے ناشتہ وغیرہ اور گھر پر بیٹھنے کے لیے کمائی اور ذخیرہ۔ پس ایک اثر تو آخرت کے گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا۔ ایک دوسرا اثر اس کے سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا کہ دنیا کی مصیبتوں وبلاؤں سے غم نہ ہوتا نہ اپنے واسطے اور نہ لگے سگے کے واسطے۔ کیونکہ دنیا اپنا گھر نہیں وہ تو سرائے ہے اور سب جانتے ہیں کہ سرائے کی چند روزہ تکلیفوں کا غم نہیں ہوتا۔ ہاں دنیا اگر گھر ہوتی تو غم کا مضائقہ نہ تھا۔ لیکن وہ تو گھر نہیں بلکہ گھر تو آخرت ہے پھر غم کیوں ہو اور معمولی مصیبت پر تو کیا غم ہوتا۔ مسلمان کو تو موت سے بھی غم نہ ہونا چاہیے۔ اب جو ہم کو موت سے موت آتی ہے یہ صرف اسی لیے کہ اس کو گھر نہیں سمجھتے بلکہ موت کے خیال سے وہی حالت ہوتی ہے جیسے کسی کو جیل خانہ میں لیے جاتے ہوں۔ ہمارے حضرت (حاجی صاحب) رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا کہنے لگا کہ میری بیوی مرتی ہے حضرت فرمانے لگے کہ اچھا ہوا جیل خانہ سے چھوٹتی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ کیوں غم کرتا ہے تو بھی چلا جائے گا۔ کہنے لگا روٹی کون پکائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا ماں کے پیٹ سے وہی روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی۔ تو موت کے متعلق اس تمام تر رنج وغم کی وجہ یہی ہے کہ ہم آخرت کو بھولے ہوئے ہیں۔ ورنہ اگر وہ یاد ہوتی تو موت کا کیا غم ہوتا۔ اور ایک اثر آخرت کو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیے تھا کہ کسی سے عداوت اور رنج نہ ہوتا۔ اگرچہ معمولی امر پر کسی بات میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی دیکھو ریل میں مسافروں میں لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہے۔ مگر یہ نہیں ہوتا کہ اپنے سامان کو چھوڑ کر کسی سے الجھنے لگیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اس سے سفر کھوٹا ہوگا سامان بھی خراب ہوگا مگر اس طرح سے دنیا کے فضول قصوں میں بھی کسی نے سوچا ہے کہ ان میں پھنسنے سے آخرت کا سفر کھوٹا ہوگا۔ نیز اگر آخرت کو اپنا گھر سمجھتے تو دنیا کے ساز وسامان پر اترایا نہ کرتے۔ جیسے اگر سفر میں بیچ بند کسا ہوا پلنگ ملے تو کوئی اس پر نہیں اتراتا اور نہ فخر کرتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ یہ تو مانگی ہوئی چیز ہے

عاریت ہے جس کی ہے وہ لے لے گا۔ اسی طرح ہم بھی اگر دنیا میں اپنے کو مسافر سمجھتے تو یہاں کے ساز و سامان پر نہ اتراتے حالانکہ ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہمارے پاس چار پیسے بھی ہوں تو ہم ان پر اتراتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ غرض کہ بہت سی علامتیں ایسی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ یہی بڑی خرابی ہے بلکہ جڑ ہے تمام خرابیوں کی اور اسی سے آخرت کے کاموں میں سستی اور کاہلی پیدا ہوتی ہے یہ تو ہماری حالتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے آخرت کو اپنا گھر نہیں سمجھا۔ اب صحابیوں رضی اللہ عنہم کو دیکھئے کہ انہوں نے آخرت کے واسطے کیسی کیسی سختی اٹھائی اور مصیبت جھیلی فاقے انہوں نے کیے، وطن سے بے وطن وہ ہوئے۔ اپنے پیاروں اور عزیزوں کو انہوں نے چھوڑ، لیکن ان کو کبھی ہراس نہیں ہوا، اور ان سختیوں سے تو ان پر کیا اثر ہوتا جو سب سے بڑی سختی ہے موت۔ وہ اس کے مشتاق رہتے تھے کہ کو نسا وقت ہو گا کہ ہم یہاں سے چھوٹیں گے وہ حضرات کماتے بھی تھے لیکن لاچاری کو جیسے بڑی زبردستی سے کوئی کام کرتا ہے۔ پس وہ حضرات آخرت کو اپنا گھر سمجھتے تھے اور یہ اس کے آثار تھے اور میں جو کہتا ہوں کہ دنیا کو گھر نہ سمجھو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا مت کماؤ۔

دنیا سے کتنا تعلق رکھنا چاہیے:

دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں ضرورت کے موافق کماؤ مگر یہ نہ ہو کہ اس میں بالکل کھپ جاؤ۔ جیسے ہم لوگوں کی حالت ہے کہ گویا خدا تعالیٰ سے کوئی واسطہ ہی ہم کو نہیں۔ مثلاً کپڑا لے کر پسند کرنے بیٹھیں گے تو معلوم ہو گا کہ گویا ان کا یہی دین اور یہی ایمان ہے۔ جب زیور کے پیچھے پڑیں گے تو اس طرح کہ بس وہی دل میں بسا ہو گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں دنیا کا کام کرنے سے منع نہیں کرتا مگر یہ کہتا ہوں کہ اس میں دل نہ لگاؤ۔ کام سب کرو اور ضرور کرو مگر جی اترا ہوا ہونا چاہیے دل کو دنیا میں کھپا دینا یہی زہر ہے۔ یہ وہ بلا ہے کہ اس سے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت یہی غالب نہ ہو جائے اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے اس وقت بے تعلقی نہ ہو جائے۔ اس لیے جہاں تک ہو اس کی کوشش کرو کہ دنیا

میں دل لگا ہوا نہ ہو۔ دل کو خدا تعالیٰ ہی سے لگاؤ۔ ہاتھ سے کام کرو۔ کچھ حرج نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ خود حضور ﷺ گھر میں سب کام کر لیتے تھے۔ لیکن جب اذان ہوتی تو آپ ﷺ کی یہ حالت ہوتی کہ: قام کانه لایعرفنا: یعنی آپ ﷺ سب کام چھوڑ کر اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ گویا آپ ﷺ ہم کو پہچانتے ہی نہیں۔

صاحبو! آخرت کو اپنا گھر سمجھنے والوں کی تو یہ حالت ہونی چاہیے۔ حالانکہ ہم لوگوں کی اور خاص کر عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر مثلاً کپڑا سینے میں لگیں تو نماز کی فکر ہے نہ روزے کی۔ اسی طرح دنیا کے ہر کام میں یہی رنگ نظر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دین اور آخرت کی کچھ خبر ہی نہیں۔ اور یہ دین کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ افسوس کیا دین ایسی بے فکری کی چیز ہے یہ معاملہ تو دنیا کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ خوب سمجھ لو کہ یہاں کا غم ہی کیا یہاں کے غم کو تو ایسی حالت ہے جیسے خواب کا غم۔ سو خواب میں اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے اور اسی وقت آنکھ کھل جائے اور دیکھے کہ ایک نہایت عمدہ سیج بند کسے ہوئے پلنگ پر آرام کر رہا ہے اور بہت بڑا محل ہے لوگ ادھر ادھر کھڑے جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں تو کیا اس شخص کے ذہن میں وہ خواب رہے گا اور کیا اس کو کچھ غم ہوگا ہرگز نہیں۔ اسی طرح یہاں کی خوشی بھی خواب کی سی خوشی ہے جیسے اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ میں شاہی تخت پر بیٹھا ہوں اور آنکھ کھل جائے تو دیکھے کہ چاروں طرف سپاہی بیڑیاں لیے کھڑے ہیں اور اس کو جیل خانہ لے جانا چاہتے ہیں تو کیا اس خواب کی بادشاہت سے اس کو کچھ راحت پہنچے گی۔ ہرگز نہیں بس یہی حالت ہے دنیا کے غم اور دنیا کی خوشی کی اگر خدا کے سامنے خوش گیا تو یہاں کے عمر بھر کے رنج و غم کچھ بھی نہیں ہیں۔ سب ہیچ ہیں اور اگر خدا کے سامنے غمزدہ گیا تو یہاں کی عمر بھر کی خوشی اور عیش بھی خاک ہے مگر اب لوگ اس خواب وخیال کو ہی حقیقی غم اور حقیقی خوشی سمجھتے ہیں جس کی وجہ بس وہی ہے کہ جس کا میں بیان کر رہا ہوں کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ صحابیوں رضی اللہ عنہم میں بس یہ بات نہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان حضرات میں نہ تکبر تھا نہ بڑائی تھی نہ شیخی تھی اور نہ وہ کسی مخلوق سے ڈرتے تھے۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ سے لو لگائے ہوئے تھے۔ ہر

وقت موت کے منتظر تھے اور صحابیوں رضی اللہ عنہم کی تو بڑی شان ہے بزرگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ پر جب فقر وفاقہ ہوتا اور بیوی کئی کئی وقت کے بعد بہت پریشان ہوکر شکایت کرتیں تو آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ اب عنقریب ہم کو جنت میں ملنے والا ہے وہاں ہمارے لیے عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں وہ بھی ایسی نیک بخت تھیں کہ فوراً ہی مان جاتیں اور صبر کر کے بیٹھ رہتیں۔ آج کل کی بیویاں نہ ہوئیں۔ بعض تو اس وقت ایسی ہیں کہ عجب نہیں یوں کہتیں کہ بس وہ نعمتیں تم ہی لیجیو۔ مجھے تو یہاں لادو جس سے پیٹ بھرے مگر ان بندی خدا کی یہ حالت تھی کہ ان کے پاس زیور تو کیا ہوتا صرف ایک چاندی کا ہار تھا وہ اس لیے رکھا تھا کہ مولانا رکن الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ یعنی صاحزادہ کے نکاح میں اگر دو چار مہمان آ گئے تو اس کو بیچ کر ان کو ایک دو وقت کھانا کھلا دیا جائے گا۔ مگر حضرت شیخ کو وہی ناگوار تھا اور ہمیشہ اس کے جدا کرنے کا تقاضا فرماتے اور وہ یہ عذر کرتیں۔ تو دیکھئے اس بندی خدا نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آخر کچھ تو میرے ناک کان میں ہونا چاہیے آخر عورت ہوں۔ سبحان اللہ وہ حضرات کیسے قانع اور صابر تھے تو ان حضرات کی یہ حالت صرف اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کا کوئی دنیا کا نقصان ہو جاتا ہے تو ان کو غم بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ غم خلاف امید ہونے سے ہوتا ہے تو جو شخص کسی چیز کے جدا ہونے کا غم ہو گا اور نہ کچھ بھی غم نہ ہونا چاہئے۔ ہاں طبعی رنج ہونا۔ یہ دوسری بات ہے میں پریشانی اور اضطراب کے غم کی نفی کر رہا ہوں۔ یہ ہے فرق ان لوگوں میں جو دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور ان میں جو دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ساری خرابیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے اس کو دل سے نکالنا چاہیے۔

دنیا کی محبت دل سے نکال دینے کا طریقہ:

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آخرت کو کثرت سے یاد کیا جائے اس سے دنیا کی محبت دل سے نکال جائے گی۔ اور آخرت کی نعمت کی محبت اور آخرت کے عذاب سے خوف یوں پیدا کرو کہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ ہم کو مرنا ہے اور خدا کے سامنے جانا ہے پھر ایک دن ہمارا حساب ہو

گا اگر اچھی حالت ہے تو بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی اور اگر بری حالت ہے تو سخت سخت عذاب ہوں گے اور نفس سے کہا کرو کہ اے نفس تو دنیا کو چھوڑنے والا ہے۔ قبر میں تجھ سے سوال ہوگا اگر اچھے جواب دے سکا تو ہمیشہ ہمیشہ کا چین ہے۔ ورنہ ہمیشہ کی تکلیف ہے۔ پھر تجھے قیامت کو اٹھنا ہے اور اس روز تمام نامہ اعمال اڑائے جائیں گے تجھے پل صراط سے گزرنا ہو گا۔ پھر آگے جنت ہے یا دوزخ ہے اس کو روزانہ سوچا کرو۔ اس سے آخرت کے ساتھ تعلق ہوگا اور دنیا سے دل سرد ہو جائے گا۔ اس کو موت کا مراقبہ کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس مراقبہ سے کسی کو وحشت ہونے لگے اور جی گھبرانے لگے اس کا علاج یہ ہے کہ جب وحشت ہونے لگے تو خدا تعالیٰ کی نعمت کو یاد کیا کرو اور سوچا کرو کہ اس کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ ماں کو بھی اپنے بچے سے اتنی محبت نہیں ہے تو اس کے پاس جانے سے وحشت کی کوئی وجہ نہیں۔ اور اگر اس مراقبہ کے بعد پھر کبھی دنیا کی طرف دل مائل ہو اور گناہ کو جی چاہے اور کوئی گناہ ہو بھی گیا ہو تو اس مراقبہ کو پھر شروع کر دو اور توبہ کر لیا کرو۔ اور توبہ کے لیے ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کسی کا حق تمہارے ذمہ ہوا اس کو بہت جلدی ادا کر دو۔ اس سے انشاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کر دے گا۔ پھر انشاء اللہ تعالیٰ آخرت میں ہمیشہ عیش کے ساتھ رہو گے اور آخرت کا شوق پیدا ہونے کی میں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام ہے ''شوق وطن'' اس کا دیکھنا سننا بھی بہت مفید ہوگا۔ حاصل اس سب بیان کا یہ ہوا کہ دنیا کی محبت ایک مہلک مرض ہے اور اس کا علاج موت کی یاد ہے اور اس کے توحش سے بچنے کے لیے شوق وطن کا دیکھنا ہے اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ اپنے مرض کی اطلاع سب کو ہوگئی ہے اس کا علاج بہت جلد کریں۔ اور خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمت عطا فرمائیں۔ آمین یارب العلمین۔

تمت

(۳۷) بیان کی تعلیم

منتخب از تعلیم البیان وعظ چہارم دعوات عبدیت جلد پنجم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خطبہ ماثورہ:

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَO خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَO

ترجمہ: ''رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھائی''

تمہید وضرورت وعظ:

یہ مجلس طلباء کو بیان کرنے کی عادت ڈالنے کے لیے قائم کی جارہی ہے تاکہ وہ جو کچھ پڑھیں اس کا نفع دوسروں کو بھی پہنچا سکیں۔ قاری صاحب نے جو رکوع تلاوت کر کے سنایا میں نے بھی بیان کے لیے اس وقت یہی آیت تجویز کی تھی۔ قاری صاحب کے شروع کرتے ہی میرے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ دونوں کے دلوں میں ایک ہی مضمون کے آیتوں کا آنا انشاء اللہ اس مجلس کے مقبول ہونے کی علامت ہے۔

واردات کا توافق مقبولیت کی علامت ہے:

حدیث شریف میں شب قدر کے بارے میں ارشاد ہے کہ چونکہ چند خواب متفق ہیں کہ آخری عشرہ رمضان میں شب قدر ہے اس لیے شب قدر کو آخری عشرہ میں تلاش کرو۔ اس سے بزرگوں نے یہ سمجھا ہے کہ چند قلوب کا کسی وارد پر متفق ہو جانا اس وارد

کے صحیح ہونے کی علامت ہے۔ گو ہم کیا اور ہمارے واردات کیا۔ لیکن چھوٹی باتوں میں چھوٹے واردات کا بھی وہی اثر ہوگا جو بڑی باتوں بڑے واردات کا ہوتا ہے۔ اس وقت میرے اور قاری صاحب کے دل میں یہ آنا کہ اس آیت کی تلاوت کی جائے ظاہر ہے کہ ہم دونوں میں کم از کم بحمد اللہ اسلام تو ضرور ہے۔ اور ہماری مجلس چھوٹی سی مجلس ہے۔ یہ قرینہ اس کا ہے کہ مجلس انشاء اللہ مقبول ہوگی۔ لیکن صرف اس قرینہ پر کفایت نہ کی جائے۔ بلکہ اس کی مقبولیت کے لیے تدبیر بھی کرنا چاہیے۔ کیونکہ تدبیر کرنا سنت ہے۔ اور یہ دعا بھی کرنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ اس کو کامیاب کریں کہ اس میں سنت نبوی ﷺ کی موافقت ہو۔ شریعت کی حدود سے باہر نہ ہو اس لیے کہ بڑی چیز ہر امر میں دعا ہی ہے اور دل خوش کرنے والی علامات تو درجہ خال میں ہیں۔ دعا کے بعد تدبیر کا درجہ ہے۔ اب میں اصل مقصود کو شروع کرتا ہوں۔

تفسیر آیت ''الرحمٰن علم القرآن'' الخ اور مقصود وعظ:

اللہ تعالیٰ نے اس رکوع کو اپنے مبارک نام ''الرحمٰن'' سے شروع فرمایا ہے۔ اور اس کے بعد اپنی تین نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَO خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَO طرز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ منشاء ان تینوں عنایتوں اور نعمتوں کا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ الرحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہے..... مطلب یہ ہوا کہ بڑی رحمت والی ذات نے رحمت ہی کی وجہ سے قرآن سکھلایا۔ رحمت ہی کی وجہ سے انسان کو پیدا کیا۔ رحمت ہی کی وجہ سے اس کو گویائی اور بیان سکھلایا۔

نعمت بیان پر نعمت قرآن وخلقت انسان کو کیوں مقدم کیا گیا:

گو مقصود یہاں پر نعمت بیان کو بتلانا ہے لیکن اس نعمت کے بیان سے انسان کی پیدائش کی نعمت کو اس لیے بیان کیا گیا کہ اول انسان کا وجود ہو تب نعمت بیان کی صلاحیت اور اہلیت حاصل ہو سکتی ہے اور تعلیم قرآن کو اس لیے پہلے بیان کیا کہ بغیر تعلیم قرآن اور علم شریعت کے کوئی بیان قابل اعتبار نہیں ہو سکتا۔

تعلیم قرآن پر توجہ نہ کرنے کی شکایت:

عام طور پر طلباء اور بیان کرنے والے نے بھی اپنے وعظوں میں تعلیم قرآن کو بہت زیادہ ترک کر دیا ہے۔ اور وہ اکثر امور میں حدود شریعہ سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے علماء طلباء کو ایسے جلسوں اور انجمنوں میں شرکت کی اجازت دیتے ہوئے کھٹکتے ہیں۔ چنانچہ بعض نوجوان عربی طلباء کو بھی دیکھتا ہوں کہ وہ ان جلسوں میں شریعت کی بہت سی باتیں چھوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً واہی تباہی غلط مضامین بیان کرتے ہیں کہیں تقریر میں یورپ والوں کا طریقہ اختیار کرت ہیں اور ستم یہ ہے کہ ان کے بزرگ اور استاد بھی اس طرز سے ان کو نہیں روکتے۔ بلکہ تقریر میں ان چیزوں کو اچھا اور زوردار سمجھا جاتا ہے۔

تقریر میں ملمع سازی اور تصنع کا منشاء:

تقریروں میں ان نئی باتوں اور بناوٹ کی یہ وجہ ہے کہ طلباء اور واعظین میں آج کل علم کی تو کمی ہوگئی ہے اور علم قرآن سے خالی ہیں کھری چیز تو پاس نہیں جو باطنی قوت کی وجہ سے دلوں پر اثر کرے خواہ الفاظ کیسے ہی سادہ ہوں۔ اس لیے وہ لفظی آب وتاب اور بناوٹی تقریر سے ہی بیان میں زور پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر تدبر اور تفکر کے بعد لفظی آب وتاب کا رنگ اتر جاتا ہے۔ بس الفاظ ہی الفاظ رہ جاتے ہیں۔ کلام بے اثر ہو جاتا ہے۔ حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

خوش بود گر محک تجربہ آید میاں
تاسیہ روشود ہر کہ وردغش باشد

اور فرماتے ہیں

حسد چہ می بری اے ست نظم بر حافظ
قبول خاطر و حسن سخن خداداد اوست

اور

دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند
دلبر ماست کہ باحسن خدادادا آمد

ان تینوں شعروں کا حاصل یہ ہے امتحان کے وقت جو کھرا ہوگا باوجود سادگی کے ایسی آب وتاب کے ساتھ رہے گا۔ بلکہ اور زیادہ رونق ہو جائے گی۔ اور جس میں کھوٹ ہوگا وہ کسوٹی پر رکھنے کے بعد روسیاہ ہو جائے گا۔ اوران کی ملمع سازی کی قلعی کھل جائے گی۔

اہل اللہ کے سادہ الفاظ میں شستہ تقریروں سے زیادہ خوبی اور دلچسپی ہوتی ہے:

ہم نے حضرات اہل حق کو دیکھا ہے کہ ان کے سادہ الفاظ میں وہ خوبی اور دلچسپی ہوتی ہے کہ لوگ بڑے چکنے چپڑے الفاظ میں نہیں پائی جاتی۔ یہ جتنی شستہ اور چست تقریریں ہوتی ہیں۔ ان کو خوبی پہلی ہی نظر تک ہوتی ہے۔ جس قدر زیادہ غور کرتے جاتے ہیں ان کا پوری اور پھر ہونا ظاہر ہوتا جاتا ہے کیونکہ وہاں علم کا سرمایہ نہیں ہوتا۔ اور اہل اللہ کے سادہ الفاظ کی یہ حالت ہے کہ جس قدر نظر کو گہرا کرتے چلے جاؤ۔ حسن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مجھے ایک انسپکٹر ڈاک خانہ جات ملے۔ وہ طالب حق تھے اور طلب حق کا خاصہ ہے کہ اس میں حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک صاحب جو اخباری دنیا میں بہت مشہور ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ رہنے اور ان کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں ان کی تقریریں سن کر سمجھا کرتا تھا کہ ان کے برابر کوئی محقق نہیں۔ لیکن جب سے اہل حق کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا جن کو نہ لیکچر دینا آتا ہے نہ بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اصل علم کیا چیز ہے؟

اہل حق اور جدید طرز کی تقریروں میں فرق:

اور کہتے تھے کہ اہل حق اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریروں میں جو فرق میں نے سمجھا وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں تو بڑی باوقعت اور مؤثر معلوم ہوتی ہیں۔ اور حق انہیں میں منحصر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو حقیقت کھلتی ہے اور ان کا لچر اور کمزور اور خلاف واقع ہونا اور بناوٹی ہونا معلوم ہو جاتا ہے اور اہل حق کی تقریر نظر اول میں بے رنگ اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے

ان کی قوت اور مطابق واقع ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اور قلب پر نہایت گہرا اثر ان کا ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تمام رنگینیاں دل سے سے ڈھل جاتی ہیں۔

اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیکچر دینا نہیں آتا:

یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو علماء پر کیا جاتا ہے کہ ان کو لیکچر دینا نہیں آتا۔ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن وحدیث کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے تو ہم کو کسی ظاہری آب وتاب کی کیا ضرورت ہے

زعشق ناتمام باجمال یار مستغنی است

باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

ہمیں لیکچر سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تو صاف کہتے ہیں کہ جو شخص لیکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے وہ پہلے ہی دن ہمارے دل میں ناپسند ہونے کا بیج بوتا ہے۔

حدیث نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِيَّةٌ کے معنی:

ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف: نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِيَّةٌ میں اشارہ ہے کہ ہم امت امیہ ہیں۔ امیہ کے معنی سادگی کے ہیں۔ حضور ﷺ کی اصل مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت سادہ ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے لفظ نحن (ہم) فرما کر ساری امت کو شامل فرمالیا۔ اتباع نبوی ﷺ کی یہی روح ہے کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو۔ امیہ ام کی طرف منسوب ہے ام ماں کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی رہے۔ جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی زندگی سادہ بغیر کسی بناوٹ بے ساختہ ہوتی ہے۔ اسی بے ساختگی کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی ہے۔ ورنہ بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ ہوتے ہیں۔ بہت نفرت ہونا چاہیے تھی۔ حتیٰ کہ یہ سادگی اور بے ساختگی جن بوڑھوں میں ہوتی ہے آج ان میں بھی وہ کشش اور حسن ہوتا ہے کہ بڑے بڑے حسین ان پر جان فدا کرتے ہیں۔ پس اصلی مفہوم امیت کا یہی سادگی اور بے ساختگی ہے جو تصنع اور بناوٹ سے خالی ہو اور لکھا پڑھا نہ ہونا جو امیت کا مشہور مفہوم ہے یہ بھی اسی

سادگی کا ایک شعبہ اور شاخ ہے پس بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہیے اور بناوٹ اور فریب سے بالکل پاک ہونا چاہئے۔ البتہ سادگی کے ساتھ صفائی ہونا چاہئے۔ لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔

اہل علم میں بھی رائج الوقت زبان کا طرز آتا جاتا ہے جو ہماری مادری زبان کی خصوصیت کے خلاف ہے:

ہم دیکھتے ہیں کہ اہل علم میں آج کل انگریزی ملی ہوئی ہے اردو کا طرز آتا جاتا ہے۔ قطع نظر شریعت کی تعلیم کے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور زبان کی کچھ خاص باتیں ہوتی ہیں یہ نیا طرز اختیار کر کے انگریزی کی خصوصیات کو زبان اردو میں داخل کر لیا گیا ہے اور اس میں روز بروز زیادتی ہو رہی ہے حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اردو میں نہیں کھپتیں۔ اور ان کی بدولت زبان بھدی اور خراب ہوتی جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے کو اردو کا حامی سمجھتے ہیں حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ اردو کے ماحی (مٹانے والے) ہیں کیونکہ ہر زبان کا ایک مادہ ہوتا ہے یعنی حقیقت اور ایک ہیئت یعنی ظاہری صورت ہوتی ہے۔ ان دونوں سے ملا کر زبان پیدا ہوتی ہے۔ جو جب زبان اردو کی (ہیئت) ظاہری صورت نہ رہے گی تو وہ اردو کدھر سے رہ جائے گی۔

اردو کے حامیوں کے لیے اس کی خصوصیات کی حفاظت ضروری ہے:

پس اگر ہم ازدو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہیے کہ اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی سنے تو وہ سمجھ لے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے اور انگریزی طرز سے ہمیں کچھ مناسبت نہیں۔

ہماری اصلی زبان عربی ہے:

تعجب کی بات ہے کہ آج کل عربی خواں طلباء کی تقریروں میں بھی کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں۔ ان کی تقریر میں اگر عربی الفاظ آتے تو اتنا تعجب نہ تھا اس لیے کہ اول تو وہ عربی پڑھ رہے ہیں۔ دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان ہے۔ اس لیے بھی

ہماری اصلی اور قدیمی اور مادری زبان عربی ہی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد اور اسلاف عرب ہی سے آئے تھے۔ اردو زبان تو بہت تھوڑے دنوں سے ہندوستان میں بود و باش کے بعد ہماری زبان بنی ہے۔

عربی زبان کی حفاظت نہ کرنے پر افسوس:

مجھے اکثر افسوس ہوا کرتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہندوستان میں اپنے نسب نامے تک کو تو محفوظ رکھا۔ لیکن زبان کی حفاظت نہ کی۔ حالانکہ ان حضرات کے لیے یہ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاں جہاں فتوحات حاصل کی ہیں۔ اپنی عربی زبان کو نہیں چھوڑا پھر ملک بھر نے ان کی زبان اختیار کرلی۔ اور آج تک وہاں وہی زبان چلی جاتی ہے۔ مثلاً مصر ہی کو دیکھا جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بدولت تمام مصر کی زبان عربی ہے۔ اگرچہ تمام مصر کا مذہب اسلام نہیں۔ خیر اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی سی برکت غیر صحابہ میں نہیں تھی۔ اس لیے تمام مفتوح قوموں نے ان کی زبان نہیں لی تو کم از کم یہ اپنی زبان خود تو سنبھالتے۔ تعجب ہے کہ ہندوستان میں آ کر ہمارے بزرگ اپنی زبان کو ملک میں رواج تو کیا دیتے خود بھی اس کو نہیں سنبھالا بلکہ اپنی زبان کو بھی ملکی زبان سے بدل دیا۔

زبان بدلنے کا اصلی سبب:

غور کرنے سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے بزرگ یہاں تنہا آئے تھے بال بچوں کو ساتھ نہیں لائے تھے یہاں آ کر نومسلم عورتوں سے نکاح کرلیا۔ اس لیے اولاد کی زبان ماں کے اثر سے نئی زبان بن گئی ماں ہی کی معاشرت کا یہ اثر ہے کہ مسلمانوں میں آج تک تیجے وغیرہ کی رسمیں باقی ہیں جو غیر اسلامی ہیں چونکہ ہندی عورتیں اپنے خاندانوں کی رسوم جانتی تھیں۔ جب ان رسوم کے دن آئے تو انہوں نے کہا ہوگا کہ ہم ایسے موقع پر یوں کیا کرتے تھے۔ ان حضرات نے کوئی خرابی نہ دیکھ کر محض دلجوئی کے لیے تھوڑا سا تغیر کر کے مثلاً ہندی ''اشلوک'' کے سورہ فاتحہ کا پڑھنا بتلا کر اجازت دیدی ہوگی۔ اس وقت تو یہ عارضی طور پر دل جوئی کے لیے تھا۔ اب لوگ اس کو فرض عین سمجھنے لگے۔ علماء نے اس کو منع کیا کیونکہ جائز کام کو لازم وضروری کر لینا بدعت ہے تو ان کو وہابی اور کیا

کیا کہنے لگے۔ غرض اس مادری اثر کی وجہ ہندوستان میں عربی نہ چل سکی کہ ابا جان تو عربی بولتے ہوں گے اور اماں جان ہندی اور بچہ زیادہ ماں ہی کے پاس رہتا ہے۔ اس لیے کچھ عربی اور ہندی مل کر ایک مجموعہ ہوگیا۔ اگر گھر میں عربی ہوتی اور باہر آ کر لوگوں سے ہندی سنتے تو دونوں زبانیں باقی رہتیں۔ چنانچہ ہم بنگالیوں اور انگریزوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی زبان بھی بولتے ہیں اور اردو بھی بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گھروں میں وہی بنگلہ اور انگریزی بولی جاتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے یا تو اس کا اہتمام نہیں کیا یا ہو نہ سکا۔ اسی لیے ہماری زبان مرکب ہوگئی۔ کچھ عربی کچھ ہندی۔ مرکب ہونے پر یاد آیا کہ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ صاحب فرماتے تھے کہ میں نے مکہ میں ایک ہندی عربی مرکب بچہ کو دیکھا کہ رو رہا تھا انا (میں) بازار جاؤں۔ غرض ماں کی ہندیت نے زبان کی عربیت کو ضائع کیا اور اصلی زبان برباد ہوگئی۔ اگر کوئی کہے کہ ہم تو مادری زبان کو اصلی سمجھتے ہیں تو میں کہوں گا کہ جب نسب باپ سے ہے تو کیوں باپ کی زبان کو اپنی اصلی زبان نہ کہا جائے۔

اردو زبان کونسی معتبر ہے:

غرض جب کہ ہماری اصلی زبان عربی ہے تو اگر ہمیں اردو میں آمیزش ہی کرنا تھی تو زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کر دیتے' انگریزی کے تابع کر دینے سے اور اس کے ملانے سے اردو زبان قریب قریب اردو ہونے سے ہی نکل گئی۔ اصل اردو زبان وہ ہے جیسے چہار درویش یا اردوئے معلیٰ غالب کی۔ اور اگ اس میں آمیزش ہو تو عربی کی آمیزش ہونا چاہیے کہ عربی کی آمیزش لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ دیکھو فارسی میں اگر کہیں ایک جملہ عربی کا آ جاتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پھول جھڑنے لگے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو انگریزی کے ملانے سے ایک جدت پیدا ہوگئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ اس میں ایک شرعی پہلو بھی ہے وہ یہ کہ اس کو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہونا ہے اور یہ مشابہت خود حرام ہے۔ حدیث شریف میں ہے من تشبہ بقوم فھو منھم (جو دوسری قوموں سے مشابہت کرے وہ ان میں ہی محشور ہو گا) کیونکہ تشبہ میں لباس اور طرز سب چیزیں شامل ہیں ممکن ہے اس دلیل کے بیان

کرنے کی وجہ سے کوئی شخص مولویوں کی متعصب کہے۔ لیکن ہم کو اس کی بالکل پرواہ نہیں کیونکہ ہم اپنے موقف پر پختہ مضبوط دلائل سے اس کا برا ہونا ثابت کر چکے ہیں یہ حدیث تو اپنے ماننے والوں کے لیے پڑھی گئی ہے۔ ورنہ یہ مسئلہ اپنی جگہ سب پر حجت ہے کہ دوسری قوموں سے مشابہت جائز نہیں۔ دیکھو اگر کوئی مرد زنانہ جوڑا پہن کر مردوں میں آ بیٹھے تو اس کو برا بر کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اس نے سوائے تشبہ کے کس کام کا ارتکاب کیا ہے۔ غرض اس وقت تقریروں میں یہ تمام خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ پس جن تقریروں میں اصول شرعیہ کا لحاظ نہ ہو۔ ایسی تقریروں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اور ثابت ہو گیا کہ کثرت بیان کی تعلیم ظاہری وجود جیسے خلقت انسان پر موقوف ہے۔ اس لیے آیت میں پہلے خلقت انسان کا رحمت ہونا ذکر فرمایا پھر تعلیم قرآن کا کیونکہ ان دونوں رحمتوں کے بعد ہی بیان کی تعلیم قابل اعتماد اور معتبر طریقہ پر پائی جاسکتی ہے کیونکہ بیان کی غایت عمل ہے اور عمل وہی معتبر ہے جو تعلیم قرآن کے مطابق ہو جس میں حدیث وفقہ بھی شامل ہیں کیونکہ قرآن مثل بنیاد اور متن کے ہے اور سب علوم شرعیہ اس کی شرح ہیں کوئی حکم صاف صاف الفاظ قرآن سے سمجھ میں آ جاتا ہے اور بعض حکم غور کرنے اور تدبر اور تفکر سے سمجھ میں آتے ہیں چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی میں نے سنا ہے کہ (پیشانی کو کشادہ ظاہر کرنے کے لیے) بال نوچنے والی عورت کو لعنت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جس پر قرآن لعنت کرے میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں۔ کہنے لگی میں نے تو تمام قرآن پڑھا اس میں تو یہ نہیں ہے آپ نے فرمایا: لو قراتیه لو جدتیه یعنی اگر تو سمجھ کر پڑھتی تو اس میں یہ مسئلہ مل جاتا کیونکہ ان افعال کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور قرآن میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو حکم دیں اس کو قبول کرو۔ اس طرح یہ حکم بھی قرآن کا حکم ہو گیا۔ جیسا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو قرآنی حکم فرمایا اور خود قرآن میں بھی ہے فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ جب ہم قرآن کو پڑھیں (فرشتہ کی زبان سے) تو اس کی قراءت کا اتباع کیجئے۔ یعنی خاموشی کے ساتھ سنیے پھر ہمارے ذمہ اس کا بیان ہے ہم اس کی مطالب آپ کو سمجھا دیں گے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے قرآن کے اجمال کو ظاہر فرما دیا یعنی مشکل باتوں کو سمجھا دیا۔ اگر کہیں احادیث میں بھی اشکال یا اجمال رہا۔ اس کو حضرات مجتہدین نے ظاہر فرمایا دیا۔ یہاں تک کہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا پورا ظہور ہو گیا کہ (کامل کر دیا ہم نے تمہارے لیے دین کو) اس کے بعد پھر کوئی حاجت اجتہاد کی نہیں رہی۔ اس لیے چوتھی صدی کے بعد قوت اجتہاد یہ کا بھی خاتمہ ہو گیا...... کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

حق تعالیٰ جس چیز کی جب تک ضرورت ہوتی ہے پیدا کرتے ہیں ضرورت کے بعد پیدا نہیں فرماتے:

خدا تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ ضرورت کے وقت کسی چیز کو پیدا فرماتے ہیں اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا جب وہ پیدا ہو چکے تو ان کی پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا جب ایک جوڑا پیدا ہو گیا تو اب مٹی اور پسلی سے پیدا کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا اور مرد عورت کے تعلق سے سب لوگ پیدا ہونے لگے۔ رہا عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا وہ معجزہ کے طور پر تھا۔ یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا اور مخلوقات میں بھی ہے میں نے ایک ڈاکٹر کا قول دیکھا ہے وہ لکھتا ہے کہ بارش اس لیے کم ہو گئی کہ درخت کٹ کٹ کر کم ہو گئے۔ زیادہ بارش ہونے کی تدبیر یہ ہے کہ جہاں جہاں درخت کم ہیں۔ ہاں بہت کثرت سے درخت لگائے جائیں۔ اس ڈاکٹر نے تو اس کی وجہ خدا جانے کیا سمجھی ہوگی۔ لیکن راز اس میں یہی ہے کہ جب درخت نہ رہے تو بارش کی زیادہ ضرورت نہ رہی اور جہاں درخت زیادہ ہیں وہاں بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ رہی زراعت کی ضرورت' اس کا کام نہروں سے نکالنے لگے ہیں تو بارش سے اس کا تعلق بھی کم ہو گیا۔ غرض ہم تو مانتے ہی ہیں سائنس اور فلسفہ بھی اس کو مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز ضرورت کے وقت پیدا فرماتے ہیں...... مدت ختم ہو جانے پر پیدا نہیں فرماتے آیت وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَاسَاَلْتُمُوْہُ کا یہی مطلب ہے۔ ترجمہ (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) اور جو چیز تم نے مانگی تم کو ہر چیز دی۔ یعنی تمہاری ضرورت کو اللہ تعالیٰ پورا فرماتے ہیں خواہ

زبان سے مانگو یا تمہاری حالت کا تقاضا ہو۔ اسی قاعدہ کے مطابق جب تک اجتہاد کی ضرورت تھی اجتہاد کی قوت پیدا ہوتی رہی جب تمام احکام ترتیب کے ساتھ جمع ہو گئے تو یہ قوت ختم ہوگئی یہی حالت قوت حافظہ کا ہے کہ جس زمانہ تک ضرورت تھی اس وقت تک قوت حافظہ کمال درجہ کی عطا ہوتی رہی۔ حتی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سو شعر کا قصیدہ ایک دفعہ سن کر یاد ہو جاتا تھا۔ حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جب نابینا ہو گئے تو ایک مرتبہ آپ کو سفر کا اتفاق ہوا ایک مقام پر پہنچ کر آپ نے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے سر جھکا لیا اونٹ والے نے اس کا سبب پوچھا آپ نے فرمایا یہاں پر ایک درخت ہے اس میں ٹکر لگتی ہے۔ اونٹ والے نے کہا یہاں تو کوئی درخت نہیں۔ آپ نے اونٹ کو وہیں رکوا دیا اور فرمایا کہ میرا حافظہ اس قدر کمزور ہو گیا ہے تو میں آج سے حدیث بیان کرنا چھوڑ دوں گا۔ قریب کے گاؤں میں بھیج کر تحقیق کرایا۔ اکثر نے وہاں درخت ہونے سے انکار کیا لیکن بعض بوڑھوں نے تصدیق کی کہ تقریباً بارہ سال پہلے یہاں درخت تھا اس کو کاٹ دیا گیا ہے۔ جب ان کے حافظہ کی تائید ہوگئی تب آگے بڑھے۔ اسی طرح ابوداؤد میں ایک قصہ ہے۔ ایک راوی بیان کرت ہیں کہ میں نے ایک اعرابی سے حدیث سنی تھی مدت کے بعد مجھے خیال ہوا کہ اس کے حافظہ کا امتحان کرنا چاہیے۔ چنانچہ راوی اس کے پاس گئے اور جا کر وہ حدیث پوچھی اس نے وہ حدیث بتلائی اور کہا تم میرا امتحان کرتے ہو۔ میرا حافظہ اس قدر قوی ہے کہ میں نے ستر حج کیے ہیں اور ہر سال نئے اونٹ پر حج کیا اور مجھے یاد ہے کہ فلاں سال فلاں اونٹ پر حج کیا تھا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لے گئے وہاں کے عالموں نے آپ کا امتحان کرنا چاہا اور سو حدیثیں الٹ پلٹ کر کے آپ کے سامنے پڑھیں آپ ہر حدیث پر لا اعرف فرماتے رہے کہ میں اس حدیث کو نہیں جانتا جب وہ لوگ اپنا کام ختم کر چکے تو آپ نے ان سب احادیث کو جو انہوں نے سنائی تھیں اسی طرح نقل فرما دیا اور ساتھ ساتھ تصحیح کرتے گئے کہ اَمَّا الْاَوَّلُ فَهُوَ كَذَا وَاَمَّا الثَّانِیْ فَهُوَ كَذَا۔ کہ اول حدیث صحیح اس طرح پر ہے اور دوسری اس طرح پر۔ پھر جب حدیثیں کتابوں میں جمع ہوگئیں اور اس قدر حافظہ کی ضرورت نہ رہی تو قوت حافظہ کم ہونا شروع

ہوگئی۔ پس اجتہاد دین کے کامل مکمل ہونے کے بعد ہوا ہے۔ اور ان کا یہ اجتہاد دین کے کامل مکمل ہونے کے بعد ہوا ہے اور ان کا یہ اجتہاد قرآن وحدیث کے احکام کا ظاہر کرنے والا ہے۔ اور مقلد پر ان کا اتباع ضروری ہے۔ پس علم القرآن سے مراد شریعت کا ہر حکم ہے خواہ وہ بواسطہ ثابت ہو یا بلا واسطہ اس کا ثبوت اس واقعہ سے بالکل صاف طور سے ظاہر ہو جاتا ہے ایک مرتبہ ایک مقدمہ کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا قضی بینکما بکتٰب اللّٰہ۔ ترجمہ کہ میں تمہارا کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا اور پھر وہ فیصلہ حدیث کے موافق تھا۔ قرآن میں اس کا ذکر صراحۃً نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو حکم حدیث کے موافق ہو وہ بھی قرآن ہی کا حکم ہوگا کیونکہ حدیث قرآن کا بیان اور اس کی شرح ہے۔

قوتِ بیانیہ بڑی نعمت ہے:

انسان علم کی بدولت مقبول بندوں میں داخل ہو سکتا ہے اور علم نعمت بیانیہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہمارے حضرات سلف صالحین علوم کو بیان فرما کر مدون نہ کر جاتے تو ہم کچھ بھی خبر نہ ہوتی۔ ایسے ہی ہم اگر دوسروں کو نفع پہنچانے کے لیے تحریر وتقریر میں پوری مہارت حاصل کرلیں تب ہی دوسروں کو علم پہنچا سکتے ہیں اور جن کو تحریر وتقریر نہیں آتی ان سے بہت کم نفع پہنچتا ہے۔ پھر بہ نسبت تحریر کے تقریر میں مہارت پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت ہے تحریر سے تو پڑھے لکھوں کو ہی نفع پہنچتا ہے اور تقریر سے سب کو پہنچتا ہے۔ پھر بیان سے نفع پہنچنے کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک درس وتدریس یعنی پڑھنا پڑھانا' اس سے تو صرف طلباء کو نفع پہنچتا ہے۔ دوسرے وعظ جس کا نفع طلباء اور عوام سب کو پہنچتا ہے۔ اور یہ نفع اس پر موقوف ہے کہ بقدر ضرورت قوت بیانیہ حاصل ہو اس لیے ہمارے طلباء کو درس وتدریس اور وعظ دونوں کی تکمیل اور مشق کی ضرورت ہوئی۔

وعظ اور تقریر وتدریس کے آداب:

یعنی جب وعظ کہا جائے تو ایسا عالم فہم اور کھول کر بیان کیا جائے کہ عوام الناس پوری طرح سمجھ جائیں اور سبق کو سمجھایا جائے تو ایسا کہ طالب علم اس کو خوب سمجھ لیں جو کتابیں سبقاً پڑھائی جاتی ہیں ان میں بعض تو صرف ونحو منطق ومعانی وغیرہ کے علوم ہوتے

ہیں جو مقصود نہیں مگر علم مقصود کا وسیلہ ہیں۔ ان کی تقریر اس طرح کرائیں کہ کتاب کی عبارت پڑھائی اور اس کے مضامین کو حل کر دیا۔ زیادہ طول نہ دیا جائے اس میں علاوہ صفائی تقریر کے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ان کو پڑھانے کا طریقہ معلوم ہو جائے گا۔ ہمارے بزرگوں کا پڑھانے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ حضرات محض کتابوں کو حل کرادیتے تھے اور زیادہ کچھ نہ بتلاتے تھے البتہ کوئی خاص بات بتلانا ضروری ہوئی تو اس کو بیان فرمادیتے تھے اور اگر پڑھانے میں کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تو صاف کہہ دیتے کہ یہ مقام ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ طریقہ حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے موروث چلا آتا ہے۔ اس میں ایک نفع یہ ہے کہ طالب علم کو مدرس پر ہمیشہ بھروسہ رہتا ہے کہ مجھے جو کچھ بتلایا جا رہا ہے۔ صحیح ہے۔ ورنہ طالب علم کو مدرس پر ہٹ دھرمی کا شبہ رہتا ہے اور جھک جھک میں وقت بھی خراب ہوتا ہے اور طالب علم بدخلقی سیکھتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنی غلطی یا لاعلمی کے اقرار سے طالب علم بگڑ جاتا ہے یہ محض لغویات ہے بلکہ وہ اور سنور جاتا ہے اور بدخلقی سے محفوظ رہتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ غرض کہ درس اور تقریر کے وقت نفس مطلب بیان کریں اور زیادہ تحقیقات و بالکل حذف کر دیا۔ کیونکہ یہ تقریریں کتاب پڑھانے کا طریقہ بتلانے کے لیے کہ جاتی ہیں۔ طبیعت کے جولانیاں دکھلانے کے لیے نہیں۔ پھر درس کے وقت جو فضولیات بیان کی جاتی ہیں۔ وہ یاد بھی نہیں رہتیں اور وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ مولانا محمد صدیق مرحوم گنگوہی کہتے تھے کہ جب میں دہلی مدرس ہو کر گیا تو ولایتی طالب علم میرے سپرد ہوئے اور سلم شروع ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ تحقیق سے پڑھو گے یا سیدھا سادھا' کہنے لگے ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے۔ میں نے رات کو بہت کتابیں دیکھ کر صبح کو نہایت تحقیق سے پڑھایا دوسرے دن میں نے پھر یہی سوال کیا' انہوں نے کہا ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے۔ میں نے کہا کہ اگر تحقیق سے پڑھو گے تو کل میں نے جو کچھ بتلایا تھا اس کو میرے سامنے بیان کردو۔ تاکہ مجھے یہ اندازہ ہو کر تم میں تحقیق سے پڑھنے کی قابلیت ہے یا نہیں یہ سن کر سب کے سب میرا منہ تکنے لگے اور ایک بھی بیان نہ کر سکا' تب میں نے ان سے کہا کہ تم نے باوجود یہ کہ مجھ سے یہ تقریریں

سنی ہیں، دوبارہ بیان نہ کر سکے اور میں نے باوجودیکہ اس مقام پر استاد نے یہ تقریریں نہیں کی تھیں، پھر بھی تحقیقات بیان کر دیں آخرت اس کا کیا سبب ہے؟ معلوم ہوا کہ اصل چیز استعداد کا پیدا ہونا ہے جو کتاب کا مطلب سمجھ لینے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان تقریروں سے استعداد پیدا نہیں ہوتی اس لیے کتاب کے اصل مطلب کو خوب سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تب وہ سمجھے اور کتاب کے سمجھا دینے پر کفایت کی۔

غرض کہ مدرس کے لیے لیکچر کا طرز بہت مضر ہے۔ میں نے ایک طالبعلم کو دیکھا کہ وہ ایک مبتدی کو میزان پڑھا رہا ہے اور اس کے خطبہ میں الف لام کی قسمیں بیان کر رہا ہے۔ میں نے کہا مولوی صاحب اس غریب کا کیوں راہ مار رہے ہو۔ یہ ان سب مضامین کو میزان کا جزو سمجھے گا اور مشکل سمجھ کر میزان ہی کو چھوڑ دے گا۔ خود میں نے اپنے پڑھانے کا ہمیشہ یہی طرز رکھا کہ کتاب کو حل کر دیا۔ زائد باتیں کبھی بیان نہیں کیں اور وہ بھی اس طرح کہ بڑے بڑے مشکل مقامات بھی طالب علموں کو مشکل نہیں معلوم ہوئے۔

صدرا فلسفہ کی کتاب ہے اس میں مثناۃ بالتکریر کی بحث مشہور ہے۔ کانپور میں مولوی فضل حق صاحب ایک طالب علم مجھ سے صدرا پڑھتے تھے جس دن یہ مقام آیا تو میں نے معمولی طور سے اس کی تقریر کر دی۔ جب انہوں نے سمجھ لیا تو میں نے بتلایا کہ یہ وہی مقام ہے جو مثناۃ بالتکریر کے لقب سے مشہور ہے ان کو بڑا تعجب ہوا کہنے لگے یہ تو مجھ بھی مشکل نہیں۔ تو بڑی کوشش اس کی ہونی چاہیے کہ کتاب کو پانی کر دے۔ یہ طریقہ تو فنون اور علوم عالیہ کے پڑھانے کا ہے جو مقصود نہیں محض وسیلہ ہیں۔

اب رہے مقاصد یعنی علوم دینیہ تفسیر و حدیث اور فقہ کی تعلیم۔ اس میں دونوں طرز کی تعلیم کی مشق ہونا چاہیے۔ ایک وقت نفس مطلب سمجھانے پر اکتفاء کرے اور ایک وقت طرز عام کے موافق خوب تفصیلی تقریر ہو تاکہ ہر پہلو سامنے آ جائے۔ الحمدللہ! ضروری سب باتیں آ گئیں اور اس جلسہ کا نام تعلیم البیان بہتر معلوم ہوتا ہے۔

آج کل مجلسوں اور جلسوں کا نام نئے طرز کا رکھتے ہیں:

آج کل لوگوں کو یہ بھی خبط ہے کہ کوئی کام شروع کریں گے تو نام نیا اور نرالا تجویز

کرتے ہیں، اسی خبط کی بدولت اہل ندوہ کو بڑی لغزش ہوئی کہ علماء کی مجلس کا نام ''ندوہ'' تجویز کیا۔ جو جاہلوں کے سردار دشمن خدا ابوجہل کی مجلس مشورہ کا نام تھا۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور آپ کے دین کی اشاعت کو روکنے کی تدابیر پر بھی غور کیا جاتا اور مشورے کیے جاتے تھے۔

تقریروں کے اندر اخلاص کی تعلیم اور نئے طرز کی تقریر سے ممانعت:

اب بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر کر دیا جائے کہ بیان اور وعظ سے غرض احکام کی تبلیغ ہونی چاہیے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **من تعلم صرف الکلام لیسبی به قلوب الناس لم یقبل الله منه صرفا ولا عدلا** ترجمہ: جو شخص کلام کے ہیر پھیر کو اس لیے سیکھے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے قلوب کو مسخر کرے گا تو خدا تعالیٰ اس کے کسی عمل کو نفل ہو یا فرض قبول نہیں فرمائیں گے۔ دیکھیے حضور ﷺ کے زمانہ میں کوئی تعلیم بیان کی مجلس یا انجمن نہیں تھی۔ لیکن حضور ﷺ نے اس کا بھی انتظام فرما دیا۔

یہ حدیث بیان اور وعظ سے بری غرض پر تنبیہ کے لیے بہت کافی ہے اور اب کلام مجید میں علمہ البیان سے علم القرآن کو پہلے بیان کرنے کی غرض زیادہ وضاحت سے معلوم ہوگئی کہ بیان اسی وقت حقیقی اور صحیح ہوسکتا ہے کہ جب علم قرآن بھی ہو۔ تاکہ اخلاص اور خودغرضی میں امتیاز ہو۔ میں طلب علموں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل جو تقریروں کا نیا طرز ایجاد ہوگیا ہے اس کی زیادتر غرض جاہ وقعت اور قبول عام ہوتی ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ الفاظ پرشوکت ہوں۔ بندش چست ہو اس نے خاک نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تقریروں کی ہستی صرف اتنی ہوتی ہے۔ جیسے مشہور ہے کہ ایک منہار چوڑی کی پوٹ لیے جاتا تھا۔ ایک گنور نے اس میں لاٹھی ماکر کر پوچھا اس میں کیا ہے۔ کہنے لگا کہ ایک اور مار دو تو کچھ بھی نہیں۔ برخلاف پرانی تقریروں کے کہ اگر ان پر پچاس چوٹیں بھی ماریں ان کے اثر اور قوت میں ذرا بھی کمی نہیں آئے گی۔ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت بے باکی اور آزادی سے تقریر کرنا بھی ناپسندیدہ ہے۔ حدیث میں ہے: **الحیا[1] والعی شعبتان من**

[1] ترجمہ حیا اور کم گوئی ایمان کی دو شاخیں ہیں اور بے حیائی اور بہت بولنا نفاق کی دو شاخیں ہیں۔۱۲۔

الایمان والبیان شعبتان من النفاق۔ یہاں حیاء کو بذا کے مقابلہ میں اور عی کو بیان کے مقابلہ میں بیان کیا گیا ہے اور حیاء اور عی کو ایمان کی شاخ بتلایا اور بذا و بیان کو نفاق کا شعبہ فرمایا۔ اور حیا کبھی مخلوق سے ہوتی ہے کبھی خالق سے۔ یہاں خالق سے۔ یہاں خالق سے حیا مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیان کرتے ہوئے ہر لفظ پر یہ سوچے کہ کہیں شریعت کے خلاف کوئی بات زبان سے نہ نکل جائے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو بیان حدود شرعیہ سے نکل جائے وہ علمہ البیان میں داخل نہیں۔ اس لیے کہ یہاں بیان کو رحمت اور نعمت کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور رحمت و نعمت وہی بیان ہو سکتا ہے جو شریعت کے موافق ہو اور جو شریعت کے خلاف ہو وہ نعمت نہیں اس لیے اس سے بچنا چاہیے اور ایسے ہی اسی وعظ کو پسند کرنا چاہیے جس میں لفاظی کی بجائے سادگی اور خشیت ہو۔

خاتمہ و دعا

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہر امر میں شریعت کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العلمین۔

❁❁❁

(۳۸) گناہ کا نقصان

منتخب از مضار المعصیۃ وعظ دہم جلد پنجم دعوات عبدیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ:

جناب سرور کائنات رسول اللہ ﷺ روزہ دار کے متعلق فرماتے ہیں۔ مَنْ لَّمْ يَدْعُ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلِ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدْعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (ترجمہ) جو شخص نہ چھوڑے جھوٹ بات کو اور اس پر عمل کرنے کو تو خدا تعالیٰ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنے کھانے پینے کو چھوڑ دے۔'' یہ عبارت ایک حدیث کا ٹکڑا یاد پڑتا ہے یا یہ پوری حدیث ہے یا اس کے قریب قریب الفاظ ہوں۔ بہر حال یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے روزہ دار کے بارہ میں جیسا ابھی اوپر ترجمہ سے معلوم ہو گیا۔ اور اگر چہ رمضان سے پہلے ایک اور جمعہ بھی آنے والا ہے۔ جس میں رمضان کے متعلق بیان کرنا مناسب تھا۔ مگر وہ جمعہ غالباً سفر میں آئے گا۔ اس لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ آج ہی رمضان کے متعلق کچھ مختصراً اور ضروری مضمون بیان کر دیا جائے۔ اور اتفاق سے اس کے ساتھ ہی ایک اور مضمون بھی جس کا پہلے سے وعدہ تھا بیان ہوگا۔ اس مضمون کا خیال بہت دنوں سے تھا۔ مگر خدا تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ وہ مضمون ذرا عام فہم نہ ہونے کے سبب ایک ایسے مضمون کے ساتھ جو کہ عام فہم بھی ہے اور دلچسپ بھی ہے بیان ہو جائے۔

گناہوں سے طاعت کی برکت کم ہو جاتی ہے:

اور وہ مضمون یہ ہے کہ میں نے ایک مرتبہ یہ بیان کیا اور اجمالی طور پر یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ مانا کہ عبادتوں کا صحیح ہونا اس پر موقوف نہیں کہ گناہ کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔ اور یہ

بات نہیں کہ گناہ کے کام کرتے ہوئے طاعت صحیح نہ ہو۔ لیکن طاعت کی برکت ضرور کم ہو جاتی ثواب کم ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص نماز بھی پڑھتا ہو اور غیبت بھی کرتا ہو تو یہ نہ کہیں گے کہ غیبت کی وجہ سے نماز صحیح نہیں ہوئی۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہو جاتا ہے کہ جب گناہ نہ چھوڑے تو طاعت سے کیا فائدہ؟ اور پھر گناہ کو یہ لوگ اپنے نزدیک ترک کرنا دشوار سمجھتے ہیں اس لیے طاعت ہی کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور گناہ کو چھوڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔ دیکھئے یہ کتنا بڑا ضرر ہے ایسے لوگوں کو طاعت کی بھی توفیق ہو ہی نہیں سکتی۔ بلکہ ایمان کو بھی چھوڑ دیں تو کچھ تعجب نہیں۔ کیونکہ گناہ کرتے کرتے اگر یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اب نجات تو ہو ہی نہیں سکتی پھر ایمان کی کیا ضرورت ہے تو کیا بعید ہے۔

گناہ کرنے سے طاعت کا ثواب نہ جائے گا:

پس اس لیے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت ہوئی کہ اگر گناہ بھی کرے اور عبادت بھی تو گناہ کی سزا الگ رہے گی اور عبادت کی جزا الگ ملے گی یہ نہ ہوگا کہ گناہ سے عبادت بالکل بے کار ہو جائے گی اور اس کا ثواب نہ ہوگا۔ اس لیے عبادت کے ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس مضمون کے بیان کرنے کا سبب بعض لوگوں کا وہ اعتقاد ہے جو ابھی اور مذکور ہوا اور نہ بظاہر اس مضمون کا بیان کرنا بھی لوگوں کی بے فکری کو دیکھ کر مناسب نہ تھا۔ کیونکہ اگر اعتقاد رہتا کہ گناہ کرنے سے عبادت صحیح نہ ہوگی تو شاید اس کی بدولت گناہ کو چھوڑنے کی کوشش کرتے۔ اور اس سے بچ جاتے' توبہ کر لیتے تاکہ عبادت صحیح ہو جائے اور بیان کرنے میں اندیشہ ہے بے فکر ہو جانے کا کہ جب عبادت بغیر گناہ کے ترک کرنے کے بھی صحیح ہو جاتی ہے تو پھر گناہ کو چھوڑنے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ لیکن پہلی صورت میں مایوسی کا قوی اندیشہ ہے۔ اور مایوسی کا ضرر بہت بڑا ہے۔ کیونکہ اگر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ گناہ کی حالت میں میری سب عبادتیں بے کار ہیں تو گناہ تو کرتا رہے گا اور ضروری ضروری کام بھی جیسے نماز روزہ سب چھوڑ بیٹھے گا تو دیکھئے کہ یہ کتنا بڑا ضرر ہے۔ اور بے فکری میں ایسا زیادہ اندیشہ نہیں۔ کیونکہ اس میں زائد سے زائد یہ ہوگا کہ گناہوں کے چھوڑنے کی توفیق نہ ہوگی۔ لیکن دین کے ضروری ضروری کام تو انشاء اللہ کرتا

ہی رہے گا جن سے اسلام کی رونق اور شان ہے اور مایوسی کی حالت میں نماز روزہ وغیرہ پر اثر پڑتا ہے۔ کہ ان کو چھوڑ بیٹھے گا۔ یہ تو مایوسی کا عمل پر اثر ہے کہ اسلام کی رونق جاتی رہے گی۔ اور اعتقاد پر اثر یہ ہوگا کہ رحمت خداوندی اور بخشش سے مایوس ہو جائے گا۔ کیونکہ گناہوں کی پوٹ ہر وقت نظر کے سامنے ہوگی اور نیکی کوئی بھی پیش نظر نہ ہوگی اس لیے شیطان مایوس کر دے گا کہ نجات کی کوئی صورت نہیں اور اس مایوسی کی حالت میں اگر خاتمہ ہو گیا تو کفر پر خاتمہ ہوگا۔ اور یہ شخص اپنے گناہوں سے توبہ بھی نہ کرے گا کیونکہ نجات سے بالکل ناامید ہو چکا ہے تو تلافی کی کوئی صورت نہ رہے گی بعض لوگوں کو یہ بات پیش بھی آئی ہے۔ "الجواب الکافی" ایک کتاب ہے اس میں حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص سے مرتے وقت کہا گیا کہ کلمہ پڑھ لے تو اس نے کہا کہ ایک کلمہ سے کیا ہوگا۔ میرے گناہوں کی پوٹ اتنی ہے کہ ایک کلمہ اس کو میرے سر سے اتار نہیں سکتا۔ تو دیکھئے اس اعتقاد کا یہ ضرور کتنا سخت ہے کہ کفر پر خاتمہ ہونے کی نوبت آ جاتی ہے۔ اس لیے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت ہوئی اور یہیں سے ان وعظ کہنے والوں کی غلطی بھی معلوم ہوگئی ہوگی۔ جن میں بے حد تشدد اور سختی ہے اور اپنے تشدد کی وجہ سے صرف سخت سخت مضامین لوگوں کو سناتے ہیں۔ رحمت اور مغفرت کے مضامین بہت کم بیان کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سامعین کو بالکل ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ڈرایا ہی نہ جائے۔ مگر سختی اور تشدد کی بھی ایک حد ہونی چاہیے اس وقت عام طور پر لوگوں کے دل ضعیف ہیں۔ زیادہ سختی کرنے سے مایوس ہو جاتے ہیں نیک کاموں کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے طاعت کی توفیق نہیں ہوتی تو آج کل زیادہ سختی کرنا کچھ مفید نہیں۔ بلکہ ان کو اگر خوش کر کے ابھارا جائے تو ان سے نیک کاموں کی زیادہ توقع ہے اور مایوس کر کے کوئی کام ان سے نہیں لیا جا سکتا' اس لیے یہ ضروری ہے کہ لوگوں کے دلوں سے یہ خیال نکال دیں کہ گناہ کرنے سے نیکی کا ثواب نہیں ملتا بلکہ برابر ملتا ہے۔ البتہ برکت کم ہو جاتی ہے۔ یہ مضمون تھا تو اس قابل کہ اس کو مستقل اور جداگانہ بیان کیا جاتا۔ لیکن اتفاق سے آج کے مضمون کے ساتھ بیان کیا گیا آج کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص روزہ کے درمیان میں

جھوٹ اور برے کام کو نہ چھوڑے تو خدا تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے یعنی جب کام گناہ کا اور بات گناہ کی نہ چھوڑے تو کیا فائدہ روزے کا ہوا تو میرے اس وعظ میں تین مضمون بیان ہوں گے۔ ایک یہ کہ گناہ کرنے سے نیک کاموں کا ثواب ضائع نہیں ہوتا۔ دوسرا مضمون (جو اس وقت اصل مقصود ہے) یہ کہ گناہ کے ہوتے ہوئے نیک کاموں پر ثواب تو ضرور ملتا ہے۔ مگر ان کی برکت کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً غیبت کی اور پھر نماز بھی پڑھی تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ نماز صحیح نہیں ہوئی یا اس کا ثواب نہیں ملا۔ لیکن نماز کی برکت ضرور کم ہو جائے گی۔ یعنی جو نورانیت غیبت کرنے کی حالت میں نماز کے اندر ہوتی وہ نورانیت اب غیبت کرنے کے وقت نہ ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے غذا اگر قوی تندرست کھائے تب بھی نافع ہوگی، بدن کو لگے گی۔ اس سے قوت حاصل ہوگی اور مریض کھائے تب بھی۔ لیکن تندرست کو زیادہ نافع ہوگی اور بیمار کو کم یا جیسے اگر خمیرہ گاؤ زبان عنبری کسی ایسے شخص کو کھلایا جائے جس کا معدہ خراب ہو اور ابھی تک صاف نہ ہوا ہو تو زیادہ مفید نہ ہوگا۔ اگرچہ تھوڑا بہت اثر ضرور ہوگا اور اگر صاف کرانے کے بعد کھایا جائے تو بے حد مفید ہوگا۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ گناہوں کو چھوڑنے کے بعد جو جو نیک کام ہوں گے ان میں زیادہ برکت ہوگی۔ تیسرا مضمون وہ ہے جو حدیث میں صاف طور پر موجود ہے کہ جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا نہ چھوڑے تو اس کو روزہ رکھنے سے کیا فائدہ ہوا۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ روزہ میں یہ بات ضروری ہے کہ جیسے منہ کھانے پینے سے بند رکھتے ہیں اسی طرح دوسرے گناہوں کو بھی بالکل چھوڑ دینا چاہیے عجیب بات ہے کہ لوگ روزہ میں کھانے پینے اور صحبت کے چھوڑنے کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور گناہ کے چھوڑنے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ حالانکہ وہ تینوں کام ایسے ہیں کہ دوسرے اوقات میں حلال بھی تھے۔ بلکہ بعض اوقات فرض اور ضروری ہو جاتے ہیں۔ اور خود رمضان میں بھی رات کے وقت جائز ہیں تو جب روزے کی وجہ سے بعض حلال و جائز کام بھی حرام ہو گئے تو جو کام ہر وقت حرام ہیں ان کا چھوڑنا روزے میں کیوں ضروری نہ ہوگا پس اگر کسی نے روزہ میں غیبت یا بری نگاہ سے کسی کو دیکھا یا اور کوئی گناہ کا کام کیا تو یہ تو نہ کہیں گے کہ اس کا

روزہ نہیں ہوا۔ مگر یہ ضرور کہیں گے کہ روزے کی برکت جاتی رہی یہ تیسرا مضمون تو اس حدیث میں صاف طور پر موجود ہے اور اسی سے دوسرا مضمون بھی ثابت ہوگیا کیونکہ جب گناہ سے روزہ پر جو کہ ایک نیک کام ہے یہ اثر ہوا کہ اس کی برکت جاتی رہی۔ تو دوسرے نیک کاموں پر بھی اس کا یہی اثر ہوگا کہ ان کی برکت جاتی رہے گی۔ یہ بات بہت واضح اور بالکل ظاہر ہے تو دوسرا اور تیسرا مسئلہ تو ثابت ہوگیا۔ اب صرف پہلے کی دلیل کی ضرورت رہی ہے۔

باوجود گناہوں کے نیک کاموں کا ثواب ملے گا:

تو پہلا مسئلہ یہ تھا کہ باوجود گناہ کے بھی نیک کاموں کا ثواب ملے گا۔ دلیل اس کی یہ آیت ہے: فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (ترجمہ) ''سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا۔ وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔''

پس اس آیت میں دو باتوں کا ذکر ہے جیسے ترجمہ سے معلوم ہوا ایک نیکی کرنے والوں کے متعلق ہے کہ جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ یہ حکم عام ہے خواہ وہ نیکی کرنے والا گنہگار ہو یا فرمانبردار ہو۔ اس سے صاف طور سے معلوم ہوا کہ نیک کام کرنے پر ہر حالت میں ثواب ملے گا کسی وقت میں اس کا ثواب ضائع نہ ہوگا۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے وہ یہ کہ وہ نیکی باقی بھی رہے مرتد اور بد دین ہو جانے سے مٹ نہ جائے کیونکہ مرتد ہو جانے سے نیکیاں مٹ جاتی ہیں۔ دوسری بات بدی کرنے والوں کے متعلق ہے کہ جو شخص بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ یہ حکم بھی عام ہے خواہ گنہگار ہو یا فرمانبردار ہو اس میں علاج ہے ناز کا۔ جیسے پہلی بات میں مایوسی کا علاج ہوگیا تھا خواہ وہ کیسا ہی گنہگار ہو لیکن رہے مسلمان تو نیکی کر کے اس کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ ثواب کی امید رکھنا چاہئے تو اس دوسری بات میں علاج ہے ناز کا۔ یعنی اگر کوئی بڑا ولی کامل بھی گناہ کرے تو اس کو بھی گناہ ہوگا وہ اپنی طاعت اور بندگی پر ناز نہ کرے۔

بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہم کچھ بھی کریں ہم کو گناہ نہیں ہوتا:

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ بھی کریں ہم کو گناہ نہیں ہوتا اگر واقعی ان کا اعتقاد یہی ہے تو کفر میں مبتلا ہیں کیونکہ ایسا اعتقاد کفر ہے یہ لوگ اپنی مثال ایسی سمجھتے ہیں کہ جیسے ایک دریا ہو کہ اس میں اگر پیشاب کے کچھ قطرے گر پڑیں تو وہ دریا ناپاک نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ قطرے ہی اس میں فناء ہو جاتے ہیں اور دریا پاک کا پاک رہتا ہے ان لوگوں نے اپنے مطلب کی تشبیہ تو خوب بیان کی' لیکن اس سے کوئی پوچھے کہ تم نے جو اپنے کو دریا سے تشبیہ دی ہے تشبیہ خود تمہاری تراشی ہوئی ہے یا قرآن وحدیث میں کہیں یہ تشبیہ ہے اگر قرآن وحدیث میں ہے تو بتلاؤ کہاں ہے؟ انشاء اللہ کہیں نہ ملے گی بلکہ اس کے خلاف ملے گا جیسے میں نے ابھی ایک آیت پڑھی ہے۔ اس میں اس کے خلاف حکم موجود ہے اور اگر اپنی تراشی ہوئی ہے اور تمہارے نزدیک ٹھیک ہے تو یہ بھی کرو کہ گورنمنٹ جس کی اب تک اطاعت کی ہے اب اس کی عملداری میں ڈکیتی ڈالو قتل کرو اور جب گرفتار ہو کر آؤ تو کہو کہ اب ہم دریا ہو گئے ہیں۔ جو کچھ بھی ہم کریں وہ ہمارے لیے جرم نہیں۔ اگر اس عذر کو سن کر سرکار چھوڑ دے تو خدا سے بھی امید رکھو اور جیسے خدا سے امید باندھے بیٹھے ہو کہ وہ ہم کو دریا سمجھ کر چھوڑ دے گا۔ ایسے ہی ڈکیتی ڈالنے اور قتل کرنے میں سرکار سے بھی امید رکھنی چاہیے۔ کچھ نہیں یہ سب نفس کے بہانے اور شرارتیں ہیں۔ واقع میں نہ کوئی دریا ہے اور نہ کسی کو اس کا دعویٰ کرنے کا حق ہے۔ حضور ﷺ جو کہ واقع دریا تھے۔ کیونکہ معصوم تھے اور جن کی مقبولیت کی یہ شان تھی کہ آپ ﷺ کے اطمینان کے لیے اگلے پچھلے گناہ سب معاف کر دیئے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے تو کبھی یہ دعویٰ کیا ہی نہیں تو آج کس منہ سے وہ اپنے کو دریا کہے۔ بلکہ حضور ﷺ اس مقبولیت کے باوجود یہ فرماتے تھے کہ: انی اخشاکم لِلّٰہِ واعلمکم باللّٰہِ۔ میں میں تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں..... اور تم سب سے زیادہ خدا کا علم رکھتا ہوں۔ حضور ﷺ نے اس جگہ خوف کے بعد جو علم کو فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو جو اتنا خوف تھا وہ علم معرفت کی وجہ سے تھا۔ اب جو لوگ خدا سے نہیں ڈرتے اس کا سبب یہی ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں' تو حضور ﷺ

نے کبھی اس دریا بننے کا دعویٰ نہیں کیا اور اس بنا پر کبھی کسی کا حق نہیں دبایا حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی کوکھ میں انگلی بطور ہنسی کے چبھودی تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں تو بدلہ لوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا بدلہ لے لو اور اپنی کوکھ میں انگلی بطور ہنسی کے چبھودی تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں تو بدلہ لوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا بدلہ لے لو اور اپنی کوکھ ان کے سامنے کردی۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا بدن تو کھلا ہوا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو کرتہ پہنے ہوئے ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً کرتہ اٹھا دیا وہ صحابی رضی اللہ عنہ فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلوئے مبارک سے چمٹ گئے اور بوسے دینے لگے اور عرض کیا یارسول اللہ میرا تو مقصود یہ تھا۔

لوگوں نے جو وفات نامہ میں حضرت قاشہؓ کی حکایت گھڑلی ہے وہ صحیح نہیں صحیح حکایت یہ ہے جو میں نے اس وقت بیان کی۔ ہمارے اطراف میں جتنی کتابیں قصوں کی عورتوں میں رائج ہیں سب گھڑی ہوئی ہیں۔ جیسے ساپن نامہ' معجزہ آل نبی' وفات نامہ۔ البتہ معجزہ ہرنی صحیح ہے۔ اس کے علاوہ جتنی کتابیں قصوں کی ہیں۔ خاص کر جن کا نام میں نے گنوایا ہے سب خرافات اور لغو ہیں۔ اور چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ اس قسم کی کتابوں میں ایک وہ مسدس بھی ہے جس کا ٹیپ کا مصرعہ یہ ہے کہ: ع ''مری بار کیوں دیر اتنی کری'' ...... یہ مسدس بھی نہایت لغو ہے اس کو بھی ہرگز نہ پڑھنا چاہیے اس ظالم نے شروع سے اخیر تک خدا تعالیٰ سے لڑائی کی ہے کہیں اس نے نبیوں کے نبوت مل جانے پر حسد کیا ہے کہیں بادشاہوں کی بادشاہت پر رشک کیا ہے۔ اور پھر ہر حسد کے بعد یہ شکایت کہ مجھے کیوں نہیں ملا۔ یہ کتابیں ہرگز اس قابل نہیں کہ اپنے پاس یا اپنے گھر میں رکھی جائیں۔ بلکہ اس قابل ہیں کہ ان کو بلا تامل آگ میں جلا دینا چاہیے۔ معجزہ آل نبی جس میں یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے کو کسی سائل کو دے دیا اور اس نے ان کو بیچ ڈالا' بالکل ہی غلط اور لغو ہے۔ اسی طرح حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کی حکایت جو مشہور ہے بالکل غلط اور سراسر جھوٹ ہے اصل اس کی صرف یہ ہے جو میں نے اوپر بیان کی غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہ اپنے کو دریا کہا اور نہ کسی کا حق رکھا۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

صحابیوں ﷺ نے کبھی اپنے کو اتنا بڑا نہیں سمجھا۔ وہ حضرات ہمیشہ لرزاں وترساں رہتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اتفاقاً اگر کسی پر سختی ہوگئی ہو تو ان حضرات نے اس کا بدلہ نہ دیا ہو۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بڑے درجے کے صحابی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ ملک شام میں اسلام لشکر کے افسر تھے۔ وہاں ایک موقعہ پر کسی عیسائی بادشاہ کی تصویر کھڑی تھی اور اس وقت وہاں کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی صلح تھی۔ مسلمان اس مقام پر نیزہ بازی کرنے جایا کرتے تھے۔ بعض مسلمانوں نے جوش میں آ کر اس تصویر کی آنکھ پھوڑ دی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو جب خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے کہلا بھیجا کہ میں راضی ہوں کہ وہ لوگ اس تصویر کے بدلہ میں میری آنکھ پھوڑ ڈالیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھا گیا کہ آپ اپنی زبان کو پکڑ کر کھینچ رہے ہیں اور فرمارہے ہیں: **هذا او ردنی الموارد** کہ اس نے مجھے بلاؤں میں پھنسایا۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا گیا کہ ایک مشکیزے میں پانی لے کر محلہ میں بھرتے پھرتے ہیں اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ ایک شخص نے آ کر میری تعریف کی تھی میں نے غور کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ نفس اس تعریف سے خوش ہوا اس لیے اس کا علاج کر رہا ہوں۔ غور کیجیے ان دونوں صاحبوں نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم تو دریا ہیں جو کچھ بھی کریں سب معاف ہیں ایسا ہی ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس وقت یاد آیا کہ ایک مرتبہ آپ نے کرتہ پہنا اور اس کی آستینیں کاٹ ڈالیں پوچھا گیا تو فرمایا کہ جب میں نے اس کو پہنا تو مجھے یہ اچھا معلوم ہوا اور طبیعت اس میں مشغول ہوئی۔ اس لیے میں نے اس کی آستینیں پھاڑ ڈالیں تاکہ یہ بدنما ہو جائے۔ اب یہ حالت ہے کہ اگر کہیں بخیئے میں بھی کمی رہ جائے تو کپڑا درزی کے سر پر مارتے ہیں۔ وہ حضرات اچھے کپڑے کو بھی خراب کر لیتے تھے۔ غرض کہ کسی کا یہ خیال کہ ہم دریا ہو گئے ہیں اور ہمیں گناہ سے ضرر نہ ہوگا۔ بالکل غلط خیال ہے۔ اس قسم کے لوگ اب بھی موجود ہیں اور پہلے بھی ہوئے ہیں......

حضرت جنید سے پوچھا گیا کہ بعض لوگ اپنی نسبت یہ کہتے ہیں کہ **نحن وصلنا فلاحاجة لنا الی الصلوٰة والصوم** یعنی اب ہم پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے ہم کو نماز

روزے وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ: صدقوا فی الوصول ولکن الی سقر۔ یعنی پہنچنے کو تو انہوں نے سچ کہا۔ لیکن دوزخ کی طرف پہنچے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر ہزار برس کی میری عمر ہو تو اخیر عمر میں بھی ایک وظیفہ بھی نہ چھوڑوں۔ غرض یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ہم جو کچھ کریں گناہ نہ ہوگا اور اب آیت میں: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ اس خیال کی خدا تعالیٰ نے جڑ کاٹ دی ہے کہ جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ لیکن اس وقت مقصود تو پہلی آیت ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر گنہگار بھی نیک کام کرے تو اس پر اجر ملے گا۔ رہا گناہ کا وبال۔ سو اگر وہ معاف نہ ہو تو الگ ہوگا جیسے کوئی حاکم اپنے عہدہ اور منصب کے کام کو انجام دے اور رشوت بھی لے تو اگر حکام بالا کو اطاع ہو جائے تو رشوت ستانی پر سزا ملے گی۔ لیکن جس وقت عدالت کا کام کیا ہے اس وقت تک کی تنخواہ بھی ضرور ملے گی تو پہلا دعویٰ اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ گنہگار کو بھی نیک کرنے کا اجر ملے گا۔

گناہ کرنے سے نیک عمل کی برکت ضائع ہونا' مع ایک مثال:

رہا دوسرا دعویٰ کہ گو گناہ سے خود نیک عمل تو ضائع نہیں ہوتا لیکن اس کی برکت اور نورانیت جاتی رہتی ہے۔ سو اس کی دلیل یہی حدیث ہے جس کا بیان ہو رہا ہے اور اس کے سوا اور بھی دلیلیں ہیں۔ کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ نے روزہ دار کے بابت فرمایا کہ اگر وہ گناہ نہ چھوڑے تو خدا تعالیٰ کو اس کا کھانا پینا چھوڑانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اس پر سب عالموں کا اتفاق ہے کہ گناہ کرنے سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔ اور اس کی قضا لازم نہیں آتی تو معلوم ہوا کہ اس حدیث کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ اس شخص کا روزہ نہ ہوگا۔ کوئی اور معنی ہیں۔ سو وہ یہی ہیں کہ خدائے تعالیٰ کو ایسے روزہ کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوتی۔ جس میں محض کھانا پینا ترک کر دیا جائے اور گناہ سے باز نہ رہا جائے۔ اور یہی حاصل ہے اس کہنے کا کہ ایسے روزے کی نورانیت اور رونق کم ہوگئی۔ پس جب اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جس روزے میں گناہ سے نہ بچا جائے اس کی برکت اور نورانیت کم ہو جاتی ہے تو اور نیک کاموں کا حال بھی یہی ہوگا کہ گناہ سے ان کی برکت جاتی رہے گی۔ اور یہ

بات مشاہدہ سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر نیک کام کیا جائے اور گناہوں سے بچتا نہ رہے تو اس وقت طاعت کی بدولت جو نور قلب میں پیدا ہوگا وہ گناہوں کے ساتھ ہرگز نہ ہوگا۔ اور وہ رونق اور راحت اور مسرت اور خوشی جو کہ طاعت کے کرنے سے ہوتی ہے وہ نہ ہوگی بلکہ ایسا ہوگا جیسا کہ بہت لذیذ کھانا پکایا اور اس میں تھوڑی راکھ جھونک دی تو راکھ جھونکنے کے بعد وہ کھانا تو رہا لیکن کرکرا ہوگیا۔ اسی طرح گنہگار آدمی نماز تو پڑھتا ہے۔ لیکن طبیعت اس کی پھیکی پھیکی رہتی ہے وہ نشاط جو نماز میں ہوتا ہے وہ اس کو نہیں ہوتا۔ چاہے نماز ہو جاتی ہو۔ اور اس پر ثواب ملنے کی بھی توقع ہو۔ لیکن قلب بالکل کورا ہوتا ہے معلوم ہوا کہ گناہ سے نیک کام میں اس قدر بے برکتی ہوتی ہے کہ جو ثواب ملتا ہے وہ نظر ہی نہیں آتا بلکہ گناہوں کی تاریکی میں چھپ جاتا ہے اس کی ایسی مثال سمجھئے کہ جیسے لالٹین کو روشن کر کے اوپر سے سیاہ کپڑا لپیٹ دو۔ اس صورت میں اسی کی روشنی اندر تو باقی رہے گی لیکن باہر اس قدر دھیمی ہو جائے گی کہ بعض اوقات راستہ تک نظر نہ آئے گا بلکہ وہ خود بھی نظر نہ آئے گی۔ البتہ بہت ہی کوئی تیز نظر والا ہو تو وہ دیکھیں لے گا یا کوئی دیکھ کر بتلا دے تو مان لیں گے۔ باقی خود کچھ نظر نہ آئے گا۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ شریعت نے ہم کو بتلا دیا ہے کہ گنہگار آدمی کو نماز کا ثواب ملے گا اس لیے ہم مانیں گے کہ اس کے اندر برکت اور روشنی ضرور ہے مگر اوپر سے گناہوں کی اس قدر مٹی پڑی ہے کہ وہ بالکل نظر نہیں آتی غرض کہ یہ بات صحیح ہے کہ گناہ سے نیک عمل ضائع نہیں ہوتا۔ لیکن ذرا اس میں تفصیل کی ضرورت ہے۔

گناہ کی دو قسمیں، اور ہر ایک کا طاعت پر کیا اثر؟

وہ یہ کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ بعض گناہ تو ایسے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے طاعت صحیح اور مقبول ہوتی ہے اور نہ باقی رہتی ہے۔ جیسے کفر کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی نیک عمل صحیح نہیں ہے اور نہ باقی رہتا ہے یعنی فرض کرو کہ اگر کوئی کافر نماز پڑھے تو صحیح نہیں اور اگر کوئی نماز پڑھ کر کافر ہو جائے تو وہ نماز باقی نہ رہے گی۔ ایسا ہی روزہ حج وغیرہ وغیرہ۔ یہاں سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو کہ کفریہ کلمات کی پرواہ ہی نہیں

کرتے۔ آپ صاحبان نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگوں کو جب روزہ رکھنے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں کھانے کو نہ ہو۔ یہ کلمہ بڑا سخت ہے۔ اگر کسی کے منہ سے یہ کلمہ نکل گیا تو وہ کافر ہوگیا۔ اس کا نکاح ٹوٹ گیا اس کا حج جاتا رہا۔ اس کو توبہ کر کے نکاح پھر کرنا چاہیے۔ پہلے سب عمل اس کے مٹ گئے جب تک اس سے توبہ نہ کرے۔ اس وقت تک اگر یہ کوئی نیک عمل آئندہ کو کرے گا تو بھی مقبول نہ ہوگا۔ کفر کے علاوہ ایک عمل اور بھی ہے کہ ایک آیت سے ثابت ہوگیا ہے کہ اس کا اثر بھی مثل کفر ہی کے ہے کہ اس سے بھی سب نیک عمل مٹ جاتے ہیں۔

حضور ﷺ کی شان میں بے ادبی کرنے سے اعمال برباد ہو جاتے ہیں:

اور وہ عمل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء پہنچائی جائے اور حضور ﷺ کی شان میں بے ادبی کی جائے چاہے اس کا قصد بھی نہ ہو مگر لاپرواہی سے اس کا خیال نہ رکھا جائے اور اس سے حضور ﷺ کا مرتبہ معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ کا خدا تعالیٰ کے نزدیک کتنا بڑا مرتبہ ہے مسلمانو! خدا تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے ایسی بڑی عزت عطا کی کہ حضور ﷺ کا متی بنایا وہ آیت یہ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (ترجمہ) ''اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبر (ﷺ) کی آواز سے بلند مت کیا کرو۔ اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہیں کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔'' اس آیت میں صاف موجود ہے کہ حضور ﷺ کی بے ادبی سے اعمال کے برباد ہونے کا قوی اندیشہ ہے اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہماری شریعت نے سلیقہ اور ادب بھی سکھلایا ہے۔

شریعت صرف نماز روزہ کا نام نہیں بلکہ معاشرت اور معاملات بھی اس میں داخل ہیں:

لوگ کہتے ہیں کہ شریعت میں سوائے نماز روزے کے اور رکھا کیا ہے۔ خدا کی قسم ان لوگوں نے اب تک اسلام کی حقیقت دیکھی ہی نہیں اور جو کچھ دیکھا وہ ایسا ہے جیسا کہ

کسی نے کسی حسین اور خوبصورت کا صرف ایک ناخن دیکھا ہو اور صورت شکل بالکل نہ دیکھی ہو تو اس کو اس کے حسن و جمال کا کیا اندازہ ہو گا۔ اس موقع پر ایک بہت اچھی مثال یاد آئی۔ اس سے ہماری حقیقت شناسی اور اصلی واقفیت کی پوری حقیقت کھل جائے گی۔

مشہور ہے اندھوں کے شہر میں ایک ہاتھی آ گیا تھا جب سنا تو اس کے دیکھنے کا شوق ہوا۔ لیکن آنکھیں تو تھی نہیں دیکھتے کیونکر؟ آخر سب اکھٹے ہو کر پہنچے اور اس کے قریب جا کر سب نے ہاتھ سے چھو کر اس کو دیکھا کسی کا ہاتھ تو سونڈ پر پڑا کسی کا پیر پر پڑا کسی کے ہاتھ میں کان آ گیا کسی نے دم پکڑ لی۔ دیکھ بھال کر آپس میں اس کی شکل کے متعلق گفتگو شروع ہوئی ایک نے کہا ایسا تھا جیسا کھمبہ ہوتا ہے دوسرے نے کہا نہیں بلکہ جیسا سانپ۔ تیسرے نے کہا نہیں بلکہ جیسے چھاج چوتھے نے کہا نہیں بلکہ جیسے مورچھل۔

مولانا رومی اس حکایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اگر وہاں کوئی بینا ہوتا کہتا کہ تم سب سچے ہو اور سب جھوٹے ہو سچے تو اس لیے کہ جس نے جو کچھ دیکھا وہی آ کر بیان کر دیا۔ اور جھوٹے اس لیے کہ اصل حقیقت کی خبر ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں ہوئی۔ پورا ہاتھی تو کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کا ایک عضو ٹٹول کر اسی کو پورا سمجھ کر بیان کر دیا۔ تو اس وقت مسلمانوں کی یہی حالت ہے کہ انہوں نے عام طور سے اسلام کو پورا نہیں دیکھا اس لیے سمجھتے ہیں کہ صرف وضو نماز ہی کا نام اسلام ہے اور بس۔ میں ایک مقام پر گیا وہاں ایک اسکول بھی تھا اور اس میں دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ جس کے لیے صرف راہ نجات پڑھائی جاتی تھی اور غضب یہ کہ اس کو کافی سمجھتے تھے حالانکہ راہ نجات میں دین کی بہت سی باتیں نہیں لکھی ہیں۔ میں نے کہا کہ صاحبو! اگر راہ نجات تمام ضروریات دین کے لیے کافی ہے تو بتلایئے اگر ایک شخص کے پاس سرسوں ہو اور ایک کے پاس تیل ہو اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بدلنا چاہیں تو اس کی کیا صورت ہوگی اور کیسے یہ بدلا جائے گا کیا راہ نجات میں اس صورت کے متعلق مسئلہ ملے گا۔ سن کر کہنے لگے کیا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے افسوس ہے کہ معاملات[1] کو اور معاشرت کو علی العموم لوگوں نے دین سے خارج سمجھ رکھا

[1] معاملات آپس میں لین دین اور خرید و فروخت کو کہتے ہیں اور معاشرت باہمی برتاؤ کو کہتے ہیں ۱۲۔

ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ قانون خداوندی سے تو اپنے معاملات اور معاشرت کو الگ سمجھ لیا اور گورنمنٹ کے قانون سے خارج نہ سمجھا کبھی کسی نے گورنمنٹ سے نہ کہا ہوگا کہ تجارت وغیرہ میں آپ کو کیا دخل ہے کہ اس کے لیے قانون مقرر کیے ہیں آپ صرف سلطنت کے انتظام کے لیے قانون مقرر کیجیے اور اس کے خلاف کرنے پر ہم سے باز پرس کیجیے باقی یہ ہمارے ذاتی معاملات اور آپس کا لین دین ہے ہم کو لائیسنس وغیرہ کا پابند کیوں کیا جاتا ہے۔ کیا کوئی شخص گورنمنٹ سے ایسا کہہ سکتا ہے۔ اور اگر کہے تو پھر دیکھئے گردن ناپی جاتی ہے یا نہیں۔ یقیناً گردن ناپی جائے گی اور کہا جائے گا کہ جب ہم حاکم ہیں تو ہم کو ہر امر میں قانون مقرر کرنے کا حق ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ گورنمنٹ کو تو اس کہنے کا حق دار سمجھا جائے اور خدا تعالیٰ کے قانون کو صرف وضو اور نماز میں منحصر کر دیا جائے تو خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ایک قانون مقرر فرمایا ہے اور ہر چیز کا ایک قاعدہ بتلایا ہے مگر لوگ دین کو پورے طور پر نہیں دیکھتے۔ اس لیے صرف نماز روزہ یا زیادہ سے زیادہ معاملات تک کو شریعت کے ماتحت سمجھتے ہیں۔ لیکن وضع قطع اور معاشرت اور عادات کو اس سے خارج سمجھتے ہیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ ہم لوگ تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں:

اور اس سے زیادہ غضب یہ ہے کہ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور اپنی شریعت کو تہذیب سے خالی سمجھتے ہیں ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک شخص یکچشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی گیا' سیر کے لیے چاندنی چوک میں نکلا۔ اتفاق سے آپ کی گردن بھی نہ مڑ سکتی تھی۔ اس لیے جاتے وقت صرف ایک طرف سے دوکانیں نظر آئیں دوسری جانب کی نظر نہ آئیں۔ جب وہاں سے واپس ہونے لگا تو دوسری جانب کی نظر آئیں ان کو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں کہ دلی کے لوگ بھی ستم کے لوگ ہیں۔ ابھی یہ دکانیں داہنی طرف تھیں ابھی ہمارے لوٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھا کر رکھ دیا۔ تو ہمارے بھائیوں نے بھی شریعت کو صرف ایک طرف سے دیکھا اس لیے وہ اپنے کو دوسروں کا تہذیب میں محتاج سمجھتے ہیں۔ ورنہ اگر پورے طور

سے دیکھتے تو شریعت میں وہ اعلیٰ درجہ کی تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی ایسی تہذیب نہیں ہے اگر کسی کو اس میں کچھ تردد ہو تو چند روز آ کر ہمارے پاس رہے اور پھر دیکھو کہ وہ شریعت جس کو آج خونخوار بتلایا جارہا ہے وہ کیسی دلفریب ہے۔ جب اس کی حقیقت سے واقف ہو گئے تو اس پر عاشق ہو جاؤ گے۔ اس کی ہرادا کو پسند کرو گے۔ آج اس سے بھاگتے ہو۔ پھر تم خود ہی اس کو چپٹو گے اور یوں کہو گے۔

یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے
نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے

تو شریعت کی تہذیبوں میں سے ایک تہذیب یہ بھی ہے کہ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ۔ (ترجمہ) اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبی (ﷺ) کی آواز پر۔

بزرگوں سے ملنے کے آداب:

اور اس سے معلوم ہوا کہ بڑوں کے سامنے ذرا جھجک کر بولنا چاہیے۔ البتہ بات جو کہو نہایت صاف کھو گول نہ ہو۔ اب ہم میں یہ منحوس حالت ہے کہ ہم دونوں میں فرق کرتے۔ اب یا تو تکلف ہوتا ہے کے اپنی حالت بھی صاف بیان نہیں کرتے' جیسا کہ آج کل بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر پیر کا ادب کریں گے تو یہ کہ چار دن تک ان کے پاس رہیں گے لیکن یہ نہ بتلائیں گے کہ کس ضرورت کے لیے آئے تھے اور جب عین چلنے کا وقت ہوگا تو کہیں گے کہ میرے بارے میں حضور کا کیا ارشاد ہے اور اگر پیر کہے کہ بھائی! تم نے اول اپنی حالت تو کہی ہوتی پھر رائے لی ہوتی۔ تو اس کا یہ جواب ملتا ہے کہ حضور کو روشن ہے۔ حضور کو اپنی تو خبر ہی نہیں ان کی حالت حضور پر روشن ہوگئی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کشف کا انکار کرتا ہوں۔ میں کشف کا انکار نہیں کرتا۔ بزرگوں کو کشف ہوتا بھی ہے۔ لیکن یہ ان کے اختیار میں نہیں یہ چیز بالکل ان کے اختیار سے باہر اور بزرگوں کے اختیار میں تو کشف کیا ہوتا' نبیوں کے اختیار میں بھی نہیں۔ دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کو مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہوتی مصر میں تو وہ بعد کو گئے ہیں

پہلے تو وہ ان کے قریب ہی کنویں کے اندر رہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی۔ حالانکہ اس بے خبری سے جو کچھ ان کو رنج و غم پہنچا مشہور ہے کہ روتے روتے نابینا ہو گئے تھے تو اگر کشف امر اختیاری تھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو کیوں خبر نہ ہوئی۔ اور جب خبر ہونے کا وقت آیا تو یہ ہوا کہ میلوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتہ کی خوشبو آنے لگی۔ پس جب کہ کشف اختیاری چیز نہیں تو یہ کیا ضروری ہے کہ بزرگوں کو ہر وقت کشف ہوا ہی کرے اور وہ تمہارا حال خود بخود جان جایا کریں۔ اس لیے اپنا حال خود ہی بیان کرنا چاہیے اور کوئی بات پیر سے نہ چھپانا چاہیے۔

پیر و مرشد سے اپنا مرض اور عیب صاف بیان کرنا چاہیے:

یہاں تک بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر اپنے اندر عیب بھی ہوں تو پیر و مرشد سے صاف کہہ دے کہ میرے اندر یہ عیب ہے یہ مرض ہے۔ اب بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ لڑکوں کی محبت میں پھنس جاتے ہیں اور اپنے اس مرض کو بلی کے گوں کی طرح چھپاتے ہیں۔ اس چھپانے کا کچھ نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ اور دل خراب ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ برے کاموں کا تو ظاہر کرنا جائز نہیں ہے تو سمجھ لیجئے کہ چھپانے کا حکم اس موقع پر ہے کہ جہاں ظاہر کرنے میں کوئی مصلحت نہ ہو اس کی ممانعت ایسے موقع پر ہے جیسے کہ ایک شخص کی نسبت سنا ہے کہ جب حج کو گیا تو کنکریاں مارتے وقت ایک لمبا جوتا لے کر ان تین پتھروں میں سے ایک پتھر کو خوب پیٹ رہا تھا اور شیطان کو کہہ رہا تھا کہ کمبخت فلاں دن تو نے مجھ سے یہ گناہ کرایا تھا۔ اور فلاں رات کو تو نے مجھے زنا میں مبتلا کیا تھا اور چوری کرائی تھی تو ایسے موقع پر بلا کسی ضرورت اور مصلحت کے ظاہر کرنا یہ تو حماقت ہے مگر پیر سے ہر گز نہ چھپاؤ۔ اس پر ظاہر کر کے اس عیب کا علاج پوچھو۔ جیسے طبیب یا ڈاکٹر سے پردہ کی جگہ کا پھوڑا پھنسی دکھلا کر علاج کرایا جاتا ہے۔ اور اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جائیں گے تو ایسے شخص کو پیر ہی نہ بناؤ جس پر یہ احتمال ہو کہ وہ تم کو ذلیل سمجھے گا یا رسوا کرے گا۔ یہ جھوٹے پیروں کا کام ہے۔ جو پیر سچے ہیں وہ کسی کو ذلیل نہیں سمجھتے۔ کیونکہ جانتے ہیں جس کو پیا چاہے وہی سہاگن ہو۔ کیا معلوم ہے وہاں

کون مقبول ہے اور کون مردود ہے۔ وہ تو کتے تک کو بھی ذلیل نہیں سمجھتے وہ کسی کی نسبت یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ مقبول نہ ہوگا۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ بڑے سے بڑا متقی پرہیزگار تمام عمر اس مرتبہ تک نہ پہنچے جس کو ایک بدکار فاسق وفاجر آن کی آن میں ایک نعرہ مار کر حال کرلے تو جن کا یہ مذہب ہو تو وہ کسی کو حقیر سمجھیں گے۔ ہرگز نہیں۔ اور کوئی یہ کہے کہ وہ ہمارا حال کسی سے کہہ دیں گے اور وہ ہم کو ذلیل سمجھے گا تو یاد رکھو کہ وہ کسی سے نہ کہیں گے وہ خدا تعالیٰ کا راز تو کسی سے کہتے ہی نہیں۔ جس کے ظاہر کرنے سے خدا تعالیٰ کا کوئی ضرر نہیں۔ تمہارا راز کیا کسی سے کہیں گے۔ جس کا ظاہر کرنا تمہارے لیے مضر ہے تو جب یہ بھی اندیشہ نہیں تو ویسے ہی عزت سب کی نظر میں رہے گی جیسے کہ اب ہے۔ اور ویسی ہی ان کی نظر میں بھی رہے گی۔ اور اسی وجہ سے حدیث میں آیا ہے کہ اگر ضرورت کی وجہ سے مانگو' کیونکہ بھیک مانگنا اس لیے حرام ہے کہ اس میں اپنی ذلت ہوتی ہے اور دوسرے پر بوجھ پڑتا ہے اور بزرگوں سے مانگنے میں یہ دونوں باتیں نہ پائی جائیں گی۔ ذلت تو اس لیے نہ ہوگی کہ وہ حضرات کسی کو ہرگز ذلیل نہیں سمجھتے۔ اور بوجھ اس لیے نہیں پڑتا کہ وہ حضرات بالکل آزاد ہوتے ہیں تکلف نہیں کرتے اگر گنجائش ہوتی ہے دے دیتے ہیں ورنہ وہ اس کے پابند نہیں کہ ضرور ہی دیں اگر نہ ہوگا' تو بے تکلف عذر کردیں گے اور اگر کبھی غفلت سے ایسا ہو بھی جائے کہ وہ ذلیل سمجھیں تو ان کو فوراً آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے پھر آئندہ اس کا احتمال نہیں رہتا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ انہوں نے مسجد میں ایک شخص کو دیکھا کہ خوب قوی اور تندرست موٹا تازہ ہے اور بھیک مانگتا ہے انہوں نے اپنے دل میں اس پر طعن اور اعتراض کیا رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص مردے کا گوشت کھانے کو ان سے کہہ رہا ہے۔ انہوں نے انکار کیا۔ تو وہ کہتا ہے کہ تم نے آخر اس فقیر کی غیبت کر کے مردے کا گوشت کھایا نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تو اس کو کچھ نہیں کہا۔ جواب ملا کہ کیا غیبت دل میں نہیں ہوتی۔ بلکہ اول تو دل ہی میں پیدا ہوتی ہے پھر زبان پر آتی ہے۔ آپ بیدار ہو کر چلے معاف کرانے کے لیے اس شخص نے آپ کو آتے دیکھ کر یہ آیت پڑھی: هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ

(ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ ایسا ہے جو قبول کرتا ہے توبہ کو اپنے بندوں سے'' مطلب یہ ہے کہ میں معاف کر چکا ہوں آپ کو توبہ ہو چکی ہے اب معاف کرانے کی ضرورت نہیں۔ پھر اس شخص نے کہا کہ پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔ تو یہ شخص بہت بڑا کامل تھا کسی خاص مصلحت سے اس وقت بھیک مانگی ہوگی۔ غرض بزرگوں کی اس طرح اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ کسی کو حقیر نہیں سمجھتے۔ بلکہ دنیا بھر سے اپنے ہی کو ذلیل اور رذیل سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ کوئی شخص کامل ایماندار نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے کو فرنگی کافر سے بھی بدتر نہ سمجھے تو جب کہ وہ حضرات اپنے کو بہت ہی حقیر سمجھتے ہیں اس لیے ان کے سامنے اپنے عیب کا ظاہر کر دینا کچھ مضائقہ نہیں۔ غرض اپنے حالات پیر سے ضرور بیان کرو اس کے کشف پر بھروسہ مت کرو۔ کیونکہ بعض بزرگوں کو ہوتا ہی نہیں اور ہوتا بھی ہے تو ہر وقت نہیں ہوتا دوسرے اگر ہوا بھی تو تم کو کیا خبر کیا تم کو بھی اس کے کشف کا کشف ہوا ہے تو یہ تو تکلف ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر کچھ نہ کہے اور یہ بے ادبی ہے کہ وہاں جا کر پتھر توڑنے لگے۔ اسی کی اصلاح اس آیت میں فرماتے ہیں کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ (ترجمہ) ''اے ایمان والو! مت بلند کیا کرو اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو۔ جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہیں۔''

ادب کی تعلیم:

عرب میں بے تکلفی بہت زیادہ تھی بڑے بڑے لوگوں کے نام لیتے تھے۔ حضور ﷺ کا نام مبارک بھی بعض نے لیا۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں اس کی ممانعت فرمائی اور اس کے بعد فرمایا: اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ☆ کہ یہ ہم اسی لیے کہتے ہیں کہ کہیں تمہارے اعمال نہ برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ اس بربادی کی وجہ کیا ہے؟ سو اس کی وجہ میں یہ سمجھا ہوں کہ ایمان والوں کو اپنے نبی کا ادب کرنا ضروری ہے اس کے برخلاف کرنے سے نبی کو تکلیف اور اذیت ہوگی کیونکہ فطری بات ہے...... کہ جس سے ادب کی توقع ہو اگر وہ اس کے خلاف کرتا ہے تو ضرور تکلیف ہوتی

ہے اور جس سے یہ توقع ہی نہ ہو اگر وہ ادب کا برتاؤ نہ کرے تو دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ دنیا کے حاکموں کو دیکھو کہ دیہاتیوں سے بہت سی باتیں خلاف تہذیب گوارا کر لیتے ہیں جو کہ شہریوں سے ہرگز گوارا نہیں ہو سکتیں۔

ایک دیہاتی کی حکایت ہے کہ اس نے ایک درخواست پیش کی تو کاغذ پر ٹکٹ نہیں لگایا۔ اور جب حاکم نے اس سے کہا کہ اس پر ٹکٹ لگاؤ تو روپیہ جیب سے نکال کر کہتا ہے۔ لے روپیہ بس تیری صاحبی معلوم ہوگئی اس میں سے ٹکٹ لگا لیجیو۔ جو بچے خود رکھ لیجیو۔ حاکم ہنس کر خاموش ہو گیا اور درخواست مفت لے لی۔ بھلا کوئی شہری تو ایسا کر کے دیکھے کہ اس کی کیا گت بنتی ہے تو ایمان والے اگر نبی کے ساتھ ادب کا برتاؤ نہ کریں تو ان کو اذیت ہوگی اور اذیت پہنچنے میں اندیشہ ہے اعمال کے برباد ہو جانے کا۔ اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض بزرگوں کی زبان سے ایسے کلمات سنے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی شان میں خلاف ادب ہوتے ہیں اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے چرواہے کا قصہ مشہور ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ ایسے کلمات پر جو مواخذہ نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں پر کوئی خاص حالت غالب آ جاتی ہے اور عقل مغلوب ہو جاتی ہے معذور سمجھ کر ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ورنہ جو بزرگ ایسے نہیں ہوتے ان کی ذرا سی بے حجابات بھی گوارا نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے بارش پر یہ فرما دیا کہ آج کیسے موقع سے بارش ہوئی ہے۔ فوراً ڈانٹ پڑی کہ او بے ادب اور بے موقع کس روز ہوئی تھی سن کر ہوش اڑ گئے اور مؤاخذہ بالکل سچا ہے کیونکہ بے موقع بارش کبھی نہیں ہوتی۔ اور ایک بارش ہی کیا خدا تعالیٰ کی کوئی کام بھی بے موقع نہیں ہوتا تو با ادب جب بے تمیزی کرتا ہے تو بہت ناگواری ہوتی ہے اس کی اصلاح اس آیت میں فرما رہے ہیں اور اس کی کئی جگہ اصلاح فرمائی ہے ایک جگہ ارشاد ہے: يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ اِنٰىهُ

فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَانِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ (ترجمہ) کا حاصل یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم پیغمبر ﷺ کے گھروں میں بجز دعوت کے ویسے مت جاؤ۔ اور اس میں بھی پہلے سے جا کر کھانے کی تیاری کے انتظار میں مت بیٹھو۔ بلکہ جب بلایا جائے تو جاؤ اور کھاتے ہی وہاں سے الگ ہو جاؤ اور باتوں میں مشغول ہو کر مت بیٹھ جاؤ۔ اس سے نبی کو ایذاء ہوتی ہے اور وہ لحاظ کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ حق بات سے کیوں شرمائے وہ تو خدا تعالیٰ ہیں۔ دیکھئے اس انداز بیان سے کیسا بے دھڑک فرما دیا ہے کہ خدا تعالیٰ حق بات سے نہیں شرماتے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا۔ ترجمہ: تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جنہوں نے موسیٰ کو ایذا دی تھی۔ سو ان کو خدا تعالیٰ نے بری ثابت کر دیا۔

غرض شریعت نے اس کا بہت خیال کیا ہے کہ کسی کو بے وجہ ایذاء نہ ہو تو نبی کو ایذاء دینا بدرجہ اولیٰ حرام ہوگا اور اس کا وہ اثر ہے جو کہ کفر کا ہے یعنی جیسے کفر سے اعمال مٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح اس سے بھی اعمال برباد ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ایذاء ہوئی ہے یا نہیں اور اعمال مٹ جاتے ہیں۔ اس لیے ارشاد ہوا کہ وہ کام بھی نہ کرو جس میں ایذاء کا احتمال بھی ہو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو ایذا پہنچانے سے کل اعمال مٹ جاتے ہیں تو گناہوں میں صرف یہ گناہ ایسا ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی نیک عمل باقی نہیں رہتا۔ البتہ بعض گناہ ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے کوئی خاص عمل کیا کرایا برباد ہو جاتی جاتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ترجمہ: اے ایمان والو! مت برباد کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر۔ یعنی صدقہ خیرات کا جب ثواب مل گیا تو احسان جتلا کر اس کو برباد مت کرو تو بعض گناہ ایسے ہیں جن کا یہ اثر ہے۔ پس ہمارے اس دعویٰ میں کہ گناہوں سے طاعتوں کا ثواب نہیں زائل ہوتا۔ گناہوں سے مراد ایسے گناہ نہیں ہیں جن کی وجہ سے کل اعمال یا بعض اعمال مٹ جاتے ہیں اور ان کا ثواب نہیں ملتا بلکہ وہ گناہ مراد ہیں جن کو

موجودگی میں طاعت صحیح بھی ہو جاتی ہے اور باقی بھی رہتی ہے اور اکثر گناہ ایسے ہی ہیں تو ان گناہوں کے متعلق میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ان سے نیکیاں ضائع نہیں ہوتیں گو برکت کم ہو جاتی ہے اور اس کی دلیل ایک تو وہ حدیث ہے جو اوپر ذکر کی گئی اور ایک دلیل اور بھی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ (ترجمہ) بے شک نیکیاں دور کر دیتی ہیں برائیوں کو۔ دیکھئے کیسی صاف دلیل ہے۔ اگر گناہ کرنے نیکیوں کا ثواب نہ ملتا تو نیکیوں میں یہ اثر گناہوں کے دور کرنے کا کہاں سے آئے گا۔ اور اس سے ایک بڑی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ گناہوں سے تو نیکیاں نہیں مٹتیں لیکن نیکیوں سے گناہ دھل جاتے ہیں تو اس آیت سے ثابت ہوا کہ نیکیاں گنہگار کی بھی مقبول ہوتی ہیں گو ان کی برکت کم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ یہی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں میں نے شروع میں روزے کے متعلق پڑھا ہے۔ اب میں اس حدیث سے اس کو ثابت کرتا ہوں۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر روزہ دار گناہوں سے نہ بچے تو کھانا پینا چھوڑنے سے کیا فائدہ۔ دیکھئے حضور ﷺ یہاں فائدہ کی نفی فرما رہے ہیں۔ اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ باوجود گناہوں کے بھی روزہ ہو جاتا ہے تو جس فائدہ کی نفی حضور ﷺ نے فرمائی ہے وہ روزے کی برکت ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ گناہوں سے نیکیوں کی برکت جاتی رہتی ہے۔ اور اس سے میرا وہ مقصود بھی ثابت ہوا جس کے بیان کے لیے اس حدیث کو پڑھا ہے۔ یعنی گناہ کے چھوڑنے کی کوشش خاص کر روزے میں ضروری ہے۔ کیونکہ گناہ کی حالت میں بھی یہ مانا کہ روزہ صحیح ہو جاتا ہے۔ مگر جب اس کی برکت حاصل نہ ہوئی تو وہ روزہ کیا ہوا۔

روزے میں گناہ چھوڑنا زیادہ ضروری ہیں:

اب میں اس بیان کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا کون مسلمان نہیں جانتا کہ گناہ برا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ گناہ برا ہے تو کم از کم مہینہ بھر کے لیے تو گناہ چھوڑ دو۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے بعد گناہ کرنے کی اجازت ہے۔ بلکہ اس میں ایک حکمت ہے وہ یہ کہ نفس سے ابتداء ہی سے اتنا لمبا وعدہ لینا کہ تمام عمر گناہ چھوڑ دیں گے۔ یہ تو ہم

سوال کے لیے بہت مشکل ہے۔ ہاں تھوڑی مدت کے لیے نفس وعدہ کر سکتا ہے۔ اس واسطے میں نے یہ کہا کہ ایک مہینے کے لیے تو گناہ نہ کرنے کا عہد کرلو۔ اس کے بعد پھر ایک مہینہ کا وعدہ کر لینا' اس کے بعد پھر ایسا ہی کرنا۔ اس میں آسانی ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ کے لیے نبھ جاتا ہے۔ بعض بزرگوں نے اپنے نفس کو اسی طرح ایک ایک گھنٹہ دو گھنٹہ کا وعدہ لے کر بہلایا اور ذکر میں مشغول کیا ہے۔

نفس کی خصلتیں' اور اس کو قابو میں لانے کی تدبیر:

اس میں راز یہ ہے کہ نفس جتنا شریر ہے اتنا ہی بھولا ہے اس کو شیطان نے شریر بنا رکھا ہے۔ مگر بزرگوں کے سامنے شیطان بھی بہت عاجز و پریشان ہوتا ہے اور اس کی عقل بھی خرچ ہو جاتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا نہایت ہی پریشان اور کہا کہ میں نے اپنا خزانہ ایک جگہ دفن کر دیا تھا۔ اور اب مجھے یاد نہیں رہا کہ کہاں دفن کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ تو گھر جا کر نفلیں شروع کر دے۔ اور پکا ارادہ کر لے کہ جب تک یاد نہ آئے گا برابر نفلیں پڑھتا رہوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ خزانہ مل جائے گا۔ امام صاحب کا ذہن اس طرف گیا کہ شیطان نے اس کو بھلایا ہے۔ اور جب یہ نفلیں شروع کرے گا تو شیطان کو اس طاعت میں مشغول ہونے سے سخت رنج ہوگا۔ اور زیادہ دیر تک اس میں مشغول نہ رہنے دے گا۔ اس لیے وہ فوراً یاد دلائے گا۔ آخر ایسا ہی ہوا۔ تو بزرگوں کے سامنے اس کی عقل بالکل چرخ ہے۔ البتہ ہم جیسوں پر اس کا بہت زور ہے مگر پھر بھی کبھی اس کو دھوکہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن نفس کو بہت ہی زیادہ دھوکہ ہوتا ہے، کیونکہ نفس ہر ایک کا علیحدہ ہے اور کم عمر ہے تو گویا وہ بچہ ہے کہ شریر بھی اور بھولا بھی۔ کیونکہ بچوں میں بھی یہ دو خصلتیں ہوتی ہیں۔ اس وقت شریر بچوں کی ایک حکایت یاد آئی۔ ایک مرتبہ ایک میاں جی کے پاس بتاشے آئے ان کو خیال ہوا کہ کھلے رکھوں گا تو لڑکے کھا جائیں گے اس لیے بدھنے میں بھر کر اس کا منہ آٹے سے بند کر دیا۔ ایک وقت جو میاں جی کہیں گئے تو لڑکوں نے مشورہ کر کے بدھنے کی ٹونٹی میں سے پانی بھرا اور خوب شربت بنا کر پیا۔ غرض نفس بھولا بھی

ہے بہلا پھسلا کر جو چاہو اس سے کام لے سکتے ہو۔ اسی لیے ایک بزرگ نے اس سے یہ صلح کر لی تھی کہ ایک گھنٹہ ذکر کر لو۔ اس کے بعد پھر ایک گھنٹے کے لیے اسی طرح ذکر میں مدتوں مشغول رہے۔ ایک اور بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو حلوہ بہت مرغوب تھا تو اپنے نفس سے کہتے کہ دس رکعتیں پڑھ لو پھر حلوا کھالینا۔ دس رکعتیں پڑھ کر پھر حلوا کھلا دیتے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو خوب کھلاؤ پلاؤ اور پھر اس سے خوب کام لو۔ ع

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

کہ مزدور خوش ہو کر خوب کام کیا کرتا ہے۔ واللہ یہ حکمت جو حضرت نے فرمائی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور حضرت کی ان حکمتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے کامل شیخ تھے کیونکہ واقعی ہماری حالت ایسی ہی ہے کہ اگر نفس کو کچھ دیتے رہو تو خوشی سے کام کرتا رہے گا۔ ورنہ نہیں۔ ہاں اتنا بھی نہ دو کہ شریر ہو کر قابو سے باہر ہو جائے۔ غرض نہ اتنا کم دو کہ ضعیف ہو کر کام کرنے کے قابل بھی نہ رہے اور نہ اس قدر زیادہ دو کہ وہ بالکل ہی شریر ہو جائے ہمارے سب حضرات کا یہی طریقہ رہا ہے کہ سہولت سے کام ہو جائے۔ بلا ضرورت مشقت کو پسند نہیں فرماتے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ذکر میں نیند بہت آتی ہے۔ فرمایا کہ علاج یہ ہے کہ تکیہ رکھ کر سو رہا کرو۔ جب نیند بھر جائے پھر اٹھ کر کام میں لگ جاؤ۔ اللہ اکبر! ہمارے حضرات کے یہاں کس قدر آسانی ہے اور پھر لطف یہ کہ مقصد میں کامیابی بھی جلد ہوتی ہے۔ یہ محض اس کی بدولت ہے کہ ان حضرات کا سلسلہ بالکل سنت کے موافق ہے اور یہ سب حضرات نہایت درجہ سنت کے راستہ پر چلتے ہیں۔ اسی لیے لوگوں کو اس سلسلہ میں کامیابی تھوڑی سی توجہ میں ہو جاتی ہے۔ راز اس کا یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے خاص محبوب ہیں اور ظاہر ہے کہ محبوب کی ہر ادا محبوب ہوتی ہے تو جو شخص ان اداؤں کو اختیار کرے گا وہ بھی محبوب ہو جائے گا گو اس درجہ محبوب نہ ہو۔ اور نہ اس درجہ کا ہو سکتا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص غلاموں میں داخل ہو کر خدا تعالیٰ کا محبوب ضرور ہو جائے گا

تو چونکہ ہمارے حضرات بھی حضور ﷺ کے طریقہ پر چلتے ہیں اور ان کا سلسلہ عین سنت کے موافق ہے۔ اس لیے باوجود سہولت کے لوگوں کو کامیابی جلد ہو جاتی ہے تو یہ بزرگ جن کے حلوے کی حکایت بیان کی ان کی عادت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نفس بیان کی ان کی عادت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نفس کی تنگی میں نہ رکھتے تھے۔ ہاں گناہوں کو سختی سے روکنا چاہئے۔

نفس کے ساتھ زیادہ نرمی وسختی دونوں مضر ہیں:

اب بعض تو یہاں تک نفس کے ساتھ نرمی کرتے ہیں کہ گناہوں سے بھی نہیں روکتے اور بعض اس قدر تنگی کرتے ہیں کہ جائز کاموں کو بھی نہیں کرتے حالانکہ انجام دونوں صورتوں کا خراب ہے۔

رمضان میں تقویٰ اختیار کرنے کی برکت:

تو نفس سے یہ کہہ دو کہ رمضان تک کوئی گناہ نہ کرے اور صرف ایک مہینہ کا عہد اس سے لو پھر اس کے بعد میرا یقین ہے کہ اگر رمضان تقویٰ کی حالت میں گزر گیا تو پھر یہ تقویٰ انشاء اللہ تعالیٰ نہ ٹوٹے گا۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ رمضان جس حالت پر گزرتا ہے۔ بقیہ گیارہ مہینے بھی نہایت آسانی سے اسی حالت پر گزر جاتے ہیں۔ اور آسانی سے اس لیے کہا کہ تم یہ نہ کہو کہ گناہ سے گیارہ مہینے تک بچا رہنا یہ تو ہمارا فعل اختیاری ہے اگر ہم قصد کریں گے تو اس میں رمضان کی کیا فضیلت ہوئی۔

صاحبو! فرق یہ ہے کہ ویسے دشواری سے بچتے اور رمضان کی برکت سے آسانی بچ سکو گے اور بچنے کا قصد کرنا تو اس کی ضرورت تو ہر حال میں ہے۔ غرض اس ماہ کے لیے سب گناہ چھوڑ دو زبان کے گناہ بھی جیسے گالیاں غیبت شکایت کرنا کسی ناجائز مضمون کا پڑھنا۔ جھوٹ بولنا۔ کان کے گناہ۔ جیسے غیبت سننا گانا سننا۔ آنکھ کے گناہ بھی جیسے نامحرم کو شہوت سے دیکھنا' لڑکوں کو تکنا' ہاتھ کے گناہ بھی جیسے کسی پر ظلم کر کے اس کو مارنا پیٹنا۔ سودی یا اور کوئی ناجائز مضمون لکھنا وغیرہ' اسی طرح پیر کے گناہ' جیسے ناچ گانے کے محفل

میں جانا جھوٹے مقدمے کی پیروی کے لیے جانا۔

پیٹ کو حرام غذا سے خاص کر رمضان میں ضرور بچانا چاہیے:

اور سب سے بڑھ کر ایک گناہ ہے کہ اس کو تو ضرور ہی چھوڑ دینا چاہیے' یعنی پیٹ کا گناہ کہ اس کو حرام غذا سے بھرا جائے کیونکہ اگر اس کو نہ چھوڑا تو دوسرے گناہوں کا چھوڑنا نہایت دشوار ہو گا۔ اس لیے کہ پیٹ تمام بدن کا حوض ہے یہ ایک حدیث کا مضمون ہے پس اگر اس میں گندا پانی ہو گا تو تمام نالیوں میں گندا ہی پہنچے گا۔ اور یہ مضمون انسان کے بدن اور روح دونوں کے لیے عام ہے یعنی بدن کی بیماریاں بھی جتنی پیدا ہوتی ہیں۔ اکثر ان کا سبب پیٹ ہی کی خرابی ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کے امراض بھی جس قدر پیدا ہوتے ہیں ان کا چشمہ بھی پیٹ ہی ہے۔ تو جس طرح بدن کی بیماریوں کے واسطے طبیب ظاہری کے قول پر عمل کر کے پیٹ کا علاج کرتے ہو۔ اسی طرح باطنی امراض کی اصلاح کے لیے طبیب باطنی کے قول پر عمل کر کے حرام کھانا چھوڑ دو تو ایک تو صحت روحانی ہے اور ایک صحت جسمانی۔ جسمانی صحت تو اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ مزاج کے مناسب غذا کھائی جائے وہی سب جگہ تقسیم ہو گی۔ اور روحانی اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ حلال غذا معدے میں پہنچائی جائے اس سے تمام اعضاء کو نیک اعمال کی توفیق ہو گی اور حرام غذا پہنچی تو تمام اعضاء کو گناہوں کی طرف میلان ہو گا تو کم از کم اتنا تو کرو کہ رمضان بھر کے لیے تو رشوت کا سود کا غصب کا موروثی کا اناج نہ کھاؤ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ رمضان کے بعد مثلاً موروثی کا کھانا حلال ہو جائے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر رمضان بھر اس سے بچے رہے تو پھر امید ہے کہ ہمیشہ بچے رہو گے اور جو لوگ ایسے ہی کہ ان کے پاس تمام آمدنی موروثی ہی کی ہے وہ کم سے کم اتنا کریں کہ کسی بنیے سے بے شرکی ادھار لے لیں۔ پھر چاہے اس کو اگلے ہی دن ادا کر دیں اور جس آمدنی سے بھی ادا کریں' مگر وہ اناج جو بذریعہ ادھار حاصل ہوا حلال ہوتا ہے۔ اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

صاحبو! یہ مسئلہ کہنے کے قابل نہ تھا کیونکہ اس سے لوگوں کی حرام آمدنی پر جرأت بڑھنے کا اندیشہ ہے لیکن شفقت و خیر خواہی کے غلبہ نے کہلا دیا کہ مثلاً دس روپے کسی بنیے

سے ادھار لے کر اناج خرید لو یا روپوں کا اناج ادھار لے لو۔ یہ بھی نہ ہو تو اناج ہی ادھار لے لو اور اس میں ایک مسئلہ بھی سمجھ لو کہ اناج ادھار لینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم تم کو اس کے عوض میں دوسرا فلاں اناج دیدیں گے مثلاً یوں کہا جائے کہ ان ایک من گیہوں کے بدلہ میں ہم دو من جو یا چنے دیدیں گے یہ طریقہ ادھار کا تو ناجائز ہے۔ دوسرا طریق وہ ہے کہ جس طرح عام طور پر گھروں میں ادھار کیا جاتا ہے کہ سیر بھر آٹا دے دو۔ جب ہمارے پاس ہوگا تو تم کو دے دیں گے۔ یہ جائز ہے تو تم اسی طرح بنئے سے اناج قرض لے لو اور پھر اس کا قرض چاہے موروثی اناج ہی سے ادا کر دینا اور بنئے کے لیے موروثی اناج لینا حرام نہیں بلکہ اور بہت سی باتیں بھی اس کو حرام نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ کفر کے سبب خدا تعالیٰ کا باغی ہے اور بغاوت ایسا سنگین جرم ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ان چھوٹے چھوٹے جرموں پر مقدمہ نہیں چلایا جاتا۔ غرض بنئے سے یوں کہو کہ ہم کو اناج ادھار دے دو پھر ہم ادا کر دیں گے۔ اس کے بعد چاہے ایک گھنٹہ میں ہی ادا کر دینا اور اگر بے سودی نہ ملے تو ہرگز نہ لو مگر اطمینان رکھو انشاء اللہ تعالیٰ بے سودی مل جائے گا۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ یہ تو بہت اچھی ترکیب ہاتھ لگ گئی۔ اب جب کبھی حرام چیز آیا کرے گی اس کے بدلے میں حلال چیز اس طرح لے لیا کریں گے۔ سو یاد رکھو کہ میں نے جو بتلایا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں کسی قسم کا گناہ نہ ہوگا۔ کئی گناہ اس میں بھی جمع ہیں۔ اول حرام اناج یا مال حاصل کرنا دوسرے کسی کو حرام چیز دینا۔ تو میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ شخص حرام کھانے سے بچ جائے گا۔ گو دوسرے گناہ رہیں گے کہ ان سے بچنا بھی ضروری ہے اور حرام شئے کسی کو دینا یا کھلانا ایسا گناہ ہے کہ کتے کو بھی کھلانا درست نہیں۔

ناپاک اور حرام چیز جانوروں کو بھی کھلانا منع ہے:

اور اسی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اکثر لوگ جو ناپاک چیز گائے یا بھینس کو کھلا دیتے ہیں یا بھنگن کو دے دیتے ہیں یہ جائز نہیں البتہ یہ جائز ہے کہ کسی جگہ رکھ دیا جائے اور حرص کے مارے بغیر تمہارے کہے ہوئے خود ہی اٹھا کر لے جائے یا کتا خود کھا لے لیکن اگر تم

سے کوئی پوچھے کہ میں اٹھالوں یا نہیں تو تم صاف کہہ دو کہ ہم سے کیوں پوچھتے ہو۔

وعظ کا خلاصہ:

غرض رمضان میں ہر قسم کے گناہ بالکل چھوڑ دو پھر انشاء اللہ تعالیٰ وہ روزہ مبارک روزہ ہوگا اور وہ روزہ تمہاری شفاعت کرے گا۔ اور وہ روزہ ہوگا جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا: انا اجزی به کہ میں خود اس کا بدلہ دوں گا اور اگر گناہ نہ چھوڑے تو روزہ تو ہوگا لیکن ایسا ہوگا کہ جیسے تم کسی اپنے دوست سے کہو کہ ہم کو ایک آدمی لادو۔ اور وہ کسی ایسے آدمی کو لادے کہ اس کے کان بھی نہ ہوں آنکھ بھی نہ ہو لنگڑا بھی ہو لنجا بھی ہو۔ گونگا بھی ہو تو یہ شخص آدمی تو ضرور ہے لیکن محض بے کار صرف ایک سانس کے چلنے کی وجہ سے اس کو انسان کہیں گے تو جیسے یہ شخص آدمی ہے بھی اور نہیں بھی ایسا ہی یہ روزہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اور یہ روزہ اس قابل ہے کہ اس کو روضہ میں دفن کر دیا جائے۔ اس لیے حضور ﷺ اس حدیث میں ترغیب دے رہے ہیں کہ روزہ میں گناہ کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔ اب ختم کرتا ہوں مجھے جو کچھ کہنا تھا میں کہہ چکا ہوں۔ خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

تمت

(۳۹) نفس کی اصلاح

منتخب از اصلاح النفس وعظ اول حصہ چہارم

دعوات عبدیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خطبہ ماثورہ:

امابعد: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو جب راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں' اللہ ہی کے پاس تم سب کو جانا ہے پھر وہ تم کو بتلا دیں گے جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔''

یہ ہی وہ آیت ہے جس کے متعلق پہلے جمعہ میں بیان ہو چکا ہے' اس روز خیال تھا کہ آیت کے متعلق جتنا کچھ ضروری مضمون ہے وہ بیان ہو گیا ہے۔

وعظ کا مقصود:

لیکن بعد میں خیال آیا کہ ابھی آیت کے ایک ٹکڑے کے متعلق بیان کرنا باقی ہے' کیونکہ اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے دو حکم بیان فرمائے ہیں' اول یہ کہ تم اپنی فکر کرو' دوسرا یہ کہ تم دوسروں کی فکر میں نہ پڑو' پہلے جمعہ کو بیان کا زیادہ رخ اس دوسری بات کی طرف رہا' کیونکہ اس وقت یہ خیال تھا کہ مقصود آیت میں صرف اسی کا بیان کرنا ہے' لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اگرچہ مقصود اصلی تو یہی ہے لیکن پہلے حکم کا بیان بھی ضروری

ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے دونوں حکم بیان فرمانے کے بعد اپنے سے ڈرایا کہ تم کو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے' سو دوسروں کی فکر کرنا تو کچھ ایسا گناہ نہیں جس سے ڈرانے کی ضرورت ہو' ہاں! اپنی فکر کرنا البتہ ایسی چیز ہے جس سے ڈرانے کی ضرورت ہو' ہاں! اپنی فکر کرنا البتہ ایسی چیز ہے جس سے ڈرانے کی ضرورت ہے' تو مطلب یہ ہے کہ چونکہ تم کو خدا کے پاس جانا ہے اس لیے تم اپنی فکر کرو اور غفلت میں نہ پڑو اور اپنی اصلاح کرو' ظاہر ہے کہ یہ ایک ضروری مضمون ہے' پھر ایک وجہ سے نہیں بلکہ دو وجہ سے کیونکہ ایک تو خود یہ مضمون فی نفسہ ضروری ہے' دوسرے خاص اس موقعہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہی ضروری ہے۔

اس مضمون کے اختیار کرنے کی وجہ:

اس وقت اس کے بیان کرنے کی ضرورت یہ ہوئی کہ ہماری غفلت حد سے بڑھ گئی ہے' ہمارے اندر سینکڑوں خرابیاں ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں ہوتیں' اگر ہم اپنی حالت میں غور کریں تو ہم کو معلوم ہو کہ ہمارے اندر کیا کیا خرابیاں ہیں ہاں اگر غفلت ہی میں رہیں جیسا کہ اب تک رہے تو اور بات ہے پھر اتنی غفلت ہونے پر بھی یہ ہر شخص جانتا ہے کہ میرے اندر کیا کیا برائیاں ہیں لیکن اس کی فکر نہیں کرتا۔

آخرت کی فکر کرنا کتنا ضروری ہے:

اگر غور کرے تو اس کو معلوم ہو جائے کہ آخرت کی فکر کتنی ضروری ہے ہر شخص اپنے روزمرہ کو دیکھ لے اور سوچ لے کہ اس کے تمام وقت میں سے آخرت کی فکر میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔

دنیا کی اگر کوئی پریشانی ہوتی ہے تو اس کی تو اس قدر فکر ہوتی ہے کہ ہر وقت اس میں لگے رہتے ہیں اور بالکل اسی میں کھپ جاتے ہیں اور آخرت سے ایسی غفلت ہے کہ اس کی کچھ خبر ہی نہیں لیتے' حالانکہ ہر شخص کے نزدیک موت کا آنا یقینی ہے بلکہ ایسا یقینی کہ دنیا کی کوئی مصیبت اتنی یقینی نہیں' دیکھو اگر کوئی شخص کسی سخت مقدمہ میں پکڑا جائے اور

مسل پوری اس کے خلاف ہو تو اس کو زیادہ گمان اپنے سزا پانے کا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی رہائی کی بھی کچھ کچھ امید ہوتی ہے اسی طرح اگر کوئی شخص طاعون میں یا اور کسی ایسے مرض میں بیمار ہو جائے جس کے بچنے کی امید و آس نہیں ہوتی تو جس طرح اس کے مرنے کا گمان ہوتا ہے' اسی طرح صحت کا بھی کسی قدر گمان ہوتا ہے۔

غرض دنیا کی ہر مصیبت میں دونوں پہلو ہوتے ہیں لیکن پھر بھی دیکھو اس کی فکر میں کس توجہ سے اور کس طرح جان دے کر مشغول ہوتے ہیں یہاںتک کہ اس کی فکر میں گھلے جاتے ہیں لیکن موت ایسی چیز ہے کہ اس میں کسی شخص کو ذرا بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں اس سے بچ سکوں گا' نہ کافر ہی کو یہ خیال ہو سکتا ہے نہ مسلمان کو' اور تو اور شیطان جو سب سے بڑا کافر اور شریر ہے وہ بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں اس سے بچ سکوں گا ذ نہ کافر ہی کو یہ خیال ہو سکتا ہے نہ مسلمان کو ذ اور تو اور شیطان جو سب سے بڑا کافر اور شریر ہے وہ بھی یہ خیال نہیں کر سکتا' اس کو بھی ایک دن موت آئے گی کیونکہ اس کو جو مہلت دی گئی ہے تو صرف قیامت تک مہلت دی گئی ہے' جب قیامت آئے گی تو وہ بھی نہ بچ سکے گا' غرض موت میں کسی کو شبہ نہیں' اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ توحید جیسی یقینی چیز میں لوگوں نے شبہ کیا اور خدا کو ایک ماننے سے انکار کیا مگر موت سے انکار نہیں کر سکے' پھر اس قدر یقینی اور اتفاقی چیز ہونے پر اس کو ہم نے ایسے بھلا دیا ہے کہ یاد دلانے سے بھی ہم کو یاد نہیں آتی' نہ کسی کے کہنے سے مرنے کا خیال آتا ہے نہ کسی کو مرتے دیکھ کر موت یاد آتی ہے' اگر ہمارے سامنے کوئی شخص مرتا ہے اور ہم اس کے جنازے میں شریک ہوتے ہیں قبرستان تک جاتے ہیں تو دفن کے بعد ہنستے کھیلتے چلے آتے ہیں ہمارے دل پر ذرا بھی فکر نہیں ہوتی' غرض یہ کسی صورت سے ہم کو اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

تو صاحبو! کیا یہ حالت اسی طرح چھوڑنے کے قابل ہے کہ اس کا علاج ضروری نہیں ہے اگر ہے تو فرمایئے آج تک اس کا کیا علاج کیا؟ اگر نہیں تو اب کرنا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ علاج میں جس قدر دیر اور غفلت کی جاتی ہے' مرض بڑھتا جاتا ہے ہر شخص اپنی حالت میں غور کر لے کہ جس قدر خوف بچپن میں تھا' جوانی میں نہیں ہے اور جس

قدر جوانی میں ہے بڑھاپے میں نہیں ہے بعض کی تو یہ حالت ہے کہ برسوں تک ان کو موت کا خیال بھی نہیں آتا اور ذرا بھی اثر ان کے دل پر نہیں ہوتا' اور بعض کو اگر چہ موت یاد ہے لیکن خوف اور دہشت نہیں ہے سو اس حالت کی اصلاح بہت جلد ضروری ہے اس کے علاج میں غفلت اور دیر نہ چاہیے معلوم نہیں کس وقت موت آ جائے' دیکھو اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ میرے پکڑنے کے لیے گارد پھرتی ہے تو اس کے دل کی کیا حالت ہوتی ہے' زندگی بدمزہ ہو جاتی ہے' چین آرام برباد ہو جاتا ہے ہر وقت یہ دھن ہوتی ہے کہ کس طرح میں اس مصیبت سے نجات پاؤں تو کیا موت کی اتنی بھی فکر نہ ہونی چاہیے' غرض موت سے ہر وقت ڈرنا چاہیے خاص کر جبکہ گناہوں کا بوجھ بھی سر پر لدا ہوا ہو جس سے سزا کا بھی سخت اندیشہ ہے آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی' کیونکہ دنیا کی مصیبتیں بھی اکثر گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں مگر ہم لوگ اس سے بے خبر ہیں کہ کسی مصیبت میں اپنے گناہوں کو کبھی یاد ہی نہیں کرتے بلکہ بعض وقت مصیبت میں یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ ''کرتو ڈر نہ کرتو ڈر'' مطلب یہ کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا مگر اڑنگے میں آ گئے۔

بعض لوگ مصیبت کے وقت کہا کرتے ہیں کہ: ''کرتو ڈر نہ کرتو ڈر'' یہ بڑی جہالت کی بات ہے:

سو خوب سمجھ لو کہ یہ بڑی جہالت کی بات ہے کیونکہ نہ کر کے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں' اگر کچھ نہ کر کے بھی ڈرنا ضروری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ توبہ توبہ خدا تعالیٰ ظالم ہیں۔

خوب یاد رکھو! کہ ایسا کہنا خدا تعالیٰ کے ساتھ بڑی بے ادبی ہے اور گستاخی ہے' صاحبو! خدا تعالیٰ تو کیے پر بھی بہت کم پکڑتے ہیں اور بے کیے تو پکڑتے ہی نہیں' قرآن شریف میں اس کو صاف طور پر فرما دیا کہ:

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝

''یعنی جو کچھ مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے کرتوتوں کی بدولت پہنچتی ہے اور تمہارے کرتوتوں میں بھی بہت سے معاف ہی کر دیئے جاتے ہیں کہ ان پر پکڑ

نہیں ہوتی۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک چور پکڑ کر لایا گیا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جو شرع کے اندر چور کی سزا ہے' اس چور نے کہا کہ حضرت! یہ میرا پہلا قصور ہے اس مرتبہ مجھے معاف فرما دیجیے! پھر کبھی چوری نہ کروں گا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو غلط کہتا ہے' خدا تعالیٰ پہلے قصور میں کبھی کسی کو رسوا نہیں کرتے۔

چنانچہ پتہ لگانے سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی پانچ مرتبہ چوری کر چکا ہے' تو واقعی یہ بات ہے کہ خدا تعالیٰ بہت کچھ معاف فرماتے ہیں' لیکن جب ہم حد سے بالکل ہی نکل جاتے ہیں تو آخر خدا تعالیٰ کی غیرت ہم کو رسوا کر دیتی ہے ورنہ اس کی وہ شان ہے کہ گناہوں پر بھی ہم کو بہت کم پکڑتا ہے' لیکن چونکہ ہم لوگ اپنے بہت معتقد ہیں اس لیے اپنے گناہوں کی خبر ہم کو نہیں ہے اور بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ غفلت کی وجہ سے ہم کو پتہ نہیں چلتا' چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم نے کیا گناہ کیا تھا کہ جس کی وجہ سے یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے غفلت کا کہ رات دن گناہ کرتے رہتے ہیں اور پھر ہم کو گناہ سے خالی ہونے کا بھی گمان ہوتا ہے۔

گناہوں سے غفلت سخت مرض ہے:

صاحبو! اپنے گناہوں سے غفلت کرنا بہت بڑا مرض ہے جس سے کوئی بچا ہوا نہیں ہے۔

سر سے پیر تک گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور پھر اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتے ہیں اور اپنے معتقد ہیں' اور بعض ایسے بھی ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان کے معتقد ہیں ان سے لوگ اور بھی زیادہ تباہ ہوتے ہیں کیونکہ ان پاس اپنی بزرگی کی یہ دلیل بھی موجود ہے کہ جب اتنے لوگ ہم کو اچھا کہتے ہیں تو ضرور ہم اچھے ہوں گے۔

ایک مکتب کے لڑکوں کی حکایت:

مگر ہماری بالکل وہ حالت ہے جیسا مشہور ہے کہ ایک مکتب کے لڑکوں نے اتفاق کیا کہ آج استاد صاحب سے چھٹی لینی چاہیے اور تو کوئی تدبیر نہ نکل سکی' آخر یہ راہ ٹھہری

کہ جب استاد صاحب آئیں تو سب مل کر ان کا مزاج پوچھو اور ان کو بیمار بتلاؤ' چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا دو چار لڑکوں کو تو استاد صاحب نے جھڑک دیا لیکن جب بار بار سب نے یہی کہا تو استاد صاحب کو بھی خیال ہوا' اور چونکہ قاعدہ ہے کہ جس بات کا وہم غالب ہو جاتا ہے وہ بات سچ مچ ہو جاتی ہے' آخر استاد صاحب کی طبیعت بگڑ گئی اور سب کو لے کر گھر چلے گئے اور حکم کیا کہ تم دہلیز میں بیٹھ کر پڑھو میں گھر میں آرام کرتا ہوں' لڑکوں نے دیکھا کہ مقصود اب بھی حاصل نہ ہوا' آخر نہایت زور سے چلا کر پڑھنا شروع کر دیا' استاد صاحب کو وہم سے بیماری تو پیدا ہو ہی گئی تھی چلا کر پڑھنے سے اس میں زیادتی ہونے لگی مجبور ہو کر سب کو چھوڑ دیا تو جیسے یہ استاد لڑکوں کے کہنے سے اپنے کو بیمار سمجھنے لگے تھے' یہی حال ان لوگوں کا ہے کہ یہ دوسروں کو اپنی بزرگی کے معتقد دیکھ کر یوں سمجھ گئے کہ اتنے مسلمان کس طرح جھوٹے ہو سکتے ہیں میں بطور لطیفہ اور ظرافت کے کہتا ہوں کہ ایسے لوگوں میں جہاں اپنے کو بزرگ سمجھنے کا مرض ہے اس کے ساتھ یہ خوبی بھی ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو بھی بزرگ اور سچا جانتے ہیں اور ان کے خیال کی قدر کرتے ہیں۔

ایک نائن کی حکایت:

مگر یہ اعتقاد ایسا ہے جیسے کسی نائن نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ نتھ اتار کر دھو رہی ہے' نتھ اتری ہوئی دیکھ کر فوراً اپنے شوہر کے پاس دوڑی گئی اور کہا کہ ہماری بیوی صاحبہ تو بیوہ ہو گئیں' جلدی جا کر اس کے شوہر کو خبر کر نائی صاحب فوراً اس بیوی کے شوہر کے پاس پہنچے اور کہا حضور! آپ کیا بے فکر بیٹھے ہیں' آپ کی بیوی صاحبہ تو بیوہ ہو گئیں' ججمان صاحب نے رونا شروع کر دیا رونے کی آواز سن کر یار دوست جمع ہو گئے سبب پوچھا تو یہ حماقت معلوم ہوئی' دوستوں نے سمجھایا کہ میاں جب تم زندہ ہو تو تمہاری بیوی رانڈ کیونکر ہوئی' اس پر آپ فرماتے ہیں کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں' پھر اس کو کیا کروں کہ گھر سے معتبر نائی آیا ہے یہ نہایت معتبر شخص ہے جھوٹ نہ بولے گا۔

یہی ہماری حالت ہے کہ اپنے گناہوں کو خوب جانتے ہیں لیکن صرف اس وجہ سے کہ دوسرے لوگ ہم کو اچھا کہتے ہیں ہم بھی اپنے معتقد ہو گئے' اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کا

کوئی معتقد نہیں لیکن وہ پھر بھی اپنے معتقد ہیں اسی وجہ سے اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے کہ کیوں ہم پکڑے گئے۔

صاحبو! ہم کو تو نہ پکڑے جانے پر تعجب ہونا چاہیے تھا' دیکھو جو شخص روزانہ ذکیتی ڈالتا ہو اگر وہ چھ مہینے تک بچا رہے تو تعجب ہونا چاہیے اور پکڑا جائے تو کچھ بھی تعجب نہیں ہم لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جو گناہ ہم روزانہ کرتے ہیں اور ان پر پکڑ نہیں ہوتی' خدا تعالیٰ ان سے ناراض تو نہیں ہوئے وہ تو معاف ہو گئے، اسی وجہ سے جب مصیبت کے وقت فکر کرتے ہیں تو نئے گناہ کو دیکھتے ہیں۔

گناہ کی سزا فوراً ملنا ضروری نہیں ہے:

حالانکہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ اگر گناہ آج کیا ہو تو آج ہی اس کی سزا بھی مل جائے' دیکھئے اگر کوئی شخص کچھ مٹھائی کھالے تو یہ عادت ہے کہ اس کو پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں لیکن یہ کچھ ضروری نہیں کہ جس روز کھایا ہو اسی روز نکلنے لگیں' فرعون نے چار سو برس تک خدائی کا دعویٰ کیا' لیکن کبھی سر میں درد بھی نہیں ہوا' اور پکڑا گیا تو اس طرح کہ ایک دم ہلاک ہی کر دیا گیا' خدا تعالیٰ کے ہاں ہر کام حکمت سے ہوتا ہے کبھی ساتھ کے ساتھ سزا مل جاتی ہے اور کبھی مدت کے بعد پکڑ ہوتی ہے' اسی طرح نیکیوں میں بھی کبھی ہاتھ کے ہاتھ بدلہ دے دیا جاتا ہے اور کبھی دیر کے ساتھ ملتا ہے' دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لیے بد دعا فرمائی تھی اور قبول بھی ہو گئی چنانچہ ارشاد ہوا قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا' یعنی تمہاری دعا قبول کر لی گئی' لیکن قبول ہو جانے پر بھی اس وقت قبولیت کا کچھ ظہور نہ ہوا بلکہ یہ ارشاد ہوا فَاسْتَقِیْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ☆ کہ تم دعا کا اثر ہونے میں جلدی نہ کرنا یہ نادانوں کا طریقہ ہے بلکہ صبر سے کام لینا سو چالیس برس تک حضرت موسیٰ نے انتظار کیا اس کے بعد فرعون اور اس کی قوم ہلاک ہوئی' ان دونوں واقعوں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ نہ کسی جرم پر فوراً اثر ظاہر ہونا ضروری ہے نہ نیکی پر، دیکھئے فرعون کو چار سو برس کی مہلت دی گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس سال تک انتظار میں رکھا گیا جب یہ بات ہے تو اگر کبھی جرم کی فوراً سزا نہ ملے تو اس کی نسبت یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اس

جرم سے خدا تعالیٰ ناراض نہیں ہوئے یا یہ جرم سزا کے قابل نہ تھا یا ہم کو معاف کر دیا گیا' مگر لوگ اس غلط خیال کی وجہ سے جب کسی مصیبت میں پڑتے ہیں تو ہمیشہ نئے گناہ کو دیکھا کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت کر کے یہ کہتے ہیں کہ کرتو ڈر نہ کر تو ڈر۔

صاحبو! کسی مسلمان کے منہ سے ایسی بات نکلنا بڑے افسوس اور تعجب کی بات ہے کیا کسی کے نزدیک خدا تعالیٰ کی سلطنت اودھ کے نوابوں کی سلطنت ہے کہ جس کا کوئی قانون اور قاعدہ نہیں جس طرح جی چاہا کر لیا۔

آخرت سے ہم کو بہت نفرت ہے:

خیر یہ بات تو درمیان میں آ گئی تھی' مقصود یہ تھا کہ دنیا کی مصیبتوں کا تو یہاں تک خوف ہے کہ کچھ نہ کر کے بھی ڈرتے ہیں اور آخرت کے بارے میں اس قدر غفلت ایسی بے پروائی ہے کہ کر کے بھی نہیں ڈرتے آئے دن سینکڑوں خرافات کرتے ہیں ہزاروں گناہوں کے بوجھ میں دبے جاتے ہیں لیکن ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے کیا یہ مرض نہیں ہے اور اگر ہے تو کیا اس کی تدبیر ضروری نہیں ہے؟

صاحبو! یہ یاد رہے کہ جس قدر اس کی جانب سے غفلت ہوگی تدبیر دشوار ہوتی جائے گی۔

ہم میں جو دیندار ہیں علاج کا فکر ان کو بھی نہیں:

ایک بات ہو تو اس کا رونا رویا جائے ہماری تو جو بھی حالت ہے وہ رونے کے قابل ہے کس کس بات کی اصلاح کیجائے ایک تو یہ مرض تھا جس سے کوئی بچا ہوا نہیں' دوسرا مرض وہ ہے جو دینداروں کے اندر زیادہ ہے کہ جب کبھی ان کی کوئی حالت قابل افسوس ان کو یاد دلائی جاتی ہے اور ان کی برائیاں ان کو دکھلائی جاتی ہیں' تو فکر ہوتا ہے۔ لیکن صرف اس قدر کہ تھوڑی دیر رو لیے اور بے فکر ہو گئے بڑی ہمت کی تو ایک دو وقت کا کھانا چھوڑ دیا غم کی صورت بنا کر بیٹھ گئے لیکن تدبیر کی جانب ذرا توجہ نہیں بلکہ اس غم کی حالت

میں بھی اگر کوئی دنیا کا کام یاد آ گیا فوراً اس میں لگ گئے' بھلا یہ کچھ فکر ہوئی' یہ تو اللہ میاں کو دھوکہ دینا ہوا' خوب کسی نے کہا ہے ۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق تعالیٰ را بسجودے و نبی ﷺ را بدرودے

یعنی تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جو نماز اور درود سے خدا اور رسول ﷺ کو بہلانا چاہتے ہیں اور سچی طلب ان کے اندر بھی نہیں ہے۔

گناہوں پر صرف رونے سے' بغیر تدبیر کے کام نہیں چلتا:

بعض لوگ ان سے بھی چند قدم آگے ہیں کہ ہمیشہ اپنی حالت پر پریشان رہتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں لیکن کبھی تدبیر کی طرف توجہ نہیں ہوتی' پھر نری پریشانی سے کیا ہو سکتا ہے' اگر کسی شخص کو دق کی بیماری کا پہلا درجہ شروع ہو جائے اور اس کو خبر بھی ہو جائے اور پریشانی بھی ہونے لگے' لیکن وہ صرف یہی کرے کہ جب کوئی اس سے ملنے کو آئے اس کے سامنے رونا شروع کر دے اور دن رات کو کڑھا کرے مگر علاج کی طرف توجہ نہ کرے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا' صرف یہی کہ پاس پانچ روز میں دوسرا تیسرا درجہ بھی شروع ہو جائے گا اور آخر کار ایک روز خاتمہ ہو جائے گا' تو غلطی اس کی یہ ہے کہ پریشانی کو علاج سمجھتا ہے حالانکہ تدبیر اس کی یہ تھی کہ روپیہ خرچ کرتا' حکیم کے پاس جاتا' کڑوی دواؤں پر صبر کرتا' نقصان دینے والی چیزوں سے پرہیز کرتا پریشانی کا اظہار کسی ایک کے آگے بھی نہ کرتا۔

دل کی بیماریوں کی اصل تدبیر:

اسی طرح دل کی بیماریوں اور گناہوں میں بھی اصل تدبیر یہی ہے کہ کسی کامل اور پہنچے ہوئے کی خدمت میں حاضر ہو اور اس کے کہنے پر عمل کرے گناہوں سے پرہیز پر کمر باندھے اور نفس کے خلاف جو علاج بتائے جائیں ان پر صبر کرے اس تدبیر سے خدا نے چاہا تو چند روز میں سب روگ دور ہو جائیں گے اور اچھی عادتیں پیدا ہو جائیں گی' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی سچا طالب ہو تو اس کی مراد ضرور حاصل ہوتی ہے اور یار ضرور

اس پر مہربان ہوتا ہے لیکن لوگوں میں طلب ہی نہیں ہے ورنہ علاج کے لیے طبیب تو موجود ہیں۔

صرف رونا گناہوں کا علاج نہیں:

خلاصہ یہ کہ نری پریشانی سے کچھ نہیں یہ شیطان کا دھوکہ ہے کہ دین ہی کے رنگ میں دین سے ہٹا رہا ہے' اس نے یہ بیہودہ خیالی دل میں جما دیا ہے کہ صرف رونا اور پریشان ہونا کافی ہے[1] عرفی کہتا ہے کہ اگر رونے سے وصال میسر ہوسکتا تو وصال کی امید میں سو سال رونا بھی آسان تھا مگر کہیں رونے سے بھی وصال میسر ہوسکتا ہے

ایک بدو کی حکایت:

ان لوگوں کی بالکل ایسی حالت ہے کہ ایک شخص نے ایک بدو کو دیکھا کہ وہ بیٹھا رورہا ہے اور سامنے ایک کتا بڑا سسک رہا ہے بدو سے رونے کا سبب پوچھا تو کہا یہ کتا میرا رفیق تھا آج یہ مر رہا ہے اس کے غم میں رورہا ہوں اس شخص نے کتے کے مرنے کا سبب پوچھا تو بدو نے کہا کہ صرف بھوک سے مر رہا ہے یہ سنکر اس شخص کو بہت صدمہ ہوا نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو ایک بوری پر نظر پڑی' بدو سے پوچھا کہ اس بوری میں کیا چیز ہے' بدو نے جواب دیا کہ اس میں سوکھی روٹی ہے' اس شخص نے کہا کہ ظالم تیرے پاس روٹی موجود ہے اور کتا بھوک سے مر رہا ہے اور اس کے مرنے کا تجھے غم بھی ہے تو اس میں سے روٹی نکال کر اس کو کیوں نہیں کھلا دیتا تو آپ کہتے ہیں کہ صاحب مجھے اتنی محبت نہیں کہ اس کو روٹی بھی دے دوں کیونکہ اس کو دام لگتے ہیں، ہاں اتنی محبت ہے کہ اس کے غم میں رو رہا ہوں کیونکہ آنسو میں تو دام نہیں خرچ ہوتے، ہماری وہی مثال ہے کہ گھر بار سب تمہارا لیکن کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا ہم کو گناہوں میں پھنسے رہنے کا رنج بھی ہے اور ان کے مٹ

---

[1] ان کا یہ شعر ہے

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد — اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

ایک شاعر کا نام ہے اس کا یہ شعر ہے

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال — صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

جانے کی خواہش بھی ہے لیکن تدبیر نام کو نہیں، ہاں ہے تو اس قدر کہ دو آنسو بہا لیے۔

بعض لوگ بزرگوں کی توجہ کو گناہوں کا علاج جانتے ہیں:

بعض لوگوں کو توجہ بھی ہوتی ہے تدبیر بھی کرتے ہیں لیکن صرف یہ کہ کسی بزرگ کے پاس گئے اور اپنی حالت بیان کر کے فرمائش کی کہ آپ کچھ توجہ کیجئے، یہ بالکل ایسا ہے کہ ایک شخص حکیم کے پاس جائے اور اپنی مرض کو بیان کرے اور جب حکیم نسخہ لکھے تو اس سے کہے کہ حکیم صاحب میری طرف سے یہ نسخہ آپ ہی پی لیں ظاہر ہے کہ اس شخص کو ساری دنیا احمق کہے گی اور سب اس کی ہنسی اڑائیں گے، بس یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو بزرگوں سے توجہ کی فرمائش کرتے ہیں، بیمار تو یہ اور توجہ کریں بزرگ، یہ کچھ توجہ نہ کرے۔

ایک سوداگر کے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے حج کے لئے دعا چاہنے کی حکایت

حاجی امداد اللہ صاحب جب بمبئی میں تشریف لے گئے تو ایک سوداگر نے عرض کیا کہ حضور دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مجھے بھی حج نصیب کرے آپ نے فرمایا کہ ایک شرط سے دعا کروں گا وہ یہ کہ جس دن جہاز چھوڑے مجھے اپنے اوپر پورا اختیار دے دو کہ میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز میں بٹھلا دوں اور وہ تم کو لے کر مکہ کی طرف روانہ ہو جائے اور جب تک یہ نہ ہو تو صرف میری دعا سے کیا کام چل سکتا ہے اس لئے کہ جب تم قصد نہ کرو گے اور دنیا کے کاروبار کو نہ چھوڑو گے اور نہ وہ خود کم ہوں گے تو صرف میری دعا تم کو حج کیونکر ادا کرا دے گی، کیونکہ خود کعبہ تو تم تک آنے سے رہا اس کو کیا غرض پڑی ہے، خلاصہ یہ کہ جو لوگ تدبیر کرتے بھی ہیں تو صرف اس قدر کرتے ہیں کہ بزرگوں سے توجہ کی درخواست کرتے ہیں۔

ابو طالب کا باوجود حضور ﷺ کی کوشش کے ایمان نہ لانا:

صاحبو! خیال کیجیے ابو طالب جو کہ رسول مقبول ﷺ کے حقیقی چچا ہیں اور بڑی محبت کرنے والے ہیں کہ جس موقعہ پر تمام قریش آپ کے خلاف اور دشمن ہو گئے تھے اس

موقعہ پر بھی ابو طالب نے آپ ﷺ کا ساتھ دیا' پھر حضور ﷺ کو بھی ان سے بڑی محبت تھی اور آپ ﷺ نے بیحد کوشش بھی ان کے مسلمان ہونے کی فرمائی لیکن صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے ارادہ نہیں کیا' حضور ﷺ کی کوشش اور محبت کچھ بھی ان کے کام نہ آئی اور اپنے پہلے ہی دین پر ان کا خاتمہ ہو گیا اس پر حضور ﷺ کو بہت رنج ہوا تو آپ کی تسلی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ

''یعنی یہ آپ ﷺ کے اختیار میں نہیں ہے کہ جس کو چاہیں ہدایت کر دیں یہ تو خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ جس کو چاہیں ہدایت دیں'' اور جب ابو طالب کو بھی حضور ﷺ کے چاہنے سے کچھ نفع نہ ہوا تو آج کون شخص ہے جو ابو طالب سے زیادہ حقدار ہو اور کون بزرگ ہے جس کی خواہش سے زیادہ مقبول ہو پس معلوم ہوا کہ جب تک خود ارادہ نہ کرے دوسرے کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

ارادہ اور آرزو میں بڑا فرق ہے:

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو ہے' لیکن یہ بالکل غلط ہے' کیونکہ آرزو دوسری چیز ہے اور ارادہ دوسری چیز ہے مجھے خوب یاد ہے کہ میرے بچپن میں دو شخص حج کو جانے کے بارے میں کچھ بات چیت کر رہے تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ بھائی ارادہ تو ہر مسلمان کا ہے، میں نے کہا صاحب! یہ بالکل غلط ہے، اگر ارادہ ہر مسلمان کا ہوتا تو ضرور سب کے سب حج کر آتے' ہاں یوں کہیے کہ آرزو ہر مسلمان کی ہے' غرض نری آرزو اور خواہش سے کام نہیں چلتا' ضرورت ہے ارادہ کی اور ارادہ کہتے ہیں سامان کے تیار کرنے کو جیسے ایک شخص کھیتی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا کوئی سامان تیار نہیں کرتا تو یہ ارادہ نہیں کہلا سکتا ہاں اس کو آرزو ہے کھیتی کی اور ایک شخص اس کا سامان بھی جمع کر رہا ہے تو یہ بے شک ارادہ ہے' اسی طرح اگر دو شخص جامع مسجد پہنچنا چاہیں مگر ایک تو اپنی جگہ بیٹھا ہوا آرزو ظاہر کیے جائے اور ایک شخص چلنا شروع کر دے تو دوسرے کو کہا جائے گا کہ اس کا ارادہ ہے اور پہلے کو کہا جائے گا کہ اس کو نری آرزو ہے ارادہ نہیں۔

غرض جب ارادہ ہوتا ہے تو کام ضرور پورا ہو جاتا ہے، اگر کسی وجہ سے خود قدرت نہیں ہوتی تو کوئی مددگار مل جاتا ہے جو کام پورا کر دیتا ہے اسی کو کہتے ہیں اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰهِ یعنی کوشش کرنا بندہ کا کام ہے اور پورا کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے' بس کام شروع کر دینا چاہیے خدا تعالیٰ خود مدد کریں گے اور کام پورا ہو جائے گا۔

یوسف علیہ السلام کی بلند ہمتی کی حکایت:

میں بلند ہمتی کی حکایت آپ کو سناتا ہوں، تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا نے بلایا ہے تو جس مکان میں ان کو لے کر گئی ہے' آگے پیچھے سات حصے تھے اور ہر حصے میں تالا لگا ہوا تھا اور تالے بھی نہایت مضبوط تھے غرض پورا سامان کیا گیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام باہر نکل کر نہ جا سکیں' آخر زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا خوشامد بھی کی دھمکی بھی دی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہ سنی' واقعی یہ حضرت یوسف علیہ السلام ہی کا کام تھا کہ اس مصیبت میں بھی ان کو خدا تعالیٰ پر ایسا بھروسہ رہا کہ دروازے ہر طرف سے بند ہیں تالے جڑے ہوئے ہیں مگر انہوں نے دل میں یہ ہمت باندھی کہ مجھ کو اپنا کام تو کرنا چاہیے خدا تعالیٰ ضرور مدد کریں گے چنانچہ آپ نے بھاگنا شروع کیا اور زلیخا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے دوڑیں، لکھا ہے کہ جس دروازے پر پہنچتے تھے تالا خود ٹوٹ کر گر جاتا اور دروازہ خود بخود کھل جاتا تھا' اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور آپ صاف بچ کر باہر نکل گئے۔

آخرت کے کاموں کے لیے فراغت کا انتظار کرنا نفس کا حیلہ ہے:

بہت لوگ اس انتظار میں ہیں کہ فلاں کام سے فراغت کر لیں تو پھر توبہ کر کے اپنی اصلاح کی تدبیر کریں گے' کسی کو لڑکے کے نکاح کی فکر ہے کسی کو مکان بنانے کی فکر ہے کسی کو جائداد کا شغل ہے' صاحبو! ذرا غور کرو کتنے برس یہ کہتے ہوئے گزر گئے کہ اب کے سال کچھ ضرور کر لیں گے مگر آج تک کاموں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا' دنیا کی ہر ضرورت کا خاتمہ ایک نئی ضرورت پر ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ ایک دوسری ضرورت پر ہوتا

ہے آخر یہ عمریوں ہی تمام ہو جاتی ہے پس آج کل پر ٹالنے سے کیا فائدہ ہمت کر کے کام شروع کر دینا چاہیے خدا تعالیٰ خود مدد کریں گے کامل نہ ہو گے تو خالی بھی نہ رہو گے اگر تم کو صدیق کا درجہ بھی نصیب نہ ہوا تو کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہو رہو گے اور کچھ نہ ہو گا تو خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک محبت اور لگاؤ دنیا سے بے تعلقی اور طبیعت کو نفرت تو ضرور ہی ہو جائے مگر افسوس! ہماری یہ حالت ہے کہ روز یہی وعدہ رہتا ہے کہ کل ضرور کر لیں گے مگر ساری عمر اسی کل کل میں گزر گئی اور کل نصیب نہ ہوئی یہاں تک کہ موت کا وقت سر پر آ جاتا ہے اور اس وقت سوائے حسرت کے اور کچھ نہیں بن پڑتا اور اس وقت یہ آرزو کرتا ہے کہ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ☆ کہ اے رب مجھ کو ذرا سی مہلت مل جائے تو میں کہنا مان لوں اور اپنی اصلاح کر لوں مگر یہ آرزو رد کر دی جاتی ہے اور حکم ہوتا ہے کہ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا کہ اب ایک دم کی بھی مہلت نہیں مل سکتی اور صاحبو! ہم تو کیا چیز ہیں کہ ہم کو کچھ مہلت مل سکے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکایت:

حضرت سلیمان علیہ السلام جو نبی معصوم[1] و مقبول ہیں، انہوں نے جب بیت المقدس بنوانا شروع کیا تو کام کے ختم ہونے سے پہلے آپ ﷺ کی وفات کا وقت آ گیا تو آپ نے یہ خواہش کی کہ بیت المقدس کے تیار ہو جانے تک مہلت دی جائے لیکن قبول نہ ہوئی غور کیجیے نبی کی درخواست اور بیت المقدس نبوانے کے لیے مگر نامنظور! آخر آپ نے یہ درخواست کی کہ مجھے اس طرح موت دی جائے کہ جنات کو میری موت کی اس وقت تک خبر نہ ہو جب تک یہ کام پورا نہ ہو جائے یہ درخواست منظور ہوئی اور عادت کے موافق لکڑی پر سہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور اسی حالت میں روح قبض ہو گئی اور سال بھر تک آپ کی لاش اسی طرح کھڑی رہی جنات نے آپ کو زندہ سمجھ کر کام جاری رکھا جب کام ختم ہو گیا اس وقت آپ کی لاش زمین پر گر گئی اور جنوں کو اس وقت آپ کی وفات کی خبر ہوئی اور آپ کی حالت دیکھ کر سمجھے کہ آپ کے انتقال کو اس قدر زمانہ گزر گیا ہے تو اس

[1] یعنی گناہوں سے پاک ہیں ۱۲ منہ

طریقہ پر موت دینے سے کام بھی ہو گیا اور لوگوں کو یہ بھی ہدایت ہو گئی کہ جنوں کو غیب کا علم نہیں' یہ واقعہ قرآن شریف کے اندر موجود ہے' پس جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو خدا کا گھر بنانے کے لیے مہلت نہیں دی گئی تو ہم کو گناہوں کا گھر تیار کرنے کے لیے مہلت کب مل سکتی ہے۔

ہم کام کا ارادہ نہیں کرتے ہمارا ارادہ صرف ہوس ہے:

خلاصہ یہ کہ ہم لوگ ارادہ تو کرتے ہیں لیکن کام کا ارادہ نہیں کرتے کیونکہ کام کا ارادہ وہ ہے جس کے ساتھ کچھ کام بھی کیا جائے اور جس کو ہم ارادہ کہتے ہیں وہ خالی ہوس ہے' دیکھئے اگر ایک شخص کھانا کھانے کا ارادہ کرے لیکن ہاتھ نہ ہلائے نہ منہ چلائے نہ منہ کھولے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے کھانے کا ارادہ کیا' ہاں یہ کہیں گے کہ اس نے کھانے کی ہوس کی' اور جو لوگ بزرگوں کی توجہ کے امیدوار بیٹھے ہیں ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ کیا ان بزرگ کو بھی نری توجہ سے سب کچھ حاصل ہو گیا تھا، یا ان کو کچھ کرنا پڑا تھا' اگر ان کو کچھ خود بھی کرنا پڑا ہے تو کیا وجہ تم کو نری توجہ سے حاصل ہو جائے۔

بزرگوں کی توجہ کب مفید ہوتی ہے:

مجھ کو بزرگوں کی توجہ سے انکار نہیں بے شک بزرگوں کی توجہ سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے اور بہت کچھ اثر ہوتا ہے لیکن توجہ لینے والا بھی تو کسی قابل ہو' اس توجہ کے اثر کے لیے قابلیت کی بھی ضرورت ہے دیکھو اگر کھیتی کرنا چاہو تو زمین میں بیج ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بیج ڈالنا بھی اسی وقت کام دیتا ہے جب کہ زمین بنجر نہ ہو' ورنہ بیج بھی اکارت ہوتا ہے اور محنت بھی بیکار جاتی ہے' پس اول توجہ کی قابلیت پیدا کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ کام کرنے کا ارادہ کرو۔

صرف ارادہ بھی بغیر بزرگوں کی توجہ کے کافی نہیں:

ہاں صرف ارادہ بھی کافی نہیں ہے جب تک بزرگوں کی توجہ نہ ہو کیونکہ ارادہ کے پورے ہونے کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ خدا تعالیٰ کی ہم پر توجہ ہو اور اس کی علامت

یہ ہے کہ بزرگ ہماری طرف متوجہ ہوں' غرض نہ بغیر چلے کام چلتا ہے نہ بے رفیق کے سیدھا راستہ ملتا ہے' دیکھو اگر کوئی اندھا کسی جگہ پہنچنا چاہے تو اول اس کو چلنے کی ضرورت ہے اگر چلے ہی نہیں تو ہزار ساتھی ملنے پر بھی راستہ طے نہ ہوگا' چلنے کے بعد رفیق اور ساتھی کی ضرورت ہے کیونکہ اگر کوئی ساتھ نہ ہو تو راستہ میں کسی جگہ ضرور ٹکر کھا کر گرے گا' خیر وعافیت سے منزل پر پہنچنے کی صورت یہی ہے کہ اپنے پیروں چلے اور راستہ بتلانے والے کا ہاتھ پکڑے' بالکل ایسی ہی حالت اس راستہ کی بھی ہے کہ ارادہ کرنا اور کام شروع کرنا اپنے پیروں چلنا ہے اور کسی بزرگ کا ہاتھ پکڑنا رفیق کا ہاتھ پکڑنا ہے۔

خالی مرید ہونا بغیر اپنی کوشش کے کافی نہیں:

اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ لوگ جو آج کل پیری مریدی کو اصل کام سمجھتے ہیں یہ غلطی ہے' نری پیری مریدی میں کچھ نہیں رکھا' اصل کام خود چلنا ہے اور کسی بزرگ کے کہنے پر عمل کرنا اگرچہ مرید کسی سے بھی نہ ہو' میرا یہ مطلب نہیں کہ بیعت ہونے میں برکت کچھ بھی نہیں' برکت ضرور ہے' لیکن اس کو اصل کام سمجھنا بڑی غلطی ہے آج اس پیری مریدی کے بارہ میں وہ جہالت پھیلی ہے کہ خدا کی پناہ۔

ایک مکار پیر کی حکایت:

میرے ایک دوست بیان کرتے تھے کہ ایک مکار پیر صاحب کسی گاؤں میں پہنچے اتفاق سے بہت ہی دبلے اور کمزور ہو رہے تھے' مریدوں نے پوچھا کہ پیر تم اس قدر کمزور کیوں ہو' پیر صاحب نے جواب دیا کہ ظالم تمہیں میری کمزوری کی خبر نہیں دیکھو میں اپنا بھی کام کرتا ہوں اور تمہارا بھی' تم نماز نہیں پڑھتے میں تمہاری طرف سے نماز پڑھتا ہوں' تم روزہ نہیں رکھتے میں تمہاری طرف سے روزہ رکھتا ہوں اور سب سے بڑی مشقت یہ ہے کہ سب کی طرف سے پلصراط پر چلتا ہوں جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے' بس ان فکروں نے دبلا کر دیا۔ مرید یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور ایک گوجر نے خوش ہو کر کہا کہ پیر! میں نے تجھے اپنا مونجی کا کھیت بخش دیا' پیر کو خیال ہوا کہ گاؤں والوں کا کچھ

اعتبار نہیں اسی وقت چل کر قبضہ کر لینا چاہیے' کہا بھائی ابھی چل کر دے دؤ وہ گوجر ساتھ ہو لیا' رستے میں اتفاق سے کسی ڈول پر سے پیر صاحب کا پیر پھسل گیا اور گر گئے' گرنے کے ساتھ ہی اس گوجر نے ایک لات رسید کی اور کہا کہ تو جب اتنی چوڑی مینڈھ پر نہیں چل سکا تو پلصراط پر کس طرح چلتا ہوگا تو جھوٹا ہے' جا ہم تجھے اپنا کھیت نہیں دیتے۔

جب دین کا کام پیر صاحب کے بھروسہ پر چھوڑے جاتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ دنیا کے کام نہیں چھوڑے جاتے

تو صاحبو! سچ بات یہی ہے کہ کام اپنے کیے سے ہوتا ہے کسی دوسرے کے کیے سے کوئی کام نہیں ہوتا' اور میں کہتا ہوں کہ اگر دوسرے کے کرنے سے کام ہو جاتا ہے اور اپنے کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ قاعدہ دین ہی کے کاموں میں برتا جاتا ہے دنیا کے کاموں میں اس قاعدہ پر کیوں عمل نہیں کرتے ان کو پیر کے بھروسہ پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے' بس نہ کھاؤ نہ پیو نہ کھیتی کرو سب کام تمہاری طرف سے پیر ہی کر لیا کریں گے' انہیں کے کھانا کھانے سے تمہارا پیٹ بھر جائے گا' ان ہی کے پانی پینے سے تمہاری پیاس بجھ جایا کرے گی' افسوس اس کاموں میں تو اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتے بلکہ اپنے کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور دین کے کاموں کو اس قدر رستا اور بے وقعت سمجھ لیا ہے کہ اس میں اس قسم کے قاعدے برتے جاتے ہیں۔

اودھ کے ایک پیر کی حکایت:

اس پر مجھ ایک لطیفہ یاد آیا کہ اودھ میں ایک پیر تھے وہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے ان کے مرید کہا کرتے تھے کہ مکہ میں جا کر نماز پڑھتے ہیں' میرے ایک دوست نے سن کر کہا کہ صاحب اس کی کیا وجہ ہے کہ نماز کے لیے تو مکہ کو اختیار کیا جائے اور کھانے اور ہگنے کے لیے ہندوستان کو' اگر وہاں نماز پڑھی جاتی ہے تو کھانا ہگنا بھی وہیں ہونا چاہیے اور اگر یہ ہندوستان میں ہوتا ہے تو نماز بھی ہندوستان میں ہونی چاہیے کیونکہ ہندوستان بم پولیس نہیں ہے' خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا مقصد یہ ہے کہ تم اپنے اس قاعدے میں کہ سب کام

پوری کرلیں گے غور کرو کہ دیکھو کہ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ پیر تمہارے کمیں ہیں کہ گناہ تم کرو اور پیر اس کو اٹھائیں۔

پیر کا کام صرف رستہ بتانا ہے:

یاد رکھو کہ پیر صرف اور صرف راستہ بتلانے کے واسطے ہیں کام کرنے کے لیے نہیں' کام تم کو خود کرنا چاہیے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض مرتبہ پیر کی توجہ سے مرید کے دل میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو کہ خود محنت کرنے سے پیدا نہیں ہوتی' سو اس کا جواب یہ ہے کہ صرف اس کیفیت سے کچھ فائدہ نہیں جب تک خود کام نہ کیا جائے' بلکہ اگر خود کچھ نہ کیا جائے تو یہ کیفیت باقی بھی نہیں رہتی۔

توجہ کے اثر کی مثال:

اس کیفیت کی ایسی مثال ہے جیسے آگ کے سامنے بیٹھنے سے بدن گرم ہو جاتا ہے لیکن یہ گرمی باقی نہیں' آگ کے سامنے سے ہٹ کر ہوا لگی کہ بدن میں ٹھنڈک پیدا ہوئی' اسی طرح اس کیفیت سے بھی پیر سے جدا ہوتے ہی کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔

دو بزرگوں کی حکایت:

ایک بزرگ نے اپنے زمانہ کے ایک بزرگ سے کہا کہ تم اپنے مریدوں سے محنت لیتے ہو اور ہم نہیں لیتے' انہوں نے یہ سن کر اپنے ایک مرید سے کہا کہ تم ذرا ان کے مرید سے مصافحہ کرو مصافحہ کرنا تھا کہ وہ کم محنت مرید خالی رہ گئے' پیر نے ان سے کہا کہ دیکھا نتیجہ محنت نہ کرنے کا' اب تم ہمارے کسی مرید کو تو اس طرح کورا کردو' بات یہ ہے کہ اپنی کمائی ہوئی چیز کی قدر بھی خوب ہوتی ہے اور مفت کی چیز کی کچھ قدر نہیں ہوتی مشہور ہے کہ ایک شخص ادھوڑی کا جوتا دوشالے سے جھاڑ رہا تھا لوگوں نے اس سے سبب پوچھا تو کہا کہ دوشالہ تو میرے والد کی کمائی کا ہے اور یہ جوتا میری کمائی کا ہے' تو جو لوگ اپنے بوتہ پر کام کرتے ہیں ان کی حالت ساری عمر ایک سی رہتی ہے البتہ ان میں شور وغل اچھل کود نہیں ہوتی اور یہ مقصود ہے' دیکھو اگر کوئی بچے کو کھلاتا ہے پلاتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ

اس کو تھوڑا تھوڑا کھلائے کہ وہ بدن کو لگے اور اس سے موٹا تازہ ہو۔

کامل پیر آہستہ آہستہ اصلاح کرتا ہے:

اسی طرح کامل پیر بھی ایک ہی دن میں سب کچھ نہیں بھر دیتا کیونکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مرید کو حالات اور کیفیات کا ہیضہ ہو اور ایک ہی دن میں خاتمہ ہو جائے بلکہ وہ آہستہ آہستہ اس کو آگے بڑھاتا ہے اور جو لوگ اناڑی ہیں اور اصلاح کرنے کے طریقہ سے ناواقف ہیں وہ ایک دم میں بھر دینا چاہتے ہیں' ایسے پیروں کو عام لوگ بہت بزرگ سمجھتے ہیں' حالانکہ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے رشتے اس سے چھوٹ جاتے ہیں نہ بیوی کے کام کا رہتا ہے نہ بچوں کے۔

اہل وعیال کو چھوڑ دینا کمال نہیں:

اور یہ کمال نہیں بلکہ نقصان ہے' دین کا کام آپس میں ملانا ہے نہ کہ جدائی کرنا' خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں عام طور پر فرماتے ہیں وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ' یعنی وہ کاٹتے ہیں ان رشتوں اور تعلقوں کو جن کے ملانے خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے' افسوس! آج اسی کو کمال سمجھا جاتا ہے۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بزرگ ہیں' دیکھئے اولاد کو منہ بھی نہیں لگاتے بیوی تک کو نہیں پوچھتے' ہر وقت خدا کے عشق میں ڈوبے رہتے ہیں صاحبو! کیا کوئی شخص رسول اللہ ﷺ سے بھی خدا تعالیٰ کے عشق میں زیادہ ہو سکتا ہے' کبھی نہیں' پھر دیکھ لیجے حضور ﷺ کی کیا حالت تھی' آپ ﷺ بیویوں کے بھی حق ادا فرماتے تھے اولاد کے حق بھی ادا فرماتے تھے' ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما میں سے ایک کو پیار کر رہے تھے اور ایک نجد[1] کے رئیس پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے دیکھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرے تو دس بیٹے ہیں میں نے تو آج تک کسی سے پیار نہیں کیا' آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ نے تیرے دل ہی میں سے رحم نکال لیا تو اس کو میں کیا کروں' آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو بچوں پر رحم اور بڑوں کی

[1] ایک ملک کا نام ہے ۱۲ منہ

تعلیم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں' اس واقعہ سے حضور ﷺ حالت پورے طور پر معلوم ہو گئی ہوگی' سوزا جوش اور مستی اور رشتہ ناتے کا چھوڑ دنیا بزرگی نہیں ہو سکتی' اگر اسی کا نام بزرگی ہے تو شراب کا نشہ اور جنوں کی حالت بھی بزرگی ہے' کیونکہ ان دونوں میں یہ بات خوب حاصل ہو جاتی ہے۔

بزرگی کی اصلی پہچان:

صاحبو! بزرگی کی پہچان یہ ہے کہ جتنا زیادہ بزرگ ہوگا' اسی قدر حضور ﷺ کے ساتھ اس کی حالت ملتی جلتی ہوگی اور آپ کی سنت کا زیادہ پابند ہوگا' کیونکہ فقیری بھی رسول ﷺ ہی سے نکلی ہے' افسوس ہے کہ یہ لوگ مولویوں کے پاس نہیں جاتے اس لیے بہت سی غلطیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

بے ہوش کر دینا بزرگی نہیں:

چنانچہ بزرگی کی ایک پہچان یہ بھی اپنے دل سے گھڑ رکھی ہے کہ جو شخص آنکھ ملتے ہی بے ہوش کر دے' اٹھا کر زمین پر ٹپک دے وہ بڑا بزرگ ہے' کس قدر بیہودہ بات ہے کہ اگر یہ بزرگی ہے تو حضور ﷺ کو تو ضرور اس کو برتنا چاہیے تھا' پھر کیا وجہ کہ جب کافروں نے آپ ﷺ کو قتل کرنا چاہا تو آپ ﷺ اس کے انتظار میں رہے کہ یہ لوگ ذرا غافل ہو جائیں تو میں نکل کر جاؤں' آپ ﷺ نے ایک ہی نگاہ میں کیوں سب کو بے ہوش نہ کر دیا۔

مدینہ کے سفر میں سراقہ کے ملنے کا قصہ:

پھر جب مدینہ کو تشریف لے چلے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے چلتے تھے جب سراقہ سامنے آ گیا جو آپ ﷺ کی تلاش میں بھیجا گیا تھا تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور ﷺ سراقہ چلا آ رہا ہے' آپ ﷺ نے اس وقت بھی خدا تعالیٰ سے دعا ہی فرمائی کہ اے اللہ! ہم کو اس کے شر سے بچا' چنانچہ دعا کرتے ہی پیٹ تک اس کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا' سراقہ نے کہا کہ شاید آپ ﷺ نے میرے لیے بددعا کی ہے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ ﷺ خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ مجھے اس

مصیبت سے نجات دے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ قریش کو آپ ﷺ کا پتہ نہ دوں گا سو آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور اس کا گھوڑا زمین سے نکل آیا" پھر اس نے اپنا وعدہ پورا کیا کہ راستہ میں جو آپ ﷺ کی تلاش کے لیے آتا ہوا ملا اس کو لوٹا دیا۔ آپ ﷺ کا پتہ کسی کو نہ دیا۔

پہلے زمانہ میں سچائی کی صفت عام طور پر تھی:

اس واقعہ سے آج کل کے لوگوں کو سبق لینا چاہیے کہ اس زمانہ کے کافروں میں بھی عہد و پیمان کا پاس و لحاظ تھا' آج کل کی طرح پولیٹیکل اور سیاسی چالیں نہ تھیں بلکہ آج سے چند روز پہلے تک بھی یہ خوبی اکثر لوگوں میں موجود تھی مگر افسوس آج بالکل اس کا پتہ نہیں اور خاص کر مسلمانوں کی حالت تو اس وقت کہنے کے قابل نہیں دن میں سینکڑوں جھوٹے وعدے کرتے ہیں بیسیوں مکر کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ رنج کی بات یہ ہے کہ جو دیندار کہلاتے ہیں وہ بھی اس حالت سے پاک نہیں صاحبو! پہلے لوگ اس قدر سیدھے سادے بھولے ہوتے تھے کہ ان کو کسی قسم کی چالاکی آتی ہی نہ تھی۔

ایک پرانے بزرگ کے بھولے پن کی حکایت:

میرے ایک رشتہ کے بزرگ بیان کرتے تھے کہ ان کے والد زمیندار تھے ایک مرتبہ کاشتکار اناج لایا' زمیندار نے پوچھا یہ کس قدر ہے کاشتکار نے نوے من بتلایا' انہوں نے کہا کہ ہم سے تو اسی من ٹھہرایا تھا' کاشتکار نے کہا نہیں جناب نوے من ٹھیرا تھا' بہت دیر تک اس میں جھگڑا رہا آخر ان زمیندار کے بیٹے نے بہت سی کنکریاں جمع کر کے ایک ڈھیر نوے کنکریوں کا اور دوسرا اسی کنکریوں کا لگایا اور ان زمیندار سے گنوا کر پوچھا کہ یہ اسی زیادہ ہیں یا نوے انہوں نے نوے کو زیادہ بتلایا، تو ان کے بیٹے نے کہا کہ کاشکار اتنے من دنیا چاہتا ہے جس قدر یہ زیادہ کنکریاں ہیں تب ان دونوں کا جھگڑا ختم ہوا۔ سبحان اللہ! کیسا اچھا وقت تھا کہ کافروں میں بھی چالبازی نہ تھی' یہی وجہ تھی کہ سراقہ نے جو عہد آپ سے کیا تھا اس کو پورا کیا اور جو شخص اس راستہ میں ملتا گیا اس سے کہتا گیا کے میں بہت دور

تک دیکھ آیا ہوں ادھر کہیں نہیں ملے اور حضور ﷺ خیر و عافیت اور اس وامان سے مدینے پہنچ گئے' تو دیکھیے حضور ﷺ نے سراقہ کے ساتھ یہ نہیں کیا کہ ایک نظر سے اڑا دیتے یا گرا دیتے بلکہ خدا تعالیٰ سے دعا فرمائی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پریشانی سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں یہ خیال ذرا بھی نہ تھا کہ حضور ﷺ نظر سے بے ہوش کر دیں گے' ورنہ آپ رضی اللہ عنہ کبھی پریشان نہ ہوتے بلکہ بے فکر رہتے کہ حضور ﷺ ایک نظر بھی کریں گے تو یہ فوراً لوٹ پوٹ ہو جائے گا' تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی کمال نہیں ہے۔

نظر اور توجہ سے کیا نفع ہے:

ہاں نظر اور توجہ سے صرف اس قدر نفع ہوتا ہے کہ کام پر لگا دیا جائے' آگے جو کچھ ہوتا ہے اپنے کرنے سے ہوتا ہے۔

حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

جیسا کہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا ہے کہ آپ بڑے امیر زادہ تھے اور حالت آپ کی یہ تھی کہ آپ وحشیوں کی طرح جنگلوں میں پھرا کرتے تھے ان کے والد ان کا نکما اور بے کار سمجھا کرتے تھے' حضرت نجم الدین کبریٰ کو الہام ہوا کہ فلاں جگہ فلاں رئیس کا ایک لڑکا ہے اس کی جا کر اصلاح کرو حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے والد نے بڑی آؤ بھگت کے ساتھ ٹھہرایا اور عرض کیا کہ کیسے تکلیف کی' انہوں نے فرمایا کہ اپنے بیٹوں کو جمع کرو' انہوں نے حافظ کے سوائے سب بیٹوں کو بلا کر آپ کی خدمت میں حاضر کیا' آپ نے سب کو دیکھا اور فرمایا کہ کیا ان کے سوا کوئی اور لڑکا نہیں' حافظ کے والد حافظ کو بالکل بیکار سمجھتے تھے اس لیے جواب دیا کہ اور کوئی نہیں' انہوں نے فرمایا کہ مجھ کو کشف سے ایک لڑکا تمہارا اور معلوم ہوا ہے اور وہ ان میں نظر نہیں آتا' تب انہوں نے کہا کہ ایک اور ہے مگر نہایت آوارہ وحشیوں کی طرح جنگلوں میں پھرتا ہے حضرت نجم الدین نے فرمایا کہ ہاں اسی کی ضرورت ہے' حافظ کے والد کو بڑا تعجب ہوا کہ اس دیوانے سے حضرت کو کونسا کام ہے' مگر تلاش کرایا بڑی مشکل سے حافظ ملے' وحشی

خاک میں اَٹے ہوئے اور ان کو نجم الدین کبریٰ کی خدمت میں حاضر کیا حافظ نے جب حضرت کی صورت دیکھی تو بے اختیار قدموں سے لپٹ گئے اور کہنے لگے کہ حضرت آپ کی نظر سے تو خاک بھی کیمیا بن جائے' مجھ غریب کے حال پر بھی ایک نظر فرمائیے' آپ نے انہیں سینے سے لگالیا اور فرمایا کہ جاؤ میں نے تم پر نظر کی' حضرت نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ کوئی معمولی شخص نہ تھے' ایک بہت بڑے شخص ہیں آپ کا انتقال بھی اس طرح ہوا کہ ایک مرتبہ انہوں نے کسی کو شعر پڑھتے ہوئے سنا' جس کا مطلب یہ تھا کہ جان دے' جان دے' جان دے' آپ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ افسوس! محبوب جان مانگ رہا ہے اور کوئی نہیں سنتا' پھر فرمایا کہ میں نے جان دی' میں نے جان دی' میں نے جان دی' یہ کہتے کہتے آپ کا انتقال ہو گیا غرضکہ حافظ کو سینے سے لگا کر انہوں نے فیض دیا اور اپنا نظر کردہ کیا' مگر خالی نظر بھی کافی نہیں ہوئی بلکہ اس کے ساتھ محنت اور مجاہدہ کی بھی ضرورت ہوئی یہ دوسری بات ہے کہ قابلیت اچھی ہونے کی وجہ سے زیادہ محنت کی ضرورت نہ ہوئی ہو۔

اچھی لیاقت والوں کو تھوڑی محبت بھی کافی ہوتی ہے:

کیونکہ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ان کے تھوڑے کام میں بہت کچھ نفع ہو جاتا ہے۔

سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اور ایک ہفتہ میں خلافت لے کر چلا گیا آپ کے دوسرے مرید اس کو دیکھ کر دل میں بہت خفا ہوئے اور یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ حضرت ہماری طرف پوری توجہ نہیں فرماتے' آپ نے ان لوگوں کے انداز سے اس وسوسہ کو تاڑ لیا اور ان کے علاج کے لیے فرمایا کہ کچھ تر اور کچھ سوکھی لکڑیاں جمع کرو جب جمع ہو گئیں تو فرمایا کہ گیلی لکڑیوں میں آگ لگاؤ سب نے بہت کوشش کی لیکن آگ نہ لگی، اس کے بعد فرمایا کہ ان سوکھی لکڑیوں میں آگ لگا دو، ان میں فوراً آگ سلگ اٹھی، آپ نے فرمایا کہ کیا وجہ یہ لکڑیاں اس قدر جلدی کیوں سلگ اٹھیں اور پہلی لکڑیوں میں آگ کیوں نہیں لگی' ان لوگوں نے کہا کہ حضور! پہلی لکڑیاں گیلی تھیں اور

سوکھی ہیں، گیلی لکڑیوں میں آگ نہیں لگا کرتی، آپ نے فرمایا کہ ظالمو! تم گیلی لکڑیاں ہو کر میری شکایت کرتے ہو اور اس سوکھی لکڑی کے جل اٹھنے پر تعجب کرتے ہو وہ سوختہ[1] ہو کر آیا تھا صرف ایک پھونک کی ضرورت تھی، سو ایک ہی پھونک میں جل بھڑک اٹھا اور تم گیلی لکڑی ہو کر آئے ہو رات دن دھونکتا ہوں مگر تم آگ ہی نہیں پکڑتے، سو اس میں میری جانب سے کمی ہے یا تمہارا قصور ہے، غرض بعض دل جلے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کو تھوڑے ہی کام میں سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے اور ایک ہی نظر میں وہ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں لیکن آگے یا پیچھے محنت و مجاہدہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑتا ہے۔

محنت کرنے پر بھی جو کچھ ملتا ہے وہ خدا کا فضل ہے:

اور محنت کرنے پر بھی جو کچھ ملتا ہے وہ صرف خدا تعالیٰ کا فضل ہے ورنہ ان پر کسی کا زور نہیں ہے لیکن ان کی عادت ہمیشہ سے یوں ہی جاری ہے کہ جو ادھر ذرا توجہ کرتا ہے وہ اس کی طرف بہت توجہ کرتے ہیں خود ذرا سا کام کرتا ہے وہ اس کو بہت کچھ دیتے ہیں، تو صاحبو! یہ بات کچھ کم ہے کہ کام پیسہ کا کیا جائے اور ملے اشرفی، ایک[2] شاعر اسی کی نسبت کہتا ہے کہ ایسا بازار کہاں ملے گا کہ دیا تو ایک پھول اور اس کے عوض مل گیا ایک باغ، دوسرا[3] کہتا ہے کہ وہ آدھی جان لے کر سینکڑوں جانیں دیتے ہیں، پھر اس سے زیادہ اور کیا چاہیے، غرض جو تدبیر کرنے کی ہے لوگ اسے نہیں کرتے، صرف ادھوری تدبیر کرتے ہیں حالانکہ تدبیر پوری کرنی چاہیے تب فائدہ ہوتا ہے۔

وعظ کا خلاصہ:

اب میں وعظ کا خلاصہ بیان کرتا ہوں اور آخرت سے غفلت کی مذمت ایک مثال سے سمجھاتا ہوں کہ دیکھئے جب کسی سفر کا قصد ہوتا ہے تو اس کے لیے کس قدر سامان کرتے ہو کہ کتنے دن پہلے سے دھوبی کو حکم کرتے ہو کہ کپڑے جلدی دینا، ناشتہ کا انتظام کرتے

---

[1] جلانے کی لکڑی۔

[2] شعر یہ ہے   خود کہ یابد ایں چنیں بازار را   کہ بیک گل می خری گلزار را   ۱۲

[3] شعر یہ ہے   نیم جاں بستاند و صد جاں دہد   آنچہ در وہمت نیاید آں دہد   ۱۲

ہو اور طرح طرح کا سامان کرتے ہو' یہ نہیں کیا جاتا کہ خاص وقت پر سارا سامان کیا جائے بلکہ اگر ایسا کیا جاتا ہے تو بے وقوف بنائے جاتے ہیں اور خود بھی اپنے کو بے وقوف سمجھے ہیں' کیوں صاحب! جب اس چھوٹے سے سفر کے لیے اتنے پہلے سامان تیار کیا جاتا ہے تو یہ موت کا اتنا بڑا سفر اس کے لیے کتنے پہلے اور کتنے بڑے سامان کی ضرورت ہو گی کیونکہ یہ وہ سفر ہے کہ اس سے پھر کبھی لوٹنا ہی نہ ہو گا' پھر اس کے لیے کیا سامان کیا' دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو خدا کی عبادت میں سرگرم ہیں دوسرے وہ جو گناہوں میں پھنسے ہیں' پہلی قسم کے لوگوں کے لیے یہ سفر رغبت اور شوق کا سفر ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لیے یہ سفر دہشت اور خوف کا سفر ہے اور یہ دونوں صورتیں دنیا کے سفروں میں بھی ہوئی ہیں چنانچہ دیکھ لیجیے کہ اگر کوئی شخص بادشاہ کے ہاں مہمان کی حیثیت سے بلایا جائے تو یہ سفر اس کے لیے رغبت اور شوق کا ہو گا اس کے لیے کیا کچھ سامان وہ پہلے سے کرے گا اپنے پاس نہ ہو گا تو دوسروں سے مانگ کر قرض لے کر چیزیں جمع کرے گا اور ہر طرح سے درست ہو کر سفر کا ارادہ کرے گا' اسی طرح اگر کسی شخص نے چوری کی ہو اور گورنمنٹ کی طرف سے اس کے نام سمن آ گیا ہو تو غور کیجیے کہ جانے سے پہلے وہ کیا کیا سامان کرے گا' اپنی صفائی کے گواہ جمع کرے گا وکیلوں سے مل کر مشورہ کرے گا یار دوستوں سے رائے لے گا اور بھی جو اس سے ہو سکے گا انتظام کرے گا' غرض دونوں قسموں کے سفر میں طرح طرح کے سامان کیے جاتے ہیں تو کیا وجہ کہ جب یہی دونوں صورتیں آخرت کے سفر میں بھی ہیں اس میں بھی کیوں سامان نہیں کیا جاتا اور غفلت برتی جاتی ہے' صاحبو! یہ یقینی ہے کہ سفر آخرت کا آنے والا ہے پس اگر ہم مطیع اور تابعدار ہیں تو یہ سفر ہمارے لیے رغبت اور شوق کا سفر ہو گا ورنہ دہشت اور خوف کا سفر ہو گا' سو بتلایئے کہ آپ نے رغبت کے کیا سامان جمع کیے ہیں اور چھٹکارے کی کونسی صورتیں پیدا کی ہیں' کونسی عبادت کی ہے کتنے حق دوسروں کے ادا کر دیئے ہیں بلکہ اگر غور سے دیکھو تو آخرت کا سفر ہر مسلمان کے لیے رغبت اور دہشت دونوں پہلو لیے ہوئے ہے کیونکہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے' نہ خدا تعالیٰ پر ناز ہو سکتا ہے اور نہ ان سے مایوس ہونا چاہیے۔

خوف اور امید دونوں کی ضرورت:

تو مسلمانوں کی اصل حالت یہ ہونی چاہیے کہ خوف اور شوق ملا ہوا ہو' دیکھو! نبیوں کی حالت خدا تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ترجمہ کہ وہ پکارتے ہیں ہم کو شوق اور خوف سے یہ دونوں باتیں ان میں جمع ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر قیامت کے میدان میں یہ پکارا جائے کہ صرف ایک شخص جنت میں جائے گا' مجھے یہ امید ہوگی کہ وہ شخص میں ہوں اور اگر یہ پکارا جائے کہ صرف ایک شخص دوزخ میں جائے گا تو مجھے یہ خوف ہوگا کہ وہ شخص میں ہی ہوں غرض مسلمان کو ہر وقت شوق بھی ہونا چاہیے اور خوف بھی اور جب یہ ہے تو ہر وقت توبہ استغفار بھی کرتے رہنا چاہیے اور دین کے کاموں میں بھی پوری کوشش ہونا چاہیے اور صاحبو! ایک آدھ وقت کام کر لینے سے کام نہیں چلتا ضرورت اس کی ہے کہ روز کا دھندا ہو جائے' خدا تعالیٰ فرماتے ہیں يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ☆ یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس کو سوچو کہ کل کے لیے کیا کر رکھا ہے۔

آخرت کی فکر کے یہ معنی نہیں کہ دنیا کے سب کام چھوڑ دو:

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ بیٹھو' ہاں یہ ضرور ہے کہ آخرت کی دھن لگ جائے' اگر روزانہ آدھ گھنٹہ بھی اس فکر کے لیے نکال لیا جائے تو پھر خدا نے چاہا تو بہت کم گناہ ہوں گے اور دنیا کی محبت جاتی رہے گی' پھر یہ حالت ہوگی کہ تم دنیا کے سب کام کرو گے لیکن ان کاموں میں جی نہ لگے گا۔

اصلاح کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں دین کا علم اور بزرگوں کی صحبت:

اور اس کے بعد دو چیزوں کی اور ضرورت ہوگی ایک تو ضرورت کے لائق دین کا علم حاصل کرنے کی' سو خدا کا شکر ہے کہ اب اس کا سامان بہت میسر ہو گیا ہے اور ہر شخص کو ہر جگہ رہ کر اس کو سیکھنا آسان ہے' اس کے لیے یہ کرو کہ کوئی ایسی کتاب لے کر جس میں ضرورت کی سب باتیں ہوں کسی مولوی سے پڑھنا شروع کر دو' یا اگر پڑھنے کا موقع نہ

ہوتو نہایت غور سے دیکھنا شروع کردو اور ہمیشہ اس کا شغل رکھو دوسرے کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کرلو اور ان کے پاس آتے جاتے رہو مگر تعلق دین کے لیے پیدا کرو دنیا کے کاموں کے لیے اللہ والوں سے تعلق نہیں پیدا کرنا چاہیے ہاں اگر کبھی اتفاقیہ دنیا کا کام بھی ان سے نکل جائے تو مضائقہ نہیں۔

دنیا کے واسطے بزرگوں سے تعلق پیدا مت کرو:

لیکن صرف دنیا ہی کو مقصود بنا کر ان سے راہ درسم نہیں پیدا کرنا چاہیے جیسا کہ بعض لوگ اللہ والوں سے اس لیے ملتے ہیں کہ ان کی ملاقات بڑے لوگوں سے ہے ان کے ذریعہ سے ہمارے کام نکلیں گے یا بعض لوگ تعویذ گنڈوں کے لیے ملتے ہیں مگر سمجھ لو کہ اللہ والوں سے اس قسم کے کام لینے کی ایسی مثال ہے کہ کسی سنار سے کھرپا بنانے یا لوہار سے زیور بنانے کی فرمائش کی جائے بعض لوگ بزرگوں سے مشورہ لیا کرتے ہیں کہ ہم کس قسم کی تجارت کریں اناج کی تجارت کریں یا کپڑے کی خدا جانے یہ لوگ بزرگوں کو خدا کا رشتہ دار سمجھتے ہیں کہ ان کا بتلانا خدا کا بتلانا ہوگا اور جب خدا بتلادے گا تو اس کام میں ضرور نفع ہوگا یا خدا تعالیٰ کا رازدار سمجھتے ہیں کہ یہ خدا سے مشورہ کر کے بتلادیں گے ابھی کل کی بات ہے ایک شخص کہنے لگے کہ مولوی صاحب آپ کو تو سب خبر ہوگئی ہوگی صاحبو! اس دربار میں نبیوں کا پتہ بھی پانی ہوتا ہے دوسروں کی تو کیا مجال ہے ایک شخص نے مجھ سے یاد نہیں رہا کسی دنیا کے کام کی فرمائش کی میں نے کہا یہ کام مجھے نہیں آتا کہنے لگے کہ اللہ والوں کو سب آتا ہے میں نے کہا کہ اگر سب کچھ آتا ہے تو کل ایک چارپائی بھی لے آنا کہ اس کو بن دیجیے، غرض مولویوں سے صرف اللہ تعالیٰ کے حکم احکام پوچھیے اور بزرگوں سے اللہ کا نام پوچھیے دنیا کی فرمائش کسی سے نہ کیجیے ہاں دنیا کے لیے دعا کرانے کا مضائقہ نہیں۔

اپنے کام کے لیے خود بھی دعا کرو:

دعا کے متعلق بھی یہ نہ کرو کہ صرف ان ہی پر ڈال دو بلکہ تم خود بھی اپنے لیے دعا

کرو اور بزرگوں سے بھی کراؤ' ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ خود دعا کروں' میں نے کہا کہ کلمہ بھی پڑھتے ہو یا نہیں کہنے لگے کہ ہاں! پڑھتا ہوں' میں نے کہا کہ اس کی کیا وجہ کہ تم کلمہ پڑھنے کے قابل تو ہو مگر دعا کرنے کے قابل نہیں' یہ شیطان کی شرارت ہے کہ دل میں یوں ڈالتا ہے کہ اپنے آپ کو دعا کے قابل نہ سمجھنا تواضع ہے' ایک شخص نے یہ بھی فرمائش کی کہ تم ہی استخارہ بھی دیکھ دو' غرض اپنے اوپر کسی قسم کی تکلیف نہ ہو سب کچھ دوسرے ہی کر دیں' مگر کھانے میں یہ کبھی نہ سوجھا کہ بزرگوں سے کہتے کہ آپ ہی کھالیا کیجئے' ہمارے کھانے کی ضرورت نہیں' خلاصہ یہ کہ کام دین کا خود کرو اور بزرگوں سے اس میں اصلاح اور مشورہ لیتے رہو۔

آخرت کی فکر ہمیشہ ہونی چاہیے:

اور عمر بھر اسی تدبیر میں لگے رہو یہ نہ کرو کہ چار دن کیا اور چھوڑ دیا' کیونکہ ہم کو تو جنم روگ لگا ہے اس کے لیے عمر بھر کی ضرورت ہے۔

یہ ضروری بیان اس آیت کے متعلق تھا' میں پھر آیت کا ترجمہ دوبارہ کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! اپنی فکر میں لگو کیونکہ تم کو خدا تعالیٰ کی طرف جانا ہے وہ تم کو بتلا دیں گے جو کچھ تم کرتے تھے' اب میں ختم کرتا ہوں اور پھر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ سفر ضرور ہونے والا ہے اس لیے آج ہی سے اس کے لیے تیار ہو جانا چاہیے' اب خدا سے دعا کیجیے کہ وہ کام کرنے کی توفیق دے۔ فقط

تمت

❁❁❁

(۴۰) نیک کاموں کے درجے

منتخب از تفاضل الاعمال وعظ دوم حصہ چہارم دعوات عبدیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خطبہ ماثورہ:

اَمَّابَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِالْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَايَسْتَوٗنَ عِنْدَاللّٰهِ وَاللّٰهُ لَايَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَO

ترجمہ: ''کیا تم حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کی تعمیر کرنے کو اس شخص کے کاموں کے برابر کرتے ہو جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا ہو دونوں جماعتیں اللہ کے نزدیک ہرگز برابر نہیں۔''

اس آیت میں ایک ضروری مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے آج میں اس کو آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں' اس سے پہلے کبھی اس کی طرف خیال بھی نہ گیا تھا اور شاید اور لوگوں کے خیال میں بھی یہ بات کم آئی ہوگی' لیکن بات نہایت ضروری ہے اور قرآن میں صاف طور پر موجود ہے اور چونکہ مسئلہ کچھ بکھیڑے کا نہیں اس لیے اس وقت بیان بھی کچھ زیادہ نہ ہو گا' اور آج اس کے بیان کرنے کی ضرورت یہ ہوئی کہ اول تو خود مسئلہ ہی ضروری ہے' پھر یہ کہ پہلے جمعہ کو جو مضمون بیان کیا گیا تھا اس سے ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے اور اس مسئلہ کے سمجھ میں آ جانے کے بعد وہ شبہ جاتا رہے گا تو اس لحاظ سے اس مضمون کا پہلے مضمون کے ساتھ بھی جوڑ ہو جائے گا اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس مسئلہ کو بیان کر دوں تاکہ

اچھی طرح سمجھ میں آ جانے کے بعد آیت کے ترجمے ہی سے معلوم ہو جاء کہ وہ مسئلہ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

نہ سب نیک کام برابر ہیں اور نہ سب گناہ برابر ہیں:

سنیے! یہ بات تو ہر چھوٹا بڑا جانتا ہے کہ جس قدر بھی نیک کام ہیں سب ایک درجے اور ایک مرتبے کے نہیں، بلکہ ان میں فرق یہ ہے کسی کا مرتبہ زیادہ اور کسی کا کم ہے، مثال کے طور پر لیجیے، جیسے نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، مسجد بنوانا، حج کرنا، مظلوم کی مدد کرنا یہ سب نیک کام ہیں مگر سب کا مرتبہ برابر نہیں، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جو ثواب نماز پڑھنے میں ملتا ہے اسی قدر مسجد بنوانے میں بھی ملتا ہے یا جو حج کا ثواب ہے ایک پیسہ خیرات کرنے میں بھی اس کے برابر ہے، اسی طرح گناہ بھی سب برابر نہیں، چوری، ڈکیتی، زنا، شراب پینا کسی کو مار ڈالنا بڑے گناہ ہیں لیکن ان کے اندر آپس میں بھی فرق ہے، اسی طرح بہت سے چھوٹے گناہ ہیں، لیکن کوئی بہت ہلکا ہے کوئی اس سے زائد ہے، نیک کاموں کے متعلق حدیث میں ہے کہ ایمان کی ستر ۷۰ سے زیادہ شاخیں ہیں جن میں سب سے زیادہ کامل تو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ ہے اور سب سے ادنیٰ درجہ کا کام یہ ہے کہ رستے سے تکلیف دینے والی چیزوں کو ہٹا دے، جیسے راستے میں کانٹے پڑے ہوں یا کوئی بڑی لکڑی پڑی ہو، جیسے اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ وہ سڑک پر ایسی چیزیں ڈال دیتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں جن سے راستہ میں چلنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے، بعض لوگ بہلی یا چھکڑے راستے میں کھڑے کر دیتے ہیں، بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اندھا وہاں سے گزرتا ہے اور اس سے ٹکر کھا جاتا ہے، ہاں! اگر کسی ایک کنارے پر ہو تو کوئی مضائقہ نہیں لوگوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شرع نے ان باتوں کے متعلق کوئی قاعدہ قانون مقرر ہی نہیں کیا صاحبو! ہر کام کے لیے شرع میں ایک حکم موجود ہے، دیکھو جب ایسی چیزوں کو راستہ سے ہٹا دینا ایمان کی ایک شاخ قرار دیا گیا تو ان چیزوں کا راستہ میں ڈالنا یا چھوڑ دینا گناہ ہو گا یا نہیں، سو اس حدیث میں غور کرنے سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ نیک کام سب ایک مرتبہ کے نہیں، بلکہ یوں

کہنا چاہیے کہ صاف طور پر اس کا ذکر ہے' دیکھئے حضور ﷺ نے بتلا دیا کہ ایمان سب سے زیادہ کامل ہے شرم وحیا اس سے کم ہے تکلیف دینے والی چیزوں کو راستہ سے ہٹانا اس سے کم ہے' بلکہ لوگوں کو حالت میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ لوگ بھی اپنے برتاؤ میں نیک کاموں کے اندر فرق مان رہے ہیں' دیکھئے اگر کسی کے پاس دس روپیہ ہوں اور وہ ان کو کسی نیک کام میں لگانا چاہتا ہے تو وہ اول یہ معلوم کرتا ہے کہ کس کام میں لگانا بہتر ہے اور اگر خود معلوم نہیں ہوتا تو مولویوں سے دریافت کرتا ہے اور ان کے بتلائے ہوئے کہ موافق عمل کرتا ہے اگر وہ مدرسہ میں خرچ کرنے کو افضل بتاتے ہیں تو مدرسہ میں خرچ کرتا ہے اور اگر مسجد میں خرچ کرنے کو بہتر بتاتے ہیں تو مسجد میں دیتا ہے' پس اگر یہ نیک کاموں میں فرق نہیں سمجھتا تو اس کی چھان بین کیوں ہے' سو ہر طرح سے یہ فرق یقینی ہے' دلیل سے بھی اور لوگوں کے برتاؤ سے بھی' اتنی بات میں تو کچھ شبہ نہیں کہ نیک کاموں میں فرق تو ضرور ہے۔

افضل کی پہچان میں علماء اور عوام دونوں کی غلطی:

اب رہی یہ بات کہ کونسا کام کس کام سے افضل ہے اور افضل ہونے کی کیا پہچان ہے سو اس کے اندر اکثر نے غلطی کی ہے' عوام نے بھی اور علماء نے بھی اس لیے اس کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے وہ غلطی یہ ہے کہ لوگ افضل کی پہچان اپنی رائے سے کرتے ہیں' یا اگر بعض لوگ کسی شرع کی دلیل سے کرتے ہیں تو وہ لوگ اس دلیل میں پوری طرح غور نہیں کرتے کہ اس سے افضل ہونا ثابت ہوا یا نہیں تو عام لوگ جب نیک کاموں کے درجے مقرر کرتے ہیں تو اکثر اس کا فیصلہ اپنی رائے سے کرتے ہیں اور اس کی جانچ کا قاعدہ اور طریقہ بھی اپنی رائے سے مقرر کر لیا ہے' کیونکہ جب ایک چیز کو کسی چیز پر فضیلت دی جائے تو اس کی جانچ کے لیے کوئی کسوٹی اور پہچان تو ہونی چاہیے' ایک چاندی کو دوسری چاندی پر یا ایک کپڑے کو دوسرے کپڑے پر اگر فضیلت دیں تو اس کی کوئی کسوٹی اور پہچان ضرور ہوگی۔

عام لوگوں نے افضل کی کیا پہچان مقرر کی ہے:

پس اسی طرح عام لوگوں نے بھی نیک کاموں میں فضیلت دینے کا ایک قاعدہ اور اس کی پہچان مقرر کرلی ہے کہ جس کام کی صورت عبادت کی ہوتی ہے یا اس کو ظاہر میں عبادت سے زیادہ تعلق ہوتا ہے' اس کو افضل سمجھتے ہیں۔

بیان اس کا یہ ہے کہ نیک کام دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں کہ جس طرح واقع میں وہ عبادت ہیں صورت بھی ان کی عبادت کی ہے یا عبادت سے ظاہر تعلق رکھتی ہیں' جیسے نماز پڑھنا کہ یہ صورت اور حقیقت دونوں کے لحاظ سے عبادت ہے یا مسجد تیار کرانا کہ اس کو عبادت یعنی نماز سے ظاہری تعلق ہے' دوسرے وہ کام ہیں کہ واقع میں وہ عبادت ہیں لیکن ان کی ظاہری تعلق ہے' دوسرے وہ کام ہیں کہ واقع میں وہ عبادت ہیں لیکن ان کی ظاہری صورت عبادت نہیں معلوم ہوتی اور نہ ان کو کسی عبادت سے ظاہری تعلق ہے کہ ہر شخص کی نظر میں آجائے' جیسے کسی طالب علم کی مدد کرنا کھانے یا کپڑے سے (کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کے مجھے کسی طالب علم کا کھانا مقرر کرانا ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ واقع میں ایک عبادت ہے لیکن) اس کا عبادت سے تعلق ہر ایک کی نظر میں نہیں آتا' کیونکہ طالب علم کا کھانا مقرر کرنا جو عبادت ہے تو اس لیے کہ یہ دین کی خدمت ہے اور اس کا دین کی خدمت ہونا اس وقت سمجھ میں آسکتا ہے کہ جب طالب علم پڑھنے سے فارغ ہو کر دین کی خدمت میں مشغول ہو تو یہ دونوں قسم کے کام عبادت ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے کہ مسجد بنوانے کا تعلق عبادت کے ساتھ ظاہر ہے کہ اس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں اور نماز ایسی ظاہر عبادت ہے کہ کسی کو اس کے عبادت ہونے میں شبہ نہیں ہوسکتا' ہر شخص جانتا ہے کہ نماز پڑھنا عبادت ہے تو جو چیزیں نماز سے ظاہری تعلق رکھتی ہیں ان کو بڑی عبادت سمجھتے ہیں اسی لیے مسجد بنوانا' اس میں تیل بتی دینا بڑے ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے۔

طالب علموں کی خدمت کرنے کو عام لوگ عبادت نہیں سمجھتے:

رہا طالب علم کا کھانا تو اس کو ایسا نہیں سمجھتے کیونکہ اول تو عبادت کے ساتھ اس کا

تعلق ظاہر نہیں، پھر جس عبادت سے اس کا تعلق ہے وہ ایسی ظاہری عبادت نہیں کہ عام لوگ بھی فوراً سمجھ لیں اس لیے کہ طالب علموں کی خدمت میں علم کی مدد ہے اور اس کا عبادت ہونا اتنا ظاہر نہیں، دیکھئے اگر کوئی شخص پڑھنا شروع کرتا ہے اور کوئی کتاب پڑھتا ہے تو کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ یہ عبادت کر رہا ہے کیونکہ اس کا عبادت ہونا انجام کے اعتبار سے ہے اور جب دس بارہ برس تک اسی میں لگا رہے اور علم سے فراغت حاصل کرے تو وہ اس قابل ہوگا کہ دین کی خدمت کر سکے اور دین کی خدمت تمام عبادتوں سے افضل ہے۔

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو فضیلت دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم پر خدمت دین کی وجہ سے ہے:

یہی دین کی خدمت ہے جس کی بدولت حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل کہا جاتا ہے، ورنہ نماز روزہ کے اندر آپ کا دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے زائد ہونا کسی کتاب سے ثابت نہیں مگر پھر بھی تمام اہلسنت وجماعت کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں حضرات تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں، حدیثوں میں بھی اس کا صاف طور پر ذکر ہے اور بزرگوں کو بھی کشف[1] وکرامت سے یہی معلوم ہوا ہے، حدیثیں تو سب کے سامنے موجود ہیں، ہاں بزرگوں کو جو کشف ہوئے ہیں، ان میں سے میں ایک آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین باتوں کا حکم فرمایا اور یہ تینوں باتیں میری مرضی کے خلاف ہیں، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے سامنے میں نے اپنی مرضی کو چھوڑ دیا، ایک تو یہ کہ میرا خیال کچھ اس طرف تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو افضل سمجھو، دوسرے یہ کہ میں چاہتا تھا کہ کسی امام رحمہ اللہ کا مقلد نہ ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہوا کہ چاروں اماموں کے مذہب سے باہر نہ ہو، تیسرے یہ کہ میں خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے تمام تدابیر اور اسباب کو چھوڑ دینا پسند کرتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] کشف یہ ہے کہ پوشیدہ بات خدا تعالیٰ کسی کے دل پر کھول دیں۔

نے اس سے روک کر تدبیر اور اسباب کے اختیار کرنے کا حکم فرمایا' ان تینوں حکموں میں بہت سے راز ہیں لیکن یہ وقت ان کے بیان کرنے کا نہیں اس لیے اس کو یہیں چھوڑا جاتا ہے' مقصود یہ ہے کہ کشف میں بھی حضور ﷺ کا یہی حکم معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھو' خلاصہ یہ کہ حدیث سے کشف سے ہر طرح ان دونوں حضرات کی فضیلت[1] ثابت ہوتی ہے' تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں کے ہاتھ سے اسلام کی خدمت بہت زیادہ ہوئی' غرض یہ کہ دین کی خدمت ایسی چیز ہے کہ تمام عبادتوں میں افضل مگر پھر بھی اس کی صورت عبادت کی نہیں اس لیے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی' پھر طالب علم کو کھانا کھلانے کا تعلق بھی دین کی خدمت کے ساتھ ظاہر نہیں' کیونکہ وہ اس وقت تو دین کی خدمت کر نہیں رہا' بلکہ فراغت کے بعد کرے گا۔

طالب علم کو کھانا کھلانے میں کس قدر ثواب ہے:

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس میں کس قدر ثواب ہے اگر آپ نے ایک طالب علم کو کھانا کھلایا اور اس سے پڑھنے کی قوت اس کی حاصل ہوئی اس قوت سے اس نے کام لیکر ایک سبق یاد کیا اور اسی طرح برابر سات آٹھ برس تک یہ کرتا رہا اور اس مدت میں فراغت حاصل کر کے اس قابل ہو گیا کہ دین کی خدمت کرے اور اس نے دین کی خدمت شروع کر دی' پس یہ خدمت دین کی اسی مدد اور کھانے کی بدولت ہے جو آٹھ برس تک اس کو پہنچتا رہا اور اس خدمت کا ثواب ان سب لوگوں کو ملے گا جو اس کی مدد میں شریک رہے لیکن عام لوگ اس کو نہیں سمجھتے اور اسی لیے ان کے پاس جب کچھ روپیہ جمع ہو جاتا ہے اور ان کو خدا کی راہ میں دینے کا کچھ خیال پیدا ہوتا ہے تو مسجد بنواتے ہیں' اکثر ایسے لوگ ہیں کہ ان کے پاس روپیہ بے شمار ہے اور اولاد ایک بھی نہیں' یا اولاد بھی ہے لیکن روپیہ ضرورت سے زیادہ ہے۔

---

[1] اگر اس مسئلہ کی تحقیق منظور ہو تو ازالۃ الخفاء دیکھو

بلاضرورت مسجد بنانے کی خرابیاں:

اول تو تدبیر ان کی سمجھ میں یہی آتی ہے کہ اپنے گھر کی مسجد بنادیں آخر مسجد بنوا کر اپنی زندگی بھر اس کے حجرے میں رہتے ہیں اور چھوڑ کر مر جاتے ہیں ایسے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس نئی مسجد میں جو نمازی آئیں گے وہ دوسری پرانی مسجد کے جانے والے اور وہاں کی جماعت کے پابند ہوں گی اور جب پرانی مسجد کے لوگ یہاں آنے لگیں گے تو اس مسجد کی جماعت میں کمی ہو جائے گی' ہم نے اسی قصبہ میں دیکھا ہے کہ چار پانچ مسجدیں بالکل ہی قریب قریب بنی ہیں ایسی کہ اگر ایک وقت میں سب جگہ نماز شروع ہو تو ایک مسجد کا امام دوسری مسجد کے امام کی قرأت پوری طرح سن سکتا ہے بلکہ عجب نہیں کہ سب کی آوازیں ایک ساتھ آنے کی وجہ سے کسی کو بھول بھی ہو جائے' اس میں بعضے لوگوں کی نیت تو اپنا نام کرنے کی ہوتی ہے' ایسے لوگ تو کسی گنتی میں نہیں' لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کو دکھلاوا مقصود نہیں ہوتا' بلکہ وہ مخلص[1] ہوتے ہیں اگرچہ ثواب میں مفلس ہی ہوتے ہیں۔

لطیفہ:

عام لوگ ہمارے قصبات میں مفلس کو مخلص کہتے ہیں' ایک مرتبہ میرے پاس دیہاتی دوست آئے' میں نے کسی بات پر کہا کہ تم تو بہت مخلص ہو کہنے لگے نہیں تمہاری دعا سے میرے پاس سب کچھ ہے میں مخلص نہیں (یعنی مفلس نہیں) غرض ایسے لوگوں کو نیت خالص ہونے پر بھی کچھ ثواب نہیں ملتا بلکہ اور گناہ ہوتا ہے' تو عام لوگوں کو ایک تو مسجد بنوانے کا بہت شوق ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی صورت عبادت کی ہے۔

لوگ قرآن دینے کو ثواب سمجھتے ہیں مسئلہ کی کتاب دینے کا ثواب نہیں سمجھتے:

اور اسی وجہ سے قرآن کو پڑھنے کے لیے دے دینا بہت ثواب کی بات سمجھتے ہیں۔

---

[1] مخلص وہ ہے جس کی نیت خالص ہو دکھلاوا کی نہ ہو۔

مسئلہ: مسائل کی کتاب دینے میں اتنا ثواب نہیں سمجھتے چاہے لینے والا قرآن کو پڑھے بھی نہیں، کیونکہ قرآن اسقدر چھپ گئے ہیں کہ ہر شخص کے پاس کئی کئی موجود ہوتے ہیں، تو جس کو قرآن دیا جاتا ہے وہ اس کو پڑھتا بھی نہیں، اسی طرح جب کوئی مرتا ہے تو اس کے مال میں سے قرآن دیا جاتا ہے، چاہے وہ اتنا غلط ہو کہ کوئی پڑھ بھی نہ سکے، ایک مرتبہ ایک شخص بہت سے قرآن مسجد میں لایا کہ میں ان کو پڑھنے کے لیے دینا چاہتا ہوں دیکھا تو سب غلط تھے آخر میں نے ان کو دفن کرایا تو ایسے قرآن دینے سے کیا فائدہ، پس افضل ہونے کا ایک قاعدہ اور پہچان تو عام لوگوں کے ذہن میں یہ ہے:

افضل ہونے کی عام لوگوں کے نزدیک دوسری پہچان:

اور دوسری پہچان یہ ہے کہ جس کام کا نفع فوراً ظاہر ہو اس میں ثواب زیادہ سمجھتے ہیں اور جس کا نفع دیر سے ظاہر ہو اس میں اتنا ثواب نہیں سمجھتے اسی وجہ سے پانی پلانے کا ثواب زیادہ سمجھا جاتا ہے، دیکھئے اگر کسی شخص کا ارادہ کنواں بنوانے کا ہو اور اس سے کہا جائے کہ مسجد کا ایک حجرہ ٹوٹا ہوا پڑا ہے اس کو بنوا دو تو وہ کنویں کو فضیلت دے گا۔

تیسری پہچان:

تیسری پہچان عام لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ جس چیز کا نفع عام ہو اور اس سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اس میں زیادہ ثواب ہوتا ہے جیسے کنواں بنوانا، یہ نمونہ کے طور پر عام لوگوں کے قاعدے اور پہچانیں تھیں جو ان کے حالات میں غور کرنے سے سمجھ میں آئیں کہ نفع جلدی ظاہر ہو اور نفع عام ہو اور اس کام کی صورت عبادت کی ہو پھر اس پر بس نہیں کہ کاموں ہی کے جانچنے میں ان سے کام لیں۔ بلکہ بزرگوں میں بھی۔

کامل کی پہچان میں عام لوگوں کی غلطی:

جب ایک کو دوسرے پر فضیلت دیتے ہیں تو انہی تینوں قاعدوں سے ان کو جانچتے ہیں اگر ایک شخص تمام رات جاگتا ہے کسی سے بات بھی بہت کم کرتا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو کہ فرض واجب، سنت سب ادا کرتا ہے رات کو گھنٹہ دو گھنٹہ جاگ لیتا ہے، دماغ

کی حفاظت کی تدبیر بھی کرتا ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت بھی کرتا ہے' مخلوق کا دل رکھنے کے لیے لوگوں سے ملتا بھی ہے بچوں سے ہنس بھی لیتا ہے تو عام لوگ ان کے مقابلہ میں پہلے شخص کو زیادہ کامل سمجھیں گے' چنانچہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا عابد ہے اور دوسرے شخص کو دیکھتے ہیں کہ زیادہ عبادت نہیں کرتا اس لیے اس کو زیادہ کامل نہیں سمجھتے حالانکہ زیادہ عابد یہی شخص ہے کیونکہ عبادت کہتے ہیں بندہ ہونے کو اور بندگی نام ہے حکم بجالانے کا' جس وقت بھی جو حکم ہو' پس لوگوں سے ملنا جلنا بھی دینی غرض سے عبادت میں داخل ہے۔

عبادت کی تحقیق:

عبادت کی حقیقت حضرت حاجی صاحب نے بڑی عجیب بیان فرمائی ہے وہ آپ کو سناتا ہوں' فرمایا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ☆ یعنی ہم نے انسان اور جن کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے عبادت کے لیے انسان اور جن کو خاص فرمایا' حالانکہ فرشتے اور جتنے جانور اور بے جان ہیں سب کے سب عبادت میں مشغول ہیں' جیسا کہ آیتوں سے معلوم ہوتا ہے' فرشتوں کے بارے میں ارشاد ہے کہ رات دن اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں' تھکتے نہیں بے زبان چیزوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے لیکن تم اس کو نہیں سمجھتے' جب ہر چیز عبادت میں مشغول ہے پھر انسان اور جن کی کیا خصوصیت ہے جو یہ فرمایا کہ ان دونوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک تو نوکر ہوتا ہے ایک غلام ہوتا ہے' نوکر کے کام ہمیشہ مقرر ہوتے ہیں اگرچہ کتنے ہی کام نوکر سے لیے جائیں لیکن کوئی کام ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس میں نوکر عذر کر سکتا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اس کام کے لیے نہیں' دیکھیے اگر کوئی شخص اپنے نوکر سے کہنے لگے کہ تو مہتر کا کام بھی کیا کر تو وہ ہرگز منظور نہ کرے گا اور عذر کر دے گا اسی طرح اور بہت سے کام ایسے نکلیں گے جن میں نوکر کی جانب سے عذر ہوگا بلکہ اولاد بھی جن پر نوکر سے

زیادہ قبضہ ہوتا ہے بعض کاموں میں انکار کر دیتی ہے ہمارے ایک دوست کا واقعہ ہے جو خاندانی سید اور بڑے گھرانے کے ہیں انہوں نے ایک مرتبہ جبکہ سقوں نے پانی بھرنا چھوڑ دیا' اپنے لڑکے کو کہا کہ بھائی سقوں نے تو پانی بھرنے سے جواب دے دیا ہے محلہ والوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے تم ہی لوگوں کے ہاں پانی بھر آیا کرو' وہ لڑکا اس پر بہت خفا ہوا تو دیکھیے بعض کاموں سے اولاد بھی انکار کر دیتی ہے' لیکن غلام کسی کام سے انکار نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا کوئی خاص مقرر کام نہیں ہوتا بلکہ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک وقت آقا کی جگہ پر کام کرتا ہے اور زرق برق لباس میں ہوتا ہے اور دوسرے وقت آقا کے ناپاک کپڑوں کو صاف کرتا ہے ایک وقت بھنگی کا کام کرتا ہے تو دوسرے وقت سفیر کا کام کرتا ہے' پس غلام نوکر بھی ہے مہتر بھی ہے' سفیر بھی ہے' خلیفہ بھی ہے' پس انسان اور جن تو مثل غلام کے ہیں اور دوسری مخلوق مثل نوکر کے ہے اور یہی وجہ ہے کہ دوسری مخلوق کی عبادت کو پاکی بیان کرنے اور سجدہ کرنے کے نام سے یاد کیا' اور انسان اور جن کے کام کو عبادت کا لقب دیا اور جب انسان اور جن بندے اور غلام ہیں تو ان کی کوئی خاص خدمت نہ ہوگی' بلکہ ان کے لیے ایک وقت نماز' روزہ کرنا عبادت ہوگا' تو دوسرے وقت سونا اور حاجت پورا کرنا اور لوگوں سے ملنا اور اسی طرح کے کام عبادت ہوں گی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو اس وقت نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اور اس سے فراغت کرنا واجب ہے۔ دیکھیے ایک وقت انسان کے لیے ایسا نکلا کہ اس کو مسجد میں جانا حرام اور پاخانہ میں جانا واجب ہوا۔

زیادہ بھوک کے وقت کھانے سے نماز سے پہلے فراغت کرنا واجب ہے:

اسی طرح اگر کوئی اول وقت نماز پڑھنا چاہے اور اس کو شدت سے بھوک لگی ہو تو شریعت حکم کرے گی کہ نماز بعد میں پڑھو اول کھانا کھاؤ' اس کے راز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت پاکیزہ الفاظ میں فرماتے ہیں کہ میرا سارا کھانا نماز ہو جائے' یہ اس سے بہتر ہے کہ میری ساری نماز کھانا بن جائے' مطلب یہ ہے کہ جب کھانا اول کھائے گا تو سارے کھانے میں نماز کا دھیان رہے گا کہ اس سے جلد نمٹوں اور نماز کو جاؤں تو یہ سارا وقت نماز

کے انتظار میں گزار اور نماز کے انتظار میں نماز ہی کا ثواب ملتا ہے تو کل کھانا نماز ہو گیا اور اگر ایسا نہ کیا جاتا بلکہ بھوک میں نماز شروع کر دی جاتی تو جسم تو نماز میں ہوتا اور دل کھانے میں پڑا ہوتا تو ساری نماز کھانے کی نذر ہو جاتی' اور اسی راز کی وجہ سے ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر جسم ہندوستان میں ہے اور دل مکہ میں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ جسم مکہ میں رہے اور دل ہندوستان میں' غرض انسان کے لیے کوئی عبادت مقرر نہیں کیونکہ اس کی شان غلام کی سی ہے اور جب یہ ہے تو ایک تو وہ شخص ہے کہ نماز پڑھ کر کسی دیہاتی سے باتوں میں مشغول ہے اور کھیتی باڑی کا حال پوچھ رہا ہے اور دوسرا شخص لاالہٰ الا اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے' تو ظاہر میں یہ دوسرا شخص افضل معلوم ہوتا ہے' لیکن غور کریں تو معلوم ہو کہ اگر پہلے شخص کی نیت اچھی ہے کہ کسی مسافر یا مہمان کا دل خوش کرنا مقصود ہو یا کوئی دوسری ایسی ہی نیت ہو تو یہ باتیں زیادہ افضل اور مقبول ہیں۔

افضل ہونے کی صحیح پہچان:

کیونکہ ہر کام اپنے نتیجہ اور فائدہ کے لحاظ سے افضل ہوتا ہے' جس کام کا نتیجہ افضل ہوتا ہے وہ کام بھی افضل ہے' تو ہر کام کے نتیجہ اور غرض کو دیکھنا چاہیے لیکن عام لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔

حضرت حاجی صاحب کی حکایت:

حضرت مولانا فتح محمد صاحب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی حکایت بیان فرماتے تھے کہ میں حضرت کے پاس بیٹھا ہوا تھا' بہت دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا آخر جب بہت دیر ہو گئی تو میں اٹھا اور عرض کی کہ حضرت آج میں نے آپ کی عبادت میں بہت حرج کیا' حضرت فرمانے لگے کہ مولانا یہ کیا فرمایا' کیا نماز روزہ ہی عبادت ہے اور دوستوں کا جی خوش کرنا عبادت نہیں' حضور نبی کریم ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھتے تھے اور جس قسم کی جائز باتیں صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے حضور ﷺ ان کے ساتھ شریک رہتے، اگر صحابہ رضی اللہ عنہم ہنستے تو ان کے ساتھ آپ بھی مسکراتے' تو یہ ہے کہ کاملوں کی حالت مگر عام لوگ

اس کو کیا سمجھیں۔

ایک حکایت:

عام لوگوں کی پسند پر مجھے ایک حکایت یاد آئی' حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ جب شیخ نہال احمد صاحب رئیس دیوبند نے اپنے بیٹے کا نکاح کیا تو چماروں کو بھی زردہ پلاؤ' فرنی کھلائی اور کھانے تو انہوں نے جس طرح ہوئے کھائے' مگر جب فیرینی سامنے آئی تو اس کو چکھ کر ان میں سے ایک شخص کیا کہتا ہے کہ یہ تھوک سا کیا ہے' واقعی جس نے گڑ اور شیرہ کھایا ہو وہ کیا جانے کہ قند میں کیا مزہ ہے اور فیرینی کیا ہوتی ہے' اسی طرح عام لوگ کاملوں کی کیا حالت جانیں۔

حضور ﷺ کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ برتاؤ:

رسول اللہ ﷺ کا یہ دستور تھا کہ کھانے پینے کی باتوں میں بلکہ اسلام سے پہلے کے قصوں میں بھی صحابہ کے ساتھ شامل رہتے تھے اور ان لوگوں کی باتوں کو سن کر آپ ﷺ مسکراتے تھے'

حضور ﷺ آواز سے کبھی نہ ہنستے تھے:

آپ ﷺ کا ہنسنا مسکرانے سے زیادہ نہ ہوتا تھا' کبھی کسی نے آپ ﷺ کی ہنسی کی آواز نہیں سنی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب غم کا غلبہ ہوتا ہے تو ہنسی کی آواز نہیں نکلتی چاہے مسکرانے کی حالت ہو جائے' اور حضور ﷺ ہمیشہ غمگین اور فکر مند رہتے تھے۔ جس کی وجہ بھی خود ارشاد فرماتے ہیں کہ میں کیونکر چین سے رہوں' جب کہ فرشتہ صور لیے تیار کھڑا ہے کہ اب حکم ہو اور صور پھونک دوں' تو بتلایئے اس حالت میں ہنسی کیونکر آتی ہے' ہنسی تو ان لوگوں کو آ سکتی ہے جو بالکل بے فکر ہوں' سو اللہ والوں کو بے فکری کہاں! صرف دوسروں کی خاطر سے کبھی کچھ ہنس دیتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام کی حکایت:

اس کے مناسب ایک اور حکایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ملاقات ہوئی' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر مسکرایا کرتے تھے اور حضرت یحییٰ زیادہ رویا کرتے

تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یحییٰ علیہ السلام کیا تم خدا تعالیٰ کی رحمت سے بالکل نا امید ہو گئے ہو کہ کسی وقت تمہارا رونا ختم ہی نہیں' حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے عیسیٰ علیہ السلام! کیا تم خدا کے قہر سے بالکل بے خوف ہو کہ تم کو ہر وقت ہنسی ہی آتی رہتی ہے، آخر ایک فرشتہ آیا اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم تم دونوں میں فیصلہ کرتے ہیں، کہ اے عیسیٰ علیہ السلام! لوگوں کے سامنے تو ایسے ہی رہو جیسے اب رہتے ہو لیکن تنہائی میں یحییٰ علیہ السلام کی طرح رویا کرو' اور اے یحییٰ تنہائی میں تو ایسے رہو جیسے اب ہو لیکن لوگوں کے سامنے ہنسی بھی لیا کرو تاکہ لوگوں کو میری رحمت سے مایوسی نہ ہو جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کبھی کبھی مسکرانے کی وجہ:

اور یہ حکایت اس لیے بیان کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسا جو کچھ تھا وہ صرف دوسروں کی خاطر سے تھا' اور اگر دوسروں کی رعایت نہ ہوتی تو شاید مسکرانے کی بھی نوبت نہ آتی غرض جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم باتوں میں یا ہنسی میں مشغول ہوتے تھے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال کی عام لوگوں کو کیا خبر ہوتی ہوگی اسی لیے کافر کہتے تھے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ کہ یہ کیسے رسول ہیں کہ کھانا کھاتے ہیں اور بازار میں پھرتے ہیں۔

مولانا روم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی کو مثنوی میں بیان فرماتے ہیں کہ کافروں نے انبیاء کے ساتھ برابری کی اور ان کو اپنی طرح سمجھا اور کہا کہ ہم بھی آدمی ہیں اور کہا کہ ہم بھی کھاتے پیتے ہیں اور وہ بھی کھاتے پیتے ہیں' پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق ہے مگر جہالت سے وہ یہ نہ سمجھے کہ ان میں اور ان میں بے انتہا فرق ہے یہ کھاتے ہیں تو پلیدی نکلتی ہے اور وہ کھاتے ہیں تو سب نور خدا بن جاتا ہے۔

مثنوی کے ایک شعر کا مطلب:

میں جب حضرت حاجی صاحب سے مثنوی مولانا روم پڑھا کرتا تو اس شعر[1] میں

---

[1] شعر یہ ہے جس کا ترجمہ کر دیا۔

ایں خورد گردد پلیدی زو جدا　　　واں خورد گردد ہمہ نور خدا ۱۲ منہ

مجھے یہ خیال ہوا کہ مولانا نے یہ فرق واقعی نہیں بیان کیا' بلکہ ایک خیالی بات بیان کر دی ہے جیسے شاعروں کی باتیں خیالی ہوا کرتی ہیں' کیونکہ واقعی فرق تو اس وقت ہو سکتا تھا جبکہ اللہ والوں کے پیٹ سے یہ پلیدی نہ نکلتی' جب سبق شروع ہوا تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا کہ پلیدی سے مراد بری عادتیں ہیں اور نور خدا حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا کہ پلیدی سے مراد بری عادتیں ہیں اور نور خدا سے مراد اچھی عادتیں ہیں' مطلب یہ ہے کہ اللہ والے کھاتے ہیں تو غذا سے ان کو اچھی عادتوں میں مدد ملتی ہے اور دوسرے لوگ کھاتے ہیں تو ان کو بری عادتوں میں مدد ملتی ہے' تو اتنا بڑا فرق ہوتے ہوئے کفار نے کچھ نہ سمجھا اور انبیاء علیہم السلام کو اپنے جیسا کہا' کیونکہ ان میں کوئی انوکھی بات نہ تھی' کھانا بھی کھاتے تھے اور پانی بھی پیتے تھے۔

کھانا پینا چھوڑنے کا نام بزرگی نہیں ہے:

آج کل بھی ایسے لوگوں کو جو کھانا چھوڑ دیں پانی چھوڑ دیں بہت بزرگ سمجھا جاتا ہے' میں کہتا ہوں کے اگر پانی کے یا کھانے کے چھوڑنے پر بزرگی کا دارو مدار ہے تو سر سری اور سانڈ اور سمندر جو جانور ہیں بہت بزرگ ہیں کیونکہ سر سری پانی بالکل نہیں پیتی اور سانڈا نہ کھانا کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے صرف ہوا اس کی غذا ہے۔

بزرگی کی اصل پہچان:

صاحبو! بزرگی اللہ کے ساتھ تعلق کا نام ہے جس کی پوری حقیقت کا بعض دفعہ فرشتوں کو بھی پتہ نہیں لگتا ہاں اس کی ظاہری پہچان یہ ہے کہ اس کی ہر حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملتی ہو۔ اور ہر بات میں آپ کے قدم بہ قدم ہو یعنی جس طرح نماز ادا کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری موافقت کی کوشش ہو اسی طرح آپس کے برتاؤ' روز مرہ کی باتوں میں' سونے میں جاگنے میں غرض ہر ہر بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پابندی ہو' یہاں تک کہ اس کی ایسی عادت ہو جائے کہ بے تکلف سب کام سنت کے موافق ہونے لگیں تو یہ بزرگی کی پہچان ہے اور کم کھانے اور کم پینے کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

کم کھانے کی حقیقت:

دوسرے کسی شخص کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بہت کھاتا ہے یا کم کھاتا ہے، کیونکہ کم کھانا یہ ہے کہ بھوک سے کم کھائے کیا خبر ہے کہ جس کو تم بہت کھانے والا سمجھے ہو اس کی بھوک اس خوراک سے دونی ہو تو وہ کم کھانے والا ہوا۔

ایک مرید کی حکایت:

ایک پیر سے ان کے مریدوں نے ایک دوسرے سے مرید کی شکایت کی کہ حضرت یہ بہت کھاتا ہے، چالیس پچاس روٹیاں کھا جاتا ہے، پیر نے اس کو بلا کر کہا کہ بھائی اتنا نہیں کھایا کرتے ہر کام میں اوسط درجہ ٹھیک ہوتا ہے، بہت زیادتی اچھی نہیں، اس مرید نے کہا کہ حضرت ہر ایک کا اوسط درجہ الگ ہوتا ہے، یہ صحیح ہے کہ میں اتنی مقدار کھا جاتا ہوں، لیکن یہ غلط ہے کہ میں زیادہ کھاتا ہوں، کیونکہ اصلی خوراک میری اس سے بہت زیادہ ہے جب تک مرید نہ ہوا تھا، اس سے دونی خوراک کھایا کرتا تھا، تو اس حکایت سے معلوم ہوا ہوگا، کہ بعض آدمیوں کی خوراک ہی بہت زیادہ ہوتی ہے اور اصلی خوراک کے اعتبار سے وہ بہت کم کھاتے ہیں تو یہ پہچان صحیح نہیں ہے کیونکہ اول تو کم یا زیادہ کھانا معلوم نہیں ہو سکتا، دوسرے کم کھانے پر بزرگی کا دارومدار نہیں ہے۔

بزرگوں نے جو کم کھانے اور کم سونے کا حکم فرمایا ہے اس کا مطلب:

اگر کسی کو شبہ ہو کہ بزرگوں نے تو کم کھانے اور کم سونے کا حکم فرمایا ہے تو سمجھو کہ اول تو ہر ایک کا کم کھانا جدا ہے، جیسا اس حکایت سے معلوم ہوا، دوسرے ہر شخص کے لیے یہ حکم دیا بھی نہیں گیا بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے لیے کسی بڑی خرابی کے دور کرنے کے لیے کسی ہلکی سی مکروہ بات کی اجازت دے دی جاتی ہے جبکہ اس کے ذریعہ سے کسی بڑے گناہ سے بچانا منظور ہو۔

ایک چور کی حکایت:

جیسے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ایک چور ان سے مرید ہوا اور چوری کرنے سے

توبہ کی لیکن چونکہ مدت کی عادت پڑی ہوئی تھی اس لیے ہر رات چوری کرنے کا سخت تقاضا طبیعت میں پیدا ہوتا اور اس کے دبانے کے لیے وہ یہ کرتا کہ تمام مریدوں کے جوتے اٹھا کر گڑ بڑ کر دیتا' اس کے جوتے کی جگہ اس کا اور اس کے جوتے کی جگہ اس کا' غرض کسی ایک کا جوتا بھی اپنے ٹھکانے نہ ملتا' آخر جب لوگ دق ہو گئے اور اس کا پتہ نہ چلا کہ یہ کس کا کام ہے تو انہوں نے کیا کیا کہ تمام رات جاگے اور چھپ کر دیکھا' معلوم ہوا کہ یہ نئے مرید صاحب کے کرتوت ہیں' صبح ہوئی تو سب نے مل کر پیر سے شکایت کی انہوں نے بلا کر اس سے دریافت کیا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ اس نے کہا کہ حضور! بے شک میں ایسا کرتا ہوں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ مدت سے مجھے چوری کرنے کی عادت تھی اب میں نے توبہ کر لی ہے لیکن رہ رہ کر طبیعت میں تقاضا پیدا ہوتا ہے اس کو میں اس طرح دباتا ہوں' اب اگر مجھے اس سے منع فرمائیں گے میں مجبور ہو کر پھر چوری کروں گا' غرض میں نے چوری سے توبہ کی ہے ہیرا پھیری سے توبہ نہیں کی۔ پیر نے کہا بھائی تجھ کو اس کی اجازت ہے تو ہیرا پھیری کر لیا کر' مگر مرید کے ان حالات کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں یہ بڑے کامل کا کام ہے۔

مرید کو ملازمت اور اپنے کاروبار کا چھوڑنا بعض اوقات نقصان دیتا ہے:

ہمارے حضرت حاجی صاحب سے اگر کوئی ملازمت چھوڑنے کی اجازت چاہتا تو آپ ہرگز اجازت نہ دیتے تھے' فرمایا کرتے تھے کہ اب تو ایک ہی بلا میں پھنسا ہوا ہے ملازمت چھوڑ دے گا تو خدا جانے کیا کچھ کرے گا اور کس قسم کی آفتوں کا شکار ہو گا تو اتنی بلاؤں سے ایک ہی بلا اچھی ہے اب لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ پیر صاحب لنگوٹہ بندھوا دیں اور بیوی بچوں کو چھڑا دیں' ایسے لوگوں کو تنخواہ پیر صاحب تو دینے سے رہے' نتیجہ یہ ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ جب ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا تو حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جھوٹی گواہی دینا' جھوٹے مقدمے لڑانا۔ قرض لے کر دبا لینا' غرض کہ گزارہ کرنے کے لیے ہر قسم کے کام کر گزرتے ہیں حضرت حاجی

صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ملازمت چھڑانے کی کیا ضرورت ہے خدا کا نام جب دل میں جگہ لے گا وہ خود ہی چھڑا دے گا' مولانا روم فرماتے ہیں کہ عشق وہ چیز ہے کہ جب عشق کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو معشوق کے سوا دل میں جو کچھ ہوتا ہے سب کو جلا دیتی ہے' مشہور بات ہے جب پانی آیا تیمم رخصت ہوا تو پانی کو آنے دو تیمم خود ہی جاتا رہے گا' یہی راز تھا کہ جس کے لیے حضرت فرمایام کرتے تھے کہ چھوڑانے کی کیا ضرورت ہے وقت پر خود ہی چھوٹ جائے گا اور یہ حکم ایسے شخص کے لیے تھا جس کے کھانے پینے کا کوئی ذریعہ نہ ہو اگر کسی کے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود ہو تو اس کو یہی مناسب ہے کہ اسی پر کفایت کرے اور خدا کی یاد میں مشغول ہو تو اس فرق کو دریافت کرنا اور لوگوں کی حالت اور طبیعت کا اندازہ کرنا یہ کامل ہی کا کام ہے۔

پیر کے اندر کیا بات ہونی چاہیے:

اور پیر بھی وہی ہو سکتا ہے جس کی یہ شان ہو' ورنہ تصوف کی باتیں رٹ لینے سے پیر نہیں ہو سکتا اگر ایک شخص کو بہت سی مٹھائیوں کے نام یاد ہوں اور نصیب ایک بھی نہ ہو تو نام یاد ہونے سے کوئی فائدہ نہیں' لیکن اگر نام ایک کا بھی یاد نہ ہو اور کھانے کو دونوں وقت ملتی ہو تو سب کچھ حاصل ہے' آج یہ حالت ہے کہ دو چار تعویذ گنڈے یاد کر لیے کچھ جھاڑ پھونک سیکھ لی اور پیر بن گئے تو کہیں اس طرح پیر ہو سکتا ہے' اول کسی کامل پیر کی خدمت میں رہ کر خود اپنی اصلاح کر لیں تب دوسروں کی اصلاح کریں اول کسی کے سامنے چھوٹا بن لیں تب بڑا بننے کی نوبت آئے گی یہ تو پیروں کی حالت ہے' مریدوں کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے کامل پیر کی عجیب عجیب پہچانیں گھڑ رکھی ہیں جس میں ذرا ''ہوحق'' پاتے ہیں اس کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں۔

کامل کی پہچان میں عام لوگوں کی غلطی دل کے جاری ہونے کی حقیقت:

ایک شخص حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے پاس آیا اور عرض کیا کہ حضرت میرا دل جاری ہو گیا' آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ دل کے دھڑکنے کو دل کا جاری ہونا نہیں کہتے'

دل کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی یاد دل پر حاضر رہے۔

بوٹیاں تھرکنا کمال نہیں:

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کی بوٹیاں تھرکتی ہیں' یہ بہت کامل ہیں' اور جن لوگوں میں یہ بات نہیں ہوتی ان کی نسبت کہتے ہیں کہ نیک آدمی ہیں یعنی ان میں فقیری کے کمالات نہیں'

پیر کے کمالات کیا ہیں؟

مگر یہ نہیں جانتے کہ فقیری کے کمالات بالکل چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کو بوٹیوں کے تھرکنے سے کچھ بھی تعلق نہیں اور وہ کمالات یہ ہیں کہ تصوف کے علم میں مہارت ہو' اصلاح کرنے کا طریقہ خوب جانتا ہو' شریعت کا پورا پابند ہو' یہ باتیں نہ ہوں تو ہزار محنت مجاہدہ ہو کچھ نہیں' ہاں ان کو جفاکش کہیں گے' محنتی کہیں گے' لیکن بزرگی سے کوئی علاقہ نہیں' خلاصہ یہ کہ عام لوگ نیک کاموں کے اندر بھی افضل کی پہچان غلط طریقہ سے کرتے ہیں اور بزرگوں کی جانچ میں بھی بے طریقے چلتے ہیں کہ اس کی بدولت اکثر دوسروں کے حق بھی تلف اور ضائع ہو جاتے ہیں۔

سرحد کے ایک عابد حکایت:

سرحد کے ایک عابد کی نسبت سنا ہے کہ وہ آخر رات میں تہجد کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں آئے اتفاق سے اس روز مسجد میں کوئی مسافر بھی سو رہا تھا آپ نے نماز شروع کی لیکن مسافر کے خراٹوں کے سبب خیال بٹنے لگا اور نماز میں اچھی طرح دل نہ لگ سکا' آخر آپ نے نماز توڑ دی اور مسافر کو سوتے سے جگا دیا۔ کہ تمہارے خراٹوں میں ہماری نماز میں خلل پڑتا ہے اس کے بعد پھر آ کر نیت باندھ لی' مسافر چونکہ بہت تھکا ہوا تھا' تھوڑی دیر میں پھر سو گیا اور خراٹوں کی آواز پھر شروع ہوئی آپ نے پھر نماز توڑ کر اسے اٹھایا اور اس کے بعد نماز شروع کر دی' تیسری بار پھر ایسا ہی ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور چھری لے کر اس غریب مسافر کو شہید کر دیا' پھر فراغت سے نماز پڑھی' صبح کو نماز

کے لیے لوگ جمع ہوئے تو مسجد میں لاش کو دیکھا' تعجب سے پوچھا کہ اس شخص کو کس نے قتل کیا تو عابد صاحب فرماتے ہیں کہ اس نے ہماری نماز میں خلل ڈالا اس لیے ہم نے قتل کر دیا یہ تو کھلی ہوئی حماقت تھی اس لیے سب نے اسے برا بھلا کہا لیکن آج کل بھی لوگ بہت بڑی بڑی حماقتیں کرتے ہیں اور ان کی طرف ذرا توجہ نہیں ہوتی کیونکہ وہ اس سے زیادہ باریک ہوتی ہیں۔

آج کل دین کی سمجھ نہیں رہی:

افسوس ہے کہ آجِ کل دین کی سمجھ بالکل نہیں رہی' بے وقوفی سے بعض وقت وہ حالت ہوتی ہے۔

ایک سرحدی کی حکایت:

جیسے ایک سرحدی کی نسبت سنا ہے کہ وہ ہندوستان میں آیا ہوا تھا' اتفاق کی بات کہ چوروں نے کسی موقع پر اس کو زخمی کر دیا' ایک شخص نے اس پر رحم کھا کر اس کا علاج کرایا چند روز میں اس کو آرام ہو گیا' جب اپنے وطن جانے لگا تو اس شخص سے کہا کہ تم کبھی ہمارے دیس میں آؤ گے تو ہم تمہارے احسان کا بدلہ کریں گے چنانچہ ایک مرتبہ کسی وجہ سے وہ شخص اس کے وطن گیا اور یاد آیا کہ اپنے دوست سے ملنا چاہیے' دریافت کرتا ہوا اس کے گھر پہنچا' ملاقات ہوئی نہایت عزت سے پیش آیا اور اپنے گھر پر لے گیا اور اس سے کہا کہ تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں اس کے جانے کے بعد گھر والوں نے اس شخص سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو اس نے سارا قصہ ان سے بیان کیا انہوں نے کہا کہ خدا کے لیے تم فوراً یہاں سے بھاگو ورنہ وہ تم کو ہلاک کر دے گا کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کبھی ہمارا دوست ہمارے وطن آئے تو ہم اس کے احسان کا بدلہ اس طرح دیں گے کہ اول اس کو اسی قدر زخمی کریں گے جتنے ہم ہوئے تھے' پھر اس کا علاج کر کے اس کو تندرست کریں گے اس لیے وہ ابھی اپنا چھرا لے کر آئے گا اور تم کو زخمی کرے گا' یہ غریب وہاں سے بھاگا اور اس طرح اس کی جان بچی۔

اکثر لوگوں کی عبادت حق تلفی کا ذریعہ ہوتی ہے:

بہت لوگوں کی عبادت ایسی ہوتی ہے، جیسے اس نے احسان کا بدلہ سوچا تھا لیکن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا دیکھئے بعض لوگوں جو مراقبہ[1] کا ایسا شوق ہوتا ہے، اگر مراقبہ کی حالت میں کوئی شخص ان کے پاس آ کر نماز کا کوئی مسئلہ پوچھے اور نماز کا وقت نکلا جاتا ہو اور کوئی دوسرا آدمی مسئلہ بتلانے والا بھی نہ ہو تو یہ ہرگز مراقبہ سے سر نہ اٹھائیں گے، حالانکہ ایسے وقت میں فرض ہے کہ مراقبہ چھوڑ کر مسئلہ بتلائیں، میں نے خود ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں ہے لیکن بیوی کی خبر ہے نہ بچوں کی، یوں سمجھتے ہیں کہ ہمیں خدا کے سوا کسی سے کچھ واسطہ نہیں اور سبب اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگ حالت اور کیفیت کو مقصود سمجھتے ہیں اور جوش وخروش ہستی و بے ہوش اور اچھل کود کو بڑا کمال جانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم خدا کے مقبول نہ ہوتے تو ہم پر یہ کیفیتیں کیونکر طاری ہوتیں اور اس کی خبر نہیں کہ یہ کیفیتیں کافروں پر بھی ہوتی ہیں یہ بات ایک واقعہ سے سمجھ میں آئے گی۔

ایک سجادہ صاحب نے عرس میں صاحب کلکٹر اور صاحب جج کو شرکت کرنے کے لیے بلایا، وہ بڑے خوش اخلاق تھے، شریک ہو گئے آخر تن تن شروع ہوئی اور قوالوں نے گانا شروع کیا کچھ ایسا سماں بندھا کہ صاحب جج کو غشی آنے لگی اور وہ بے اختیار ہو کر گرنے لگے، تھوڑی دیر تک تو اپنے کو سنبھالا، جب نہ سنبھل سکے تو صاحب کلکٹر سے کہا کہ مجھ کو کیا ہو گیا کہ میں گرا جاتا ہوں، صاحب کلکٹر نے کہا کہ میری بھی یہی حالت ہے آخر دونوں وہاں سے اٹھ گئے اور چلا دیئے، تو صاحبو! کیا یہ صاحب کلکٹر اور صاحب جج بھی بزرگ تھے، پس معلوم ہوا کہ یہ کیفیت اور حالت بزرگی اور مقبول ہونے کا نشان نہیں وہ ایک اثر ہے جو کہ اکثر محنت اور مجاہدہ اور اللہ اللہ کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی کسی اور سبب سے بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔

---

[1] مراقبہ: خدا کی طرف دھیان لگا کر بیٹھنا ۱۲

کیفیت کی حقیقت:

اسی طرح بعض شغل اور مجاہدے ایسے ہیں کہ ان سے عبادت میں یکسوئی زیادہ ہو جاتی ہے اور وسوسے کم ہونے لگتے ہیں کیونکہ شغل اور مجاہدہ سے دماغ کی رطوبت کم ہو جاتی ہے تو یہ حالت رطوبت کم ہو جانے سے پیدا ہو جاتی ہے نہ کہ بزرگی کی وجہ سے۔

ایک بزرگ کی حکایت:

ایک بزرگ کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے بڑھاپے میں روتے تھے' سبب پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ جوانی میں نماز کے اندر لذت زیادہ ہوتی تھی' میں سمجھتا تھا کہ اللہ کے ساتھ تعلق اور محبت کا یہ اثر ہے لیکن اب وہ حالت نہیں رہی' معلوم ہوا کہ وہ سب جوانی کا جوش تھا' اب چونکہ وہ نہیں رہا اس لیے وہ کیفیت بھی نہیں رہی لیکن محبت کی گرمی بڑھاپے میں جا کر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

کونسی کیفیتیں مفید ہیں:

غرض کیفیتیں نہ خود اچھی چیز ہیں نہ بری چیز ہیں بلکہ اگر ذریعہ مقصود کا بن جائیں تو پھر یہ اچھی ہیں ورنہ بالکل بیکار' تو چونکہ یہ کیفیتیں بیوی بچوں کو چھوڑ کر یا اور گناہ کر کے بھی باقی رہتی ہیں' اس لیے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مقبول اور خدا کے خاص بندے میں لیکن یاد رکھو کہ وہ مردود ہیں۔

گناہ کے ساتھ کیفیت اگر ہو بھی تو بیکار ہے:

اور یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ گناہ کر کے بھی دعویٰ مقبول ہونے کا کرتے تھے' چنانچہ وہ کہا کرتے تھے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ' یعنی ہم مثل بیٹے کے ہیں کہ جس طرح باپ اپنے بیٹے کو ہر حال میں چاہتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ ہم کو ہر حال میں چاہتے ہیں' خدا تعالیٰ ان کے اس خیال کو رد کرتے ہیں قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ یعنی اگر تم مثل بیٹے کے ہو تو پھر تمہارے اوپر عذاب کیوں نازل ہوتا ہے' غرض یہ عقیدہ یہود کا تھا' مگر اس امت میں بھی بعض لوگ اس خیال کے موجود ہیں تو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ قیامت میں

ایسے لوگوں کی گردن ناپی جائے گی‘ اس شغل اور مجاہدہ کی وہاں کچھ بھی قدر نہ ہوگی‘ کیونکہ مقصود عبادات ہیں محنت اور مجاہدہ مقصود نہیں۔

محنت اور مجاہدہ سے کیا مقصود ہے؟

لیکن چونکہ ہم لوگوں سے عبادت اچھے طور پر نہیں ہوتی اس لیے یہ محنت مجاہدے کیے جاتے ہیں تا کہ ہماری نمازوں اور دوسری عبادتوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی عبادت کی شان پیدا ہو جائے‘ پس یہ خود مقصود نہیں بلکہ عبادت کے درست کرنے کے لیے ہیں اصل مقصود عبادات ہیں‘ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کہ حضرت وہ فقیری کے رموز جو زندگی میں بیان کیا کرتے تھے یہاں بھی کچھ کام آئے‘ فرمایا کہ وہ سب گئے گزرے ہوئے، ہاں کچھ نماز اخیر رات میں پڑھ لیتا تھا‘ وہ ضرور کام آئی‘ لوگ خدا جانے ان کیفیتوں کو کیا کچھ سمجھے ہوئے ہیں‘ حالانکہ ان کی یہ حقیقت ہے‘ یہاں تک عام لوگوں کے جانچنے کے طریقوں کا بیان تھا۔

افضل ہونے کی صحیح پہچان:

اب مناسب ہے کہ جانچنے کا صحیح طریقہ بیان کر دیا جائے‘ تو سنیے! خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا تم حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد بنوانے کے اس شخص کے کاموں کے برابر کرتے ہو جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے دین کو نفع پہنچایا ہو‘ یہ دونوں جماعتیں ہرگز برابر نہیں‘ اس آیت کے نازل ہونے کے کئی قصے حدیثوں میں آئے ہیں‘ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض لوگوں میں بحث ہوگئی تھی کہ ایک جماعت اپنے کاموں کی وجہ سے اپنے کو افضل سمجھتی تھی‘ دوسری جماعت اپنے کو‘ خدا تعالیٰ اس آیت میں افضل ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ کونسی جماعت افضل ہے تو فرماتے ہیں کہ مسجد بنوانا اور حاجیوں کو پانی پلانا ایمان اور جہاد کے برابر نہیں مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد بنوانے کو ایمان اور جہاد سے افضل کہتے ہیں‘ ان کا دعویٰ غلط ہے‘ وجہ اس دعویٰ کی وہی تھی جو آج کل عام لوگوں میں ہے یعنی

کام کا نفع عام ہونا اور جلدی ہونا اور کام کی صورت عبادت کی سی ہونا حاجیوں کے پانی پلانے میں تو نفع فوراً تھا اور عام تھا' اور مسجد نبوانے کی صورت عبادت کی سی تھی' اس وجہ سے وہ ان دونوں کو افضل سمجھتے تھے تو خدا تعالیٰ نے اس کو رد کر دیا جس سے معلوم ہوا کہ یہ پہچان افضل ہونے کی صحیح نہیں' پھر اس دعویٰ کو غلط کر کے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فضیلت ایمان اور جہاد میں ہے' اب اس میں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ ایمان اور جہاد میں وجہ افضل ہونے کی کیا ہے۔

تمام کاموں میں افضل ایمان ہے اور جو ایمان سے زیادہ تعلق رکھے:

تو آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسوٹی افضل ہونے کی ایمان ہے' جس کام کو ایمان سے زیادہ تعلق ہو گا وہ زیادہ افضل ہو گا' اسی وجہ سے ایمان کے ساتھ جہاد کو بھی ذکر کر دیا' کیونکہ وہ اسلام کے پھیلانے کا سبب ہے اور اس کا ذریعہ ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایمان ایسی چیز ہے کہ بغیر اس کے دوسرے کام مقبول نہیں ہوتے' ایمان کے سوا اور کوئی کام ایسا نہیں جس کے بغیر دوسرے کام مقبول نہ ہوتے ہوں' پس معلوم ہوا کہ دارومدار افضل ہونے کا ایمان ہے اور یہیں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی۔

کافروں کو مسلمانوں پر فضیلت دینا بڑی غلطی کی بات ہے'

جو کہ دوسرے مذہب والوں کو ایمان والوں پر فضیلت دیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے فلاں قوم اچھی ہے' ہاں! اگر ایسا کہنے سے مسلمانوں کو غیرت دلانا مقصود ہو تو مضائقہ نہیں' بعض لوگ بے دھڑک ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص مسلمان ہو کر بھی فلاں عیب کو نہیں چھوڑتا اس سے تو مسلمان ہی نہ ہوتا تو بہتر تھا' یہ بڑی جہالت اور غلطی کی بات ہے' ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ رنڈیوں کو مسلمان نہ کرنا چاہیے اسلام کو ایسے مسلمانوں سے عیب لگتا ہے' میں نے کہا کہ اگر اسلام ایسے مسلمانوں کو نکالے تو تم کو ان سے پہلے نکال دے گا تمہارے کام کہاں کے اچھے ہیں' بعض لوگ چمار' بھنگی کے مسلمان ہونے کو حقارت سے پسند نہیں کرتے' مگر یاد رکھو جب قیامت کا دن ہو گا اس روز

معلوم ہو جائے گا کہ ہم جن کو ذلیل سمجھتے تھے ان کی کیا حالت ہے اور ہماری کیا گت ہے۔

مسلمان کتنا ہی عیب دار ہو کافر باکمال سے افضل ہے

غرض مسلمان چاہے کتنا ہی عیب دار ہو وہ کافر سے خواہ کتنی ہی خوبیاں رکھتا ہو' ہزار درجہ افضل ہے آپ دیکھیں گے کہ جو شخص صرف ایمان لایا تھا اور کوئی کام اس نے اچھا نہیں کیا اس کو ایک مدت کے بعد عذاب سے نجات ملے گی اور کہا جائے گا کہ جاؤ جنت میں آرام کرو' اور اس کے مقابلہ میں ایک ایسا شخص لایا جائے گا جو کہ دنیا میں بڑا خوش اخلاق اور ہر طرح کی خوبی رکھتا تھا مگر ایمان کی دولت سے محروم تھا وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور کبھی اس کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

مسلمان عیب دار کی کافر باکمال سے افضل ہونے کی مثال:

اس کی مثال یوں سمجھو کہ اگر گورنمنٹ کی رعایا میں دو مجرم پکڑے جائیں' ایک پر تو چوری کا الزام ہو اور دوسرے پر بغاوت کا تو سزا دونوں کو دی جائے گی لیکن چور کی سزا ایک خاص مدت کے لیے ہوگی' ایک دن ایسا ضرور ہوگا کہ وہ سزا بھگت کر پھر اپنے گھر آئے اور چین سے بسر کرے اور وہ باغی کبھی قید سے رہائی نہ پائے گا اور زندگی بھر سزا کی تکلیف میں رہے گا یا فوراً پھانسی کا حکم ہوگا کہ زندگی ہی کا خاتمہ ہو جائے چاہے وہ کتنا ہی لائق اور قابل ہو اور وہ چور بالکل جاہل نکما ہو۔

دوسری مثال:

صاحبو! ایمان ایک سورج ہے اگر ہزاروں بادل کے ٹکڑے اس کو چھپالیں تب بھی اس کا نور چمک کر رہے گا اور جھلک جھلک کر روشنی ڈالے گا' اور کافر کی خوبیاں آئینہ کی چمک ہے جو بالکل عارضی ہے' اور دوسری مثال لیجئے' اگر ایک گلاب کی شاخیں کسی گملا میں لگا دی جائیں اور اس کے مقابل کاغذ کے ویسے ہی پھول بنا کر رکھ دیئے جائیں تو اس وقت تو بے شک کاغذ کے پھولوں میں زیادہ رونق اور تازگی ہے اور اصل گلاب کی وہ حالت نہیں' لیکن ایک چھینٹا بارش کا ہو جائے' پھر دیکھئے کہ گلاب کیا رنگ لاتا ہے اور کاغذ

کے پھول کیسے بدرنگ ہوتے ہیں' پس مسلمان چاہے دنیا میں کسی حالت میں ہو لیکن قیامت میں جب رحمت کا ابر برسے گا تو دیکھنا اس کا اصلی رنگ کیسا کچھ نکھرتا ہے اور کافر کی زرق برق حالت پر کیا پانی پڑتا ہے' صاحبو! غیرت آنی چاہیے کہ مسلمان ہو کر اسلام کی حقیقت جان کر اپنے منہ سے کافر کو مسلمان پر فضیلت دو اور مسلمان کی برائی اور کافر کی تعریف کرو' جب معلوم ہوا کہ ایمان ایسی بڑی چیز ہے تو اس کے ساتھ جن چیزوں کو زیادہ تعلق ہوگا وہ افضل ہوں گی لیکن ایمان کے ساتھ اس تعلق کا سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ کیونکہ کام دو قسم کے ہیں' بعض ایسے ہیں کہ اسلام کا وجود ان سے ہے اور بعض کام ایسے ہیں کہ ان کا وجود اسلام سے ہے۔

افضل وہ کام ہیں جن سے اسلام کو مدد پہنچتی ہے:

تو افضل وہ کام ہیں جن سے اسلام کا وجود ہے اسی وجہ سے آیت میں ایمان کے ساتھ اسی کام کو ذکر کیا گیا ہے' جس سے اسلام کو قوت پہنچتی ہے' کیونکہ ظاہر ہے کہ جہاد سے کس قدر اسلام پھیلتا ہے اور کتنی مدد اسلام کی پہنچتی ہے اور مسجد کی تعمیر خود اسلام پر موقوف ہے تو اسلام کی قوت اور شوکت جہاد سے ہے مسجد کی تعمیر سے نہیں بلکہ خود مسجد کا وجود اسلام سے ہے پس مسجد کی خدمت سے دین کی مدد اور اس کو قوی بنانا افضل ہے اسی طرح اور جس قدر کام ہیں ان میں اسی کو دیکھنا چاہیے جیسے علم کا پڑھنا پڑھانا' وعظ ونصیحت کرنا یعنی لوگوں کی اصلاح کرنا کہ ان سے اسلام کا اشاعت ہوتی ہے اور قوت اور مدد پہنچتی ہے' پس یہ وظیفوں اور نفل نماز سے افضل ہیں' لیکن جب کہ ضرورت کے لائق یہ کام ہو جائیں تو بلا ضرورت اس میں مشغول رہنے سے یہ بہتر ہوگا کہ کچھ وقت عبادت کے لیے بھی نکالے اور کسی وقت اپنی بھی فکر کرے اور خدا کی یاد میں لگے اور اسی کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ☆ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ☆

''یعنی جب اصلاح کے کالم سے آپ فارغ ہو جائیں تو اپنے رب کی عبادت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔''

مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی نکالیے کہ صرف خدا ہی کی یاد میں اس وقت مشغول ہوں کوئی دوسرا کام نہ ہو یہاں سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہوگئی جو کہ پیر ہو جانے کے بعد بالکل مریدوں کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں' اس سے اس کی نسبت کمزور ہو جاتی ہے اور فیض بند ہو جاتا ہے کیونکہ ہر چیز کے باقی رہنے کا ایک سبب ہوتا ہے اور نسبت کے باقی رہنے کا سبب ذکر شغل اور اپنا کام کرنا ہے اور نسبت ہی کی وجہ سے وعظ میں تاثیر بھی ہوتی ہے جب نسبت ہی نہ رہے گی تو فیض بھی بند ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کام ایسے ہیں جن سے اسلام کو قوت اور مدد پہنچتی ہے وہ افضل ہیں' اس قاعدے کو سامنے رکھ کر نیک کاموں کے اندر فیصلہ کرنا چاہیے اور جس کو اس قدر لیاقت نہ ہو کہ خود فیصلہ کر سکے وہ کسی مولوی سے پوچھ لے کیونکہ ہر شخص کچھ نہ کچھ کام ضرور کرتا ہے' البتہ اگر کوئی کام ایسا ہو کہ اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور دوسرا کام اس وقت کے مقابلہ میں ضروری نہ ہو تو جو ضروری ہونا چاہے ادنی ہی درجہ کا ہو اس کو کرنا چاہیے۔

جیسے ایک آباد مسجد گر گئی اور نمازی پریشان ہیں یا عیدگاہ گر گئی تو ایسے موقع پر اس کا بنوانا زیادہ ضروری ہے۔

جس کام کی ضرورت ہو اس کو کرنا چاہیے خواہ وہ ادنی درجہ کا ہو:

خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ کسی کام کی ضرورت خاص طور پر پائی جائے اور وہ معلوم بھی ہو جائے وہاں تو اس کو کر لینا چاہیے خواہ وہ کم درجہ ہی کا ہو اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں اپنی رائے سے کسی کام کو فضیلت نہ دینا چاہیے جیسے بخاری شریف کا مدرسہ میں دنیا یا کسی غریب کو کھانا کھلا دینا' اب نیک کاموں کے مقابلہ میں یہ بھی بیان کر دینا مناسب ہے کہ جس طرح نیک کاموں کے اندر آپس میں فرق ہے اسی طرح گناہوں میں بھی فرق ہے۔

---

[1] نسبت کہتے ہیں اللہ کے ساتھ تعلق اور محبت کو ۱۲ منہ

گناہوں میں بھی فرق ہے لیکن چھوڑنا سب کا ضروری ہے:

لیکن جس طرح نیک کاموں میں دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ کس کام کو کیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے‘ اس طرح گناہوں میں دریافت کرنے کی ضرورت نہیں‘ بلکہ گناہوں کو سب کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ چھوٹے بڑے گناہ سب گناہ ہیں اور حرام ہیں‘ اکثر لوگ پوچھا کرتے کہ کیا فلاں کام بہت ہی بڑا گناہ ہے‘ مطلب یہ ہوا کہ اگر چھوٹا گناہ ہو تو ہم کرلیں‘ یاد رکھو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی ایک چنگاری کی نسبت پوچھے کہ کیا یہ چنگاری بہت بڑی ہے‘ تو صاحبو! جس طرح ایک بڑا انگارا مکان بھر کو پھونک دے گا اسی طرح ایک چنگاری بھی گھر بھر کو پھونک دے گی تو ایمان کے مکان کو ایک چھوٹا گناہ بھی ویسا ہی برباد کردے گا‘ جس طرح بہت بڑا گناہ تو سب سے بچنا چاہیے۔

بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ رشوت لینا زیادہ گناہ ہے یا سود کھانا میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ پیشاب زیادہ گندہ ہوتا ہے یا پاخانہ‘ تاکہ جو کم گندہ ہو اس کو کھالو۔ غرض یہ ہے کہ نیک کاموں میں تو فرق دریافت کرو اور گناہ سب چھوڑ دو۔

اس وعظ کا تعلق پہلے وعظ سے:

اب میں اس وعظ کا تعلق پہلے وعظ سے بیان کرتا ہوں۔ کہ اس آیت عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ میں تو یہ حکم تھا کہ تم اپنی فکر کرو دوسروں کی فکر میں نہ پڑو‘ اس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید دوسرے کو نفع پہنچانے کی اجازت نہیں‘ تو آج کے بیان سے یہ شبہ جاتا رہا‘ کیونکہ اس بیان سے دوسرے کو نفع پہنچانے کی بھی فضیلت معلوم ہوئی‘ پس وہ آیت نفع پہنچانے کی ممانعت نہیں کرتی‘ ہاں کسی کے پیچھے نہ پڑو‘ حق بات کہہ کر ختم کرو‘ جیسا کہ اس وقت میں نے وعظ کہا ہے‘ یہاں تک تو مناسب ہے‘ اب اگر میں ایک ایک کے پیچھے پڑوں اور معلوم کرتا پھروں کہ کس نے اس پر عمل کیا اور کس نے نہیں کیا اور پھر اس کی فکر اور تدبیر میں لگوں اس کی ممانعت ہے‘ کیونکہ اس سے بہت مرتبہ نقصان پہنچ جاتا ہے‘ دیکھو

حضور ﷺ کو ارشاد ہے وَ ذَكِّرْ فَاِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ یعنی آپ نصیحت کر دیجیے! آپ کا کام صرف نصیحت کرنا ہے اور دوسرے موقع پر یہ بھی ارشاد ہے کہ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ☆ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ☆ یعنی جو بے پروائی کرتا ہے آپ ﷺ اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہیں' غرض سمجھا دینے کا حکم ہے پیچھے پڑنا بیکار ہے' ہاں جہاں اپنی قدرت پوری ہو وہاں ضروری ہے' جیسے اپنی اولاد یا شاگرد' اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ جب پہلے وعظ سے یہ شبہ ہوتا تھا تو اسی وعظ میں یہ آیت بھی ذکر کرنا چاہیے تھی تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں کیونکہ غرض تو اس مضمون کے معلوم ہونے سے ہے' اس روز نہ معلوم ہوا تو نہ سہی' آج معلوم ہو گیا۔

یہ مضمون دس بارہ دن سے میرے ذہن میں تھا' درمیان میں خیال نہ رہا' اللہ کا شکر ہے کہ آج بیان ہو گیا' یہ بالکل نیا مضمون ہے' اس سے اپنے کاموں میں افضل کے سمجھنے کا طریقہ معلوم ہو گیا' اور اس طریقہ سے افضل کی پہچان آسان بھی ہے' اب خدا سے دعا کیجیے کہ وہ عمل کی توفیق دیں۔ (امین)

تمت

✿✿✿

(۴۱) دنیا سے رَضامندی

منتخب از وعظ ملقب بہ الرضا بالدنیا حصہ چہارم

دعوات عبدیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خطبہ ماثورہ:

اَمَّابَعْد! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّ الَّذِیْنَ لَایَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ O اُوْلٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَO

ترجمہ: ''بے شک وہ لوگ کہ ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی سے راضی ہیں اور اس میں دل لگائے ہوئے ہیں اور وہ لوگ کہ ہمارے حکموں سے غافل ہیں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بسبب (اس عمل کے) کہ وہ کرتے ہیں۔''

ان آیتوں میں اللہ پاک نے ایک خاص فرقہ کی برائی بیان فرمائی ہے اور جس فرقہ کی برائی اس آیت میں ہے خدا کا شکر ہے کہ اس فرقہ کا یہاں پر ایک شخص بھی نہیں ہے لیکن اس وجہ سے اس بیان کو بے ضرورت اور بے تعلق نہ سمجھنا چاہیے

تعریف یا برائی صفات کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ ذات کی وجہ سے:

بلکہ اس میں غور کرنا چاہیے کہ جس کی برائی کی جاتی ہے تو اس کی ذات کی وجہ سے

نہیں کی جاتی' کیونکہ ذات میں تو سب انسان ایک ہیں بلکہ اس کے اندر کوئی بات برائی کی ہوتی ہے کوئی کام اس کا برا ہوتا ہے جس کی وجہ سے برائی کی جاتی ہے' دیکھئے قرآن شریف میں جہاں کہیں کسی کی برائی اور مذمت کی گئی ہے تو جو صفت برائی کی اس کے اندر تھی وہ بھی بیان کر دی ہے اسی طرح رضامندی اور تعریف بھی ذات کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ کسی خوبی اور اچھی صفت پر ہوتی ہے کہ یہ خوبی اس میں پائی جاتی ہے اس لیے ہم اس سے خوش اور راضی ہیں' تو جب یہ معلوم ہو گیا کہ مذمت اور تعریف کا دارو مدار ذات پر نہیں بلکہ صفات پر ہے تو جس کے اندر بھی وہ صفات پائی جائیں گی وہ مستحق اس مذمت یا تعریف کا ہو گا خواہ وہ کوئی شخص بھی ہو' اب یہ شبہ نہ ہو گا کہ جس فرقہ کی ان آیتوں میں مذمت ہے جب ان میں سے ایک شخص بھی یہاں موجود نہیں ہے تو ان آیتوں کے بیان کرنے کی یہاں کیا ضرورت ہے غرض کی یہ آیتیں چونکہ کافروں کے بارے میں ہیں اس لیے یہ شبہ ہوتا تھا لیکن اب یہ شبہ جاتا رہا' کیونکہ جس باتوں پر کافروں کی مذمت کی گئی ہے' دیکھنا یہ ہے کہ وہ ہم میں تو نہیں پائی جاتیں اگر ہمارے اندر بھی وہ باتیں موجود ہیں تو ہم بھی اس مذمت سے بری نہیں۔

جن آیتوں میں کافروں کی مذمت کی گئی ہے اس سے مسلمانوں کی عبرت پکڑنی چاہیے:

آج کل لوگ یہ سن کر کہ یہ آیت کافروں کے حق میں ہے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ ہم سے اس کا کچھ تعلق نہیں' لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو کہ وہ آیت جو کافروں کے حق میں ہے وہ بے فکر کرنے کی چیز نہیں وہ تو مسلمانوں کے لیے بہت بڑا تازیانہ ہے' اس سے عبرت پکڑنی چاہیے' مگر مسلمان اس کو سن کر بے فکر ہو جاتے ہیں کہ یہ تو کافروں کی مذمت ہے اور قرآن میں اکثر جگہ کافروں ہی کی مذمت کی گئی ہے، مسلمانوں کی مذمت قرآن شریف میں بہت کم ہے' مگر یہ غور کرنے کی بات ہے کہ کافروں کی برائی ہم مسلمانوں کو کیوں سنائی گئی ہے مطلب اس سے یہ ہے کہ ان باتوں کا مسلمانوں میں ہونا

بہت زیادہ عجیب ہے' یہ باتیں تو صرف کافروں میں ہوتیں' مسلمانوں میں کبھی نہ ہوتیں' ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کو نہ کسی کی ذات سے عداوت ہے اور نہ کسی کی ذات سے محبت ہے' بلکہ جس کے اندر اچھی باتیں ہوں اس سے وہ راضی اور خوش ہیں اور جس کے اندر بری باتیں ہوں اس سے وہ ناراض ہیں' تو اگر وہی بری باتیں جن پر کافروں کی مذمت کی گئی ہے مسلمانوں میں بھی ہوں جو تابعدار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو اور بھی شرمانا چاہیے اور اس کی اصلاح کرنا چاہیے' پس اب یہ دیکھنا ضروری ہوا کہ کافروں کو جن باتوں پر لتاڑا گیا ہے وہ ہمارے اندر ہیں یا نہیں' اگر ہم میں وہی باتیں ہیں تو ان کی درستی بہت زیادہ کرنی چاہیے۔

ایک مثال:

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک باغی کو بادشاہ برا بھلا کہے کہ تو نے بغاوت کی تو نے سرکار کا مقابلہ کیا تو نے یہ کیا تو نے وہ کیا' تو اس خفگی کو سن کر دوسرے کو بھی ڈرنا چاہیے اور بے خوف نہ ہونا چاہیے' ان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جو الزام باغی پر لگائے گئے ہیں اور جن باتوں پر خفگی اس پر کی گئی ہے وہ تمام یا ان میں سے کچھ ہمارے اندر تو نہیں' یا ایک زبردست آدمی ظلم کرتا ہے اور رعایا کو ستاتا ہے یا ڈکیتی کرتا ہے لیکن باغی نہیں ہے' ہاں فوجداری کی بہت سی دفعیں اس پر قائم ہیں' اور اتفاق سے بادشاہ نے اسی کے سامنے ایک باغی پر خفگی اور غصہ کیا کہ تو نے بغاوت کی' تو نے رعایا کو ستایا' تو نے ڈکیتی کی' تو اس شخص کے بھی کان کھڑے ہونے چاہئیں' ہاں! ایک فرق ضرور ہے کہ اگر جرائم کم ہوں گے تو ناخوشی کم ہوگی' اور زائد ہوں گے تو ناخوشی زائد ہوگی' سو مسلمان خواہ کیسا ہی بد دین مجرم ہو مگر اس کا جرم کافر کے برابر نہیں ہوسکتا' تو یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمان پر اتنی ناخوشی نہ ہوگی' لیکن اس پر تو تسلی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم سے ناخوشی کم ہے' دیکھو اگر کسی مجرم کو دس برس کی قید ہو اور دوسرے کو پانچ برس کی تو کیا اس دوسرے کو بے فکری ہوگی' میرے خیال میں کوئی عقلمند ایسا نہیں کہ وہ اس وجہ سے بے فکر ہو جائے کہ میری سزا فلاں شخص سے تو کم ہے' بلکہ ایک باریک بات ہے کہ بعض وقت بڑی دفعہ اور بڑی سزا سن کر اتنی کلفت نہیں ہوتی جتنی

چھوٹی دفعہ اور چھوٹی سزا سن کر ہوتی ہے' کیونکہ بڑی سزا سن کر تو مایوسی ہو جاتی ہے اور مشہور ہے کہ مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہے۔

مایوسی کی راحت ہونے کی ایک مثال:

ایک شخص کا واقعہ ہے کہ اس کو ایک جرم میں جج نے سات برس کی قید کا حکم دیا۔ اور اس سے کہا کہ دیکھو تم اپیل نہ کرنا ورنہ تم کو زیادہ سزا ہو جائے گی' میں نے تم کو بہت کم سزا دی ہے مگر اس شخص نے اپیل کی اس میں شاید ۲۸ برس کی سزا ہوئی ۲۸ برس کا نام سن کر اس کو بالکل مایوسی ہوگئی کہ میں اب زندہ بچ کر نہیں نکل سکتا اور اس مایوسی سے ایک قسم کی راحت اور اطمینان ہو گیا' تو اس لحاظ سے مسلمان کو چھوٹی سزا سن کر زیادہ فکر میں پڑنا چاہیے کہ اس کو تو مایوسی بھی نہ ہوگی' غرض اس لحاظ سے یہ فرق ہے چاہے دوسرے لحاظ سے دوسرا فرق بھی ہو' مگر میں نے خاص اس فرق کو اس لیے بیان کیا تا کہ بے فکری نہ رہے۔

کافر سے مسلمان کو تھوڑی سزا ہونا بے فکری کا سبب نہیں بلکہ زیادہ فکر کا سبب ہے:

کیونکہ یہ بات سن کر ایک نہ ایک دن دوزخ سے نکل آئیں گے' اکثر لوگ بے فکر ہیں سو یہ بڑی غلطی کی بات ہے کہ تھوڑی سزا کو سن کر بے فکر ہو جائیں' غرض مسلمانوں اور کافروں کی سزا میں یہ فرق ہونے کا انکار نہیں لیکن وہ فرق بے فکر نہیں کر سکتا' بلکہ زیادہ فکر ہونی چاہیے یا برابر ہی ہو یا کم ہی فکر ہو' مگر ہو' تو ہم تو دیکھتے ہیں کہ بالکل ہی بے فکر بیٹھے ہیں' جو بے خبر ہیں وہ تو بالکل ہی خیال نہیں کرتے ان کی تو شکایت ہی کیا' مگر غضب تو یہ ہے کہ بعض خبردار بھی بے فکر ہیں' کہتے ہیں کہ کافروں کی برابر سزا تھوڑا ہی ہوگی' اور میں اس بے فکری کے دور کرنے کے لیے یہ تمام تقریر کر رہا ہوں کہ اس خیال کو کبھی دل میں نہ لایئے اور اس اعتراض کا جواب دے رہا ہوں کہ یہ آیت تو کافروں کے حق میں ہے پھر ہم کو کیا فکر۔

خلاصہ اس شبہ کے جواب کا کہ آیت کافروں کے حق میں ہے مسلمانوں کو اس سے کیا تعلق:

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جن باتوں پر کافروں کو یہ دھمکی دی گئی ہے اگر آپ میں بھی وہ باتیں ہیں تو آپ کو ضرور فکر ہونی چاہیے' دیکھیے اگر چمار کو چمار کہہ کر دس جوتیاں مار لی جائیں تو اسے کچھ زیادہ شرم نہیں لیکن اگر کسی بڑے آدمی کو چمار کہہ دیا جائے تو نہایت شرم کی بات ہے' سو اسی طرح کافروں کو اگر یہ کہ دیا جائے کہ وہ آخرت کا انکار کرنے والے اور دنیا کے ساتھ راضی رہنے والے ہیں۔

اور خدا تعالیٰ کے حکموں سے غافل ہیں تو کچھ عجب نہیں لیکن اگر مسلمانوں میں یہ باتیں پائی جائیں اور اس وجہ سے وہ بھی اس مذمت میں آ جائیں تو زیادہ شرم کی بات ہے' اور لیجیے! اگر کسی عزت دار کو بھنگی کے ساتھ قید کر دیں تو اس کے لیے کتنی ننگ کی بات ہے۔

دوزخ خاص کافروں کا ٹھکانا ہے مسلمان اس میں کافروں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کی وجہ سے جائیں گے:

یاد رکھو کہ دوزخ خاص کافروں کے لیے ہے مگر مسلمان اپنے ہاتھوں وہ عادتیں اختیار کر کے جو کافروں میں پائی جاتی ہیں ان میں شامل ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ قید ہونے کا کام کرتے ہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ☆ یعنی جو شخص کسی فرقہ کے ساتھ مشابہ اور موافق بنے اور اس کا طرز و طریقہ اختیار کرے پس وہ اسی فرقہ میں سے ہے۔

کافروں کی مشابہت سے کیا مراد ہے:

اس حدیث کو اول تو لوگوں نے اڑا ہی دیا اور اگر لیا بھی ہے تو صرف لباس اور وضع میں' بہت سے دیندار بھی اس غلطی میں ہیں کہ صورت دینداروں کی بنا کر اپنے کو دینداروں

اور پرہیزگاروں میں شمار کرنے لگے' چاہے کام کیسے ہی ہوں' ان کے اس خیال کی ایسی مثال ہے جیسے میرے وطن میں ایک بہروپیا میرے پاس انعام لینے کی غرض سے کسی بڈھے کی شکل بنا کر آیا' میرے پاس جو لوگ بیٹھے تھے ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ خدا کے ہاں ان بہروپیوں کی کیا حالت ہوگی کہ کبھی عورت بنتے ہیں کبھی اور کوئی مکر کی شکل بناتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ہم وہاں اس طرح تھوڑا ہی جائیں گے' مولویوں کا لباس پہن کر جائیں گے پس فوراً بخشش ہو جائے گی' میں نے ڈانٹا کہ کیا واہیات بات ہے کہ خدا تعالیٰ کو کوئی دھوکہ دے سکتا ہے' یہی حالت ہماری ہے کہ شکل تو بنا لیتے ہیں مولویوں اور صوفیوں کی، لیکن دل کے اندر سینکڑوں خباثتیں بھری پڑی ہیں' ظاہری صورت تو ایسی کہ بایزید[1] بھی شرما جائیں اور دل کی یہ حالت کہ یزید کو بھی اس سے عار آئے' ہم میں صورت کے دیندار تو بہت ہیں مگر سیرت کے دیندار کم ہیں' غرض یہ حدیث صورت اور لباس ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر حالت کو عام ہے اور لوگ اس حدیث میں خواہ مخواہ شبہ کرتے ہیں۔ یہ بات تو بالکل ظاہر ہے ہر شخص کی عقل میں آتی ہے اور ہر شخص اس کو سمجھتا ہے' دیکھو اگر کوئی شخص بے ہودہ باتیں کرنے لگے اور گالیاں دینے لگے تو اس کو کہتے ہیں کہ تو چمار ہو گیا' یا اگر ایک شخص ہر وقت ہیجڑوں میں رہنے لگے تو انہیں میں شمار ہونے لگے گا' جب یہ بات ہے تو اگر ہم کافروں کی عادتیں اختیار کریں گے تو ہم بھی ان ہی جیسے ہو جائیں گے پس ان کے ساتھ دوزخ میں بھی جائیں گے اگر یہ بات نہ ہو تو مسلمان کو دوزخ سے کیا کام۔

جنت خاص دینداروں کے لیے ہے:

کیونکہ جس طرح جنت خاص دینداروں اور پرہیزگاروں کے واسطے ہے اسی طرح دوزخ خاص کافروں کے واسطے ہے' رہے بیچ کے لوگ تو چونکہ وہ نہ کافر ہیں نہ پرہیزگار اس لیے ہمیشہ کو دوزخ میں بھی نہ جائیں گے اور شروع ہی سے جنت میں بھی نہ جائیں گے' مگر چونکہ ایمان کی وجہ سے دینداروں کے مشابہ ہیں اس لیے ایک مدت کے بعد جنت میں چلے جائیں گے تو جنت میں جانے کے قابل وہ ہے کہ یا تو خود دیندار ہو یا دیندار کے

[1] ایک بڑے بزرگ کا نام ہے ۱۲۔

ساتھ مشابہ ہو ان کے سوا اور کوئی جنت کے قابل نہیں تو یہ لوگ بھی ایمان کے اندر دینداروں کے ساتھ مشابہ ہیں اس لیے جب گناہوں سے پاک صاف ہو جائیں گے اس وقت جنت میں جانے کے قابل ہوں گے جیسے چراغ کہ اس پر اگر بہت سی کیٹ جمع ہو جائے تو اس کو آگ میں ڈال کر صاف کیا جاتا ہے اور اس وقت وہ کسی نفیس مکان کے اندر رکھنے کے قابل ہوتا ہے اسی طرح ان لوگوں کو دوزخ کے چولہے میں ڈال کر صاف کیا جائے گا یا دوسری مثال میں یوں سمجھو کہ بچہ اگر ناپاکی میں لتھڑا ہوا آئے تو کہا جائے گا کہ اس کو حمام میں لے جاؤ اور خوب رگڑو اور اس پر سے پلیدی کو کھرچو تو دوزخ بھی حمام ہے لیکن اس کا برداشت ہرگز نہ ہو سکے گا۔

غرض مسلمانوں کا دوزخ میں جانا کافروں کے طور وطریقہ اختیار کرنے کی وجہ سے ہے فرق اتنا ہے کہ کافروں کو عذاب دینے کے لیے بھیجا جائے گا اور مسلمانوں کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے مگر تکلیف تو ضرور ہوگی دیکھو جب حمام میں جھانو سے رگڑا جاتا ہے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے تو پاک کرنے کے لیے جانے سے ان کا کیا نفع ہوا تکلیف تو ہوئی دوزخ میں تو گئے دیکھو اگر ایک شخص کے چھریاں بھونکی جائیں اور دوسرے کے بدن میں سوئیاں کوچی جائیں تو کیا دوسرے کو اطمینان ہو سکتا ہے ہرگز نہیں اور ہم لوگ اس سزا کو تو کیا برداشت کر سکتے ہیں ہم سے نشتر کی تکلیف تو برداشت نہیں کی جاتی تو اس فرق سے ہرگز تسلی نہیں ہونی چاہیے۔

ابوطالب کا واقعہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے لیے حدیث میں آیا ہے کہ چونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی تھی اس لیے ان کو ایسا عذاب نہ ہوگا جیسا ان کافروں کو ہوگا بلکہ صرف دو جوتیاں آگ کی انہیں پہنا دی جائیں گی مگر حالت یہ ہوگی کہ یوں سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو عذاب نہیں خدا تعالیٰ کی حکمت کے قربان ہو جایئے دیکھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت کرنے والے مگر ان کو کلمہ نصیب نہ ہوا موت کے وقت کلمہ پڑھنے پر راضی ہو گئے تھے مگر خدا برباد کرے ابوجہل کو اس نے اس وقت بھی بہکایا آخر اسی

حالت پر خاتمہ ہو گیا' بیان کرنے کی جی تو نہیں چاہتا تھا مگر اس ضرورت سے بیان کرنا پڑا کہ اس سے ایک ضروری مسئلہ کو سمجھانا ہے وہ یہ کہ اس سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج کل جو لوگ صرف مجلس کر لینے کو یا مولود شریف کر لینے کو نجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور اس پر ان کو ناز ہوتا ہے کہ ہم کو حضور ﷺ سے بہت محبت ہے وہ اپنے لیے نہ روزہ کی ضرورت سمجھتے ہیں نہ نماز کی نہ حج کی نہ زکوٰۃ کی نہ گناہ سے توبہ واستغفار کی یہ لوگ بڑی غلطی میں ہیں' اس میں زیادہ خطا پڑھے لکھے لوگوں کی ہے انہوں نے اپنی طمع اور لالچ کی وجہ سے عام لوگوں کو راضی کرنے کے لیے ایسی باتیں سنائیں' ایسی مجلسیں کیں' وعظ میں یہ بیان کیا کہ صاحبو! ڈاڑھی منڈاؤ اور زنا کرو ناچ کرو' سب معاف ہو جائے گا مگر حضور ﷺ سے محبت رکھو اور ان وہابیوں کے پاس نہ بیٹھو اور وہابی نام رکھا ہے اہل سنت کا چاہے وہ مقلد اور حنفی ہی ہوں۔

غرض یہ کہ وعظ کی مجلس میں بھی اور ویسے بھی یہ کہا جاتا ہے کہ جو چاہو کرو' حضور ﷺ سے محبت رکھو' اس کا اثر لوگوں پر یہ ہوا کہ انہوں نے تمام کاموں کو غیر ضروری سمجھ لیا تو ایسے لوگوں کو اس حدیث سے سمجھ لینا چاہیے کہ ابوطالب کے برابر کوئی بھی ان میں سے حضور ﷺ کے ساتھ محبت رکھنے والا نہیں ابو طالب وہ تھے کہ سب نے حضور ﷺ کو چھوڑ دیا لیکن ابو طالب نے ساتھ دیا اور بہت سی تکلیفیں اٹھائیں' آج تو وہ حالت ہے کہ اگر ایک پیسہ کا نفع ہو تو حضور ﷺ کے حکم کے خلاف کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں' ایک مجلس میں یزید کے ذکر پر ایک شخص کہہ رہا تھا کہ افسوس میں نہیں ہوا ورنہ یوں کرتا اور یوں کرتا' یہ سنکر ایک دیہاتی شخص کو جوش آ گیا کہنے لگا کہ میں کہتا ہوں کہ میں یزید ہوں اور میں نے ایسا ایسا کیا ہے اگر کچھ ہمت ہے تو آ جاؤ' یہ سن کر ان بہادر صاحب کے حواس درست نہ رہے اور ہوش اڑ گئے' یہی حالت آ جکل حضور ﷺ کے ساتھ محبت کا دعوی کرنے والوں کی ہے تو دیکھئے ابو طالب جن کو اس قدر محبت حضور ﷺ سے تھی ان کو بھی نری محبت نے دوزخ سے نہ بچالیا کیونکہ اطاعت اور فرمانبرداری نہ تھی' اور آج تو کس کا منہ ہے کہ اتنی محبت کا دعویٰ بھی کرے اور اگر کرے بھی تو اس کا عمل اور برتاؤ اس کو جھٹلا دے گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم مولود شریف کس طرح کرتے تھے (حضور ﷺ کا ذکر):

میں کہتا ہوں کہ محبت سے حضور ﷺ کا ذکر ضرور کرو مگر جس طرح ذکر کا طریقہ ہے اس طرح کرو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی حضور ﷺ کا ذکر کیا ہے لیکن وہاں کیا کوئی تاریخ مقرر ہوتی تھی ہرگز نہیں وہ تو ہر وقت زبان پر رسول مقبول ﷺ ہی کا ذکر رکھتے تھے جیسا کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ ہم تو ہر وقت مولود شریف کرتے ہیں جب بھی ایمان لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتے ہیں اس وقت بھی آپ ﷺ ہی کا ذکر ہوتا ہے' حضور ﷺ ہمارے تو ہر وقت دل میں بسے ہیں' زبان سے' ہاتھ سے ہر وقت حضور ﷺ کی یادیں ہیں سبحان اللہ! کیا پتہ کی بات کہی ہے' تو صحابہ رضی اللہ عنہم تو ہر وقت ذکر کیا کرتے تھے اور نرا ذکر نہیں بلکہ ویسا بننے کی کوشش کرتے تھے' یہ پھنڈ جواب ہیں' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کہیں نام کو بھی نہ تھے' کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے کبھی مٹھائی تقسیم نہیں کی کبھی ذکر مولد کی تاریخ مقرر نہیں کی' اور اگر کوئی کہے کہ ہم تو خوشی میں مٹھائی تقسیم کرتے ہیں' تو میں کہتا ہوں کہ روز کیوں نہیں تقسیم کرتے' اس کی کیا وجہ کہ خاص مولود شریف میں ہی تقسیم کی جاتی ہے' اسی طرح ولادت شریف کے ذکر کے وقت کھڑا ہونا اس کی بابت بھی یہی ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جب مولود شریف کی مجلس ہوتی ہو تو کھڑے ہوتے ہو اور پھر اول سے لیکر اخیر تک نہیں کھڑے ہوتے' بلکہ ایک خاص وقت میں کھڑے ہوتے ہو' لیکن اس کے سوا اور کبھی اگر حضور ﷺ کا ذکر ہوتا ہے جیسے وعظ میں تو نہیں کھڑے ہوتے' دیکھو اس وقت جو حضور ﷺ کا ذکر ہو رہا ہے' اس کی کیا وجہ ہے کہ اس وقت کوئی نہیں اٹھتا۔

مولود شریف کی رسم کی بنیاد کیا ہے:

یاد رکھو کہ یہ سب کمانے والوں کی من گھڑت ہے کہ ہر ہر چیز کو خاص طور سے گھڑا ہے۔ کہ لوگ ہر کام میں ان کے محتاج ہیں اور جب ان سے وہ کام لیں تو کچھ دیں بھی اور جب وعظ کہنے والے یا مولود پڑھنے والے کے لیے کچھ ہوا تو آنے والوں کے لیے بھی کچھ چاہیے اس لیے مٹھائی کی رسم نکالی گئی۔

رسم مولد پر عرب کے فعل سے سند پکڑنا صحیح نہیں:

لوگ عرب کے فعل سے سند پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عرب والے بھی تو مولود شریف کرتے ہیں' لیکن افسوس ہے کہ لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ عرب میں کس طرح کا مولود شریف ہوتا ہے' یہ مانا کہ وہاں بھی مٹھائی ہوتی ہے مگر پھر بھی یہاں کی نسبت بہت سادگی ہے' مٹھائی تقسیم کرتے ہیں لیکن اگر تقسیم میں مٹھائی پوری نہ پڑے بلکہ کچھ لوگ باقی رہ جائیں تو بلا تامل کہہ دیں گے کہ خلاص یعنی اب ختم ہوا' یہ ہے خلوص بھلا یہاں تو کوئی ایسا کرکے دکھلا دے' یہاں تو ڈرتے ہیں کہ اس سے بڑی بدنامی ہوگی خدا کی قسم یہاں جو کچھ ہوتا ہے سب نام کے لیے ہوتا ہے' صاحبو! محبت کے طریقے ہی دوسرے ہوتے ہیں۔

شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلوی ربیع الاول میں کچھ کھانا پکا کر تقسیم کیا کرتے تھے' ایک مرتبہ آپ کو کچھ میسر نہ ہوا' تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے پیسے دو پیسے کے چنے بھنوا کر تقسیم کر دیئے' خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان چنوں کو تناول فرما رہے ہیں' دیکھو اللہ والوں ہی میں محبت ہوتی ہے' ان سے سیکھو اور ان کے طرز پر چلو' اس کا بہت آسان طریقہ بتلاتا ہوں مگر وہ طریقہ نفس کو گوارا نہ ہوگا' وہ یہ کہ خفیہ خرچ کیا کرو۔ اگر ربیع الاول کے مہینے میں پچاس روپے خرچ کرو مگر ظاہر نہ کرو اور ایک ایک مسکین کو دے دو' تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے زیادہ خوشی ہوگی اگر واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو اس طریقے پر عمل کرو مگر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ کبھی نہ ہو سکے گا' نفس کہے گا کہ میاں پچاس روپے بھی خرچ ہوئے اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی۔

آجکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ کیسی محبت ہے اس پر ایک حکایت:

آج کل تو یہ حالت ہے کہ میں کانپور میں تھا کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے لیے مجھے بلا کر لے گئے میں چلا گیا' اگلے دن معلوم ہوا کہ اسی جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہوا تھا' آج رنڈی کا ناچ ہوا ہے' مجھے سن کر بے حد صدمہ ہوا' دریافت کرنے سے معلوم ہوا

کہ اس کے ہاں شادی تھی اور اصل مقصود ناچ کرانا تھا' لیکن اس کے بعض دوست جو دیندار بھی تھے ان کی خاطر سے حضور ﷺ کا ذکر بھی کرا دیا تھا' تو یہ ذکر حضور ﷺ کی محبت کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ دیندار دوستوں کے لیے ہوا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کا ناچ کے ساتھ مقابلہ کیا گیا اور اسی جگہ ناچ ہوا' خدا کی پناہ پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو حضور ﷺ سے محبت ہے اور میں کانپور میں سنا کرتا تھا کہ آج فلاں رنڈی کے ہاں مولود شریف ہے' ہاں فلاں رنڈی کے ہاں حضور ﷺ کا ذکر ہوگا۔ افسوس ہے کہ جب وہاں ضروری باتیں زنا کی مذمت اور گانے بجانے کی برائی کو کوئی بیان نہیں کرتا تو نرے حضور ﷺ کے ذکر سے کیا فائدہ کی توقع ہے۔

دیکھو! اگر دسترخوان پر صرف چٹنی ہو تو کیا کسی کا اس دسترخوان سے پیٹ بھر سکتا ہے کبھی نہیں' ہاں اگر نرا کھانا ہو اور چٹنی نہ ہو تو اس سے کام چل سکتا ہے اور اگر دونوں چیزیں ہوں تو پھر کیا ہی کہنا' یہ اس پر یاد آ گیا کہ لوگ محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ابو طالب کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا:

تو دیکھ لیں کہ ابو طالب کی کیا حالت ہے کہ اگرچہ حضور ﷺ کی بدولت صرف دو جوتے آگ کے ان کے پیروں میں ہوں گے مگر حالت یہ ہوگی کہ یوں سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں۔

دنیا ہی میں دیکھ لو کہ اگر ببول کا کانٹا بھی لگ جاتا ہے تو کیا حالت ہوتی ہے تو اگر کوئی کہے کہ مجھے تو ہلکا عذاب ہوگا' وہ خوب سمجھ لے کہ وہاں کا ہلکا عذاب بھی برداشت نہیں ہو سکے گا اس گھمنڈ میں ہرگز نہیں رہنا چاہیے کہ مجھے تو تھوڑی سزا ہو گی' یہ شبہے تو دفع ہو گئے۔

آیت میں کن کن باتوں پر لتاڑا گیا ہے:

اب وہ باتیں بھی سن لیجئے جن پر آیت میں لتاڑا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایسے ہیں کہ ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں رکھتے' یہ پہلی بات ہے تو اس سے تو ہم

بری ہیں لیکن اس سے بری ہو کر بے فکری نہیں ہو سکتی' کیونکہ اگلی باتیں ہمارے اندر موجود ہیں' چنانچہ دوسری بات یہ فرمائی کہ جو دنیا کی زندگی پر راضی ہیں اور اس میں دل لگائے ہوئے ہیں' اور جو ہم ہمارے حکموں سے غافل ہیں' یہ کل چار چیزیں ہیں ان پر اس سزا کو مرتب فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے' آیت کے ترجمہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ کافروں پر چار دفعیں لگائی گئی ہیں اور یہ سزا ان چاروں باتوں پر ہے تو ان چاروں کی مذمت ثابت ہوئی' ان میں سے پہلی بات تو کسی طرح ہم میں نہیں' اس دفعہ سے تو بے شک ہم پاک صاف ہیں اور آخر کی بات یعنی ان کے حکموں سے غافل ہونا' اس کی بابت شبہ ہے کہ ہم میں ہے یا نہیں کیونکہ اس کی تفسیریں دو ہیں' ایک تو یہ کہ ان کے حکموں کو مانتے ہیں' ان کا اعتقاد نہیں اس لیے غفلت ہے' سو اس بات سے تو ہم بچے ہیں' دوسری تفسیر یہ ہے کہ ان کے حکموں سے بے فکر ہیں' خواہ اعتقاد ان کا ہو یا نہ ہو" تو یہ جرم ہمارے اندر بھی ہے ہمیں بھی ان پر عمل کرنے کی فکر نہیں' رہے بیچ کے دو جرم کہ دنیا سے راضی ہونا اور دنیا میں دل لگانا' ان میں یقینی بات ہے کہ ہم بھی پھنسے ہوئے ہیں' اور وہ دونوں ایک ہیں۔

راضی ہونے اور دل لگانے میں فرق:

مگر تھوڑا سا فرق ہے راضی ہونا تو یہ ہے کہ عقل سے اس کی پسند کریں اور اچھا سمجھیں۔ اور دل لگنا یہ ایک طبعی بات ہے کہ طبیعت کو ایک چیز کی طرف رغبت اور خواہش ہو بعض مرتبہ رغبت اور خواہش ہوتی ہے' مگر اچھا نہیں سمجھتے' جیسے چوری' حرام کاری وغیرہ اور کبھی اچھا سمجھتی ہیں مگر رغبت نہیں ہوتی جیسے کڑوی دوا یا شہادت کے لیے سفر کرنا کہ عقل تو اچھا سمجھتی ہے مگر اس کے ساتھ رغبت نہیں ہوتی۔ غرض ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ کبھی ان دونوں میں سے ایک بات ہوتی ہے اور ایک نہیں ہوتی تو اگر دنیا کے ساتھ رغبت بھی ہو اور اس کو پسند بھی کرتا ہو تو یہ حالت بہت سخت ہے کافروں کی تو عام طور پر یہی حالت ہے۔

دنیا کو پسند کرنے کا عیب اکثر مسلمانوں میں بھی ہے:

مگر اکثر مسلمانوں میں بھی یہ بات ہے' اس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ اگر دنیا اور دین میں مقابلہ ہوتا ہے تو دنیا کو اختیار کرتے ہیں اور اس سے دل برا نہیں ہوتا' جیسے جھوٹے مقدموں میں جانا یا رشوت لینے میں جرأت کرنا یا جیسے بعضوں کے پاس زمینیں دبی ہوئی ہیں' سب جانتے ہیں کہ یہ سب باتیں گناہ کی ہیں مگر دل سے پسند ہیں کہ کبھی اپنی حالت پر افسوس نہیں ہوتا بلکہ جب نصیحت کی جاتی ہے اور اس کی اصلاح کی رائے دی جاتی ہے تو یوں کہا جاتا ہے کہ یہ تو ریاست کے معاملہ ہیں ان کو ہم ہی جانتے ہیں' دوسرے کیا جانیں۔

غرض اکثر لوگ دین کے مقابلہ میں دنیا کو اختیار کرتے ہیں اور عقل سے اس کو پسند کرتے ہیں اگرچہ عقیدہ ایسا نہیں ہے' اسی طرح یہ جانتے ہیں کہ بچوں کو اگر شروع میں انگریزی پڑھائی جائے تو دین سے بے خبر رہتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ ایسا نہ کریں تو ترقی کیونکر کریں' جان لو کہ یہ سب باتیں دنیا کو پسند کرنے کی وجہ سے ہیں بلکہ اب تو وہ حالت ہوگئی ہے کہ مولویوں اور فقیروں میں بھی یہ مرض موجود ہے بہت ہی کم اس سے بچے ہوئے ہیں حالانکہ ان کو بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہیے تھی میں دیکھتا ہوں کہ کثرت سے ایسے مولوی اور فقیر ہیں کہ دنیا کی حرص سے ان کا یہ مذہب ہوگیا ہے کہ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں ہمارے چار پیسے سیدھے ہو جائیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی حالت دیکھ کر دنیا داروں کو دین کے علم ہی سے نفرت بڑھ گئی ہے۔

مولویوں اور فقیروں میں بھی یہ مرض ہے:

صاحبو! دین کے علم کو ہم نے خود ذلیل کیا ورنہ وہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کے سامنے سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں' دربار دہلی میں جب بادشاہ کے سامنے علماء گئے ہیں تو ان کو دیکھ کر بادشاہ خود جھک گیا' افسوس ہے کہ دوسرے مذہب کے لوگ تو عزت کریں' دیکھو بادشاہ جس نے نوابوں اور راجاؤں کی طرف سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اس نے مولویوں کو

دیکھ کر جھک کر ان سب کی تعظیم کی' اب بتلایئے کہ ان کے پاس کیا چیز تھی' کون سا ملک تھا' صرف یہ بات تھی کہ مولوی ہیں' دین کے پیشوا ہیں' لیکن اگر ہم خود ہی عالم کی بے قدری کرائیں تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے۔

فقیروں کی بے قدری لالچ کی وجہ سے ہوئی:

پیروں کی بھی حرص اور لالچ سے بہت بیقدری ہو گئی ہے' مجھے ایک گنوار کا واقعہ یاد آیا کہ فصل پر جب کمینوں کا اناج نکالنے بیٹھا تو گھر والوں نے سب کو شمار کیا' دھوبی کو بھی' بھنگی کو بھی اور یہ بیٹھا سنتا رہا' جب سارے کمینوں کا نام سن چکا تو کہنے لگا کہ اس سسرے پیر کا بھی تو حق نکال دو' مگر یہ پیر بھی تو ایسے ہوتے ہیں کہ موضع مساوی کے بعض لوگ قاضی صاحب منگلوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے تھے' خاندانی پیر صاحب کو جب خبر ہوئی تو کہنے لگے اچھی بات ہے' دیکھو میں بھی تمہیں پل صراط پر سے دھکا دوں گا' تو ایسے پیر اسی قابل ہیں ان کی ایسی قدر ہونی چاہیے جیسے اس گنوار نے کی' اسی طرح بعض مولوی بھی ایسے ہونے لگے ہیں۔

ایک جج صاحب کی حکایت:

چنانچہ ایک جج صاحب پرانی وضع پرانے خیال کے ایک جگہ بدل کر آئے' انہوں نے چاہا کہ وہاں کے رئیسوں سے ملیں تو ایک رئیس صاحب کے پاس پہنچے وہ دور ہی سے صورت دیکھ کر گھر میں چلے گئے' انہوں نے خادم کے ذریعے سے کہلا بھیجا کہ میں فلاں شخص ہوں آپ سے ملنے آیا ہوں' نام سن کر وہ رئیس صاحب باہر آئے اور عذر کرنے لگے کہ آپ کا عبا دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ کوئی مولوی صاحب ہیں چندہ لینے کی غرض سے آئے ہیں' یہ قدر ہے مولویوں کی عام لوگوں کے نزدیک اور یہ خیالات ہیں ان کے مولویوں کے متعلق' مگر اس میں زیادہ قصور عام لوگوں کا نہیں بلکہ ایسے مولویوں کا ہے ان ہی نے اپنے برتاؤ سے عام لوگوں کے خیالات کو خراب کیا اگر مولوی اس سے پرہیز کرتے تو عام لوگوں کو کبھی ایسی جرأت نہیں ہو سکتی تھی' یہ مولویوں کی غلطی تھی۔

علم دین کی ترغیب:

جن لوگوں نے ایساں کو دیکھ کر دین کے علم سے کنارہ کیا اور اس سے نفرت کرنے لگے وہ بھی غلطی سے خالی نہیں کیونکہ وہ اگر اپنی اولاد کو علم دین کے ساتھ نیک عادتیں بھی سکھلائیں تو ان سے ایسی باتیں ہرگز نہ ہوں۔

دوسرے ایک خاندانی رئیس کا بیٹا اگر دین کا علم پڑھے گا تو وہ پیدائشی طور پر بلند حوصلہ ہوگا' وہ ایسی حرکتیں کیوں کرنے لگا' جو لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں وہ اکثر کم خاندان کے لوگ ہوتے ہیں' پس جب حقیقت یہ ہے تو تعجب ہے کہ ایسے لوگوں کو دیکھ کر اپنے بچوں کو دین کا علم نہ سکھلاؤ' میں یہ نہیں کہتا کہ انگریزی نہ پڑھاؤ' ضرور پڑھاؤ مگر یہ بھی تو دیکھو کہ دین علم ہر وقت ضرورت کی چیز ہے' تو چاہیے تو یہ کہ اول علم دین پڑھاؤ اس کے بعد دوسرے علموں کی طرف توجہ کرو لیکن اگر علم دین اول نہ پڑھا تو ساتھ ساتھ اس کی تعلیم ضروری ہونی چاہیے' اگر زیادہ وقت نہ ہو تو اردو ہی کی کتابیں پڑھاؤ' لیکن استاد سے پڑھاؤ' یہ نہیں کہ کتاب دے دی اور کہہ دیا کہ دیکھ لو بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ کسی دیندار آدمی کو رکھ کر جتنی ضروری کتابیں ہیں وہ سب سبق لے کر پڑھی جائیں اگرچہ چوبیس ۲۴ گھنٹے میں سے ایک گھنٹہ ہی دو' بلکہ میں کہتا ہوں کہ فضول وقت میں سے جو کھیل کود میں ختم ہو جاتا ہے اس میں سے اگر ایک گھنٹہ دو تو وہ بھی کافی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی امتحان لیا کرو' پاس ہونے پر بچے کو انعام دو اور فیل ہونے پر سزا دو' اور عمل کرانے کی بھی کوشش کراؤ جیسے حساب میں مشق کراتے ہو اور اگر وہ نہیں کرتا تو سزا دیتے ہو' اسی طرح جو مسئلہ پڑھاتے ہو اس پر عمل بھی کراتے جاؤ' اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچہ ساتھ کے ساتھ دیندار ہوتا چلا جائے گا ہاں اس کے لیے ایک مولوی کو بلانے کی ضرورت ہوگی' تو جب سینکڑوں روپیہ انگریزی میں صرف ہو جاتا ہے اگر دس ۱۰ روپیہ اس میں صرف ہو جائیں گے تو کیا ظلم ہوگا۔ اور ان مولوی صاحب سے آپ اپنے لیے بھی یہی کام لے سکتے ہیں کہ ان سے خود بھی علم دین سیکھیں اور اس موقع پر یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس

شہر میں جب پہلے سلسلہ تھا' پھر کبھی کوئی سلسلہ علم دین کا ہو تو اچھا ہے کہ یہاں کے بچے کچھ نہ کچھ تو ضرور پڑھ لیں' دیکھو اگر دو گھنٹے کی صحبت بھی کسی مولوی کی ہو جائے تو خواہ یہ بچے دیندار نہ ہوں لیکن ان کو بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی مگر اس طرف لوگوں کی توجہ نہیں' اگر کہیے کہ یہاں کوئی مولوی نہیں ملتا تو میں کہتا ہوں کہ اگر معمار کی ضرورت ہو اور وہ نہ ملے تو کیا کرتے ہو' یہی کہ دوسری جگہ معمار کو بلاتے ہو' پھر مولوی کو دوسری جگہ سے کیوں نہیں بلاتے یہاں اس کے انتظار میں کیوں رہتے ہو کہ مولوی خود آئے۔

صاحبو! اگر دین کی کچھ بھی عزت دل میں ہوتی تو خود مولویوں کو تلاش کرتے' خلاصہ یہ کہ یہ سب دنیا کو پسند کرنے کی خرابیاں ہیں' ان خرابیوں سے بہت کم لوگ خالی ہیں' یہاں تک کہ مولوی اور فقیر بھی' اور مولویوں اور فقیروں سے ایسا ہونا زیادہ برا ہے کیونکہ یہ دھوکہ دے کر کماتے ہیں' مگر ہر جماعت میں دیندار ہوں یا دنیا دار سب ایک سے نہیں ہوتے' کچھ لوگ ان خرابیوں سے محفوظ بھی ہیں' یہ تو بیان تھا دنیا کے ساتھ راضی ہونے کا۔

دنیا سے جی لگانے کا بیان:

آگے فرماتے ہیں کہو واطمأ نوابہا کہ دنیا میں جی لگایا اور دنیا ان کے دل میں بھی گھس گئی' اللہ تعالیٰ جب یہ حالت کافروں کی بیان فرمائی ہے تو مسلمانوں کا تو دنیا سے دل گھبرانا چاہیے' مگر ہر مسلمان تبلائے کہ روزانہ کتنی مرتبہ دنیا میں رہنے سے اس کا جی گھبرایا ہے اور کب وحشت ہوتی ہے ہاں اگر وحشت ہوتی ہے تو آخرت میں جانے سے ہوتی ہے' حالانکہ دنیا سے وہ تعلق ہونا چاہیے جو مسافر کو سرائے سے ہوتا ہے کہ وہاں اس کو سارے کام کرنے ہوتے ہیں مگر دل وطن میں پڑا رہتا ہے' اس کا مطلب بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں یہ بالکل غلط ہے' ہاں مولوی یہ کہتے ہیں کہ دنیا سے سرائے کا سا تعلق رکھو' دیکھو کیا سرائے میں کھاتے نہیں ہو یا کوٹھری کرائے پر نہیں لیتے' سب کچھ کرتے ہو مگر وہاں جی نہیں لگتا اور دنیا میں جی لگا لیا ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا

ل یعنی جلال آباد ۱۲ منہ

کی حقیقت کو نہیں سمجھا' ہماری بالکل وہی حالت ہے جیسے بچہ سرائے کے کسی آرام کو دیکھ کر ضد کرنے لگے کہ میں تو یہیں رہوگا۔

جو دنیا کی حقیقت سے واقف ہیں وہ اس سے گھبراتے ہیں:

باقی جن کو دنیا کی حقیقت اور اصلیت کی خبر ہے وہ خدا سے چاہتے ہیں اور منت مانتے ہیں کہ کسی طرح یہاں سے چھٹکارا ہو جائے' بیان تو بہت کچھ کرنا تھا۔

دنیا کی محبت زائل ہونے کی آسان ترکیب:

مگر وقت نہ ہونے کی وجہ سے میں ایک ترکیب بتلا کر وعظ کو ختم کرتا ہوں اور وہ ایسی ترکیب ہے کہ جس سے تم کو خدا نے چاہا وہ فیض ہوگا جو بزرگوں کی صحبت سے ہوتا ہے اور یہ جو حد سے باہر قدم نکلا جا رہا ہے' یہ رک جائے گا اور وہ حالت ہو جائے گی جو طاعون کے زمانہ میں ہوتی ہے کہ سب کچھ کرتے ہو لیکن کسی چیز میں دل نہیں لگتا' وہ ترکیب یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے اس میں موت کو یاد کیا کرو اور پھر قبر کو یاد کرو' پھر میدان قیامت کو یاد کرو اور اس کی دہشتوں اور سختیوں کو یاد کرو اور سوچو کہ ہم کو خدا تعالیٰ کے روبرو کھڑا کیا جائے گا' وہ بڑی قدرت والا ہے اور ہم سے پوچھ گچھ ہوگی ایک ایک حق اگلنا پڑیگا پھر سخت عذاب کا سامنا ہوگا' اسی طرح روزانہ سونے کے وقت سوچ لیا کرو۔ ہفتے دو ہفتے میں ان شاء اللہ کایا پلٹ جائے گی اور جو محبت دنیا کے ساتھ اب ہے باقی نہ رہے گی۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ عمل کی توفیق دے۔ (آمین)

تمت

✿✿✿

(۴۲) دوسروں سے عبرت پکڑنا

منتخب از وعظ چہارم ملقب بہ الاتعاظ بالغیر حصہ چہارم

دعوات عبدیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خطبہ ماثورہ:

اَمَّا بعد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

اَلسَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهٖ

ترجمہ: ''خوش نصیب وہ ہے کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔''

یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمایا ہوا ہے اس میں ہمارے ایسے مرض کا علاج بتلایا گیا ہے جس سے کوئی بچا ہوا نہیں ہے اس واسطے میں نے اس حدیث کو بیان کے لیے اختیار کیا' پھر یہ وجہ بھی ہے کہ یہ ایک چھوٹی سی بات ہے اور ہے بڑے کام کی' اور چونکہ اس وقت طبیعت سست ہے اس لیے ضرورت اس کی تھی کہ چھوٹا سا مضمون بیان کیا جائے' لیکن یہ مضمون ظاہر میں تو چھوٹا ہے مگر ہماری بہت سی باتوں کی اس سے اصلاح ہو سکتی ہے۔

مرض دو قسم کے ہیں:

اب سمجھئے کہ مرض دو قسم کے ہیں ایک دو مرض جس کی خبر نہ ہو اور ایک وہ جس کی خبر

ہو اور اس کی پرواہ نہ ہو ایسے مریض کی حالت زیادہ قابل افسوس کے ہے' سو ہم میں بعض مرض بے علمی کی وجہ سے ہیں اور بعض بے پروائی کی وجہ سے کیونکہ بعض تو ہم میں بے علم ہیں سو ان کی تو زیادہ شکایت نہیں۔

دین کے اندر بے پروائی کی شکایت:

لیکن بعض وہ ہیں کہ علم رکھتے ہیں پر اپنی حالت کو نہیں سوچتے دنیا کا کام جس طرح سوچ سمجھ کر کرتے ہیں' سچ تو یہ ہے کہ دین کے کاموں کی اتنی فکر نہیں کرتے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ فکر بالکل نہیں کرتے جس میں جتنا دین ہے وہ بھی عادت کی وجہ سے ہے نہ فکر کی وجہ سے اگرچہ یہ خوشی کی بات ہے کہ دین کی عادت تو ہوئی لیکن شکایت یہ ہے کہ جس کاموں کی عادت ہے وہ تو کرتے ہیں باقی اور کام کیوں نہیں کرتے ان کی بھی تو فکر چاہیے دنیا میں تھوڑی چیز پر کفایت نہیں کرتے بلکہ زیادتی کی تدبیر کرتے ہیں خود سوچتے ہیں دوسروں سے پوچھتے ہیں جہاں تک ہو سکتا ہے کوشش کرتے ہیں چاہے کچھ نتیجہ حاصل ہو یا نہ ہو' کیونکہ دنیا میں کوشش سے بہت کم مقصود حاصل ہوتا ہے ورنہ اگر سب کا مقصود تدبیر سے حاصل ہو جایا کرتا تو آج ساری دنیا بادشاہ ہوتی' یہ خدا کی مصلحت ہے کہ کسی کی تدبیر کارگر کر دیتے ہیں' آج جن لوگوں کی تدبیر کارگر ہوگئی وہ تدبیر ہی کو کافی سمجھتے ہیں' صاحبو! ذرا ان سے پوچھو کہ جن کو تمام عمر تدبیر کرتے گزری اور کبھی مقصود حاصل نہ ہوا تو صرف تدبیر نہ کافی ہے نہ بالکل بیکار' خلاصہ یہ کہ دنیا کے کاموں میں تدبیر اکثر بے فائدہ رہتی ہے پھر بھی اس کی کوشش کی جاتی ہے اور آخرت کے لیے کوشش بھی بے کار نہیں جاتی مگر اس کے لیے اسقدر کوشش نہیں کی جاتی ہے' کس قدر تعجب کی بات ہے اگر آخرت کے لیے اس سے آدھی کوشش کریں' جتنی دنیا کے لیے کرتے ہیں تو کبھی ناکام نہ رہیں۔

غرض یہ کہ یہ مرض ہم میں ضرور ہے کہ اپنی حالت کو سوچتے نہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف یہی مرض ہم میں ہے بلکہ اور عیبوں کے ساتھ ایک یہ عیب بھی ہے اور یہ عیب قریب قریب ہر شخص میں ہے' مگر پھر اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں کی جاتی' تو اگر

ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ اس حدیث میں اس کا علاج موجود ہے' کیونکہ ہمارا عیب یہ ہے کہ سوچتے نہیں اور اس میں حکم ہے سوچنے کا' سوفرماتے ہیں کہ خوش نصیب وہ ہے کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے' عجب نہیں کہ یہ مضمون بہت دفعہ سنا ہو کیونکہ یہ ایک مشہور بات ہے' یہاں تک کہ عام لوگ بھی اپنے محاورہ میں کہتے ہیں ''تازی پٹے اور ترکی کانپے'' اس کا بھی یہی خلاصہ ہے کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو پس اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے یہ کوئی ایسی بات نہیں سکھلائی کہ جو عقل کے خلاف ہو' بلکہ یہ مضمون سب کے نزدیک مانا ہوا ہے اس کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں۔

شرع کی ہر بات طبیعت کے مناسب ہے:

میں اس سے بڑھ کر کہتا ہوں کہ شرع نے جو بات بھی سکھلائی ہے وہ طبیعت کے اتنی مناسب ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ہزاروں مشقتیں پڑ جائیں مگر اس کی دریافت کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ طبیعت میں سلامتی ہو' ہمارا نفس چونکہ گناہوں کی وجہ سے بگڑ گیا ہے اس لیے شرع کی باتوں سے بھاگتا ہے جیسے بیمار کو بدپرہیزی کی طرف رغبت ہوتی ہے اور جو دوا اور غذا مفید ہو اس سے بھاگتا ہے اور حکیم کے کہنے کو طبیعت کے خلاف سمجھتا ہے' دیکھو جو تندرست ہوتا ہے وہ پانی مناسب مقدار میں پیتا ہے اور جس کو استسقاء کی بیماری ہو تو اس کی پیاس اس درجہ ہوتی ہے کہ سمندر سے بھی نہیں بجھتی' اگر حکیم اس کو زیادہ پینے سے روکے گا تو وہ یوں سمجھے گا کہ یہ تعلیم طبیعت کے خلاف ہے' حالانکہ خود اس کی طبیعت ہی صحیح حالت سے ہٹی ہوئی ہے ورنہ ایک گھونٹ زیادہ پینے سے بھی طبیعت پر بوجھ ہوتا ہے' اسی طرح کھانے میں' ہم نے ایک شخص کو دیکھا ہے کہ کھا رہے ہیں اور نکل رہا ہے مگر کھائے جاتے ہیں اور نکلتا جاتا ہے' اسی طرح برابر سلسلہ رہتا تھا' تو کیا اس کی طبیعت صحیح حالت پر ہے' ہرگز نہیں میں تو دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر طبیعت میں سلامتی ہو' رغبت شرع ہی کی طرف ہوگی اور اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو امتحان کر لیجے کہ جب کبھی خلاف شرع لیجیے گا ضرور تکلیف پہنچے گی جیسے زیادہ کھانے سے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ گناہ کا اول تو نفس میں تقاضا

پیدا ہوتا ہے مگر کرنے کے بعد طبیعت پر بوجھ بھی ہوتا ہے' اگر کہیے کہ ہم کو تو کچھ بھی بوجھ نہیں معلوم ہوتا تو سمجھئے کہ یہ دل کے سیاہ ہو جانے کی علامت ہے' یہ دیکھئے کہ اول اول جب یہ گناہ کیا تھا اس وقت کیا حالت ہوئی تھی' جو شخص پہلی مرتبہ رشوت لیتا ہے تو اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور خود اپنی نظر میں اپنی عزت جاتی رہتی ہے' اسی طرح اول مرتبہ زنا کرنے سے خود اپنے اوپر شرم آتی ہے اور خود اپنی نظر میں آدمی ذلیل ہو جاتا ہے' یہی حالت دوسرے گناہوں کی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر گناہ طبیعت کے خلاف ہے اور شرع کے تمام حکم طبیعت کے موافق ہیں البتہ بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ ان کا اثر فوراً ہی ہر شخص کو نہیں معلوم ہوتا بلکہ مرنے کے بعد معلوم ہوگا۔

حضور ﷺ کی تعلیم مصلحت کے موافق ہے:

غرض یہ کہ حضور ﷺ نے وہی باتیں بتلائی ہیں جو طبیعت کے موافق ہیں تو اس حدیث میں جو ارشاد فرمایا ہے کہ دوسروں سے عبرت پکڑو وہ بھی طبیعت کے موافق ہے' دیکھو اگر ایک چور کو سزا ہو تو دوسرے لیے فائدہ اس میں ہے کہ چوری چھوڑ دے اور نقصان اس میں ہے کہ دوسروں کی سزا دیکھے اور برابر کیے جائے اور جب یہ حالت رہے گی تو مثل مشہور ہے کہ "سو دن چور کے ایک دن شاہ کا۔" کبھی نہ کبھی یہ بھی پکڑا جائے گا۔

ایک چور کی حکایت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک چور کو پکڑا کر لایا گیا آپ رضی اللہ عنہ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا' اس نے کہا اے امیر المومنین![1] میں نے پہلی ہی مرتبہ یہ چوری کی تھی' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو غلط کہتا ہے خدا تعالیٰ کی یہ عادت نہیں ہے وہ کبھی اول گناہ پر نہیں پکڑتے آخر دریافت جو کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو بڑا پکا پرانا چور ہے' مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے بہت کچھ ہمارے گناہوں پر پردہ ڈال دیتے

[1] مسلمانوں کے سردار ۱۲

ہیں لیکن جب کوئی حد سے نکل جائے تو وہ رسوا بھی کر دیتا ہے۔

پس جو دوسرے کے حال سے عبرت نہ پکڑے گا آخر اس کا بھی ایک دن وہی انجام ہوگا' غرض یہ تو ثابت ہو گیا کہ یہ حکم بالکل مصلحت اور طبیعت کے موافق ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں یہ مرض ہے یا نہیں تو اگر ذرا بھی اپنی حالت کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہو کہ بہت زیادہ ہم اس بلا میں گرفتار ہیں' ہماری حالت یہ ہے کہ کسی بات میں دوسروں کو دیکھ کر عبرت نہیں پکڑتے' مگر میں اس وقت ایک خاص بات کو بیان کرتا ہوں' آپ نے سنا ہوگا کہ جگہ جگہ اس وقت طاعون ہے' بلکہ اخباروں میں بھی ضرور پڑھا ہوگا۔

اخبار کی حقیقت اور اخبار بینی میں حد سے تجاوز کرنا:

کیونکہ آپ لوگوں نے اخبار کو ایک مشغلہ بنالیا ہے' میں نے ایک مرتبہ اخبار کے متعلق ایک مضمون لکھ دیا تھا جس میں یہ بتلایا تھا کہ کس صورت میں اخبار کا دیکھنا جائز ہے اور کس صورت میں ناجائز ہے اخبار والوں نے اس مضمون کو بلا دیکھے ہی وہ شور غل مچایا کہ خدا کی پناہ اور مشہور کر دیا کہ لو اخبار دیکھنا بالکل حرام کر دیا' میں نے کہا کہ اس وقت تک میں نے اخبارات دیکھنے کے بارے میں سخت حکم نہیں دیا مگر اب میرے پاس ایک دلیل بھی ہے سختی کرنے کی کہ اخبار والے تہمت بھی لگاتے ہیں' واقعی اخباروں کی یہی حالت ہے کہ اکثر باتیں بے تحقیق اٹکل ہی سے لکھ دیتے ہیں۔

صاحبو! اخبار بھی ایک قسم کی تاریخ ہے اگر خبر لکھنے میں احتیاط برتی جائے تو کیا حرج ہے اور تاریخ بہت مفید چیز ہے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ فِىْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ ط کہ پہلی امتوں کے قصے اس واسطے نقل کیے جاتے ہیں کہ لوگ عبرت پکڑیں۔

عبرت کا خلاصہ یہی ہے کہ یہ سوچیں کہ فلاں شخص نے ایسا کیا تھا' اس کو یہ نتیجہ ملا' ہم اگر ایسا کریں گے تو ہم کو بھی یہی نتیجہ ملے گا' یہ حقیقت ہے عبرت کی اس کی وجہ سے تاریخ کا علم مفید ہوا' پس اگر اخبار سے بھی یہی سبق حاصل کریں تو وہ فائدہ کی چیز ہے

---

[1] شعر یہ ہے علم حق باتو مواسا ہا کند چونکہ از حد بگذری رسوا کند

ورنہ بے کار، اب دیکھ لیجیے کہ کون شخص یہ عبرت حاصل کرتا ہے، اکثر لوگ مسلمانوں کی مصیبت سنتے ہیں مگر کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔

طاعون سے ہم کو عبرت نہیں ہوتی:

اب دیکھ لیجیے کہ دوسری جگہوں سے طاعون کی خبریں سننے میں آ رہی ہیں اخباروں میں دیکھتے ہیں، مگر ۱۰۰ سو میں ننانوے ۹۹ آدمی ایسے ہیں کہ جن کے دل پر ویسا اثر اگر ہوتا ہو جیسا اپنی بستی کے اندر طاعون ہونے سے ہوتا ہے، جب دوسروں کی تکلیف کو سن کر ہمارا دل نہ دُکھا تو ہم آدمی نہیں، اب ہم نے اخبار کو جس غرض سے اختیار کیا ہے، اس کا خلاصہ گھر پھونک کر تماشا دیکھنا ہے کہ دوسرے کا گھر جلے اور ہم بیٹھ کر باتیں کیونکہ اخبار اس لیے دیکھتے ہیں کہ خالی وقت کا مشغلہ ہو اور دل بہلے، اگر اخبار نہ دیکھتے تو یہ تو نہ ہوتا کہ ہم نے مسلمانوں کی مصیبت کو مشغلہ بنا رکھا ہے اور سبق حاصل کرتے تو یہ سبق حاصل کرتے کہ ان کی مدد کریں، سو یہ تو بہت کم لوگوں کے دل میں آتا ہے، ہاں یہ سبق حاصل کرتے ہیں کہ فلاں جگہ کے لوگوں نے صفائی نہیں رکھی اس لیے وہاں طاعون پھیلا، مگر اس سے بڑھ کر اور بات بھی ہے جس کی ابھی آپ کو ہوا بھی نہیں لگی، مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یونان والوں کی حکمت کہاں تک پڑھو گے، اب کچھ ایمان والوں کی حکمت پڑھ لو، یونان والوں کی حکمت سے جسمانی حکمت مراد ہے کہ اس پر تو آپ کی نظر جاتی ہے، مگر روحانی حکمت پر نظر نہیں جاتی، یہ تو معلوم کر لیا کہ ہوا کے صاف نہ ہونے سے طاعون ہوا، مگر یہ بتلایئے کہ ہوا کے صاف نہ ہونے سے طاعون ہوا، مگر یہ بتلایئے کہ ہو کے صاف نہ ہونے کا سبب کیا ہے آپ نے طاعون کا سبب تو دیکھا کہ ہوا خراب ہوگئی تھی، مگر سبب کا سبب نہ دیکھا کہ ہوا کیوں خراب ہوئی، ہم ڈاکٹروں اور حکیموں کو جھٹلاتے نہیں۔

طاعون کا سبب بیان کرنے میں دنیا والوں کی غلطی:

مگر یہ دکھلاتے ہیں کہ ان کی نظر اصل سبب پر نہیں جاتی اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص قلم سے لکھ رہا ہے، چند چیونٹیوں نے دیکھا ایک نے تو کہا کہ یہ حرف خود بخود بن

رہے ہیں، دوسری جس کی نظر کچھ آگے تک پہنچی اس نے کہا کہ نہیں بلکہ قلم چل رہا ہے، تیسری جس کی نظر اس سے بھی آگے تھی کہنے لگی کہ قلم خود بخود نہیں چل رہا، بلکہ وہ انگلیوں میں ہے، انگلیاں اس کو چلا رہی ہیں، چوتھی جس کو پورا علم تھا اس نے کہا کہ انگلیاں خود بخود نہیں چل رہیں بلکہ انسان کا ارادہ اس کو چلا رہا ہے اب بتلائی کہ ان میں صحیح رائے کس کی ہے اور اصل چیز پر کس کی نظر ہے ظاہر ہے کہ جس نے ارادہ کا پتہ چلا لیا اسی کی نظر اصل پر پہنچی باقی سب کوتاہ نظر ہیں۔

ایک بزرگ مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ دیوار نے کھونٹی سے کہا کہ تو مجھے کیوں پھاڑتی ہے، کھونٹی نے جواب دیا کہ میرا کیا بس ہے، اس سے کہو جو مجھے ٹھوکتا ہے۔ دوسری مثال لیجیے کہ کسی شخص کو پھانسی ہوگئی کسی نے پوچھا کہ کیونکر ہوئی، ایک نے کہا کہ چمڑے سے گلا گھونٹ دیا گیا، دوسرے نے کہا کہ احمق اصل سبب یہ ہے کہ حاکم نے حکم اس لیے دیا تھا، تیسرے نے کہا کہ حاکم نے حکم اس لیے دیا تھا کہ اس نے ڈکیتی کی تھی تو حقیقت سے واقف یہ تیسرا شخص ہے کہ اس نے حاکم کے حکم کو بھی دیکھا اور مجرم کے قصور کو بھی دیکھا بس یہی فرق ہے، ظاہر کے دیکھنے والوں میں اور حقیقت کے دیکھنے والوں میں تو یہ بھی سچ ہے کہ موت پھانسی کے پھندے سے ہوئی اور طاعون ہوا کے زہریلی ہونے سے ہوا مگر یہ بھی تو دیکھو کہ ہوا زہریلی کیوں ہوئی، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکم حقیقی نے اس میں زہر کا مادہ پیدا کر دیا اور اس کے پیدا کرنے کا سبب مخلوق کے گناہ ہوئے تو صرف چوہے مارنے پر کفایت نہ کرنی چاہیے بلکہ جن گناہوں کی وجہ سے طاعون ہوا تھا اس کو بھی چھوڑنا چاہیے اور ایک طاعون کیا؟ جتنی بھی مصیبتیں آتی ہیں سب گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ

یعنی کہ جو کچھ بھی مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے گناہوں کی وجہ ہے۔

مولوی ظاہری اسباب کا انکار نہیں کرتے:

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مولویوں پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ

رمصیبت میں گناہوں کو سبب بتاتے ہیں اور ظاہر اسباب کو نہیں مانتے سو یہ اعتراض بالکل غلط ہے وہ اسباب سے بے خبر نہیں بلکہ سبب کے ساتھ سبب کے سبب کو بھی دیکھتے ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ جو مصیبت آتی ہے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے' ہوا' آگ' پانی' سب خدا تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں ان کو جب جیسا حکم ہوتا ہے ویسا کرتے ہیں۔

ایک کافر بادشاہ کی حکایت:

ایک کافر مادشاہ نے بہت سے مسلانوں کو آگ میں ڈال دیا' کیونکہ وہ لوگ بت کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے تھے' آخر ایک عورت کو لایا گیا اور اس سے بھی سجدہ کرنے کو کہا گیا تو اس نے بھی انکار کیا اس کی گود میں ایک بچہ تھا' بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی گود سے بچہ لیکر آگ میں پھینک دیا جائے اس کے کہنے سے بچہ کو پھینک دیا گیا'' اب اس عورت سے ضبط نہ ہو سکا' قریب تھا کہ وہ عورت سجدہ کرلے کہ لڑکے نے آواز دی کہ ماں خبردار! میں یہاں بڑے آرام سے ہوں تو بھی یہیں چلی آ' وہ عورت آگ میں کود پڑی اس کے بعد اس نے اوروں سے کہنا شروع کیا کہ یہاں آؤ یہاں آؤ' بہت بڑا عجیب باغ ہے' پھر تو یہ حالت ہوئی کہ لوگ بے قرار ہو کہ اس میں کودنے لگے' سپاہی روکتے تھے' لوگ برابر آگ میں کودتے جاتے تھے' جب بادشاہ نے یہ حالت دیکھی تو غصہ ہو کر آگ سے کہنے لگال کہ اے آگ کیا تو آگ نہیں رہی یا تجھ میں جلانے کی قوت نہیں رہی' آگ نے جواب دیا کہ میں وہی آگ ہوں میری تاثیر نہیں بدلی' تو اندر آ' میرے جلانے کا تماشہ دیکھے' باقی ان کو کیونکر جلاؤں جب خدا تعالیٰ کا حکم نہیں ہے' میں اس کی تلوار ہوں' تلوار کاٹتی ہے' مگر جس کے ہاتھ میں ہے اس کے چلانے سے کٹتی ہے' بغیر چلائے تلوار کس طرح کاٹ سکتی ہے اسی طرح آب دہوا خدا کے حکم سے زہریلی ہوتی ہے اور ملاک کردیتی ہے۔

حضرت مولانا نشامی فرمایت ہیں کہ جب تک ہوا کو خدا تعالیٰ کا حکم نہ ہو اس وقت تک وہ بارش نہیں کرسکتی' اور زمین کو جب تک حکم نہ ہو ایک دانہ بھی نہیں نکال سکتی' تو مصیبتوں میں اصلی سبب گناہ ہیں' مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ بھی معصیت آتی

ہے وہ ہماری ہی گستاخی اور بے باکی سے آتی ہے۔

غم کے وقت توبہ کرو:

تو جب غم کی بات دیکھو فوراً توبہ کرلو' دیکھئے کیا عمدہ تعلیم ہے اور کیا عجیب بات ہے' اسی رسول اللہ ﷺ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر تم حاکم کی طرف سے کوئی ناگوار بات دیکھو تو ان کو برامت کہو (قربان جایئے حضور ﷺ کی تعلیم پر کہ فضول باتوں سے کیسا روک دیا ہے) پھر اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرماتے ہیں کہ حاکموں اور بادشاہوں کے دل میرے اختیار میں ہیں' اگر آرام چاہتے ہو تو میری تابعداری کرو اور مجھ سے معاملہ درست رکھو ان کے دل کو نرم کر دوں گا۔

مصیبت کے وقت خدا ہی کی طرف توجہ کرنا علاج ہے مع ایک حکایت کے:

ایک مرتبہ کانپور میں طاعون ہوا لوگوں نے چاہا کہ ایک جلسہ کریں اور حاکم ضلع سے درخواست کریں کہ نیا قانون جو طاعون کے متعلق ہے اٹھا دیا جائے مجھ کو بھی اس جلسے میں شریک کرنا چاہتے تھے میں نے انکار کر دیا' مگر جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا کہ اچھا' میں دیوان حافظ میں فال دیکھتا ہوں' یہ دیکھنا اس وجہ سے نہ تھا کہ میرا یہ اعتقاد تھا کہ فال کے موافق ہونا ضروری ہے یا میں فال کی تاثیر کو مانتا تھا' بلکہ اس وجہ سے تھا کہ دیوان حافظ میں اکثر مناسب اور مفید باتیں نکل آتی ہیں اس لیے میں نے اس کو دیکھا تو اس میں یہ شعر نکلا

گدائے گوشہ نشینی تو حافظ مخروش
رموز و مصلحت ملک خسرواں دانند

یعنی اپنے ملک کی مصلحت اور تدبیر بادشاہ جانتے ہیں' تم فقیر ہو گوشہ میں بیٹھنے والے تم اس کو کیا جانو' تم خواہ مخواہ کی گڑبڑ کیوں کرتے ہو۔

میں نے ان سے کہا کہ بھائی اب تم بھی نہ بولو' بس خدا کے سپرد کرو اور اللہ اللہ کیا کرو' اور عصر کے بعد لاحول کی تسبیح پڑھا کرو' اور اتفاق سے میرے منہ سے یہ بھی نکل گیا

کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہفتہ دو ہفتہ کے اندر ہی سب پریشانی دفع ہو جائے گی' انہوں نے ایسا ہی کیا' حاکم ضلع نے خود ہی رپورٹ کی کہ ان نئے قانونوں سے لوگوں کو تکلیف ہے ان کو اٹھالیا جائے' سودہ تمام موقوف ہوگئے' لوگ بہت خوش ہوتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ صاحب سب کام ٹھیک ہوگیا' میں نے کہا کیا ایسا ہوسکتا تھا کہ حضور ﷺ کی بتلائی ہوئی تدبیر نہ چلتی۔

دنیا کی راحت بھی شرع پر چلنے میں ہے:

صاحبو! اگر ہم عمل کریں تو دنیا کی راحت بھی شرع کی تعلیم میں ہے' تو حضور ﷺ نے فضول باتوں سے یہاں تک روکا کہ حاکموں کو بھی برا نہ کہو' غرض سب مصیبتوں کو وجہ یہ ہے کہ خدا کو ناراض کر رکھا ہے' حدیث میں ہے جس قوم میں زنا یعنی حرام کاری زیادہ ہوگی اس میں طاعون ہوگا'

طاعون کا ایک سبب وہ گناہ ہے جو قوم لوط علیہ السلام میں تھا:

اور اس طاعون کا ایک دوسرا سبب بھی ہے اگرچہ بعض باتیں ظاہر کرنے کی نہیں ہوتیں' مگر اس لیے ظاہر کیے دیتا ہوں کہ شاید اس کو سن کر لوگ اپنی حالت درست کرلیں' تین چار سال ہوئے تھانہ بھون اور اس کے آس پاس کی بستیوں میں طاعون ہوا تھا' تو طاعون سے کچھ پہلے میں ایک روز اخیر رات میں بیٹھا ہوا تھا کہ دل میں یہ آیت واقع ہوئی۔

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

یعنی ہم اس بستی والوں پر عذاب آسمان سے نازل کرنے والے ہیں ان کے فسق اور بدکاری کی وجہ سے۔

یہ آیت لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں ہے اشارہ اس طرف تھا کہ آجکل بھی لوگوں کے لڑکوں میں تعلق رکھنے میں وہی حالت ہوگئی ہے جو قوم لوط کی تھی' اس لیے عذاب نازل ہوگا' میں نے اس کو وعظ میں بیان کیا لیکن یہ نہیں کہا کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوا ہے' بلکہ

یہ کہا کہ ایک شخص کو یہ الہام[1] ہوا ہے مگر لوگوں نے توجہ نہ کی اور طاعون پھیلا' غرض ایک سبب طاعون کا وہ گناہ بھی نکلا جو قوم لوط میں تھا۔

لواطت کا مرض عام ہو گیا ہے:

اس وقت لوگ میں یہ مرض بہت زیادہ پھیل رہا ہے' کوئی تو خاص اصل ہی گناہ میں پھنسا ہوا ہے اور کوئی ان گناہوں میں جو اس کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں' جیسا کہ اجنبی لڑکے یا اجنبی عورت پر نظر کرنا' حدیث میں ہے کہ آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں اور زنا ان کا دیکھنا ہے اور ہاتھ بھی زنا کرتا ہے اور زنا اس کا ہاتھ لگانا ہے اور زبان بھی زنا کرتی ہے اور زنا اس کا باتیں کرنا ہے اور دل آرزو اور خواہش کرتا ہے تو زنا میں ہاتھ لگانا اور بری نگاہ سے دیکھنا سب داخل ہو گئے' یہاں تک کہ جی خوش کرنے کے لیے کسی خوبصورت لڑکے یا لڑکی سے باتیں کرنا یہ بھی زنا اور لواطت میں داخل ہے اور دل کا گناہ سوچنا ہے جس سے لذت حاصل ہو' تو جتنی قسمیں زنا کی ہیں اتنی ہی لواطت کی بھی ہیں' اس بلا میں اکثر لوگ پھنسے ہوئے ہیں اور یہ نہایت ہی افسوس اور رنج کی بات ہے حالانکہ پیدائشی طور پر طبیعت عورت کی طرف راغب ہوتی ہے مگر لوگ پھر بھی لڑکوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وجہ اس کی زیادہ یہ ہے کہ عورت سے ملنے میں بدنامی ہو جاتی ہے' دوسرے عورت ملتی بھی مشکل سے ہے اور لڑکے سے ملنے میں زیادہ بدنامی کا بھی اندیشہ نہیں ہوتا اور ملتے بھی آسانی سے ہیں' خاص کر دیکھنا اور سوچنا تو اس لیے بھی آسان ہے کہ اس کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی اور یہ سب بدکاری میں داخل ہے۔

نظر بازی کا مرض پرہیزگاروں میں بھی ہے:

اور نہایت افسوس ہے کہ مرض تاک جھانک کا اکثر پرہیزگاروں میں بھی ہے اور ان کو دھوکہ اس سے ہو جاتا ہے کہ وہ بعض وقت شروع میں اپنی طبیعت میں شہوت کا اثر نہیں پاتے اور اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری نظر شہوت کی وجہ سے نہیں لیکن بعد میں بہت جلد شہوت ظاہر ہو جاتی ہے اس لیے پہلے ہی سے احتیاط واجب ہے۔

---

[1] الہام دل میں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات واقع ہونا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

صاحبو! امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر تو آج کل کوئی بزرگ پاک نفس نہیں ہوگا' مگر دیکھئے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اول دفعہ تو دیکھا لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کی داڑھی نہیں آئی تو یہ حکم کر دیا کہ جب تک داڑھی نہ نکل آئے پیٹھ کی طرف بیٹھا کرؤ دونوں طرف دیندار پرہیز گار مگر احتیاط اتنی' بڑی مدت دراز کے بعد ایک مرتبہ اتفاق سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظر پڑ گئی تو تعجب سے پوچھا کہ کیا تمہارے داڑھی نکل آئی' تو جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس قدر احتیاط کی تو آج کون ہے کہ وہ جو اپنے اوپر اطمینان کرے'

تو اس آیت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ لوگوں کے اس عمل سے عذاب نازل ہونے کو ہے' میں نے روکا مگر کون سنتا ہے' جب اس بیہودہ کام کی عادت پڑ جاتی ہے تو کم ہمتوں سے بڑی مشکل سے چھوٹتا ہے۔

لڑکوں کی طرف توجہ کرنے کا مرض تھوڑی سی ہمت سے چھوٹ سکتا ہے:

ہاں اگر ہمت کی جائے اور پکا ارادہ کرے تو چھوٹ بھی جاتا ہے' کیونکہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں ایک حد تک مجبوری بھی ہو سکتی ہے' جیسے غریب آدمی کا رشوت لینا کہ اگر نہ لے تو ظاہر میں اس کے کام اٹکتے ہیں اور اس میں تو کوئی مجبوری بھی نہیں کہ کوئی کام اس پر اٹکا ہو پس اس میں تو تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے' کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ تھوڑی سی تکلیف نفس کو ہوگی' کوئی نقصان تو نہیں ہوگا تو اس کا چھوڑ دینا ہمت والے کے لیے بہت آسان ہے' ہمت والوں نے تو خدا کی راہ میں جانیں تک دے دی ہیں بہت سے ایسے ہمت والوں کے واقعے سنے گئے کہ انہوں نے تمام عمر کی افیون کی عادت چھوڑ دی۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک باہمت مرید کی حکایت:

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور مرید ہونے کی درخواست کی' مولانا نے اس کو مرید کر لیا اور تمام گناہوں سے اور کفر و شرک و بدعت غصہ سے توبہ کرا دی' جب

مرید کر چکے تو وہ دیہاتی کہنے لگا کہ مولوی جی! اور تم نے افیم (افیون) سے تو توبہ کرائی ہی نہیں مولانا نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر تھی کہ تو افیون بھی کھاتا ہے' اچھا جس قدر تو افیون روزانہ کھاتا ہے اس کی گولی بنا کر میرے ہاتھ پر رکھ دے اس نے گولی بنا کر مولانا کے ہاتھ پر رکھ دے' مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دیکھا اور اس میں سے تھوڑا سا حصہ لے کر اس سے کہا کہ اس قدر کھالیا کرو' مقصود یہ تھا کہ آہستہ آہستہ چھڑا دی جائے گی مگر جب دل میں خدا کی محبت آتی ہے تو افیون کیا سلطنت بھی چھوٹ جاتی ہے' اس نے کہا کو مولوی جی! اب کیا کھاؤں گا اور یہ کہہ کر افیون کی ڈبیہ جیب سے نکالی اور بہت دور پھینک دی' گھر جا کر افیون کا تقاضا ہوا مگر اس نے نہیں کھائی آخر دست لگے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہلا کر بھیجا کہ مجھے دست لگ رہے ہیں مگر میں توبہ کو نہیں توڑوں گا چند روز میں دست بند ہوگئے' جب بالکل تندرست ہوگیا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا آ کر سلام کیا' مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا بھائی کون ہو کہنے لگا میں ہوں افیم والا' اور دو روپیہ نکال کر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دیئے اور کہا کہ مولوی جی! یہ افیم کے روپیہ ہیں' مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی افیم کے روپے کیسے؟ کہنے لگا کہ میں دو روپیہ مہینہ کی افیم کھاتا تھا۔ جب میں نے چھوڑ دی تو نفس بہت خوش ہوا کہ دو روپے ماہوار بچ' میں نے نفس سے کہا کہ یہ دو روپے تجھے تو ہرگز نہ دوں گا' میں اپنے پیر کو دوں گا۔

دیکھئے! اس شخص نے دین کو کس قدر خالص کیا کہ وہ دو۲ روپے بھی اپنے پاس نہیں رکھے' خیر یہ تو درمیان میں ایک بات آ گئی۔

مقصود یہ ہے کہ ہمت وہ چیز ہے کہ وہ سب کچھ کرا دیتی ہے' اگر ہمت کی جائے تو بری نگاہ کا چھوڑ دینا کیا مشکل ہے مگر افسوس ہے کہ لوگ اس کو ایسا ہلکا جانتے ہیں کہ جیسے حلال ہی سمجھتے ہیں' حالانکہ حلال سمجھنا گناہ کا قریب کفر کے ہے' مگر لوگ کچھ خیال میں نہیں لاتے اور سمجھتے ہیں کہ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے' اور بے باک شاعر نے تو اس کو ایک مثال میں بیان کیا ہے

نگاہ پاک لازم ہے بشر کو روئے جاناں پر ۔۔۔ خطا کیا ہوگئی گر رکھ دیا قرآن کو قرآن پر

اس میں ایک تو یہ کھلا دھوکہ ہے کہ ناپاک نظر کو پاک سمجھا' دوسرے اگر پاک بھی مان لیا جائے تو خوب سمجھ لو کہ شیطان اول اول تو اچھی نیت سے دکھلاتا ہے۔

بدنظر کی خرابیاں:

چند روز کے بعد جب عادت پڑ جاتی ہے اور محبت دل میں بیٹھ جاتی ہے تو پھر نگاہ کو ناپاک کر دیتا ہے تو بچاؤ کی صورت ہے کہ محبت ہی نہ کرو اور محبت ہوتی ہے نظر سے پس نظر ہی نہ کرو' شاید حدیث میں ہے یا کسی بزرگ کا قول ہے اَلنَّظْرُ سِھَامٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیْسَ کہ نظر ایک تیر ہے شیطان کے تیروں میں سے اور تیر بھی ایسا ہے کہ اس کے زخم کا نشان بھی معلوم نہیں ہوتا اور دل کے اندر اترتا جاتا ہے۔

یہ نظر ایسی ہے کہ اس کا اثر پیدا ہونے کے بعد بھی مدت تک یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کو تعلق ہو گیا' بلکہ جب کبھی محبوب جدا ہوتا ہے اس وقت دل میں ایک جلن سی پیدا ہوتی ہے' اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ محبت ہوگئی اور جس قدر یہ جلن بڑھتی ہے اسی قدر خدا کی محبت کم ہوتی جاتی ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کو بہت غیرت آتی ہے اور کیوں نہ آئے' جب دنیا کے محبوبوں کو غیرت آتی ہے۔

ایک جھوٹے عاشق کی حکایت:

مثنوی میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص ایک عورت کے پیچھے چلا اس نے پوچھا کہ تو میرے پیچھے کیوں آتا ہے؟ کہنے لگا کہ میں تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں' اس نے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے میری بہن چلی آرہی ہے وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے' ہوسناک تو تھا ہی' فوراً پیچھے لوٹا' جب یہ لوٹنے لگا تو اس نے ایک دھول اس کے رسید کی اور کہا کہ مردود اگر تو عاشق تھا تو غیروں پر کیوں نظر کی۔

محبت کی نشانی:

محبت تو وہ چیز ہے کہ اگر تمام دنیا بھی حسینوں سے بھر جائے تو یہ محبوب کو چھوڑ کر ادھر متوجہ نہ ہو' حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ اگر ایک مجلس میں حضرت

جنید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حاجی صاحب دونوں ہوں تو ہم حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی طرف توجہ بھی نہ کریں گے' ہاں حضرت حاجی صاحب ان کو دیکھیں' ان سے فیض حاصل کریں لیکن ہمیں ج کچھ حاصل کرنا ہوگا۔ ہم حاجی صاحب سے حاصل کریں گے سو محبت تو ایسی چیز ہے' یہ کیسی محبت ہے کہ دعوئی خدا کی محبت کا اور لڑکوں سے تعلق' یہ دونوں باتیں کس طرح جمع ہو سکتی ہیں' پھر لڑکوں سے تعلق عشق کی وجہ سے نہیں ہے' بلکہ پیٹ بھر کر روٹی ملتی ہے یہ اس کا فساد ہے' اگر چار دن کھانے کو نہ ملے تو سب عاشقی بھول جائیں' تو یہ نفس کی شرارت ہے عشق نہیں ہے' اور یہی وجہ ہے کہ یہ عشق انہی کو ہوتا ہے جن کو فرصت اور فراغت ہے ورنہ جو لوگ کسی کام میں مشغول ہیں ان کو کبھی ایسی شرارت نہیں سوجھتی' جیسے کاشتکار اور مزدور لوگ ہیں۔

اس واسطے اس کا علاج بھی یہی ہے کہ اپنے کو کسی ایسے کام پر لگادو جس میں کھپ جاؤ۔ اگر دین کا نہ ہو تو دنیا ہی کا کوئی جائز کام کرو' حکیموں نے بھی اس مرض کے متعلق یہی لکھا ہے کہ یعرض للبطالین ☆ کہ یہ مرض نٹھالی اور نکمے لوگوں کو ہوتا ہے۔

لڑکوں سے تعلق رکھنے کی برائی:

افسوس ہے خدا تعالیٰ نے فراغت اور فرصت اس لیے دی تھی کہ دین کا کام کریں مگر زیادہ ایسے ہی لوگ محروم رہے' فراغت اور فرصت خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے مگر افسوس ہے کہ ہم قدر نہیں کرتے اور اس بیکاری میں اپنے پیچھے یہ علتیں لگا لیتے ہیں' اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ میں نے بعض درویشوں کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ایک ایک لڑکا پلا ہوا ہے اور کہتے ہیں کہ ان کے حسن و جمال میں خدا کے حسن کا جلوہ ہے۔

شیخ سعدی نے لکھا ہے کہ بقراط حکیم نے ایک شخص کو ناچتے ہوئے دیکھا پوچھا اس کو کیا ہوا؟ معلوم ہوا کہ کسی خوبصورت لڑکے کو دیکھ کر بے خود ہوگیا کہ اس میں جلوۂ حق نظر آیا' کہنے لگا یہ کیا بات ہے کہ اس کو لڑکے کے اندر تو جلوۂ حق نظر آیا' میرے اندر کبھی نظر نہیں آیا۔ یہ تو بقراط کا قول ہے اس کا چاہے اعتبار کرو' لیکن شیخ سعدی کی بات کا تو اعتبار کرو گے' وہ اس سے آگے لکھتے ہیں۔

محقق ہماں بیند اندر ابل
کہ درخوبردیان چین وچگل

یعنی صاحب نظر اونٹ کے اندر بھی وہی جلوہ حق دیکھتا ہے جو حسینوں میں نظر آتا ہے۔

ایک بزرگ کے وجد کی حکایت:

ایک بزرگ تھے پنجاب میں ان کی بابت ایک دوست بیان کرتے تھے کہ ان کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی خوبصورت مکان دیکھتے تو وجد کرنے لگتے اور یہ حالت تھی کہ ان کے سامنے کوئی کواڑ نہ کھول سکتا تھا' اس کی آواز سے آپ کو حال آ جاتا تھا' اسی طرح پنکھے کی آواز سے بھی یہی کیفیت ہو جاتی تھی اس واسطے کوئی ان کو پنکھا نہ جھل سکتا تھا' تو ایسا شخص اگر کسی حسین آدمی کو بھی دیکھ کر وجد کرنے لگے تو یہ اس کی ایک حالت ہے' اور جس کی اور چیزوں میں تو جلوۂ حق نظر نہ آئے اور حسین لڑکوں میں جلوۂ حق نظر آئے تو یہ صرف بدمعاشی ہے اور یہ ایسا مرض ہے کہ ان درویشی کا دعویٰ کرنے والوں میں مدت سے چلا آتا ہے' مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ جو ساتویں صدی میں گزرے ہیں' ایسوں ہی کے حق میں فرماتے ہیں کہ ان پاجیوں کے نزدیک خیانت اور لواطت کا نام درویشی رہ گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بہت پرانا مرض ہے اور سب سے اول حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں پیدا ہوا تھا' شیطان نے ان لوگوں کی راہ ماری' حدیث میں ہے کہ قوم لوط علیہ السلام پر عذاب نازل ہوا کہ پانچ بستیوں کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بازو پر اٹھایا اور آسمان تک لے جا کر گرا دیا' یہ دکھلا دیا کہ تمہاری امت الٹی ہوگئی تھی اس لیے سزا بھی تمہیں الٹنے ہی کی دی گئی' غرض کہ اول تو اصل گناہ ہی کی اس وقت کثرت ہے' دوسرے اس لحظ سے کہ جو چیزیں اس کی ذریعہ اور وسیلہ ہیں وہ بھی اسی کے حکم اور ہیں جیسے لذت کے لیے باتیں کرنا' نظر کرنا' تو اس لحاظ سے شاید ہی کوئی اس گناہ سے بچا ہوا ہو۔

کسی عورت یا لڑکے سے گانا سننا بھی بدکاری میں داخل ہے:

اسی طرح اجنبی عورت یا بے داڑھی کے لڑکے سے گانا سننا یہ بھی ایک قسم کی بدکاری ہے اور تو اور اگر کسی لڑکے کی آواز سننے میں نفس کی شرکت ہو تو اس سے قرآن سننا بھی جائز نہیں' اکثر لوگ لڑکوں کو نعت کی غزلیں یاد کرا دیتے ہیں' یہ بھی جائز نہیں ہے' مسئلوں کی کتابوں میں یہاں تک لکھا ہے کہ اگر بے داڑھی مونچھ کا لڑکا خوبصورت ہو کہ اس کی طرف نفس کو رغبت ہوتی ہو' اس کی امامت بھی مکروہ ہے اور نابالغ کے پیچھے تو نماز ہی نہیں ہوتی' حالانکہ جب وہ امام بن کر کھڑا ہوگا تو قرآن ہی پڑھے گا' مگر بلا ضرورت اس کی بھی اجازت نہیں دی گئی تا کہ نفس کو اس کی طرف رغبت نہ ہو' دوسرے یہ بھی وجہ ہے کہ لڑکوں کا اعتبار ہی کیا عجب نہیں کہ وہ بے وضو ہی پڑھا دیں' مجھ سے خود ایک لڑکا کہتا تھا کہ میں نے بعض مرتبہ بے وضو نماز پڑھائی۔

ایک دوسرا واقعہ سنیے دو ۲ لڑکے نماز پڑھنے کھڑے ہوئے' ان میں ایک امام تھا دوسرا مقتدی' ایک نے دوسرے کے پیر میں گدگدی کر دی' خوب کہا ہے کسی نے کہ بچہ تو بچہ ہی ہے چاہے ولی کیوں نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ علماء نے خوبصورت لڑکے کی امامت کو ناجائز لکھا ہے' جو ان یا درمیانی عمر کی عورت کو مسجد میں آنے سے منع کیا ہے البتہ بوڑھی کے لیے ہمارے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تو نہیں لیکن اور اماموں نے اجازت دی ہے کہ اس میں فتنہ نہیں ہے مگر یہ انہوں نے اپنے زمانہ کی حالت دیکھ کر اجازت دی تھی' آج تو ایسی گندی طبیعتیں ہو گئی ہیں کہ اس کو بالکل ناجائز کہا جائے گا' اگرچہ بڑھیا ہی ہو۔

ایک بادشاہ کی حکایت:

ایک بادشاہ کی حکایت سنی ہے کہ اس کے سامنے سے ایک بیوہ عورت نکلی جو کہ بے انتہا بدصورت تھی اور ایسے برے کپڑوں میں کہ دیکھ کر گھن آتی مگر حمل سے تھی بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ پتہ چلاؤ کہ یہ حمل کس کا ہے اس عورت کی طرف کس کو رغبت ہوئی ہوگی'

وزیر تحقیقات کرتے کرتے پریشان ہوگیا' مگر پتہ نہ چلا' بادشاہ کی خفگی بڑھنے لگی' ایک روز وزیر اس پریشانی میں کسی سڑک پر گزر رہا تھا کہ ایک شخص کو جو نہایت تکلف کا لباس پہنے ہوئے ہے دیکھا' کہ ایک گندہ پرنالے کے نیچے جس میں پیشاب وغیرہ کرتا تھا ایک دوات لیے ہوئے کھڑا اس میں پانی ڈال رہا ہے' بڑی حیرت ہوئی اور اس کو پکڑ لیا' پوچھ گچھ کرنے سے معلوم ہوا کہ ان ہی صاحب کا اس عورت کو حمل تھا' پس اس زمانہ میں بڑھیوں کو بھی اجازت دینے کی گنجائش نہیں رہی' سب ہی کو روکنا چاہیے۔

غرض کہ جب دین کے پیشواؤں نے شہوت کے ساتھ قرآن سننا بھی گوارا نہیں کیا تو غزلیات پڑھانے سننے کی اجازت کب ہوسکتی ہے' افسوس ہے کہ شرع سے بے پروائی کی وجہ سے اب ان باتوں کا ذرا خیال نہیں کیا جاتا۔

واعظ کو عورتوں کے مجمع میں خوش آوازی سے شعر نہیں پڑھنے چاہئیں:

بہت سے واعظ ہیں جہاں عورتیں جمع ہوتی ہیں خوش آوازی سے شعر پڑھتے ہیں یہ بالکل ہی دین کی مصلحت کے خلاف ہے' میں' خدا کا شکر کرتا ہے جہاں عورتیں ہوتی ہیں بہت زیادہ اس کا خیال رکھتا ہوں' حضور ﷺ نے ایک مرتبہ سفر میں ایک غلام کو عورتوں کے سامنے شعر پڑھنے سے روک دیا' حالانکہ وہ اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے پڑھتا تھا' اور فرمایا کہ رُوَيْدَكَ يَا اَنْجَشَةُ لَاتَكْسِرِ الْقَوَارِيْرَ" "اے انجشہ رہنے دے شیشوں کو مت توڑے ڈال۔" شیشوں سے مراد عورتیں ہیں' مطلب یہ کہ عورتوں کا دل بہت نرم ہوتا ہے ایسا نہ ہو کہ خوش آواز سے ان کے دل میں کوئی فساد آجائے' تو جب ان زمانہ میں کہ سب پر دینداری کا غلبہ تھا' حضور ﷺ نے اس کی حازت نہیں دی تو آج کس کو اجازت ہو سکتی ہے' خاص کر کہ جب خود عورتیں اور لڑکے ہی پڑھنے والے ہوں۔

بدکاری گناہ کا خاص سبب ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ اس گناہ کو طاعون میں خاص دخل ہے اور اس کی وجہ سے طاعون زیادہ ہوتا ہے' باقی ناراضی تو ہر گناہ سے ہوتی ہے اور یہ گناہ ہی اصلی سبب ہیں طاعون کا تو

جہاں طاعون آیا ہو سمجھ لیجیے کہ اس سبب کی وجہ سے آیا ہے اب دوسری جگہ کے طاعون کی خبر سن کر اور اس کو سبب معلوم کر کے یہ دیکھئے کہ وہ سبب ہمارے اندر ہے یا نہیں' اگر ہے تو اس کو چھوڑنا چاہیے' یہ معنی ہیں دوسروں سے عبرت حاصل کرنے کے' پس دوسروں میں طاعون کو دیکھ کر ان سے عبرت پکڑو اور گناہوں سے توبہ کرو۔

ہر مصیبت کو گناہ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اور اس سے عبرت پکڑنا چاہیے!

اور کچھ طاعون کی خصوصیت نہیں بلکہ جو مصیبت بھی آئے اس کو کسی گناہ کا نتیجہ سمجھا کرو اور جب کسی کو مصیبت میں دیکھو اس سے عبرت حاصل کیا کرو۔

کسی کے مر جانے سے بھی عبرت حاصل کرنی چاہیے:

اسی طرح جب کوئی مر جائے تو سوچو کہ ہمارے لیے بھی یہ دن آنے والا ہے' مگر اس وقت کچھ ایسی غفلت بڑھ گئی ہے کہ مردے کو دیکھ کر بھی ہماری حالت ذرا نہیں بدلتی' میں خود اپنی حالت میں کرتا ہوں کہ اول اول تو مردے کو دیکھ کر ایک عبرت سی ہوتی تھی مگر اب تو عادت سی ہو گئی ہے' حالانکہ آخرت کی یاد کا شرع نے یہاں تک انتظام کیا ہے کہ جب گھوڑے پر سوار ہو تو حکم ہے کہ یہ آیت پڑھو سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ ☆ یعنی خدا کا فضل ہے کہ اس نے اس جانور کو ہمارے لیے تابعدار اور ہموار بنا دیا ورنہ اس کا تابع کرنا ہماری طاقت سے باہر تھا اور ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

تو اول خدا تعالیٰ کی نعمت کا شکر ہے اور پھر ان کے پاس لوٹنے کا ذکر ہے ظاہر میں ان دونوں باتوں کے اندر کچھ جوڑ نہیں معلوم ہوتا' مگر غور سے دیکھو تو یہ اس طرف اشارہ ہے اے انسانو! تم اس جانور پر سوار ہونے کے وقت ایک دوسری سواری کو بھی یاد کرو اور سمجھ لو کہ تمہیں کسی دن تختہ اور چارپائی پر بھی سوار ہونا ہے' جس میں تم کو رکھ کر چار آدمی لے جائیں گے اور اصلی سواری وہی ہے۔ جس پر سوار کر کے تم کو خدا کے ہاں پہنچا دیں گے تو جب جانور پر سواری لیتے وقت بھی اس کے یاد کرنے کا حکم ہے تو مردے کو دیکھ کر تو یاد

کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا' اس وقت بھی یاد نہ کرنا بڑی سخت دلی کی بات ہے۔

غفلت اور سخت دلی کا عام ہونا:

اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ قبر پر بیٹھے ہیں اور مقدمے کی باتوں میں مشغول ہیں اسی طرح اگر کسی کو مصیبت میں دیکھتے ہیں تو اس سے اپنے لیے خوف نہیں کرتے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسی تک رہے گی' حالانکہ سمجھنا چاہیے کہ اس پر یہ مصیبت کیوں آئی' ظاہر ہے کہ گناہوں کی وجہ سے آئی' تو ہم کو بھی گناہوں سے بچنا چاہیے۔

جب مصیبت زدہ کو دیکھیں تو کیا کہنا چاہیے:

اسی لیے حدیث میں ہے کہ جس کسی کو مصیبت میں پھنسا ہوا دیکھو تو کہہ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا یعنی خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اس مرض سے بچائے رکھا جس میں تجھ کو گرفتار کیا ہے' تو اس میں بھی اس طرف توجہ دلائی ہے کہ سبب مصیبت کا گناہ ہے اور اس گناہ کی وجہ سے تمہارا پکڑا جانا بھی قریب تھا اس پر شکر کرو کہ تمہیں نہیں پکڑا' لیکن یہ دعا آہستہ پڑھے کہ مصیبت زدہ کی دل شکنی نہ ہو' جیسا کہ دوسری حدیث میں فرماتے ہیں کہ اپنے بھائی کی مصیبت پر خوشی نہ ظاہر کرو' بعض لوگ دوسرے کی مصیبت کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں حالانکہ ان کو ڈرنا چاہیے کیونکہ مصیبت کا سبب تو ہم میں بھی موجود ہے' ہمارے گناہ کیا کم ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم خود بھی مصیبت میں پھنس جائیں' بعض لوگ وہ ہیں کہ دوسرے کی مصیبت پر افسوس تو کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی طعن بھی کر دیتے ہیں کہ یہ اسی قابل تھا۔

اس کی بابت حدیث میں ہے کہ دوسروں کی مصیبت پر ہنسو مت' ورنہ اس کے بدلہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مانگنے والا تمہارے دروازے پر آئے تو اسی شکر میں سے اسے دے دو کہ تم مانگنے نہیں گئے' اسی طرح مصیبت زدہ کو دیکھ کر شکر اسی وجہ سے کرو کہ شاید ہم اپنے ہی گناہوں کے سبب اس حالت کو پہنچ جاتے۔

ایک عجیب حکایت عبرتناک:

اسی قسم کی ایک عجیب حکایت بوستاں میں لکھی ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کے پاس بیٹھا کھانا کھا رہا تھا' اس وقت ایک فقیر مانگنے آیا' اس نے فقیر کو جھڑک دیا' اتفاق سے کچھ ایسی حالت پلٹی کہ یہ شخص بالکل تباہ اور برباد ہو گیا' یہاں تک کہ جب بیوی کو روٹی کپڑا نہ دے سکا تو اس کو بھی طلاق دے دی اور اس نے کسی اور مالدار سے نکاح کر لیا' اتفاق سے اس مالدار کے دروازے پر کوئی شخص مانگنے آیا اس شخص نے بیوی کو کہا کہ اس کو بھیک دے آؤ' یہ جو دروازے پر گئی تو وہاں سے روتی ہوئی لوٹی' شوہر نے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ فقیر میرا پہلا شوہر تھا، پہلے یہ بہت مالدار تھا مگر ایک مرتبہ اس نے ایک فقیر کو سوال کرنے پر جھڑک دیا تھا اس وقت یہ تباہ ہو گیا اور اس حال کو پہنچ گیا' اس دوسرے شوہر نے کہا کہ وہ فقیر جیسے اس نے جھڑکا تھا میں ہی ہوں' خدا تعالیٰ نے اسی کا یہ بدل دیا کہ اس سے چھین کر مجھ کو مال بھی دیا اور اس کو بیوی بھی دے دی' تو خدا تعالیٰ کی بڑی قدرت ہے۔

پس دوسروں سے عبرت حاصل کرو اور عبرت میں یہ بھی داخل ہے کہ جس کو کسی مصیبت میں دیکھو' ڈرو' شرع نے ہر جگہ ہم کو یہ بات یاد دلائی ہے مگر ہم بے فکر ہیں۔

ہماری غفلت ظاہری اسباب پر نظر ہونے کی وجہ سے ہے:

وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو گناہ سے جو اس کا سبب ہے بری سمجھتے ہیں اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو طاعون یا اور کوئی مصیبت کس طرح آ سکتی ہے' ہمارے پاس تو تعویذ گنڈے موجود ہیں۔

تقدیر کے مقابلہ میں اسباب ظاہری کوئی چیز نہیں:

صاحبو! جس وقت کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو تعویذ گنڈے وغیرہ سب بے کار ہو جاتے ہیں' یہ چیزیں ان کے حکم کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں' قرآن میں فرماتے ہیں کہ اے عیسائیو! بتلاؤ کہ کس کو قدرت ہے کہ وہ خدا کے مقابلہ میں آ سکے اگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں اور تمام مخلوق کو ہلاک کرنا چاہے' کیا انتہا ہے قدرت کا کہ کوئی بھی

اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا' وہ جس پر جو چاہے تصرف کرے' جب یہ ہے تو یہ فقیر درویش جن کے تعویذ گنڈوں پر آپ کو ناز ہے وہ تو کیا چیز ہیں پس ان کے تعویذوں پر ناز اور بھروسہ کرنا سب بے جا ہے۔

طاعون وغیرہ کی صحیح تدبیر:

البتہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ خدا کو راضی رکھو۔ اور ان کے حکموں پر عمل کرو' خاص کر نمازیں بہت جلد شروع کردو' میں یہ نہیں کہتا کہ نماز پڑھنے سے کوئی مرے گا نہیں' مرے گا تو ضرور لیکن اطاعت کا فائدہ یہ ہوگا کہ مصیبت میں پریشانی نہ ہوگی۔

جواب اس شبہ کا کہ جب مطیع پر بھی مصیبت آتی ہے تو اطاعت سے کیا فائدہ:

یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بعض کو یہ شبہ ہوا کرتا ہے کہ مصیبت کے نازل ہونے کا اصلی سبب تو گنہگار ہیں مگر مصیبت آتی ہے سب پر تو پھر اطاعت بے کار ہے اس سے کیا فائدہ؟ تو اب یہ شبہ جاتا رہا کیونکہ اطاعت سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص مصیبت میں پریشان نہیں ہوتا' اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ اگر ماں کی گود میں ہو تو اس کو کسی بات کی پریشانی نہیں ہوتی۔

مطیع مصیبت سے پریشان نہیں ہوتا معہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکایت:

تو خدا تعالیٰ ہمارے رب اور مالک ہیں پس اطاعت کی وجہ سے جس قدر ان سے نزدیکی زیادہ ہوگی' اسی قدر زیادہ اطمینان ہوگا' خواہ کیسی ہی مصیبت ہو جیسا کہ بچہ کو ماں کے پاس اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا تھا' کہ جب آسمان کمان ہو اور دنیا کی مصیبتیں تیر ہوں اور خدا تعالیٰ نشانہ لگانے والے ہوں تو آدمی کہاں جا کر بچے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر چلانے والے کے پاس جا کھڑا ہو' کیونکہ تیر دور والے پر چلاتے ہیں' کہنے لگا کہ بیشک آپ نبی ہیں' ایسا علم نبیوں ہی کا حصہ ہے تو خدا تعالیٰ کی نزدیکی جب ہوگی' تو حقیقت میں جس کا نام مصیبت ہے وہ نہیں آ سکتی یعنی

تکلیف نہ ہوگی، چاہے صورت مصیبت کی ہو، مگر دل میں وہ بالکل خوش ہوگا۔

ایک بزرگ کا حکایت:

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میری توبہ کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ قحط کے زمانہ میں میں نے ایک غلام کو دیکھا کہ نہایت ہی خوش ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ دنیا میں تو قحط ہے اور تو ایسا خوش ہے کہنے لگا کہ میں فلاں شخص کا غلام ہوں، میرا کھانا کپڑا اس کے ذمہ ہے اور اس کے پاس ایک گاؤں ہے اس سے آمدنی آجاتی ہے وہ اس میں سے مجھے دونوں وقت کھانے کو دیتا ہے اس لیے میں بالکل بےفکر ہوں، یہ سنکر ان کے دل پر ایک چوٹ لگی کہ تیرے مالک کے پاس تو زمین و آسمان کے خزانے ہیں اور پھر تو اس قدر فکر مند ہے تو واقعی جب خدا سے نزدیکی بڑھ جاتی ہے تو بےفکری ہو جاتی ہے، دیکھیے معمولی سے مالدار کے ساتھ تعلق ہو جانے سے کیسی بےفکری ہو جاتی ہے، تو جو تمام خزانوں کا مالک ہے اس کے ساتھ تعلق رکھنے سے بےفکری کس طرح نہ ہو۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کو دیکھا کہ بھاگ رہے ہیں پوچھا کیوں بھاگ رہے ہو، لوگوں نے کہا طاعون سے بھاگ رہے ہیں آپ نے فرمایا کہ اے طاعون! تو میرے پاس آجا اور مجھے میرے مولا سے ملا، یہ دعا کرنی تھی کہ آپ کو طاعون ہو گیا اور اس میں آپ کا انتقال ہو گیا، جب خدا سے تعلق ہوتا ہے تو یہی حالت ہوتی ہے کہ دوست کی طرف سے بلا بھی اچھی معلوم ہوتی ہے اسی کو عراقی کہتے کہ تیری تلوار سے ہلاک ہونا دشمن کو نصیب نہ ہو، جب دوستوں کا سر حاضر ہے تو اس پر مشق کیجئے، بےقدر دشمن پر یہ عنایت کیوں کی جائے، تو اطاعت والوں کا یہ حال ہوتا ہے اور جو نافرمان ہیں وہ ہر حال میں پریشان رہتے ہیں، زندگی میں بھی اور مرنے کے وقت بھی۔

ایک حکایت یاد آئی، دیکھئے اطاعت والوں کا یہ حال ہوتا ہے، تھانہ بھون ہی میں ایک طالب علم تھے جن کی اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی چونکہ کئی طالب علم طاعون میں مرچکے تھے اس وجہ سے وطن جانے کا ان کا ارادہ تھا، اسی میں ان کو بھی طاعون ہو گیا، دوسرے

ے شعران کا یہ ہے: نشود نصیب دشمن شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی ۱۲ منہ

طالبعلموں کو خیال ہوا کہ اس کو بہت پریشانی ہوگی' کیونکہ یہ گھر جانے والے تھے' کہ یکایک بیمار ہو گئے اس لیے تسلی دینے کو کہنے لگے کہ تم گھبراؤ نہیں خدا چاہے گا تو اچھے ہو جاؤ گے کہنے لگے کہ یوں مت کہو اب تو یہ دعا کرو کہ خدا تعالیٰ خیریت سے اپنے پاس بلالیں' اب تو اللہ میاں سے ملنے کو جی چاہتا ہے' ایمان پر خاتمہ کی آرزو ہے۔

ایک اور حکایت سنیے! میرے ایک دوست تھے مولوی احمد علی' وہ گورکھپور میں مدرس تھے ان کی بیوی کو وہاں طاعون ہو گیا' یہ اس کے علاج کے لیے قنوج اس کے میکے میں لائے وہ اچھی ہوگئی اور انہیں خود طاعون ہو گیا ایک روز اسی حالت میں لیٹے ہوئے تھے اچانک اٹھ کر پائنتی کی طرف بیٹھ گئے اور کسی کو سرہانے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر یہ کہا کہ چلنے کے واسطے حاضر ہوں مگر ابھی وقت نہیں آیا' بارہ بجے کا وعدہ ہے اس وقت چلوں گا' لوگوں نے سمجھا کہ دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے ویسے ہی بڑ بڑا رہے ہیں' مگر جو کچھ کہہ رہے تھے اس کے موافق ٹھیک بارہ بجے روح نکلی۔

حضرت! یہ سب اطاعت کی برکت ہے' اطاعت کرنے والوں کے تو پاس بھی پریشانی نہیں آتی' پس ایک تو اطاعت میں یہ فائدہ ہے' دوسرے یہ کہ طاعون ان کے لیے رحمت ہے اور رحمت ہی کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہے کہ پریشانی نہیں ہوتی' پس اطاعت کرنے والوں کو چاہیے' طاعون ہی کیوں نہ ہو' مگر یہ دولتیں کیا تھوڑی ہیں جن سے گنہگار محروم ہیں۔

غرض اطاعت سے اول تو بلائیں نہ آئیں گی اور اگر کسی مصلحت سے آ بھی گئیں تو پریشانی سے بچیں گے یہ جواب ہو گیا شبہ کا۔

وعظ کا خلاصہ:

اب میں اصل مقصود کا خلاصہ بھی دہراتا ہوں کہ اس حدیث اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَیْرِہٖ سے مقصود یہ ہے کہ دوسرے کی مصیبت دیکھ کر اس گناہ سے بچو' جس کی وجہ سے اس پر مصیبت آئی' بس اب ختم کرتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ عمل کی توفیق دے۔

(امین) مِلَّتَتْ بِالْخَیْرِ وَبِکَ نَسْتَعِیْنُ

(۴۳) علم کی طلب

منتخب از وعظ پنجم ملقب بہ طلب العلم حصہ چہارم

دعوات عبدیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خطبہ ماثورہ:

اَمَّا بَعْدُ!

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ طَالِبُ الْعِلْمِ طَالِبُ الدُّنْيَا

ترجمہ: ''دو حریص ہیں کہ ان کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا' علم کے طالب کا اور دنیا کے طالب کا۔'' یہ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ اس وقت پڑھے گئے۔

اس میں حضور ﷺ نے ایک نہایت سچا واقعہ جس کا نتیجہ عجیب وغریب ہے بیان فرمایا ہے' اور اس سے ایک ضروری بات کی طرف توجہ دلائی ہے مگر باوجود ضروری ہونے کے ہم کو اس سے غفلت بھی ہے۔

بیان کی ضرورت:

اسی وجہ سے میں نے اس وقت بیان کے لیے اس کو اختیار کیا کہ بات ضروری ہے اور بڑے کام کی' مگر لوگ اس سے غافل ہیں' پھر اس سے زیادہ ضرورت اور کیا ہوگی' چنانچہ بیان سے اس کا ضروری اور مفید ہونا اور اس سے ہمارا غافل ہونا معلوم ہو جائے گا' اور انہی دونوں باتوں کے بتلانے کی ضرورت بھی ہے' کیونکہ جو بات مفید ہو اول تو اس پر اطلاع ہونی چاہیے' پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے متعلق ہماری حالت کیا ہے اور ہونی کیا چاہیے۔

حدیث کی شرح

ترجمہ حدیث کا یہ ہے کہ دو حریصوں کا پیٹ نہیں بھرتا طالب علم کا اور طالب دنیا کا' حرص کا خاصہ یہ ہے کہ جس قدر چیز بڑھتی جائے اسی قدر اس کی طلب بڑھتی جائے' پس اس میں دو حریصوں کی نسبت حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ان کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا' ایک طالب علم کا' دوسرے طالب دنیا کا۔

شریعت کی نظر میں علم صرف دین کا علم ہے نہ دنیا کا

یہاں علم سے مراد دین کا علم ہے کیونکہ شریعت نے علم اسی کو قرار دیا ہے' رہا دنیا کا علم تو شریعت کی نظر میں علم نہیں' ہاں اگر وہ دین کا ذریعہ ہو جائے تو تابع ہو کر علم دین میں داخل ہو جائے گا' ورنہ نہیں' اس کی مثال ایسی سمجھو کہ لکڑی کھانے کی چیز نہیں ہے اور وہ کھائی نہیں جاتی' لیکن چونکہ ذریعہ ہے کھانا تیار ہونے کا اس لیے اس کو بھی کھانے کے حساب میں شمار کرتے ہیں۔

دیکھیے جب کھانے کا حساب ہوتا ہے تو یہ بھی حساب ہوتا ہے کہ ایک روپیہ مہینے کی لکڑیاں صرف ہوئیں اور کھانا سب خرچ ملا کر پانچ روپے میں پڑا' اب اگر کوئی کہے کہ کیا لکڑیاں بھی کھاتے ہو جو اسے کھانے کے حساب میں شمار کرتے ہو تو اس اعتراض کرنے والے کو سب لوگ دیوانہ بتلائیں گے اور رجواب دیں گے کہ جو چیز ذریعہ ہو کسی مقصود کا وہ تابع ہو کر مقصود ہی میں شمار ہوتی ہے' اس وجہ سے لکڑیاں بھی کھانے میں شمار ہوئیں' کیونکہ وہ اس کا ذریعہ ہیں' اسی طرح دنیا کا علم اگر ذریعہ ہو دین کا تو اس کو بھی اس میں داخل کر دیں گے' لیکن اصل علم دین ہی ہے اور جو علم دین کا نہ ہو اور نہ اس کا ذریعہ ہو وہ علم نہیں بلکہ جہالت ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے۔

"عملے کہ راہ بحق نہ نماید جہالت است"

"یعنی جو علم تجھ کو خدا تک نہ پہنچادے جہالت ہے۔"

اس وقت ہندوستان کے عرف میں دنیا کے ہنر کو بھی علم کہا جاتا ہے' مگر شریعت کی نظر میں وہ علم نہیں اور یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ دنیا والوں کی نظر میں بہت سے علم علم سمجھے جاتے' جیسے غلاظت اٹھانا اور جوتہ گانٹھنا کوئی عزت دار آدمی اس کو علم نہ شمار کرے گا حالانکہ وہ بھی ایک ہنر ہے مگر حقیر ہونے کی وجہ سے اس کو علم کی فہرست سے نکال دیا گیا' تو معلوم ہوا کہ اس پر سب عقلندوں کا اتفاق ہے کہ علم وہ ہے جس میں کوئی وجہ شرف کی بھی ہو تو شرع کی نظر میں چونکہ علم دین کے سوا دوسرے علموں کے اندر کوئی شرف کی بھی ہو تو شرع کی نظر میں چونکہ علم دین کے سوا دوسرے علموں کے اندر کوئی شرف نہیں اس واسطے ان کو علم نہیں شمار کیا' پس اس بات پر تعصب کا الزام نہیں لگ سکتا کیونکہ جو جواب آپ مہتر کے علم کو علم نہ کہنے میں دیں گے وہی جواب شریعت کی طرف سے آپ کو ملے گا۔

غرض یہ کہ حدیث کے اندر علم سے مراد علم دین ہے تو حضور فرماتے ہیں کہ ان دو شخصوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا ایک علم دین کا طالب دوسرا دنیا کا طالب۔

حدیث کا مقصود کیا ہے:

یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہر شخص کے دیکھنے میں آتا ہے مگر مقصود صرف واقعہ کا بیان کرنا اور خبر دینا نہیں ہے' کیونکہ یہ تو ایک فضول بات ہے اور حضور ﷺ کی یہ شان نہیں کہ فضول باتوں کو بیان کریں بلکہ میں غور کرتا ہوں تو عام طور پر دیکھتا ہوں کہ جتنی خبریں حضور ﷺ کے کلام میں ہیں ان سے خبر دینا مقصود نہیں ہے بلکہ کوئی حکم مقصود ہوتا ہے' خواہ عقیدہ کے متعلق ہو یا عمل کے' پس حدیث وقرآن میں جب کوئی خبر دیکھی جائے' سمجھ لیا جائے کہ مقصود اس سے کوئی حکم ہے یہاں تک کہ...... قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کے اندر جو یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ ایک ہے اس سے بھی مقصود یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھو کہ اللہ ایک ہے' حضور ﷺ روحانی حکیم ہیں' آپ ہمارا علاج کرتے ہیں اور حکیم کا کسی سے یہ کہنا کہ تم کو تپ دق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کا علاج بہت جلد کرو' اسی طرح حضور ﷺ جہاں کوئی خبر بیان کرتے ہیں تو اس میں یا تو آپ ﷺ نے کسی دوا کی خاصیت بیان کی ہے یا مرض کی خبر دی ہے اور دونوں سے مقصود یہی حکم ہے کہ اپنا علاج کرو۔ پس ہر عقلمند پر ضروری

ہے کہ ہر خبر کے اندر حکم کا پتہ چلا لے' سو اس حدیث میں بھی ایک حکم مراد ہے اور وہ یہ کہ دنیا کی حرص چونکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہے اس لیے اس کو چھوڑ دو اور علم دین چونکہ ان کے نزدیک بہت پسند ہے اس لیے اس کو طلب کرو' یہ تو خلاصہ تھا۔

دنیا کے طالب کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا:

اب پورا بیان سنئے کہ دنیا کی نسبت تو سب ہی کو معلوم ہے کہ جب اس کی طلب ہوتی ہے تو واقعی ہرگز پیٹ نہیں بھرتا اور حدیث میں بھی ہے کہ اگر آدمی کے پاس دو نالے مال کے ہوں تو یہ چاہے گا کہ تیسرا اور ہو اور دو نالوں کے ہونے سے یا تو یہ مراد ہے کہ خود چاندی سونے کا نالہ بہنے لگے یا یہ مراد ہے کہ جتنی بڑی زمین میں نالے ہوا کرتے ہیں' اتنی بڑی جگہ میں مال بھرا ہو' اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ آدمی کا پیٹ کوئی چیز نہیں بھرتی سوائے قبر کی خاک کے۔

مطلب یہ ہے کہ جب تک زندہ رہتا ہے کسی طرح آدمی کا دنیا سے پیٹ نہیں بھرتا' یہ تو حدیث کا مضمون تھا' بزرگوں نے اور حکماء نے بھی ایسا ہی کہا ہے اور یہ نظر بھی آ رہا ہے خاص کر اس زمانہ میں کہ آج کل تو لوگ تعلیم بھی دیتے ہیں حرص دینا کی' جس کا نام ترقی رکھتا ہے' کہتے ہیں کہ دنیا کی ترقی کرو اور تھوڑے پر کفایت نہ کرو۔

ترقی دنیا کی منع نہیں لیکن مقصود بنانا منع ہے:

میں دنیا کی ترقی کو منع نہیں کرتا مگر دنیا کو قبلہ توجہ اور مقصود اصلی بنانے سے روکتا ہوں' دنیا کا حاصل کرنا منع نہیں ہے لیکن دنیا کی حرص منع ہے' حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ حلال کا حاصل کرنا فرض ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ دنیا کی محبت جڑ ہے ہر گناہ کی' تو کمانا دنیا کا دنیا نہیں اور محبت طلب دنیا کی دنیا ہے' جہاں یہ پیدا ہو جاتی ہے تو حرص غالب ہو جاتی ہے اور ضرورت کی مقدار پر کفایت نہیں رہتی اور یہی خدا کے نزدیک ناپسند بھی ہے اور اس کی خرابیاں بھی ظاہر ہیں اور نظر آ رہی ہیں۔

علم کا طالب بھی علم سے سیر نہیں ہوتا:

اسی طرح علم کی طلب میں علم والوں کی حالت ہے' چنانچہ ان کو دیکھ لیجیے کہ اس سے کبھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا' کتنا ہی بڑے سے بڑا عالم ہو ہمیشہ کسی نہ کسی مسئلہ کی تلاش میں رہتا ہے اور جو کچھ حاصل ہوتا ہے کبھی اس پر کفایت نہیں کرتا اور جب تلاش سے معلوم ہو جاتا ہے تو اس کو بڑا مزہ آتا ہے' خلاصہ یہ کہ نہ دنیا کے طالب کا پیٹ بھرتا ہے اور نہ علم کے طالب کا۔ اور یہ بالکل واقعہ ہے اور آنکھوں سے نظر آ رہا ہے' پس جب یہ ایسی ظاہر بات ہے اور ہر شخص اس کو جنتا ہے' تو اس کا خبر دینا فضول بات ہے اور حضور ﷺ کا کلام اس سے پاک ہے' پس معلوم ہوا کہ مقصود اس خبر دینے سے کچھ اور ہے اور وہ یہی ہے کہ ایک حرص کے چھوڑنے کا حکم ہے اور ایک حرص کے اختیار کرنے کا حکم ہے اور اس حدیث میں ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ حضور ﷺ نے دنیا کی طلب اور علم کی طلب کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں جس کو دنیا کی طلب نہیں ہوسکتی۔

اور دوسری حدیث میں ہے کہ علم کی طلب ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے تو اب دونوں حدیثوں کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلا کہ علم...... کی طلب میں تو کمی نہ کرنی چاہیے' کیونکہ وہ فرض ہے اور چونکہ دنیا کی طلب اس کی ضد ہے اور اس کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی اس لیے دنیا کی طلب نہ چاہیے' پس حضور ﷺ نے آگاہ کر دیا کہ اصلی کام مسلمان کا علم دین کا طلب کرنا ہے نہ دنیا کا اور اس سے ان کی غلطی ظاہر ہوئی' جو علم دین کو چھوڑ کر دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

دنیا کمانا طلب دین کے خلاف نہیں:

میں پھر کہتا ہوں کہ میں دنیا کمانے کو منع نہیں کرتا۔ بلکہ حرص اور طلب سے منع کر رہا ہوں' دنیا کمانا وہ ہے جس میں دنیا کا نقصان نہ ہو اور اس کی طلب یہ ہے کہ دین مغلوب یا گم ہو جائے' تو اصل مقصود علم دین ہونا چاہیے' اور دنیا کا علم ہو تو دین ہی کا ذریعہ بنا کر ہو' دیکھو جب ایک شخص گھوڑے کی خدمت کرتا ہے تو اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ سواری یا سفر

کے کام آئے' اب اگر کوئی شخص ہمیشہ گھوڑے کو کھلائے پلائے اور اس سے کبھی کام نہ لے تو سب اس کو بے وقوف کہیں گے' غرض گھوڑے کی خدمت منع نہیں' مگر جب اس قدر اس کی خدمت اور آرام کا خیال ہو کہ اصل مقصود ہی فوت ہو جائے اور گھوڑا ہی مطلوب بن جائے تو اسے روکا جائے گا' اور اصل مقصود کے حاصل کرنے کا حکم دیا جائے گا' اسی طرح دنیا کا حاصل کرنا اس درجہ میں کہ اس سے اصل مقصود میں جو کہ دین ہے خلل نہ آئے' کوئی گناہ نہیں' اسی کو حدیث میں اس طرح فرمایا کہ حلال کا کمانا بھی فرض ہے بعد اور فرضوں کے' اور اس کو جو بعد میں اور فرضوں کے کہا تو عجب نہیں کہ اسی اشارہ کے لیے ہو کہ یہ تابع ہے دین کا اور اصل مقصود علم دین کی طلب ہے۔

آجکل طلب علم کی کوشش نہیں:

مگر اس وقت مسلمان بڑی غلطی میں پڑے ہیں کہ علم دین کی طلب میں کم مشغول ہیں اور دنیا میں بہت زیادہ مشغول ہیں' بعض کی تو یہ کیفیت ہے کہ مہینوں بھی ان کو کسی مسئلہ کے دریافت کرنے کی نوبت نہیں آتی' کیا ان لوگوں کو کبھی ضرورت نہیں ہوتی یا کبھی کوئی شبہ نہیں پڑتا' بات یہ ہے کہ ایک تو دین سے بے پروائی ہے دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے بہت سے کاموں کو دین سے الگ کر رکھا ہے ان کو دین ہی نہیں سمجھتے۔

معاملات اور اخلاق اور رہنے سہنے کے طریقے بھی دین کے جزو ہیں:

جیسے آپس کے معاملات خریدنے بیچنے وغیرہ کے یا رہنے سہنے کے طریقے اور ملنے جلنے کے طریقے قاعدے یا اچھی بری خصلتیں جیسے صبر وشکر، کینہ وحسد ان سب کو لوگوں نے دین سے باہر سمجھ رکھا ہے، بہت کم لوگ ہیں جو جائداد خرید کر یا بیچ کر کسی مولوی کو اس کا مسودہ دکھلاتے ہوں کہ کوئی بات اس میں خلاف شریعت تو نہیں بس یوں سمجھ رکھا ہے کہ اس کو دین سے کیا واسطہ۔

صاحبو! دین خدا تعالیٰ کا ایک قانون ہے اور قانون ہے اور قانون ہر چیز کے متعلق ہوتا ہے آپ حکومت کے قانون کو دیکھ لیجیے' کیا حکومت میں معاملات کے لیے کوئی قانون

مقرر نہیں یا قانون پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں اگر ایسا ہے تو بلا لائسنس کے افیون بیچنے کی بھی ہمت کیجئے اگر کوئی ایسا کرے تو کیا قانون کی پکڑ اس پر نہ ہوگی کیا وہاں بھی آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو قانون سے کیا واسطہ وہاں کیا عذر چل سکے گا' ہرگز نہیں' بلکہ کہا جائے گا کہ حاکم کو ہر بات میں دخل دینے کا حق ہے تم رعایا ہو اور گورنمنٹ حاکم ہے اور حاکم کو اختیار ہے جو قانون جس طرح چاہے مقرر کرے' خواہ کسی کو گوارہ ہو یا ناگوار ہو' اور راز اس میں یہ ہے کہ حاکم قانون کے اندر عام مصلحت پر نظر کرتا ہے نہ خاص کی مصلحت پر، اگر کسی قانون میں اکثر کا فائدہ ہو تو اس کے مقابلہ میں خاص خاص شخصوں کے نقصان کی پرواہ نہیں کرتا اسی طرح بعض قانون چاہے خاص خاص لوگوں کو ناگوار ہوں مگر اکثر لوگوں کے لیے بے حد مفید ہوتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ باوجود ناگواری کے بھی حاکم کو صاحب اختیار اور صاحب انصاف سمجھا جاتا ہے' اسی طرح خدا تعالیٰ کے قانون کو بھی سمجھنا چاہیے تعجب ہے کہ دنیا کے حاکم کو تو یہ اختیار ہو' جو صرف نام کے حاکم ہیں اور آپ اس کے قانون کی ضرورت اور مصلحت کا بھی اقرار کریں' لیکن خدا تعالیٰ جو اصلی حاکم ہے' اس کے لیے اس کا اختیار نہ سمجھا جائے اور اس کے قانون کی ضرورت کا اقرار نہ کیا جائے خواہ عقیدہ ایسا ہو یا نہ ہو' لیکن عمل یہی ظاہر کرتا ہے کہ ہم اس کے لیے قانون مقرر کرنے کا حق نہیں سمجھتے۔

ہر کام کے لیے شرع کا قانون موجود ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے:

یاد رکھو ہم کو ہر کام میں شریعت کے قانون پر عمل کرنا ضروری ہے ہم کسی کام میں بالکل آزاد نہیں' اب جو لوگ اپنے کو آزاد سمجھتے ہیں تو یہ خیال ان کا اس وجہ سے ہے کہ وہ دین کا علم نہیں رکھتے۔

شرع میں تنگی نہیں:

اور پوچھتے اس لیے نہیں کہ عام طور پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ شریعت میں تو ہر بات ناجائز ہے پوچھ کر کون مصیبت میں پڑے کیونکہ دریافت کرنے سے یہی جواب ملے گا کہ ناجائز ہے اور یہ بڑی بھاری غلطی ہے' کیونکہ شریعت کو لوگوں سے ضد نہیں بلکہ اس میں جائز

باتیں بھی بہت سی ملیں گی ہاں اگر چھانٹ چھانٹ کر ایسے ہی معاملات پوچھو گے جو ناجائز ہوں تو ان کے جواب میں ناجائز کہنا ہی پڑے گا' جیسے حکیم سے کوئی بیمار کھانے کی خواہش ظاہر کرے اور سب ایسی غذاؤں کے نام لے جو نقصان دینے والی ہوں تو حکیم ہر ایک سے منع ہی کرے گا' اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس حکیم کے یہاں بڑی تنگی ہے ہر چیز کو منع ہی کرتا ہے تو اس کی غلطی ہے اس کے یہاں تنگی نہیں بلکہ تم نے چھانٹ کر غذائیں ہی وہ اختیار کی ہیں جو نقصان دینے والی ہیں' اسی طرح جب ہم نے اپنے تمام معاملات تباہ کر دیئے اور صبح سے شام تک ناجائز ہی معاملات کرنے لگے تو شریعت ان کو کیسے جائز کہدے گی تو یہ تنگی شریعت میں نہیں بلکہ تمہارے عمل میں تنگی ہے' اگر کہو کہ جب سب لوگوں کے اندر ان ہی معاملات کا رواج ہے تو تنہا ہم کیسے چھوڑ دیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر شریعت کو کیوں الزام دیتے ہو اپنے کو الزام دو کہ تم ایسی قوم کے ساتھ رہتے ہو یا اور لوگوں کو الزام دو' خلاصہ یہ کہ شریعت کے اندر کچھ تنگی نہیں' پھر تنگی کے ڈر سے مسئلے نہ پوچھنا بڑی غلطی کی بات ہے اور جب پوچھو گے تو پھر دنیوی معاملات میں یوں نہ کہو گے کہ اس کو شریعت سے کیا واسطہ' اس وقت خود دیکھ لو گے کہ شریعت میں ہر چیز کے متعلق قانون موجود ہے۔

صاحبو! ہم کو یہ کہتے ہوئے شرم آنا چاہیے کہ شریعت سے اس کو کیا تعلق ذرا مسئلہ کی کوئی کتاب پڑھ کر دیکھو کہ شریعت نے کونسی بات چھوڑ دی ہے۔

لباس اور وضع بھی شرع کے موافق ہونا ضروری ہے:

اسی طرح رہنے سہنے کے طریقے کو بھی لوگوں نے شریعت سے الگ سمجھ رکھا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ فلاں لباس اور وضع جائز ہے یا ناجائز ہے اور فلاں قسم کا طرز و انداز حلال ہے یا حرام بس سستا سا فتویٰ شیخ سعدی کا یاد کر لیا ہے۔

در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش

یعنی عمل درست کرلو' لباس کا کیا ہے جو چاہے پہنو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اجازت ایسی عام ہے کہ کسی وضع کی ممانعت نہیں تو ذرا مہربانی کر کے زنانے کپڑے پہن کر دکھلا

دیجیے اور بیوی صاحبہ کو اپنے مردانے کپڑے بھی پہنا دیجیے' اگر آپ ایسا کرلیں تو پھر ہم وضع اور لباس کے بارے میں فتویٰ دنیا چھوڑ دیں گے' اور اگر شیخ سعدی کی اجازت اس وضع کے لیے نہیں ہے' تو جس وضع کو شریعت منع کرے اس کے لیے کس طرح ہو سکتی ہے۔

کھانے کی چیزوں کے متعلق بھی شرع کا قانون ہے:

اسی طرح کھانے کی چیزیں ہیں کہ ان میں بھی بہت سی چیزوں کو شریعت سے بے تعلق سمجھا جاتا ہے' جیسے آجکل آموں پر پھول آرہا ہے مگر ہزاروں آدمی اسی وقت سے بیچ رہے ہوں گے' حالانکہ اس وقت خریدنا بالکل صحیح نہیں جنہوں نے اس وقت خریدا ہوگا ان سے آگے کو بھی خریدنا کسی کے لیے جائز نہ ہوگا۔

نتیجہ یہ ہے کہ تمام بازار حرام سے بھرا ہوگا اور سب لوگ حرام کھائیں گے اور جب یہ حالت ہو تو نماز روزے میں کیا مزہ آئے۔

صاحبو! اگر حلال کھانے کو ملے تو پھر دیکھو کہ نماز روزہ میں کیا مزہ آتا ہے بعض قصبات میں یہ ظلم ہے کہ کھانے کی چیزوں کا نرخ رئیسوں نے اپنے لیے اور مقرر کر رکھا ہے جیسے کہ گوشت' کہ غریبوں کے لیے اور نرخ ہے اور رئیسوں کے لیے دوسرا نرخ ہے' رئیس دباؤ ڈال کر سستا لیتے ہیں اور دونوں وقت اس حرام غذا سے پیٹ بھرتے ہیں اور اپنے جی کو سمجھا رکھا ہے کہ یہ ہمارے مکانوں میں رہتے ہیں یا ہماری گھاس چراتے ہیں۔

صاحبو! جی کو سمجھانا تو بہت آسان ہے' مگر یہ دیکھئے کہ یہ عذر واقع میں چل بھی سکتا ہے' میں کہتا ہوں کہ سرکار کے قانون میں کیوں جی کو نہیں سمجھالیا جاتا' وہاں تو وکیل سے پوچھنا ضروری سمجھتے ہیں' بغیر وکیل سے پوچھے اطمینان نہیں ہوتا' اسی طرح یہاں بھی کسی مولوی سے پوچھا ہوتا کہ یہ سمجھ کر سستا گوشت خریدنا جائز بھی ہے یا نہیں اور کیا مکان کا کرایہ اس طور سے ٹھہرانا درست ہے یا نہیں یا چرائی کے عوض میں گوشت لینا جائز بھی ہے یا نہیں' اگر پوچھتے تو معلوم ہوتا کہ شریعت کے قانون میں یہ جائز نہیں۔

قانون کی وجہ پوچھنے کا ہم کو حق نہیں اور اس پر ایک لطیفہ:

رہی یہ بات کہ اس کے حرام ہونے کی وجہ کیا ہے' سو اول تو قانون کی وجہ سمجھنے کی ضرورت نہیں' سہارنپور میں اسی وجہ سمجھنے کے متعلق عجیب لطیفہ ہوا کہ بہشتی زیور کے ایک مسئلہ کے متعلق ایک صاحب نے مجھ سے وجہ پوچھی' میں نے کہا کیا آپ کو سب مسئلوں کی وجہ معلوم ہے؟ اگر ہے تو مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں دو۲ چار کی وجہ پوچھوں' اگر معلوم نہیں تو چلو اس مسئلے کی وجہ بھی معلوم نہ سہی' پھر ایک اور صاحب تشریف لائے' وہ اپنے بوجھ بجھکو تھے' کہنے لگے کہ اگر آپ اس مسئلہ کو عام جلسے میں صاف ہی کر دیں تو کیا حرج ہے' میں نے کہا آپ حکم دیتے ہیں یا مشورہ دیتے ہیں' کہنے لگے مشورہ ہے، میں نے کہا بس آپ اپنا فرض ادا کر چکے، اب مجھے اختیار کہ مشورہ پر عمل کروں یا نہ کروں آپ تشریف لے جایئے!

غرض اول تو مسئلوں کی وجہ کے پیچھے پڑنا یہ بڑا خبط ہے' دیکھو اگر جج کوئی فیصلہ کرے تو ملزم کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس قانون کی وجہ دریافت کرے جس قانون کی رو سے یہ فیصلہ ہوا ہے اور اگر کوئی پوچھے گا تو کان پکڑے کر نکال دیا جائے گا۔ اور حاکم کہے گا کہ ہم قانون کے جاننے والے ہیں بنانے والے نہیں' اس لیے ہم کو نہ وجہ کا معلوم ہونا ضروری ہے نہ ہمارے ذمہ بتلانا ضروری۔ اسی طرح مولوی بھی کہتے ہیں کہ ہم شریعت کے قانون جاننے والے ہیں ہمارے ذمہ اس کے راز اور وجہ بتلانا نہیں ہے کیونکہ اول تو ہم وجہ کے جاننے کا بھی دعویٰ نہیں کرتے اور اگر جانتے بھی ہیں تو بتلاتے نہیں۔

عقل کے خلاف سمجھنے کی وجہ سے بعض مسئلوں پر عمل نہیں کرتے:

غرضکہ بعض لوگ اس وجہ سے بھی مسئلوں پر عمل نہیں کرتے کہ وہ ان کو ظاہر میں عقل کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔

مکان کے کرایہ میں قصاب سے سستا گوشت لینا:

جیسے مکان کے کرایہ گھاس کی چرائی میں گوشت سستا لینا' ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا

ہے کہ جب ایک شخص ہمارے مکان میں رہتا ہے تو ہم کو کرایہ میں اس سے سستا گوشت لینا درست ہے مگر بات یہ ہے کہ کرایہ کے صحیح ہونے کے لیے شریعت میں کچھ قانون ہیں چونکہ یہ ان میں سے کسی قانون کے موافق نہیں' اس وجہ سے درست نہیں' رہی اس قانون کی وجہ' تو ہم اول تو اس کے جاننے کا دعویٰ نہیں کرتے' دوسرے لوگ اس کو سمجھ بھی نہیں سکتے' تیسرے ہر شخص کو سمجھنا مقصود بھی نہیں ہوتا بلکہ زیادہ غرض یہ ہوتی ہے کہ جواب دینے والے کو عاجز کیا جائے تو چاہے وجہ کچھ بھی ہو یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ مکان کے کرایہ میں سستا گوشت لینا درست نہیں جبکہ اس کی کوئی حد نہ معلوم ہو' ہاں اگر عوض کی حد مقرر ہو تو جائز ہو۔ جیسے کسی کو مکان رہنے کو دیا اور یہ ٹھہرالیا کہ ایک سال کے کرایہ میں اتنے من گوشت ایک آنہ سیر لیں گے اور اس سے جو زیادہ ہوگا اس کی پوری قیمت دیں گے یہ جائز ہے تو دیکھیے کتنی آسان صورت ہے' البتہ اس میں یہ ضروری ہوگا کہ سال بھر کے گوشت کا حساب یاد رکھنا پڑے گا۔ صرف من سمجھوتی سے کام نہ چلے گا' کیونکہ گوشت روزمرہ برابر نہیں آتا کبھی کم آتا ہے کبھی زیادہ آتا ہے اس لیے لکھنا چاہیے کہ فلاں تاریخ میں پانچ سیر آیا اور فلاں تاریخ میں چھ سیر اور جب سال ختم ہو جائے تو اس کو جوڑ لو' اگر ٹھہری ہوئی مقدار سے ایک سیر بھی زیادہ آیا تو اس کی پوری قیمت دے دو اور گول مول رکھنا ہرگز جائز نہیں' اسی طرح اگر گوشت کی مقدار مقرر نہیں کی بلکہ یہ کہہ دیا کہ جتنے کی ہم کو ضرورت ہوگی ایک آنہ سیر لیں گے یا جب ضرورت ہوگی تم کو بیگار میں بلالیں گے' یہ صورت جائز نہیں' ایسے ہی اور بہت سے کام ہیں جن میں امیر غریب پھنسے ہوئے ہیں' اور ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔

زمین کی چرائی میں بکرا لینا ناجائز ہے:

جیسا چرائی کا بکرا لینا کہ یہ زمین والے کے لیے کسی طرح بھی جائز نہیں کیونکہ زمین پر کھڑی ہوئی گھاس کا عوض لینا منع ہے۔

ایک صاحب نے اس کے جائز ہونے کی ایک تاویل نکالی' واقعی پڑھے لکھے جنوں سے بچنا بہت ضروری ہے تو انہوں نے یہ تاویل نکالی کہ ہم گھاس کا عوض نہیں لیتے بلکہ

ہماری زمین آتے ہیں، ہم زمین کا کرایہ لیتے ہیں، مگر یہ تاویل بھی صحیح نہیں، اول تو چرائی کے لیے زمین کا کرایہ لینے ہی میں شبہ ہے، دوسرے یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر کسی کی زمین میں گھاس ہو اور وہ بلا کرایہ کے کسی کو اپنی زمین میں نہ آنے دے اور کسی شخص کو کرایہ دینا منظور نہ ہو مگر گھاس کی ضرورت اور دوسری جگہ بھی مفت نہ ملے تو زمین والے کے اوپر واجب ہے کہ اگر زمین میں نہ آنے دے اور کسی شخص کو کرایہ دینا منظور نہ ہو مگر گھاس کی ضرورت اور دوسری جگہ بھی مفت نہ ملے تو زمین والے کے اوپر واجب ہے کہ اگر زمین میں نہ آنے دے تو گھاس کھود کر حوالے کرے، پھر کرایہ لینے کا کیا حق ہوا پس یہ تاویل بھی نہیں چل سکتی، اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ کھلم کھلا گناہ کرنے والا اس قسم کی تاویل کرنے والوں سے اچھا ہے کہ وہ اپنے کو گنہ گار تو سمجھتا ہے۔

غرض ان خرابیوں میں اکثر بڑے چھوٹے سب لوگ گرفتار ہیں مگر ان کے ناجائز ہونے کا کسی کو بھی خیال نہیں ہوتا، یہ چیزیں خود بھی کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں جیسا بالکل حلال ہی ہے، حالانکہ اول تو انہیں خود بھی احتیاط چاہیے کہ آپ بھی نہ کھائیں اور اگر آپ بھی کھائیں تو کم از کم دوسروں کو تو ہرگز نہ کھلائیں، یاد رکھیے کہ اگر تم نے ایسا گوشت کسی کو کھلا دیا تو بے خبری میں کھانے سے اس کو گناہ تو نہیں ہوتا لیکن دل پر اس کے بھی ایک سیاہی چھا جاتی ہے، میں نے تھانہ بھون میں خدا کا شکر ہے کہ اس رسم کو کئی گھروں سے روک دیا ہے تو اس کے چھوڑنے کا سب کو خیال ہونا چاہیے، خلاصہ یہ کہ اکثر لوگوں نے معاملات اور اخلاق[1] اور رہنے سہنے کے طریقوں کو شریعت سے الگ سمجھ رکھا ہے۔

اسلام علیکم کی جگہ بندگی اور آداب کہنا:

ایک اور بات یاد آئی یعنی سلام کرنا کہ شریعت نے حکم کیا ہے السلام علیکم کا، مگر اب لوگوں نے اس کی جگہ یہ کہنا اختیار کیا ہے کہ بندگی آداب عرض ہے، میں جب کانپور تھا تو لوگوں نے آکر بندگی کہنا شروع کیا مجھ کو بہت ناگوار ہوا، کیونکہ یہ لفظ شرک کا ہے اس کے

[1] اخلاق کہتے ہیں خصلتوں کو، جیسے صبر و شکر وغیرہ

معنی یہ ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں' اس لفظ کو ظالم بادشاہوں نے اپنے لیے نکالا تھا' مگر معنی میں غور نہ کرنے کی وجہ سے اب تک رواج چلا آتا ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوس کے قابل یہ ہے کہ لوگوں نے السلام علیکم کہنے کو بے تمیزی میں داخل کیا ہے۔

ایک طالب علم نے اپنے والد کو جا کر سلام کیا تو وہ کہنے لگے کہ بیٹا! یہ بے تمیزی ہے آداب کہا کرو' صاحبو! یاد رکھو کہ سلام کو بے تمیزی کہنا کفر ہے کیونکہ سلام کو بے تمیزی کہنا حضور ﷺ کی سنت کو بے تمیزی کہنا ہے اور حضور ﷺ سنت کو بے تمیری کہنے والا کافر ہے اس کا قتل کرنا واجب ہے۔

اسی طرح ہمارے تمام طریقے رہنے سہنے کے خراب ہو رہے ہیں اور خصلتیں بھی بگڑی ہوئی ہیں۔

علماء کے اخلاق بھی درست نہیں:

عام لوگوں کو کیا کہا جائے مولویوں کو بھی اپنی خصلتوں کی ذرا خبر نہیں' چنانچہ ہم لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ علم دین پڑھ کر ہم اس کے انتظار میں رہتے ہیں کہ لوگ ہم کو سلام کریں اور زیادہ وجہ اس انتظار کی یہ خیال ہے کہ یہ دنیا دار ہیں اور ہم دیندار ہیں نائب رسول ﷺ سو اس قسم کے لوگ متکبر ہیں' صاحبو! یہ کہاں لکھا ہے کہ جاہل عالم کو سلام کرے' ہاں یہ لکھا ہے کہ سوار پیادے کو سلام کرے' آنے والا بیٹھے ہوئے کہ سلام کرے' مگر یہ کہیں نہیں کہ جاہل عالم کو سلام کرے بلکہ دونوں کے ذمہ پر برابر ضروری ہے پھر یہ انتظار تکبر اور غرور نہیں تو اور کیا ہے۔

دوسرے ہم مولوی بھی صرف نام کے ہیں' ہم اس سے اپنے کو مولوی سمجھتے ہیں کہ داڑھی درست ہو پاجامہ ٹخنوں سے اونچا ہو' دو چار موٹی موٹی باتیں یاد ہوں' سو ہم نے لباس کو تو درست کر لیا مگر اندر سینکڑوں خرابیاں بھری ہوئی ہیں' ان ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ظاہر تو ایسا اچھا کہ حضرت بایزید بھی شرما جائیں اور باطن ایسا خراب کہ یزید کو بھی اس سے نفرت ہو' اور مولویوں کی کیا شکایت کروں اس وقت تو اکثر فقیر بھی تکبر

وغیرہ بہت سی خرابیوں میں گرفتار ہیں اور فقیروں کا تکبر بہت ہی عجیب ہے کیونکہ فقیری کا تو حاصل یہی ہے کہ اپنے کو مٹایا جائے تو یہ فقیر ہو کر بھی نہ مٹے' غرض سب قصور اور الزام کے قابل ہیں کہ معاملات اور خصلتوں اور رہنے سہنے کے طریقوں کو سب نے دین سے نکال دیا ہے۔

جس چیز کو دین سمجھتے ہیں اس کی بھی تحقیق نہیں کرتے:

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جس کو دین سمجھتے ہیں' جیسے نماز روزہ اس کے مسئلے بھی معلوم نہیں کرتے اور ان میں بھی سب سے زیادہ خاص ان لوگوں کی شکایت ہے جو نمازی بھی ہیں کہ نماز پڑھتے ہیں مگر پھر بھی نماز کے مسئلے کسی مولوی سے نہیں پوچھتے' خدا جانے ان کو کبھی شبہ ہی نہیں ہوتا' یا خود ان کو سارے مسئلے معلوم ہیں حالانکہ نماز کے متعلق اتنے مسئلے ہیں کہ اب تک بھی مجھے کتاب دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو جو لوگ نہ لکھے نہ پڑھے' ان کو کیونکر معلوم ہو گئے۔

لوگوں کو دین کی طلب نہیں:

اصل بات یہ ہے کہ اپنے جی کو سمجھا لیا ہے کہ نماز یوں بھی ہو جاتی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی طلب نہیں' یہی ہے وہ مرض جس کے متعلق میں بیان کر رہا ہوں' اور اس حدیث میں حضور ﷺ اسی کا علاج بیان فرماتے ہیں کہ مسلمان کی یہ حالت ہونی چاہیے کہ علم کی طلب سے کبھی اس کا پیٹ نہ بھرے تو ہر مسلمان کا فرق ہوا کہ کتنی ہی عمر ہو جائے برابر دین کی طلب میں رہے۔

علم کی طلب سے کیا مراد ہے:

اس سے کوئی ڈرے نہیں کہ انہوں نے تو مولوی بننے ہی کو فرض کر دیا' صاحبو! حضور ﷺ نے کتاب کی طلب کو نہیں فرمایا بلکہ علم کی طلب کو فرمایا ہے تو شریعت کے احکام معلوم کر لو خواہ پوچھ کر[1] یا پڑھ کر عربی زبان میں یا اردو زبان میں' زبان کوئی خاص مقصود نہیں۔

---

1. یعنی ان چیزوں میں جن کے اندر شریف میں عربی کی قید نہیں لیکن جن میں عربی کی قید ہے جیسے نماز اور خطبہ وہ دوسری زبان میں نہیں ہو سکتے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

اسی پر مجھے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ یاد آیا کہ آپ کے پاس ایک بڑے درویش روم کے رہنے والے اسعد آفندی تشریف لائے' حضرت حاجی صاحب مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی مثنوی کا سبق پڑھا رہے تھے اور اردو میں تقریر کر رہے تھے وہ درویش بھی اس کو سن کر بہت خوش ہوئے اور ان کو بہت لطف آیا' ایک خادم نے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے ہوتے تو ان کو زیادہ مزہ آتا' حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میاں عشق کی باتوں کے لیے زبان کی کچھ قید نہیں محبوب کا ذکر ہر زبان میں مزہ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ زبان کو نہیں دیکھتے:

سو حقیقت میں خدا تعالیٰ زبان کو نہیں دیکھتے بلکہ لفظوں کی صحت اور غلطی کو بھی زیادہ نہیں دیکھا جاتا ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اسہد کہنا:

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اسہد کے سامنے ہماری اشہد کچھ وقعت نہیں رکھتی' یہ ایک مشہور بات ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان میں اسہد کہا کرتے تھے' لیکن حدیث اس مضمون کی میری نظر سے نہیں گزری[1] لیکن اگر کہتے ہوں تو وجہ اس کے افضل ہونے کی یہ ہے کہ آجکل کا اشہد تو صرف زبان تک ہے دل پر ذرا اثر بھی نہیں ہوتا اور حضرت بلال کا اسہد دل سے نکلتا تھا' حضرت بلال کا تو بڑا مرتبہ ہے' جن اللہ کے بندوں سے الفاظ صحیح ادا نہیں ہو سکتے اور ان کے دل کی حالت بھی کچھ ایسی اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے تو ان کو بھی قرآن شریف کی مہارت نہ ہونے میں دوہرا ثواب ملتا ہے کہ وہ الفاظ کو ادا نہیں کر سکتے اور کوشش کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکایت چرواہے کے ساتھ:

آپ نے حکایت سنی ہوگی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک چرواہا تھا' ایک

---

[1] اس کے متعلق ایک حدیث عوام میں مشہور ہے' جو موضوع ہے۔۱۲

مرتبہ وہ بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ اللہ میاں تو کہاں ہے میں تجھے روغنی روٹیاں کھلاؤں اور تیرے ہاتھ پیر دباؤں اور آرام سے سلاؤں' اس قسم کی بیہودہ باتیں کر رہا تھا' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہتے ہوئے سنا تو پوچھا کس کو کہہ رہا ہے اس نے کہا اپنے خدا کو کہہ رہا ہوں جس نے مجھ کو پیدا کیا' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہائے کم بخت یہ کیا کفر بکا' ارے تو مسلمان نہ رہا کافر ہو گیا' بس یہ سن کر اسے سناٹا آ گیا اور بہت ڈرا کہ سب کیا کرایا غارت ہوا' کہنے لگا اے موسیٰ علیہ السلام تم نے میرا منہ بند کر دیا اور شرم وندامت سے میری جان کو پھونک دیا' غرض وہ تو اس پریشانی میں رہا اور حضرت موسیٰ کوہ طور پر تشریف لے گئے' وہاں سے ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ علیہ السلام ہمارا بندہ ہم سے مناجات کر رہا تھا' تم نے اس کو روک کر ہم سے جدا کر دیا' حالانکہ تمہارا کام یہ ہے کہ بندوں کو مجھ سے ملاؤ نہ یہ کہ ان کو مجھ سے جدا کرو تم نے اس کے لفظوں کو دیکھا اور اس کے خلوص کو نہ دیکھا' لیکن ہم لفظوں کو نہیں دیکھتے خلوص کو دیکھتے ہیں' اے موسیٰ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ سب کے لیے ہم نے ایک قاعدہ نہیں رکھا بلکہ ہر شخص اپنے اپنے محاورہ اور الفاظ میں ہماری تعریف کرتا ہے' تو صاحبو! دیکھا آپ نے کہ اس چرواہے کی بیہودہ باتیں بھی خلوص کی وجہ سے کیسی قبول ہوئیں' پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں صحیح اور غلط کی بھی قید نہیں پھر کسی زبان کی قید کیوں ہوگی' خلاصہ یہ کہ علم کی طالب کے یہ معنی نہیں کہ وہ عربی پڑھیں یہ تو ان کے لیے جن کو فرصت ہو اور کھانے کمانے سے فارغ ہوں ورنہ جن کو فرصت نہ ہو وہ پوچھ پوچھ کر عمل کریں' صحابہ رضی اللہ عنہم اور پہلے بزرگوں کا یہی دستور رہا ہے کہ جس بات کی ضرورت ہوتی پوچھتے اور اس پر عمل کرتے تو یہ بھی ایک طریقہ ہے علم کی طلب کا پس عربی نہ پڑھنے والے یہ رنج نہ کریں کہ ہم کو طالب علموں کی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی' یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ حدیث میں جو طلب علم کی فضیلت آئی ہے کہ فرشتے ان کے سامنے جھک جاتے ہیں اس فضیلت کو سن کر اکثر عربی نہ پڑھنے والے حسرت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی تو اب وہ سن لیں کہ ہر شخص یہ فضیلت حاصل کر سکتا ہے مگر اس کی صورت یہ

ل یعنی جبکہ صحیح پر قدرت نہ رکھتا ہو

ہے کہ دین کی جتنے حصے ہیں' عقیدے' عبادتیں' معاملات' خصلتیں' رہنے سہنے کے طریقے سب کی اصلاح کرے اور جو معلوم نہ ہو پوچھتا رہے' بس یہ طالب علم ہو گیا اور اس کی وہی فضیلت ہو گی جو عربی پڑھنے والے طالب علم کی' ہاں جو کتابیں پڑھ کر دین کا پیشوا بن جائے وہ اس فضیلت کے ساتھ نائب رسول بھی ہو گا' ورنہ طلب علم کی فضیلت ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے تو یہ کم دولت ہے۔

طلب علم کی ترغیب ہر مسلمان کو:

پس میں مردوں اور عورتوں دونوں سے کہتا ہوں کہ علم کی طلب میں جو بے فکری ہے اس کو چھوڑ دو اور آج کل لوگوں کو کچھ فکر بھی ہے اور کبھی پوچھتے بھی ہیں تو صرف نماز کی بابت۔

صاحبو! ایک چیز لے کر طالب دین نہیں ہو سکتے' سب چیزوں کی بابت پوچھو کہ یہ جائز ہے یا نہیں اس سے ہرگز کام نہیں چل سکتا کہ ایک چیز لے کر باقی سب چیزوں سے بے فکر ہو جاؤ' مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ ہر بات میں جائز ناجائز کا خیال رکھے آجل اس میں بہت کمی ہے اس واسطے میں نے اس حدیث کو اس وقت بیان کیا' اگرچہ احکام بہت سے بیان نہیں ہو سکے مگر جو گر کی باتیں خلاصہ کے طور پر میں نے بیان کر دی ہیں وہ بہت کافی ہیں۔

اسلامی مدرسوں کی فضیلت:

پھر ایک یہ بھی وجہ اس مضمون کو بیان کرنے کی ہے کہ اس وقت میرا آنا صرف مدرسہ کی حالت دیکھنے کے لیے ہوا اور اسی لیے مجھے بلایا گیا تھا' سو میں نے دیکھا اور دیکھ کر بہت ہی جی خوش ہوا' میں چند لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں' اول ان کو جنہوں نے مدرسہ کے خرچ کے جائیداد مقرر کی' دوسرے مدرسہ کا انتظام کرنے والوں' کیونکہ وہ بھی اس فیض کا ذریعہ ہیں ان کو بھی وہی ثواب ملتا ہے تیسرے تمام بستی والوں کو' کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جو لوگ اکٹھے ہو کر ہمارا ذکر کرتے ہیں یعنی دین کی باتوں کا تذکرہ

کرتے ہیں تو فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور ان پر کیفیت اطمینان کی نازل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی درگاہ کے رہنے والوں میں جو خدا کے درباری ہیں ان کا ذکر فرماتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی رحمت کسی جگہ نازل ہوتی ہے تو سب پر نازل ہوتی ہے جیسے بارش ہوتی ہے تو سب جگہ ہوتی ہے اور اگر اس مثال پر کوئی شبہ کرے کہ بھادوں میں بارش سب جگہ نہیں ہوتی بلکہ کچھ دور تک ہوتی ہے اور کچھ دور تک خشک رہتا ہے تو میں کہوں گا کہ ادل بدل کر سب جگہ ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ کی رحمت تو بارش سے بھی زیادہ عام ہے پس اول علم والوں پر رحمت ہوگی پھر ان کی بدولت ساری بستی ہوگی تو سب کو خوش ہونا چاہیے اور قدر کرنا چاہیے مگر لوگ ڈریں نہیں کہ بس اب چندہ مانگا جائے گا' ہم چندہ نہیں مانگتے ہاں ایک دوسرا چندہ مانگتے ہیں وہ یہ کہ اپنے بچوں کو مدرسہ میں پڑھنے کے واسطے بھیجو کہ ان کو دین کی خبر ہو اور ان کی بدولت آگے کو علم دین کا سلسلہ جاری رہے یہ تم پر بچوں کا حق ہے' تمہارے گھر میں مدرسہ موجود ہے اور اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ کس قدر بے وقوفی کی بات ہے۔

یاد رکھو کہ جس گھر میں رحمت ہو اور گھر والے محروم رہیں تو بڑی بدقسمتی ہے' سو اول تو کوشش کر کے بچوں کو پڑھاؤ' دوسرے یہ کرو کہ جو بچے بڑھ کر آتے ہیں ان کو تاکید کرو کہ عورتوں کو اپنا سبق سنائیں' اگر یہ انتظام ہو جائے تو ہر روز دو چار مسئلے ان کے کان میں پڑ جائیں گے اور جب وہ ہر روز مسئلے سنیں گی تو کبھی نہ کبھی اثر بھی ضرور ہوگا۔

اللہ کے نام میں ضرور اثر ہوتا ہے مع ایک نمونہ کے:

صاحبو! خدا کا نام بے اثر نہیں ضرور اثر ہوگا' اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا' کہ کھٹائی کا نام لینے سے منہ میں پانی بھر آتا ہے تو کیا خدا کا نام کھٹائی کے برابر بھی نہیں' یہ میں دلیل کے طور پر نہیں پیش کر رہا ہوں کیونکہ خدا کے نام کا اثر عام طور پر دیکھا جاتا ہے' اس کے لیے دلیل کی کیا ضرورت ہے بلکہ نمونہ کے طور پر ایک مثال دی ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو' قرآن شریف میں ارشاد ہے اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا یعنی مسلمان کی شان یہ ہے کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ایمان بڑھ جاتا ہے۔

عورتوں کے لیے طلب علم کے طریقے:

اور عورتیں بھی اس پر توجہ کریں کہ روزانہ اپنے بچوں سے سبق پڑھوا کر سنیں اور جو بات معلوم نہ ہو اپنے مردوں کے ذریعہ سے مولویوں سے معلوم کر لیا کریں کیونکہ مسئلے سیکھنا تو ضروری ہے اور عورتوں کو اس کا زیادہ موقع نہیں ملتا اس لیے انہیں یہ تدبیر کرنی چاہیے' خلاصہ یہ کہ اول تو یہ خیال ہر وقت رکھو کہ کونسا کام شریعت کے خلاف ہے اور کونسا شریعت کے موافق اور اپنے مردوں سے کہو کہ مولویوں سے پوچھ پوچھ کر تم کو بتلائیں' دوسرے اپنے بچوں سے سبق سنا کرو' یہ عورتوں کے لیے بہت ہی آسان ترکیب ہے رہے مرد تو ان کے لیے بہت طریقے ہیں علم حاصل کرنے کے ان کو کچھ دشواری نہیں' رات دن مولویوں سے ملتے رہتے ہیں جب ضرورت ہو پوچھ سکتے ہیں کتابیں بھی پڑھ سکتے ہیں ان کے لیے علم کا حاصل کرنا بہت ہی آسان ہے' ایک بات مردوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دیکھیں کہ کوئی بات شریعت کے خلاف تو عورتوں سے نہیں ہوتی' اگر کوئی بات دیکھیں فوراً روک تھام کریں پس مدرسہ کی نعمت جو آپ کو حاصل ہے اس کی قدر اور شکر گزاری یہی ہے کہ علم دین کی تلاش میں لگ جاؤ' دوسری قدر یہ کرو کہ آج کل جو ہم لوگ کسی کام کو ایک ہی کے ذمہ ڈال دیتے ہیں' اس عادت کو بھی چھوڑ دو' کیونکہ یہ بہت ہی برا ہے' صاحبو! جو شخص جتنا کام کر رہا ہے غنیمت سمجھو' کیونکہ یہ کام سب کے ذمہ فرض ہے اگر وہ شخص بھی نہ کرتا تو سب ہی گنہ گار ہوتے' اس کا احسان ہے کہ وہ تم سب کی طرف سے کر رہا ہے' سو جن باتوں میں تمہاری ضرورت ہے ان میں بھی تم شریک ہو جاؤ' جن صاحب کو کچھ گنجائش ہو وہ اس طرح شرکت کریں کہ کچھ طالب علم یہاں باہر کے بھی ہیں' وہ ان کے کھانے کپڑے وغیرہ سے مدد کریں ہاں مدرسہ والوں کو اس کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ سب طالب علم باہر ہی کے نہ رکھیں کیونکہ بستی کو زیادہ نفع ہونا چاہیے' بس زیادہ تو بستی کے ہوں اور چار پانچ باہر کے بھی ضرور ہوں' اس میں ایک تو برکت ہوتی ہے' دوسرے وہ صرف طلب علم کے لیے آئے ہیں ان کی خدمت کرنے میں بڑا ثواب ہے' تیسرے ان سے مدرسہ کی رونق ہوتی ہے چوتھے ان سے پڑھانے والوں کا دل لگتا ہے۔ اس لیے کہ وہ

بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہیں' تو جو ہوت والے ہیں اور گنجائش رکھتے ہیں انہیں ان پڑوسیوں کی خدمت ضرور کرنی چاہیے' خواہ یوں سمجھو کہ مدرسہ میں ان کی خدمت کرنے کی گنجائش نہیں یا اگر گنجائش بھی ہو تو ثواب کے لیے ایک ایک آدمی کا کھانا اپنے ذمہ کرلو' یا دو آدمی ایک کا کھانا کرلیں' یا سات آدمی ہفتہ بھر میں باری باری کھانا دیں' جیسا کہ دیوبند میں غریب لوگ کرتے ہیں' غرض بستی والے مشورہ کر کے کوئی طریقہ مقرر کرلیں' کہ کس طرح کھانا دیا جائے اور ایک ایسے صاحب جن کو لوگ سچا اور امانت دار سمجھیں کھڑے ہو کر فہرست لکھیں کہ کون شخص کس طرح دے گا اور پھر دیکھ لیں کہ کتنے طالب علموں کے کھانے ہوئے' پھر اسی قدر باہر کے طالب علم رکھ لیے جائیں اور اگر مدرسہ میں گنجائش ہو تو کچھ کام انتظام مدرسہ کی طرف سے کردیا جائے۔

غرض سب شریک ہو جائیں تو اچھا ہے' یہ مدرسہ کے حالات تھے جن کو دیکھ کر میں نے بیان کیا اور اسی لیے میں نے اس مضمون کو اختیار کیا۔

علم دین حاصل ہونے کے طریقے عورتوں اور مردوں کے لیے:

خلاصہ یہ کہ اس مضمون سے آپ نے معلوم کرلیا ہوگا کہ ہم لوگوں کو واقعی مسئلوں کی تلاش نہیں ہے' تو میں اس کے کئی ذریعے بتلاتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ کتابیں پڑھو' پھر اس میں دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ عربی پڑھو' یہ تو بہت ہی اچھی صورت ہے' خاصکر نوجوان لڑکے تو ایک چھوٹا سا سبق جا کر ضرور ہی شروع کرلیں۔

صاحبو! کیا چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ اس کام کے لیے نہیں ہوسکتا یہ بھی نہ ہو تو ہفتہ میں دو دن ہی سہی' اور اگر عربی کی کتابیں نہ پڑھ سکیں تو یہ کریں کہ اگر کچھ اردو پڑھے ہوئے ہیں تو مسئلوں کی کتابیں خرید کر پڑھا کریں' اور جہاں شبہ ہو مولویوں سے پوچھ لیا کریں' اور اگر ان پڑھ ہیں تو اس کے لیے یہ ترکیب کریں کہ ہر محلہ کی مسجد میں ہفتہ کا کوئی ایک دن مقرر کرلیں اور کسی سمجھ دار آدمی کو مقرر کر کے ایک مسئلوں کی کتاب اس کو دیں اور کہیں کہ آدھ گھنٹہ تک اس کو پڑھ کر سناتا جائے اور سمجھتا جائے' اگر ہر محلہ میں ہفتہ میں ایک دن بھی ایسا مقرر ہو جائے تو اندازہ کرو کہ سال بھر میں کتنے مسئلے معلوم ہو

جائیں گے، پھر عمر میں کتنا ذخیرہ مسئلوں کا اپنے پاس ہو جائے گا۔

اب رہ گئیں عورتیں وہ یا تو کتاب دیکھ کر پڑھیں اور اگر بے پڑھی ہیں تو اپنے مردوں سے کہیں کہ ہم کو مسئلے سناؤ اور اپنے بچوں کا سبق روز سنا کریں اور اگر کسی کے بچہ نہ ہو وہ دوسرے کے بچے کو بلا کر اس سے سنے اور یہ کوئی مشکل بات نہیں، دیکھو اگر ایک خط لکھوانا ہوتا ہے تو کیسا لڑکوں کو تلاش کیا جاتا ہے، اگر بچے روز نہ آ سکیں تو دوسرے تیسرے دن بلا لیا کرو، یہ طریقے ہیں دین کا علم سیکھنے کے ان میں جس کو جو آسان ہو وہ کرے اگر ایسا کیا تو خدا نے چاہا چند روز میں ہر مسلمان آدھا مولوی ہو جائے گا، اگر ایک ہی مسئلہ روز معلوم ہوا تو سال میں تین سو ساٹھ مسئلے کان میں پڑیں گے، پھر انشاء اللہ ہر وقت پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ بہت کچھ ذخیرہ جمع ہوگا، چونکہ لوگوں کو اس کی فکر نہیں تھی، اس لیے میں نے یہ حدیث پڑھی۔

خلاصہ وعظ کا:

اب پھر حدیث کو دوبارہ پڑھتا ہوں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ دو حریص ایسے ہیں کہ ان کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا علم کے طالب کا اور دنیا کے طالب کا، مطلب حضور ﷺ کا یہ ہے کہ مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ علم دین کی طلب سے اس کا پیٹ نہ بھرے اور دنیا کو طلب نہ کرے کیونکہ وہ علم دین کی طلب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

اب میں ختم کرتا ہوں اور مجھے یہ امید ہے کہ چونکہ کام کی بات تھی اور آسان طریقے سے بیان ہوئی اس لیے انشاء اللہ اثر ہوگا، اور خدا کرے کہ جب دوسری مرتبہ آؤں تو سب پر اثر دیکھوں، اب دعا کیجیے کہ خدا تعالیٰ توفیق دے۔ (آمین)

تمت

(۴۴) دنیا کی محبت

منتخب از وعظ ہفتم ملقب بہ حب العاجلہ حصہ چہارم

دعوات عبدیت

خطبہ ماثورہ:

اَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ

ترجمہ: ''ہرگز نہیں بلکہ تم لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

جس مضمون کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں' وہ ایک نہایت ضروری مضمون ہے' اور نیا مضمون نہیں ہے بلکہ جو مضمون مولوی شبیر احمد صاحب نے بیان کیا ہے اسی کو پورا کرنا مقصود ہے (مولانا سے پہلے مولوی شبیر احمد صاحب نے تقریر کی تھی)

مشہور تو یوں ہے کہ اگر باپ سے پورا نہ ہو سکے تو بیٹا پورا کرے' مگر اس وقت اس کا الٹا سمجھ لیجئے' کہ بیٹے سے پورا نہ ہو تو باپ پورا کرے' مگر یہ میں نے بے تکلفی سے ان کی کم سنی کے لحاظ سے کہہ دیا ہے۔

امید ہے کہ مولوی صاحب برا نہ مانیں گے' کیونکہ واقع میں ان کو میں اپنے سے بڑا سمجھتا ہوں' غرض اس وقت مولوی صاحب کے مضمون کو پورا کروں گا' اور مولوی صاحب کا مضمون بالکل کافی تھا' لیکن اس میں بعض باتوں کو ذرا کھول کر بیان کرنے کی ضرورت ہے' میرا قصد پہلے سے بھی اس مضمون کو بیان کرنے کا تھا مگر اتفاق سے مولوی صاحب

کے لیے بھی یہی مضمون مقرر کیا گیا' مگر مولوی صاحب نے صرف اعتقاد کی حالت آخرت کے متعلق زیادہ بیان کی ہے۔ چونکہ اس کے متعلق ایک دوسرا پہلو عمل کا بھی ہے اس لیے اس کو بیان کیے دیتا ہوں تا کہ دونوں بیان مل کر آخرت کے دونوں ضروری پہلوؤں کو شامل ہو جائیں' ارشاد ہوتا ہے کہ ''اے لوگوں! تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑے دیتے ہو۔''

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو اختیار کرنے کی شکایت:

اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ان دنیا داروں کی شکایت فرمار ہے ہیں جو آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ دنیا سے محبت کرنا اور آخرت کو چھوڑنا یہ دونوں باتیں عمل ہیں' علم نہیں۔

ہر علم سے مقصود عمل ہے:

اور عمل کے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ ہر علم سے مقصود عمل ہی ہے' بعض علم ظاہر میں خود مقصود معلوم ہوتے ہیں' مگر غور سے دیکھا جائے تو اس علم کا نتیجہ بھی کوئی عمل ہی ہے' جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا اور اس مسئلے کی بات کہ ہر علم کے ساتھ عمل بھی ہے' شریعت کے عالموں کا تو مذہب آپ نے سنا ہی ہوگا' کہ ان کے نزدیک شریعت کے حکموں میں دو درجے ہیں' ایک اعتقاد کا درجہ اور ایک عمل کا درجہ' لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ صرف شریعت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر علم میں اور ہر فرقہ میں مانا ہوا ہے' خواہ وہ فلسفی[1] ہوں یا حکیم ہوں۔

علم و عمل دونوں کا ضروری ہونا:

ہر فرقہ ہر علم میں دو چیزوں کو ضروری مانتا ہے ایک علم اور دوسرا عمل اور اپنے اپنے درجہ میں دونوں ضروری سمجھے جاتے ہیں' علم تو بعض ایسے بھی ہیں' جن کو ظاہر میں عمل سے کوئی تعلق نہیں' یعنی ان کا فائدہ عمل پر موقوف نہیں بلکہ علم ہی سے اس کا فائدہ کچھ نہ کچھ

[1] فلسفی وہ جو ہر چیز کی بحث عقل سے کرتے ہیں شرع کے تابع نہیں ۱۲

حاصل ہو جاتا ہے اگرچہ حقیقت میں ان علموں سے بھی کسی درجہ میں عمل مقصود ہے لیکن عمل کوئی ظاہر میں ایسا نہیں ہے جس کا فائدہ بغیر علم کے حاصل ہو سکے دیکھو توحید کا عقیدہ یہ ایک ایسا علم ہے کہ اگر اس کے ساتھ کسی قسم کا عمل نہ کیا جائے بلکہ صرف اللہ کو ایک جانے اور کام کچھ نہ کرے تب بھی اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہو ہی جائے گا اور کبھی نہ کبھی نجات مل ہی جائے گی لیکن کسی عمل کی بابت جیسے نماز روزہ وغیرہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بغیر اعتقاد کے اس عمل کا فائدہ حاصل ہو جائے گا۔

تو معلوم ہوا کہ علم تو ایک درجے میں عمل سے بے پرواہ اور بے نیاز بھی ہے کہ اس کا فائدہ بغیر عمل کے حاصل ہوسکتا ہے لیکن عمل علم سے کسی درجہ میں بھی بے نیاز نہیں اور اس سے بغیر عقیدہ کے کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا اور یہی راز ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عبادت کا مقابلہ کوئی عبادت نہیں کرسکتی۔

عارف کی عبادت کی فضیلت غیر عارف پر:

وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں خدا تعالیٰ کی معرفت اور علم درجہ کمال پر تھا اس واسطے ان کی عبادت ہماری عبادت سے بہت بڑھی ہوئی تھی اس کے موافق حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی ایک ارشاد نقل کرتا ہوں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ عارف[1] کی دو رکعتیں غیر عارف کی ہزار رکعتوں سے بھی زیادہ درجہ رکھتی ہیں وجہ اس فرق کی یہی ہے کہ عارف کو جو علم و معرفت حاصل ہے غیر عارف کو حاصل نہیں اور کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ زیادہ بڑھا دیا ہرگز نہیں۔

صاحبو! یہ بالکل سچی بات ہے اور حدیث کے موافق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا علم کس قدر تھا اور کیسی گہری نظر تھی اور یہی وہ علم تھا جس کی وجہ سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے بڑے عالم یوں فرماتے تھے کہ مجھے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو کچھ اعتقاد ہوا ہے وہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علم کی بدولت ہوا ہے تو اس میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ بڑھا کر نہیں

[1] عارف وہ ہے جو خدا تعالیٰ کے علم میں پورا ہو اور شیطان کے دھوکہ میں نہ آتا ہو۔۱۲

کہا بالکل ٹھیک کہا ہے۔

خود حدیث شریف میں ہے کہ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اگر ایک صحابی ایک مدیا آدھا مدیعنی آدھ سیر یا پاؤ سیر خیرات کریں اور غیر صحابی احد پہاڑ کی برابر سونا صدقہ دیں تو وہ صحابی کے پاؤ سیر کی برابر نہیں ہوسکتا۔ اب ذرا دیکھئے! کہ پاؤ سیر غلہ کی قیمت کتنا سونا ہوتا ہے اور وہ احد پہاڑ سے کیا نسبت رکھتا ہے' بلکہ میں کہتا ہوں کہ قیمت کو چھوڑیئے خود پاؤ سیر غلہ ہی کو لیجیے تو خود اس کی مقدار بھی احد پہاڑ کے مقابلہ میں کچھ نسبت نہیں رکھتی' پس یہ ہزاروں کا فرق نہیں بلکہ کروڑوں کا فرق ہے۔

پس معلوم ہوا کہ حاجی صاحب نے کچھ بڑھا کر نہیں کہا بلکہ کچھ کم ہی کر کے کہا ہے' لیکن مطلب ایک ہے' تو وجہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس فضیلت کی یہی علم اور معرفت ہے' یہاں شاید کسی شخص کو یہ شبہ ہو کہ مولوی بھی عجیب چیز ہوتے ہیں ایک ہی بات سے جو چاہیں ثابت کر لیتے ہیں اور جو کام چاہتے ہیں لے لیتے ہیں' اس حدیث سے اس وقت علم کی فضیلت ثابت کر دی گئی اور بہت مرتبہ اسی سے صحابی کی فضیلت ثابت کرتے دیکھا ہے' کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے ایسا خلوص میسر ہوا تھا کہ اس سے عمل میں یہ برکت ہوگئی۔

علم اور خلوص ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے:

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں الگ الگ نہیں ہیں' ایک کا حاصل ہونا دوسرے کا حاصل ہونا ہے اگر خلوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے تھا تو علم خلوص کی برکت سے تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو علم ہی سبب اسلام کا ہوا:

بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات میں علم کا مرتبہ صحبت سے بھی پہلے ہے' کیونکہ صحبت بھی علم ہی کی بدولت نصیب ہوئی۔

دیکھیے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا تو کیا عرب میں سے کسی کو آپ نے باقی چھوڑا تھا؟ نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو انسان اور جن سب ہی کی ہدایت کے لیے آئے تھے اور سب ہی کو اسلام کی دعوت دیتے تھے' مگر پھر اس کی کیا وجہ کہ صرف انہیں

حضرات کی سمجھ میں اسلام آیا' ابوجہل' ابولہب کیوں نہیں سمجھ سکے

معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے پاس خدا تعالیٰ کی دی ہوئی کوئی ایسی دولت موجود تھی جو ابوجہل کے پاس نہ تھی' ہاں کفر کی تاریکی میں اس کی چمک دمک چھپی ہوئی تھی جو اسلام لانے سے چمک اٹھی یہ وجہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو دیکھتے ہی آپ کے رسول ہونے کا اقرار کیا' آپ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم علیہ السلام کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ صورت جھوٹے کی نہیں ہے' خوب کہا ہے کسی نے

مرد حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

قرآن شریف میں فرماتے ہیں سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ" کہ ان کے چہروں پر نشانی ہے سجدہ کے اثر سے۔"

غرض کہ ضرور یہ کوئی بات تھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جس کی وجہ سے انہوں نے فوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا' اور دوسروں کو وہ بات نصیب نہ تھی' وہ بات کیا تھی وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا علم اور معرفت تھی اور جب اس وقت ان کے علم کی یہ حالت تھی جبکہ اسلام کی دولت ان کے پاس نہ تھی' تو اسلام کے بعد اور صحبت کا فیض حاصل کر کے تو کیا حالت ہوئی ہوگی' شاید کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ اس تمام تقریر سے صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے علم اور معرفت کی فضیلت ثابت ہوئی کہ ان کو اس کی وجہ سے پاؤ سیر کے صدقہ کرنے میں وہ ثواب ملتا تھا جو دوسروں کو احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرنے سے بھی نہیں ہوسکتا' لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوا دوسرے بزرگوں کو بھی علم اور معرفت کی وجہ سے ایسی فضیلت ہوسکتی ہے' کہ ان کی دو رکعت دوسروں کی ہزار رکعت سے بڑھ کر ہوسکیں' اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے بزرگوں کے علم بھی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہی سے حاصل ہوئے ہیں اور سلسلہ برابر چلا جاتا ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کرام ہی کا فیض دوسرے بزرگوں کو پہنچا ہے۔

ل یعنی نور ہے ۱۲۔

اس کو مثال سے سمجھو' ریل کو چلتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں' اب میں اس کے متعلق دریافت کرتا ہوں کہ ریل میں جس قدر گاڑیاں لگی ہوتی ہیں ان کے چلنے کی تدبیر کیا ہے' ظاہر ہے کہ تدبیر اس کی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انجن میں آگ اور پانی سے اسٹیم[1] تیار کیا جائے اور دوسری گاڑیوں کا اس کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو جب انجن کے ساتھ ظاہری تعلق ہو جانے سے اول سے لیکر اخیر تک سب گاڑیوں میں انجن کا فیض آ گیا اور ساری گاڑیاں چل پڑیں' تو کیا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے تعلق رکھنے والوں میں' ان کا فیض نہ آئے گا اور ان میں کیا حرکت پیدا نہ ہوگی' ضرور ہوگی۔

خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کا آسان طریقہ:

اور اسی تقریر سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اگر کسی کو خدا اور رسول تک پہنچنا مقصود ہو تو اس کو چاہیے کہ اپنی زنجیر ان انجنوں سے ملا دے' جب ان کو حرکت ہوگی تو یہ بھی چل پڑے گا اور مقصود کو پہنچ جائے گا خوب کہا ہے کسی نے

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد   دست برپائے کبوتر زدو ناگاہ رسید

یعنی ایک چیونٹی کو شوق پیدا ہوا کہ کسی طرح کعبہ پہنچوں' لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ کعبہ تو بہت دور ہے اور بہت سے دقتوں کے بعد مدت میں وہاں پہنچنا ہوتا ہے بیچاری شوق کی ماری چیونٹی نے جب ان دشواریوں کو سنا اور اپنے کمزور وجود کو دیکھا' پھر دھوپ کی تیزی ہوا کی سختی' زمین کی تپش' سمندر کی موجوں کی طرف نظر کی تو بہت مایوس ہوئی' اسی حالت میں ناگاہ ایک رہبر پر اس کی نظر پڑی' جس کی صورت دیکھ کر دل کو تسلی ہوگئی کہ اس سے ضرور مراد حاصل ہوگی' بس اس کے پیروں پر گر گئی اور اس کی خوشامد کرنے لگی' اس نے کہا کہ اطمینان رکھو میں تمہیں آسان طریقہ مقصود تک پہنچنے کا بتاتا ہوں' لیکن شرط یہ ہے کہ خودرائی اور تکبر کو آگ لگا دینی پڑے گی' ورنہ اگر اس کو نہ چھوڑا تو پھر کوئی طریقہ نہیں۔

مشتاق چیونٹی نے تکبر اور خود رائی کے چھوڑ دینے کا وعدہ کیا' آخر تھوڑی دیر میں

---

[1] بھاپ ۱۲

حرم شریف کا ایک کبوتر نظر پڑا رہبر نے اسے دیکھ کر پہچانا اور چیونٹی سے کہا کہ مبارک ہو اب مقصود حاصل ہونے کا وقت قریب آیا' دیکھو یہ کبوتر حرم شریف کا ہے اگر اس کے قدم چومنے ناگوار نہیں اور اس کو ذلت نہیں سمجھتی تو بے کھٹکے اس کے پیروں سے لپٹ جاؤ اس کو تو خبر بھی نہ ہوگی اور تم اس کی ایک اڑان میں کعبہ کے اندر ہوگی' چیونٹی نے ایسا ہی کیا اور پہنچ گئی۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ بزرگوں کے ساتھ تعلق ہونا جیسا ضروری ہے کہ ان کے سامنے تکبر نہ ہو' ورنہ اگر تکبر باقی رہے گا تو مقصود سے ادھر ہی رہ جاؤ گے۔

تکبر نے ہماری راہ ماری:

صاحبو! یہ مضمون نہایت توجہ سے سننے کے قابل ہے' ہمارے مسلمان بھائیوں میں اس وقت بڑی کوتاہی یہ ہو رہی ہے کہ وہ ان حضرات کے ساتھ تکبر برتتے ہیں اور ایسے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں' اور وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی آمدنی بہت کم ہے آرام کا سامان ان کے پاس نہیں' نوکر چاکر نہیں رکھتے لباس بہت قیمتی نہیں پہنتے' جب دنیا دار لوگ اپنے لباس کے ساتھ ان حضرات کے لباس کا مقابلہ کرتے ہیں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے' دنیا داروں کا لباس تو سینکڑوں روپیہ کا ہوتا ہے۔ اور وہاں ایک چادر اور ایک تہبند ہے۔ بیٹھنے کی جگہ دیکھتے ہیں تو اپنے یہاں سینکڑوں روپیہ کے قیمتی فرش پاتے ہیں' اور وہاں چار پیسے کی ایک چٹائی' وہ بھی ٹوٹی میلی کچیلی' اس لیے سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے پاس سامان زیادہ ہے تو ہم ہی بڑے ہیں۔

تکبر کی مذمت:

مگر صاحبو! یاد رکھو کہ اس بڑے سمجھنے کی بدولت شیطان برباد ہوا جس کے برباد اور خراب ہونے سے آج تم خراب ہو رہے ہو' اس نے بھی یہی کیا تھا کہ اپنی ظاہری شان وشوکت یعنی آگ سے پیدا ہونا اور حضرت آدم کی ظاہری حقارت یعنی خاکی ہونا دیکھ کر اپنے کو بڑا اور ان کو چھوٹا سمجھا اور خدا تعالیٰ کے حکم کو بے جا بتلا کر ماننے سے انکار کر دیا'

لے رہبر رستہ بتلانے والا ۱۲۔

چنانچہ اس پر ارشاد ہے اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ یعنی اس نے حکم ماننے سے انکار کیا اور اپنے کو بڑا جانا اور کافروں میں سے ہو گیا' آج یہ مرض عام ہو رہا ہے۔

صاحبو! میں خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ اس ظاہری ٹیپ ٹاپ نے تمہیں گمراہ کر رکھا ہے' ظاہری حالت پر مدارمت رکھو' بلکہ حقیقت کو دیکھو' یاد رکھو کہ اگر آدمی ظاہری صورت سے ہوا کرتا تو رسول اللہ ﷺ اور ابو جہل میں کیا فرق رہتا' تو صورت اور لباس پر کمال کا دار ومدار نہ سمجھو بعض لوگ اسی دنیا کی شان وشوکت اور ٹیپ ٹاپ کو دیکھتے ہیں' چونکہ اللہ والوں کو اس سے خالی پاتے ہیں اس لیے اس کو حقیر سمجھتے ہیں' خوب سمجھ لو کہ ان کی سادگی اس وجہ سے ہے کہ ان کو بناوٹ کی ضرورت نہیں ہے۔

نہیں حاجت ہے زنیت کی جنہیں خوبی خدا نے دی
کہ جیسے خوشنما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے!

بزرگوں کی سادگی کی وجہ:

یہ ہے کہ ان حضرات کو ادھر توجہ نہیں ہوتی ہیں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر شریعت کا حکم نہ ہوتا تو یہ حضرات پاجامہ بھی نہ پہنتے' انہیں اتنا تعلق بھی زیب وزنیت سے بوجھ معلوم ہوتا ہے ان کی خواہش تو یہ تھی جیسے ذوق کہتا ہے

عریاں[1] ہی دفن کرنا تھا زیر زمین مجھے
اک دوستوں نے اور لگادی کفن کی شاخ

اور زینت اور لباس تو کیا چیز ہے' ان حضرات کی نظروں میں سلطنت کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہوتی' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حاکموں کی اطاعت بھی یہ لوگ نہیں کرتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے لیے اس کی خواہش نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کی حکایت:

ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ صرف ایک تہبند باندھے رہتے تھے اور کوئی کپڑا نہ

---

[1] یعنی ننگا

پہنتے تھے' ان کے بھائی اس وقت بادشاہ تھے' ایک روز انہوں نے ان بزرگ سے کہا کہ اگر آپ پاجامہ پہن لیتے تو اچھا تھا' آپ کے اس حال میں رہنے سے میری بھی بے عزتی اور ہتک ہے' انہوں نے کہا کہ اگر میں پاجامہ پہنوں گا تو اس کے لیے ایک کرتہ بھی ہونا چاہیے' بادشاہ نے کہا کرتہ بھی حاضر ہے' وہ بولے تو پھر ٹوپی جوتہ بھی ہو' بادشاہ نے کہا وہ بھی کیا مشکل ہے انہوں نے کہا تو پھر سواری کے لیے گھوڑا بھی ہو کہا وہ بھی حاضر ہے پھر کہا کہ سائیس بھی ہو اور اصطبل بھی ہو اور ان سب چیزوں کے لیے گاؤں بھی ہو' پھر اس شان کے مناسب فلاں فلاں سامان بھی ہو' پھر اس کے لیے ایک گاؤں کافی نہ ہوگا' بہت گاؤں ہوں' بادشاہ نے کہا یہ سب چیزیں حاض ہیں انہوں ن کہا تو پھر تخت اور تاج بھی ہونا چاہیے' بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے' تو آپ فرماتے ہیں کہ سارا جھگڑا ایک پاجامہ پہننے کی بدولت ہے مجھے پاجامہ ہی کی کیا ضرورت ہے کہ ان مصیبتوں میں پھنسوں۔

غرض ان حضرات کے نزدیک اس تمام سازوسامان کی کچھ بھی وقعت نہیں۔

دنیا کی بادشاہت کی حقیقت اور اس کی مثال:

ایک اور بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ انہوں نے ایک بادشاہ سے پوچھا کہ اگر تم کسی وقت شکار میں جاؤ اور اپنے ساتھیوں سے جدا ہو جاؤ اور پیاس کی شدت سے تمہارا برا حال ہو جائے اس وقت ایک شخص تمہارے پاس ایک پیالہ پانی لے کر آئے اور کہے کہ اگر مجھ کو آدھی سلطنت دے دو تو میں تم کو یہ پیالہ پانی دوں' تو اس وقت تم کیا کرو' بادشاہ نے کہا کہ میں آدھی سلطنت دے کر پیالہ خرید لوں گا' اس کے بعد ان بزرگ نے کہا کہ اگر اتفاق سے تم کو بند پڑ جائے اور کسی طرح پیشاب نہ اترتا ہو' تمام حکیم عاجز ہو جائیں اور اس وقت ایک شخص اس شرط پر پیشاب کرا دینے کا وعدہ کرے کہ باقی آدھی بادشاہت اس کو دے دو تو تم کیا کرو گے؟ بادشاہ نے کہا کہ باقی آدمی بادشاہت بھی دیدوں گا فرمایا کہ اب تو تم کو اپنی بادشاہت کی حقیقت اور اس کی قیمت معلوم ہوگئی ہوگی کہ صرف ایک پیالہ پانی' اور ایک پیالہ پیشاب اس کی قیمت ہے۔

صاحبو! آجکل جو کچھ ترقی کی پکار ہو رہی ہے اور دلوں میں ترقی کی محبت ہے صرف

اسی وجہ سے کہ آپ لوگوں نے ایک ہی چیز کو دیکھا اور پہچانا ہے۔ اگر دوسری طرف بھی کچھ نظر ہوتی تو یقینی بات ہے کہ آپ بھی وہی کہتے جو ہم کہتے ہیں' دنیا داروں کی اور جن چیزوں پر وہ جان دیتے ہیں بالکل ایسی مثال ہے جیسے آپ نے بچوں کو دیکھا ہوگا کہ بہت سا بالو جمع کر کے پیروں پر اس کو جماتے ہیں اور گھروندہ تیار کرتے ہیں اور اس کو اپنا بنایا ہوا گھر سمجھتے ہیں' اور خوش ہوتے ہیں اور جب ان کے بزرگ اس بے ہودہ حرکت سے روکتے ہیں تو لڑکے اپنے دل میں بہت خفا ہوتے ہیں اور اپنے کھیل پر اڑے رہتے ہیں۔ عقلمند لوگ ان کی اس حرکت کو دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں' تو بچوں کی خفگی اور اپنے کھیل پر اڑے رہنے کی وجہ یہی ہے کہ ان کی نظر اسی گھروندہ تک ہے ابھی تک عالی شان مکان اور بڑے بڑے محل ان کی نظروں میں نہیں آئے...... اور ان کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور اسی وجہ سے اپنے گھروندے کا بیکار ہونا ان کی سمجھ میں نہیں آتا' جس دن بڑا محل اور عالی شان مکان دیکھ لیں گے اس دن وہ بھی اپنے بزرگوں کے ہم خیال ہو جائیں گے' اسی طرح امت کے خیر خواہ آپ کو ان عالیشان کوٹھیوں اور محلوں میں پھنسا ہوا دیکھ کر اس مشغلہ پر ہنستے ہیں اور آخرت کی رغبت دلاتے ہیں' لیکن آپ ان چیزوں کی حقیقت نہ سمجھنے سے ان پر خفا ہوتے اور ان سے تکبر کرتے ہیں' ورنہ اگر آپ کو ان چیزوں کی حقیقت معلوم ہوتی تو اپنی اس حالت پر افسوس کرتے۔

دنیا سے بے تعلق ہونے کا مطلب:

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ بے گھرے ہو جاؤ اور جو کچھ تمہارے پاس ہے برباد کر دو' بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کو محبت چھوڑ دو اور اس سے دل مت لگاؤ۔

اللہ والوں کے نزدیک بادشاہت کی بھی کچھ قدر نہیں:

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ چونکہ ان لوگوں کے پاس کوئی چیز ہی نہیں اس لیے ان کو محبت اور تعلق بھی نہیں ''عصمت[1] بی بی از بے چاری۔'' کی حالت ہے تو میں کہوں گا کہ جس کا

[1] یعنی بی بی کے پاس چادر تو ہے نہیں جسے اوڑھ کر گھر سے باہر نکلیں اور ظاہر یہ کرتی ہیں کہ عصمت وجہ سے باہر نہیں نکلتیں ۱۲

جی چاہیے ان کے سامنے جائداد وغیرہ پیش کر کے دیکھ لے۔ صاحبو! جائداد تو کیا چیز ہے سلطنت تک پر انہوں نے لات ماردی ہے' سنجر شاہ نیمروز نے حضرت بڑے پیر صاحب کے پاس درخواست بھیجی کہ آپ کی خدمت میں کچھ حصہ سلطنت کا پیش کرنا چاہتا ہوں' مہربانی کر کے قبول فرمایئے' آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ مجھے تمہارے ملک کی کچھ ہوس نہیں ہے' اگر تمہارے پاس ملک نیمروز ہے تو میرے پاس ملک نیم شب ہے' یعنی آدھی رات کی عبادت' اس میں یہ لطیفہ بھی ہے کہ بادشاہ کے ایک کا نام ملک نیمروز تھا جس کے معنی ہیں آدھا دن کے' ایک اور بزرگ کہتے ہیں کہ فراغت کے ساتھ تھوڑی دیر محبوب کے ساتھ مشغول ہونا اس سے بہتر ہے کہ تخت شاہی اور چتر[1] شاہی میسر ہو اور تمام روز دنیا کے جھگڑے قصے ہوں تو ان حضرات کی ٹوٹی پھوٹی حالت کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اس سامان کی کچھ قدر نہیں ہے۔

دوسرے یہ وجہ بھی ہے کہ خود آقائے کریم ﷺ کو بھی یہی حالت پسند ہے جیسا کہ حدیث قدسی[2] میں ہے کہ میں ان سے قریب ہوں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں' مولانا روم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں[3] زمین کا حصہ نیچا ہوتا ہے پانی وہیں جاتا ہے' جسے کوئی درد ہوتا ہے دوا اسی کو دی جاتی ہے' جسے کچھ بیماری ہوتی ہے شفاء اس کو ملتی ہے تو چونکہ یہ ٹوٹی پھوٹی حالت ہی خدا تعالیٰ کو پسند ہے اس لیے ان حضرات کو بھی یہی پسند ہے۔

صاحبو! کیا آپ نے سنا نہیں کہ ''پیا جس کو چاہے وہی سہاگن ہو۔'' دیکھئے اگر کسی کو بازاری عورت سے عشق ہو جائے اور وہ حکم کرے کہ سر بازار لنگوٹا باندھ کر پھرو تو ضرور عشق ومحبت ایسا ہی کرنے پر مجبور کرے گا' اور اگر ایسا نہ کیا تو عشق کامل نہ سمجھا جائے گا'

ا؎ شعر یہ ہے: بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے — بہ ازآنکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

۲؎ چتر بادشاہ کے سر پر سایہ کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے چھتری ۱۲

۳؎ حدیث قدسی وہ ہے کہ جس میں خدا تعالیٰ کا کلام نقل کیا گیا ہو کہ وہ یہ فرماتے ہیں۔

۴؎ شعر یہ ہیں:

ہر کجا پستی است آب آنجا رود — ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود — ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

اللہ اکبر کیا انتہا ہے جب ایک بازاری عورت کی محبت میں یہ حالت ہو جاتی ہے تو خدا کے عشق میں کیا کچھ حالت ہونی چاہیے' بڑی غیرت وشرم کی بات ہے اگر اس کی سمجھ بھی نہ ہو' خوب کہا کہ

عشق مولے کے کم از لیلٰی بود

یعنی مولیٰ کا عشق کیا لیلیٰ کے عشق سے بھی کم ہوگا' غرض ان حضرات کو اس ٹوٹی ہوئی حالت کی وجہ سے حقیر نہ سمجھو اور تکبر اور غرور کو چھوڑ کر ان کے کہنے پر چلو اور اپنے اندر طلب کی شان پیدا کرو' جب یہ پیدا ہو جائے گی تکبر اور غرور خود جاتا رہے گا میں اس کی ایک زندہ مثال دیتا ہوں آپ نے اکثر رئیس دیکھے ہوں گے جن کو کیمیا کی تلاش ہوتی ہے اور اس تلاش میں ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جو شخص بھی کیمیا جاننے کا دعویٰ کرتا اس کی کیمیاگر سمجھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور اگر کہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ان کو کیمیا آتی ہے پھر تو اپنا نام اور عزت مال وجائداد سب ان کے پیچھے گنوا دیتے ہیں اور اگر کوئی ان کو سمجھاتا اور ملامت کرتا ہے تو اس کی پرواہ نہیں کرتے' بلکہ اور اس پر ہنستے ہیں' تو اس قدر ان کے پیچھے دیوانے اور ان کے کہنے میں کیوں ہو جاتے ہیں صرف اس واسطے کہ ان پر کیمیا آنے کا گمان ہے' پس جب اس گمان پر کیمیا جاننے والوں کا اس قدر کہنا مانتے ہیں اور اپنی شان وشوکت کو طاق میں رکھ دیتے ہیں اور کسی کے برا کہنے کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تو جن لوگوں کو سچ مچ کیمیا آتی ہے کہ اگر لوہے اور پتھر کو کندن کر دیں تو کوئی تعجب نہیں' ان کی اطاعت کرتے ہوئے تکبر اور غرور کیوں ہوتا ہے' خیر یہ بات تو درمیان میں آ گئی تھی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تعلق رکھنے کی برکت:

مقصود میرا یہ تھا کہ جب انجن میں یہ طاقت ہے کہ اس کے جوڑ دینے سے گاڑیاں منزل پر پہنچ جاتی ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تعلق ہو جانے کا یہ اثر نہ ہوگا' ضرور ہو گا۔

پس معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے واسطہ سے اب بھی وہ علم ومعرفت حاصل ہو سکتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد ولیوں پر بلا واسطہ بھی نور وبرکت نازل

ہوتے ہیں' کیونکہ یہ سلسلہ نہ ختم ہوا ہے نہ ہوگا' اب اس علم و معرفت کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طفیل کہیے یا خدا تعالیٰ کی بلا واسطہ عنایت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طفیل دونوں سمجھئے' غرض کہ یہ حاصل اب بھی ہوتا ہے اور یہی ایسی چیز ہے کہ اس کی بدولت ان کی دو رکعت دوسروں کی ہزار رکعت کے برابر ہے اسی علم نے صحابہ کرام کو اس مرتبہ تک پہنچا دیا' اور یہی علم و معرفت آج بھی ہزاروں کو اپنی اپنی لیاقت کے موافق بڑے بڑے درجوں پر پہنچا رہا ہے۔

عمل بغیر علم کے مفید نہیں:

غرض علم ایسی چیز ہے کہ عمل کوئی بھی علم بغیر مفید نہیں لیکن بعض علم بغیر عمل کے مفید ہوتے ہیں اگرچہ اس کا نتیجہ کوئی نہ کوئی عمل ضرور ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عمل کی طرف سے توجہ ہٹالی جائے' کیونکہ کمال علم کا ضرور عمل پر موقوف ہے۔

علم توحید کا کمال عمل سے ہے:

دور کیوں جائے توحید ہی کے عقیدہ کو دیکھ لیجئے کہ اس کی درستی اور صحت تو بیشک عمل پر موقوف نہیں لیکن نورانیت نیک اعمال سے ہی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ ایک عمل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب یہ مان لیا کہ خدا تعالیٰ کمال اور تصرف میں ایک ہے تو دوسروں سے خوف اور رغبت ایسا نہ ہونا چاہیے جیسا کہ اب ہم کو ہے، میں طالب علموں کو خصوصیت کے ساتھ کہتا ہوں' کیونکہ ان میں اکثر کو اپنے علم پر ناز ہوتا ہے' خاص کر عقیدوں کے بارے میں ہیں خود اپنے کو دیکھتا ہوں کہ عقیدے درست کرنے کی تو فکر ہے مگر عمل کی طرف ایسی توجہ نہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ عقیدہ کو بوجہ اصل ہونے کے کافی سمجھتے ہیں اور حالت ایسی ہے کہ گویا دل میں یہ جما رکھا ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں صرف عقیدہ کی پوچھ ہوگی' اس کے بعد اور کوئی پوچھ نہ ہوگی' اس لیے جو چاہو کرو۔

صاحبو! خدا کے لیے سنبھلو اور اپنی خبر لو' مجھ سے قنوج میں ایک عطر کے تاجر نے جو اہل حدیث تھے یہ کہا کہ ہم لوگوں کا حدیث پر عمل صرف چند مسئلوں میں ہے جن میں

حنفیوں سے اختلاف ہے جیسے آمین زور سے کہنا" ورنہ ہمارے عمل کی یہ حالت ہے کہ میں عطر کی تجارت کرتا ہوں اور اس میں تیل ملا کر بیچتا ہوں بے چارے سچے آدمی تھے صاف کہدیا کہ ہمارا حدیث پر عمل صرف دو چار مسئلوں پر ہے ہم لوگ حنفی ہیں خدا کا شکر ہے مگر یہ افسوس ہے کہ ہم نے بھی عقیدے ہی کی درستی پر کفایت کر لی ہے اور عمل کی ذرا فکر نہیں سر سے پیر تک دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں پرہیز گاری کا زیادہ خیال نہیں خالی محبت اور عقیدت پیر کے ساتھ کافی سمجھتے ہیں تو اس مرض کو دیکھ کر خدا تعالیٰ نے مجھے ایک بات سمجھائی ہے جو بالکل نئی ہے جس کا خلاصہ ابھی بیان کیا تھا لیکن اب ذرا کھول کر بیان کرتا ہوں کہ اگرچہ بعض علم ایسے ہیں کہ ان کی صحت اور ان کا نفع عمل پر موقوف نہیں بلکہ خود علم ہی سے نفع حاصل ہو جاتا ہے مگر قرآن و حدیث کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان علموں کا نتیجہ علاوہ اعتقاد کے جس پر نجات موقوف ہے کوئی عمل بھی ضرور ہے یعنی ایک نتیجہ تو ان کا یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی ان اعتقادوں کی برکت سے نجات ہو جائے گی چاہے ایک مدت تک عذاب کی تکلیف اٹھانے کے بعد بھی ہو اس کے سوا اور بھی ایک فائدہ ہے۔

مسئلہ تقدیر کے ماننے میں علاوہ نجات کے دنیا کی ایک بہت بڑی مصلحت ہے:

جو بغیر عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا جیسے تقدیر ہی کا مسئلہ لے لو کہ جہاں اس سے یہ غرض ہے کہ اس کے ماننے سے نجات ہوگی وہیں یہ غرض بھی ہے جس کو اس آیت میں ارشاد فرماتے ہیں مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ یعنی جو کچھ زمین میں یا تمہارے نفسوں میں کوئی مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ پہلے سے لوح محفوظ میں موجود ہے اور ہم نے پہلے سے اس لیے لکھا ہے اور تمہیں یہ عقیدہ اس لیے سکھایا کہ تم نقصان ہونے پر غمگین اور پریشان نہ ہو اور جو کچھ تم کو نعمت ملے اس پر اتراؤ نہیں۔" اس آیت میں صاف طور پر بتلا دیا کہ مسئلہ تقدیر میں ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ نقصان ہونے پر رنج اور صدمہ نہ ہو کیونکہ طبعی بات ہے کہ نقصان پر صدمہ ہوا کرتا ہے خدا تعالیٰ کی عنایت دیکھے کہ باوجود غنی اور بے پرواہ ہونے کے ہماری

مصلحت پر نظر فرمائی اور ہم کو ایسی بات بتلا دی جس میں بہت زیادہ ہماری تسلی کی سامان ہے اگر تم جہان کے عقلمند مل کر اس کی تدبیر کرتے تو ایسی بات ہاتھ نہ آتی جو خدا تعالیٰ نے بتلا دی وہ یہ کہ کہ ہم کو تقدیر کا مسئلہ سکھلایا۔

صاحبو! یہ ہی مسئلہ ہے جس کی بدولت ہم بڑی سے بڑی فکر اور مصیبت میں پڑ کر بھی اپنے دل کو تسلی دے دیتے اور غم کو دھو لیتے ہیں۔ اگر ہم کو یہ مسئلہ نہ سکھلایا جاتا تو کوئی طریق ہمارے پاس نہ تھا کہ جس سے ہم اپنے رنج کو دھو سکیں۔

تقدیر کے ماننے سے کیسی تسلی رہتی ہے اور اس کی ایک مثال:

اس کی حقیقت ایک مثال میں سمجھئے فرض کیجیے کہ دو شخص ایسے ہیں جن کی حالت ہر پہلو سے بالکل ایک سی ہے جو کچھ ساز و سامان' روپیہ پیسہ ایک کے پاس ہے وہی دوسرے کے پاس بھی ہے جو سامان آرام کا ایک کو میسر ہے دوسرے کو بھی ہے ایک ہی خاندان کے ایک ہی مزاج کے اور طبیعت کے ہیں مگر دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایک تقدیر کو مانتا ہے اور ایک نہیں مانتا' ان دونوں کو خدا تعالیٰ نے ایک ایک لڑکا بھی عنایت فرمایا ہوا ہے' اور دونوں نے اپنے اپنے لڑکے کو پڑھانے لکھانے میں ایک سی کوشش کی ہو اور وہ دونوں لڑکے نہایت اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوئے ہوں گے اور ٹھیک ایسے وقت میں جب کہ سارے گھرانے کی امیدیں ان کے ساتھ لگی ہوں اور ان کے پھلنے پھولنے کے دن آئے ہوں اور دونوں کا انتقال ہو جائے اور اتفاق سے ایک ہی مرض دونوں کو ہو اور ایک ہی حکیم کے علاج سے مرض بگڑ کر انتقال ہوا ہو' اس وقت ان کے والدین کے رنج و غم کا جو عالم ہوگا ظاہر ہے کہ دونوں کا رنج قریب قریب برابر ہوگا' کیونکہ دونوں کی حالت یکساں تھی لیکن تمام باتوں میں برابری کے ساتھ ایک فرق بھی دونوں میں تھا کہ ایک کو تقدیر کا انکار تھا اور دوسرا اس کو مانتا تھا' تو جس کو انکار تھا اس کا غم تو عمر بھر رہے گا اور جو تقدیر کو مانتا تھا اس کا غم بہت تھوڑی دیر باقی رہے گا' پھر فوراً جاتا رہے گا' کیونکہ اس کو یہ مضمون یاد آ جائے گا' قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ یعنی جو تقدیر میں لکھا جا چکا ہے وہی ہوتا ہے اور جو

معیت آتی ہے خدا کے حکم سے آتی ہے اور خدا تعالیٰ بڑے حکمت والے ہیں ان کو کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا اس لیے اس مصیبت میں مصلحت ضرور ہوگی' پھر اس کو حضرت خضر کا قصہ بھی یاد آ جائے گا جس کو قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے ایک لڑکے کو اس وجہ سے قتل کر دیا تھا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو ماں باپ کے دین کو بگاڑ دیتا اور ان کو کافر بنا دیتا اور اس کی نظر اس مصلحت پر بھی ہوگی جس کو ایک اعرابی نے سمجھا تھا' یہ قصہ بھی سننے اور غور کرنے کے قابل ہے' جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک اعرابی پرسا دینے کو آیا اور دو شعر پڑھے' مطلب ان کا یہ ہے کہ آپ ہمارے بڑے ہیں' صبر کیجیے تاکہ ہم چھوٹے بھی صبر کریں کیونکہ بڑوں ہی کے طریقے کو چھوٹے بھی سیکھتے ہیں اور آپ کیوں نہ صبر کریں' آپ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے انتقال پر جو ثواب ملا ہے وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ذات سے بہتر ہے تو آپ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے زیادہ نفع کی چیز مل گئی' اور عباس رضی اللہ عنہ کے لیے خدا تم سے بہتر ہے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو تم سے اچھی چیز مل گئی' یعنی خدا تعالیٰ کی نزدیکی' پس نہ تمہارا نقصان ہوا اور نہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا' پھر کیا وجہ صبر نہ کرنے کی' اگر کوئی اور مصلحت سمجھ میں نہ آئے تو ایک یہی مصلحت تسلی کے لیے کافی ہے' یعنی ثواب پس تقدیر کے ماننے والے کی تو ضرور ان باتوں سے تسلی ہو جائے گی' لیکن جس کو تقدیر کا انکار تھا اس کے پاس تسلی اور اطمینان کا کوئی ذریعہ ہی نہیں وہ عمر بھر اسی رنج میں رہے گا کہ افسوس میں نے فلاں تدبیر کیوں نہ کی اور فلاں حکیم سے علاج کیوں نہ کرایا' کبھی اپنی غلطی سمجھے گا' کبھی علاج کرنے والے کی بے پرواہی سمجھے گا اور اس کو بھلا برا کہنا شروع کرے گا لیکن وہ ہزار شکایت کرے بلکہ حکیم کو سزا بھی کرادے لیکن اس کے دل کی حسرت کسی طرح کم نہ ہوگی کیونکہ اس کو ہمیشہ یہ خیال رہے گا کہ اگر میں تدبیر کرتا تو ضرور آرام آ جاتا تو اس کا غم اس کی عمر کے برابر ہے کہ جب تک زندہ رہے گا غم ورنج ہی میں رہے گا' اور جس کا تقدیر پر ایمان تھا اس کا غم زیادہ سے زیادہ ہفتہ دو ہفتہ تک رہے گا' اس مثال سے معلوم ہو گیا کہ ہر علم سے کچھ نہ کچھ کام ضرور لیا گیا ہے' قرآن اور حدیث کو غور سے دیکھا جائے تو اس قسم

کے فائدے علم کے کثرت سے ملیں گے' غضب کی بات ہے کہ اس قدر فائدے سے اور ان پر بالکل نظر نہ کی جائے۔

ان علموں کے فائدے پر اگر نظر ہو تو بہت سے شبہوں کا خاتمہ ہو جائے:

اگر ان پر نظر ہو تو بہت سے شک اور شبہوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جیسا کہ تقدیر ہی کا مسئلہ ہے کہ اس پر بہت سے شبہے ہوتے ہیں لیکن ان کا فائدہ معلوم ہو جانے سے سب جاتے رہتے ہیں کیونکہ جو شخص فائدہ سمجھ کر اس سے کام لے گا اس کو شبہ واقع ہونے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔

خدا تعالیٰ کے پہلے آسمان پر اترنے کے متعلق شبہ اور اس کا جواب:

اسی طرح حدیث میں جو آیا ہے کہ خدا تعالیٰ اخیر رات میں پہلے آسمان پر نازل ہوتے ہیں اس پر شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا یہ خاصہ تو جسم کا ہے اور خدا تعالیٰ جسم سے پاک ہیں۔

صاحبو! مجھے اسی کی شکایت ہے کہ ان شبہوں کی نوبت کیوں آتی ہے کیونکہ یہ شبہے تو اسی کو ہو سکتے ہیں جو اس علم کی غرض پر نظر نہ کرے اور اس سے فائدہ نہ اٹھانا چاہے' جس دن اس غرض کی خبر ہو جائے گی اعتراض ہی پیدا نہ ہوں گے' اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص قصبہ کے تحصیلدار کو یہ اطلاع کرے کہ صاحب کلکٹر یہاں سے چھ میل کے فاصہ پر ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں اور تحصیلدار اس خبر کو سن کر اعتراض کرنے لگے کہ وہ کس طرح یہاں پہنچ گئے اور کس سواری پر آئے اور تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ یہ مسافت چھ میل کی ہے' اور تم نے کیسے پہچانا کہ وہ کلکٹر ہے وغیرہ وغیرہ تو سمجھا جائے گا کہ تحصیلدار کو اپنے تحصیل کے کام کی فکر نہیں اور اس کو معلوم ہوا نہیں کہ کلکٹر کس غرض سے دورہ کر رہا ہے' اگر اس دورہ کی غرض اسے معلوم ہوتی تو ہرگز اس کو ایسے اعتراض نہ سوجھتے بلکہ اپنے کام کی فکر ہوتی اور سب سے پہلے اپنے کام کو درست کرتا جب اس سے فراغت ہوتی اس کے بعد اس قسم کے سوال کرنے کی گنجائش تھی' پس اس اطلاع سے کہ خدا تعالیٰ پہلے آسمان پر نازل

ہوتے ہیں ہم کو یہ جتلانا مقصود ہے کہ وہ تمہارے طرف توجہ فرماتے ہیں، تم ان کی طرف توجہ کرو اور اس نے تم کو یہ شرف بخشا ہے تو اس کی قدر کرو، یہ بات تھی جس کو حضور نے یاد دلایا تھا، تا کہ اپنے آقا اور مولا کی نزدیکی معلوم کر کے جو کچھ کرنا ہے کر لو۔

لوگ کرنے کا کام تو نہیں کرتے، ناحق کے شبہے کرتے ہیں:

مگر افسوس کہ ہم نے کرنے کا کام تو نہ کیا، ہاں اس حدیث میں شک وشبہات پیدا کر لیے مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے، اس میں یہ حدیث آئی کہ نماز میں اگر دل پوری طرح حاضر ہو اور دل میں کسی طرح کا وسوسہ نہ لائے تو پہلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس پر ایک طالب علم نے اعتراض کیا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وسوسہ بالکل نہ آئے، مولانا نے فرمایا کہ میاں کبھی اس کا ارادہ تم نے کیا بھی ہے اس کی کوشش بھی کر کے دیکھی ہے اگر کر کے دیکھتے اور پھر حاصل نہ ہوا ہوتا تو یہ سوال زیبا تھا۔

خوب کہا ہے

سودا قمار عشق میں شیریں ہے کہ کہن،
بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

صاحبو! فرہاد اپنے عشق میں چاہے کامیاب نہ ہو سکا لیکن آج عاشقوں کے دفتر میں اس کا نام سب سے اول ہے اس لیے کہ اس نے اپنی طاقت بھر کوشش تو کی اگر تم بھی کوشش کرتے اور ناکام رہتے تو تمہارے سوالات بھی قابل قدر تھے مگر اب تو کچھ بھی نہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا کی زندگی اعتراض اور سوال کے لیے نہیں ہے بلکہ عمل اور حال کے لیے ہے، ہاں! جب کہ جنت میں پہنچ جاؤ گے اور پورا اطمینان نصیب ہو جائے گا، اس وقت فرصت میں پوچھ لیجئے گا کہ خدا تعالیٰ کے نازل

ہونے کے کیا معنی تھے' دیکھیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سب کچھ سنا لیکن کبھی نہ پوچھا کہ یہ کیونکر ہوتا ہے اور اس سے تو کیا پوچھتے ایک ہلکی سی بات کو پوچھتا تھا کہ چاند گھٹتا بڑھتا کیوں ہے' اس کا کیا سبب ہے کہ سورج کی طرح ایک حالت پر نہیں رہتا اس کی بابت بھی یوں ارشاد فرمایا گیا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

یعنی آپ سے چاند کی بابت دریافت کرتے ہیں (کہ اس کے گھٹنے بڑھنے کا سبب کیا ہے) آپ فرما دیجیے (کہ سبب کا پوچھنا فضول بات ہے اس کی مصلحت دریافت کرو اور مصلحت یہ ہے کہ) اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنے کاموں کا وقت معلوم ہوتا ہے اور حج کا...... خلاصہ یہ ہے کہ بے کار سوالات کے جواب کی ضرورت نہیں' نہ اس قسم کے سوالات کی اجازت ہے اپنے کام میں لگا رہنا چاہیے'

کسی شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدا تعالیٰ سے کیا کیا باتیں ہوئیں تو انہوں نے جواب دیا

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد!

یعنی اب کس کا منہ ہے کہ ان راز و نیاز کی باتوں کو پوچھ سکے یا معلوم کر سکے اس کو تو وہی جانے اور اس کا حبیب جانے۔

خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کے اسرار دریافت کرنے کی ممانعت:

تو صاحبو! خدا تعالیٰ کے ذات و صفات کے بارہ میں کس کو حق ہے جو کچھ زبان کھول سکے اور کس کا دماغ ہے جو کچھ سمجھ سکے ارشاد خداوندی ہے اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ کہ خدا تعالیٰ کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور جب وہ تمام جہان کو گھیرے ہوئے ہے تو ایک کمزور انسان کا علم اس کی ذات اور صفات کو پوری طرح کیونکر گھیر سکتا ہے' اگر پانی کا کیڑا جہان بھر کے راز دریافت کرنے کی کوشش کرے اور چاند سورج پر جن کا

عکس پانی میں اس کو نظر آتا ہے' اپنی رائے لگانے لگے تو کیا وہ ان کی پوری مقدار کو دریافت کر سکے گا ہرگز نہیں اسی طرح اگر پتھر کا کیڑا پتھر کے اندر رہ کر سنے کہ پتھر سے باہر بہت چیزیں دنیا میں ہیں اور وہ ان سب کی حقیقت وہاں ہی ڈھونڈنے لگے اور جب اس کی سمجھ میں نہ آ سکے تو وہ ان چیزوں کے وجود ہی کا انکار کر دے تو کیا اس کا انکار اس قابل ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے یا اس کی جستجو اس لائق ہے کہ اس کو کچھ وقعت دی جائے کبھی نہیں' یاد رکھو جن لوگوں نے کچھ سمجھ لیا ہے وہ تو یوں کہتے ہیں کہ جہان کے راز کیا ڈھونڈتے ہو' عشق ومحبت کے راز دار بنو' جہاں کے راز تو نہ کسی نے عقل سے معلوم کیے نہ کوئی کھول سکتا ہے'

اے سائنس[1] کے عاشقو! سائنس کی تلاش اس وقت کیجیو! جب آپ کو اپنے ضروری کام سے فرصت ہولے' ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھئے آپ کس منجدھار میں پھنسے ہیں آپ کو ابھی عشق کے دریا سے پار اترنا ہے' اس کو چھوڑ کر آسمانوں اور ستاروں کی فکر میں کہاں جا پھنسے' غرض ان کاموں میں پڑنا ایک بے کار مشغلہ ہے۔

سائنس کے مسئلے قرآن شریف میں دریافت کرنا حماقت ہے:

پھر آج اس سے بھی زیادہ یہ غضب کیا جا رہا ہے کہ سائنس کے ان بیہودہ مسئلوں کو قرآن مجید میں تلاش کیا جاتا ہے' صاحبو! اس قسم کے مسئلوں کا قرآن شریف میں تلاش کرنا ایسا ہے جیسا طب[2] اکبر میں جوتیاں سینے کی ترکیب تلاش کرنا۔ غرض جو شخص کام میں لگے گا اس کو اس قسم کی خرافات کی طرف توجہ نہ ہوگی' اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس قسم کے سوال نہ کرنا بتا رہا ہے کہ یہ سوال غیر ضروری اور بے کار ہیں' صرف اسی قدر سمجھنا کافی ہے کہ یہ تمام چیزیں کسی کی بنائی ہوئی ہیں' خود نہیں بن گئیں تو ان کا بنانے والا بھی ضرور ہوگا۔

---

[1] سائنس وہ علم ہے جس میں جہان کی چیزوں کی حقیقت عقل سے بیان کی جاتی ہے ۱۲۔

[2] طب اکبر نسخوں کی ایک کتاب کا نام ہے ۱۲۔

علاوہ نجات کے توحید کی ایک دوسری غرض:

اب توحید کو لیجیے کہ اس کی کیا غرض ہے اور اس سے کیا کام لینا مقصود ہے اس کو میں پہلے بھی کسی قدر بیان کر چکا ہوں' مگر اب دوبارہ ذرا کھول کر بیان کرتا ہوں کہ ہم کو یہ سکھلایا گیا ہے۔

قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدْO اَللّٰهُ الصَّمَدُO لَمْ يَلِدْO وَلَمْ يُوْلَدْO وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدْO

کہ خدا کا کوئی شریک نہیں وہ بے نیاز ہے' نہ اس نے کسی کو جنا نہ کسی نے اس کو جنا نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔

اس عقیدہ کی ایک غرض تو یہ ہے کہ اس کے ماننے سے ہم کو نجات حاصل ہو دوسری غرض اس کی یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کے غیر پر نظر نہ ہو اور اس کے سوا کسی سے امید اور ڈر نہ ہو کیونکہ یہ طبعی بات ہے کہ جب کسی بہت بڑے سے تعلق ہو جاتا ہے تو چھوٹوں کی دہشت یا احتیاج دل میں باقی نہیں رہا کرتی۔

اکبر بادشاہ کی حکایت بطور مثال کے:

اکبر بادشاہ کی حکایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ شکار میں گیا' اتفاق سے تن تنہا کہیں دور نکل گیا' ایک دیہاتی کے ہاں مہمان ہوا' جب چلنے لگا تو اس دیہاتی سے کہا کہ اگر تم کو کبھی حاجت واقع ہو تو تم ہمارے پاس آنا' ایک مرتبہ اسے کچھ ضرورت ہوئی تو وہ بادشاہ کے پاس گیا' اکبر اس وقت نماز پڑھ رہا تھا' نماز سے فارغ ہو کر اس نے دعا مانگی جب دعا بھی ختم کر چکا تو اس دیہاتی نے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے تھے' اکبر نے کہا کہ میں خدا تعالیٰ سے دعا مانگ رہا تھا' دیہاتی نے کہا کہ کیا تم کو بھی کسی سے مانگنے کی ضرورت ہے؟ اکبر نے کہا کہ بیشک خدا سے مانگنے کی مجھے بھی ضرورت ہے' کہنے لگا' پھر مجھے تجھ سے حاجت کہنے کی کیا ضرورت ہے جو تمہاری شاہانہ حاجتیں بڑی بڑی پوری کرے گا کیا وہ میری غریبانہ حاجتیں معمولی سی نہ پوری کرے گا' تو یہ دل کا غنی ہونا اس توحید ہی کے رنگ کے بدولت تھا' جو ذرا سی مدد پا کر جھلک اٹھا' اسی طرح عقیدے کے ہر مسئلہ کی غرض آپ

حدیث میں ملے گی جس سے معلوم ہوگا کہ ان عقیدوں سے عمل میں بہت کچھ کام ہے تو ان پر بالکل نظر نہ کرنا بڑا ظلم ہے' ان کو بھی لینا چاہیے۔

جس طرح ہر عمل کو علم سے تعلق ہے اسی طرح ہر علم کو بھی عمل سے تعلق ہے:

اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس طرح ہر عمل کے لیے علم ضروری ہے اسی طرح ہر علم کے لیے ایک درجہ میں عمل بھی ضروری ہے' یہ دوسری بات ہے کہ اس علم کی صحت عمل پر موقوف نہ ہو لیکن اس کا تعلق عمل سے ضرور ہے پس یہ بڑی کمی ہوگی کہ صرف علم کو ہی بیان کر کے چھوڑ دیا جائے اور اس کا جس عمل سے تعلق ہے اس کو نہ بیان کیا جائے' اسی واسطے میں نے اس آیت کو اس وقت پڑھا ہے تاکہ مولوی شبیر احمد صاحب نے جو علم کے متعلق بیان کیا ہے اس کے بعد اسی آیت کا عمل کے متعلق بھی بیان ہو جائے۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ ایک شکایت کو ظاہر فرما رہے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ تم لوگ دنیا سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو اور یہاں پر دنیا کی محبت کے بعد آخرت کے چھوڑنے کا ذکر فرمانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دنیا کی محبت سے کیا مراد ہے' یعنی دنیا کی محبت اسے کہیں گے جس میں آخرت چھوٹ جائے' اور اسی سے اس حدیث کے معنی بھی سمجھ میں آ گئے ہوں گے کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے یعنی ہر گناہ سے بڑھ کر گناہ ہے تو یہ اسی محبت کو کہا گیا ہے جس کی بدولت آخرت چھوٹ جائے' ورنہ اگر آخرت نہ چھوٹے تو وہ دنیا کی محبت نہ سمجھی جائے گی اور اس کی یہ مذمت نہ ہوگی خواہ دنیا کی طرف پیدائشی رغبت ہو اور ضرورت کے لائق اس کو حاصل بھی کیا جائے اس کا کوئی مضائقہ نہیں مگر آخرت سے غفلت نہ ہو' اس حقیقت کے معلوم کر لینے سے بہت سے شبہے جاتے رہیں گے۔

ترقی خواہوں کے اس اعتراض کا جواب کہ مولوی ہم سے دنیا کو چھڑاتے ہیں مع ایک حکایت کے:

کیونکہ آج کل ترقی پر جان دینے والے یہ سمجھتے ہیں کہ مولوی ہم کو دنیا کے حاصل

کرنے سے بالکل روکتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہم مسجد کے ملا ہو کر بیٹھ رہیں چنانچہ ان لوگوں نے اس قسم کی ایک حکایت بھی گھڑی ہے کہتے ہیں کسی بادشاہ کے ہاں بہت سے مولوی جمع ہو گئے تھے' سب نے اتفاق کر کے بادشاہ سے کہا کہ فوج پر یہ روپیہ فضول خرچ ہو رہا ہے سب کو موقوف کر دو' اس نے کہا کہ فوج اس ضرورت سے رکھی ہے کہ اگر کوئی غنیم[1] آئے تو یہ اس کو دفع کریں' مولویوں نے کہا کہ اگر ایسا ہوگا تو اس کام کو ہم انجام دیں گے غرض فوج موقوف کر دی گئی' یہ خبر مشہور ہوئی تو کوئی غنیم آ چڑھا' بادشاہ نے مولویوں کو خبر کی' یہ لوگ کتابیں لے کر پہنچے اور غنیم کو وعظ و نصیحت کی' وہ کیوں سننے لگا تھا آخر ناکام واپس آئے اور بادشاہ سے کہا کہ وہ بڑا نالائق ہے مانتا نہیں' خیر پھر آپ ملک چھوڑ دیجئے' آپ کا ملک گیا اس کا ایمان گیا' تو یہ حکایت گھڑ رکھی ہے اور اسے سنا کر کہا کرتے ہیں کہ ہم مولویوں کے کہنے پر چلیں تو گھر بار سب کو چھوڑ دیں۔

صاحبو! یہ حکایت تو محض گھڑت اس کی کچھ اصل ہی نہیں' جس کا جواب دیا جائے لیکن میں اصل اعتراض کی نسبت کہتا ہوں کہ آپ لوگ کسی مولوی کے پاس رہے نہیں اس لیے آپ کو اس قدر وحشت اور ناواقفی ہے چند روز تک اگر کسی مولوی کے پاس رہیے تو انشاء اللہ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مولوی آپ کو کیا سکھلاتے ہیں اور اگر کہیے کہ ہم اتنا وقت کہاں سے لائیں کہ مولویوں کے پاس جا کر رہیں تو میں کہوں گا کہ آپ کو اگر کوئی جسمانی بیماری ہو تو آپ رخصت لیتے ہیں یا نہیں اور اس رخصت میں تین تین چار چار مہینے گنوا دیتے ہیں یا نہیں۔

امراض روحانی کے علاج کے لیے چالیس روز کافی ہونا:

تو جب جسم کی بیماریوں کے لیے ایک انگریزی ڈاکٹر کے کہنے سے چار مہینے فضول برباد کر دیتے ہو تو روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے ایک مذہبی ڈاکٹر کے کہنے سے چار مہینے کی جگہ چالیس دن ہی اس کے پاس رہ لو' اور یہ بھی ضروری نہیں کہ معتقد ہو کر رہو بلکہ امتحان کے طور پر رہنے کی بھی اجازت ہے ہاں مخالف ہو کر نہ رہو' اس سے زیادہ اور کیا

[1] غنیم: دشمن ۱۲

آسانی ہوگی کہ عمر بھر میں سے صرف چالیس دن مانگے جاتے ہیں' واللہ اگر آپ ایسا کر لیں تو قریب قریب سب شبہوں کے علاج خود بخود بلا بحث آپ کی سمجھ میں آ جائیں' اور چالیس دن کی قید اپنی رائے سے نہیں کرتا بلکہ خود حدیث سے ہم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اگر چالیس دن تک کسی دین کے کام کو نباہ کر کے کرلیں تو پھر خدا تعالیٰ کی طرف سے ہماری مدد ہوتی ہے' حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص چالیس دن اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر دے تو خدا تعالیٰ اس کے دل سے حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے حضور ﷺ پر قربان ہو جائیے کہ ہر ہر ضرورت کا ہمارا خیال رکھا ہے اور اس کے لیے ایک طریقہ ہم کو بتلا دیا ہے کہ اس کے موافق اطمینان سے ہم کام کر سکیں اور وہ طریقہ یہ ہے کہ خلوص کے ساتھ چلہ کریں مگر ایسا چلہ نہ ہو جیسا ایک گنوار نے کیا تھا کہ اس کو ایک مولوی صاحب نے نماز پڑھنے کے لیے کہا اور چلہ بھر پڑھنے پر ایک بھینس دینے کا وعدہ کیا' جب چلہ پورا ہو گیا تو یہ شخص مولوی صاحب کے پاس گیا اور کہا چالیس دن پورے ہو گئے' اب بھینس دیجئے' مولوی صاحب نے کہا کہ بھائی میں نے تو اس لیے کہہ دیا تھا کہ اگر تو نے چلہ بھر جم کر نماز پڑھ لی تو عادت پڑ جائے گی اور پھر نہ چھوٹ سکے گی' کہنے لگا بہتر ہے نہ دیجیے جاؤ' پھر یاروں نے بھی بے وضوء ٹرخائی ہے' تو جیسے اس کو بے وضو نماز پڑھنے کی وجہ سے کچھ اثر نہ ہوا اسی طرح اگر تم بھی مولوی صاحب کے پاس جا کر رہنے میں دنیا کی کوئی نیت کرلو گے جیسے یہ نیت ہو کہ مولوی صاحب کے پاس رہ کر خوب دعوتیں کھانے کو ملیں گی تو خاک بھی اثر نہ ہوگا' بلکہ میں یہ بتلائے دیتا ہوں کہ اگر کسی مولوی کے پاس جا کر رہنے کا قصد ہو تو آپ کو اپنے پاس ہی سے کھانا بھی ہوگا' تاکہ خرچ کر کے اس کی تعلیم کی قدر تو ہو کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز مفت آتی ہے اس کی کچھ قدر بھی نہیں ہوا کرتی اس لیے اس تعلیم کا معاوضہ یہ ہے کہ چالیس دن تک اپنا خرچ کر کے رہو' مجھے حضرت حاجی صاحب قبلہ نے ایک کتاب چھپوانے کے لیے فرمایا تھا' میں نے اسے مفت تقسیم کرنے کا خیال ظاہر کیا' فرمایا بھائی مفت تقسیم نہ کرنا' کیونکہ لوگ دیکھیں گے بھی نہیں۔

غرض! مولویوں سے وحشت یا ان پر اعتراض یا اسلام کے مسئلوں میں شک اسی

وقت تک ہے جب تک آپ ان کے پاس جا کر رہتے نہیں مگر نہایت افسوس ہے کہ شبے بھی ظاہر کرتے ہیں اور اس کا بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم کو علم کی طلب ہے، مگر یہ توفیق نہیں ہوتی کہ چالیس دن کسی مولوی کے پاس جا کر رہ لیں۔

قصبہ کیرانہ میں ایک تحصیلدار صاحب ایک شخص کو میرے پاس لائے اور کہا ان کو اسلام کے بعض مسئلوں میں شک اور شبہ ہے، میں نے کہا کہ ان شبہوں کا علاج یہ نہیں کہ اس تھوڑی دیر کے جلسہ میں یہ ان کو پیش کریں اور میں جواب دے دوں اور یہ سن کر چلے جائیں، ان کا علاج یہ ہے کہ چند روز کے لیے میرے پاس تھانہ بھون آ کر رہیں اور میں جو کہا کروں اس میں یہ غور کیا کریں، ان صاحب نے نہایت زور کے ساتھ تھانہ بھون آ کر رہنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن مدت گزر گئی اور ان کا وعدہ پورا نہیں ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگ اپنی اس حالت کو مرض ہی نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ اتنا بڑا مرض ہے کہ کوئی مرض بھی اس کے برابر نہیں، پھر مرض بھی پرانا ہے تھوڑی دیر کی ملاقات میں اس کا جانا آسان نہیں، کم سے کم ایک چلہ ضرور علاج کرنے والے کے پاس رہنا چاہیے جیسا کہ حدیث میں بتلایا گیا ہے خدا کے لیے صاحبو! اس علاج کو آزما کر تو دیکھو، اب چونکہ میں نے اصل علاج بتلا دیا ہے کہ اگر اس کو کیا جائے تو اس سے تمام شک اور شبے جاتے رہیں گے، اس واسطے مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ میں لوگوں کے ایک ایک شبہ کا جواب دوں، لیکن اس آیت میں ایک بات آ گئی ہے، تو خیر بتلائے دیتا ہوں کہ آیت میں اول یہ فرمایا کہ دنیا سے محبت کرتے ہو، آگے یہ بڑھا دیا کہ آخرت کو چھوڑ دیتے ہو، اس لفظ کے بڑھا دینے سے اس شبہ کا جواب ہو گیا، مولوی دنیا کو ہم سے چھوڑانا چاہتے ہیں اور اس حدیث پر سے بھی شبہ جاتا رہا کہ دنیا کی محبت چوٹی ہے ہر گناہ کی، کیونکہ اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ دنیا کی محبت وہی ہے جس سے آخرت چھوٹ جائے نہ کہ دنیا کمانا پس دنیا کا کمانا جائز ہے اور دنیا کی محبت ناجائز ہے، کمانے اور محبت میں وہی فرق ہے جو غلیظ کے کمانے میں اور کھانے میں کہ اول تو برا نہیں اور دوسرا برا ہے اور سخت عیب کا کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ شکایت میں یہ فرمایا کہ دنیا سے محبت کرتے ہو اور یہ شکایت

نہیں کی کہ دنیا کماتے ہو اب اپنی حالت دیکھ لیجئے کہ آپ کس فریق میں ہیں' دنیا سے محبت کرنے والوں میں یا دنیا کمانے والوں میں اس پر اگر کوئی نیم ملا یہ شبہ کرے کہ یہ آیت تو کافروں کے بارہ میں ہے اس واسطے ہم مسلمانوں کو اس سے کیا کھٹکا ہے اور ہمیں اپنی حالت کو اس کے ساتھ ملانے کی کیا ضرورت ہے' اس قسم کے شبہے عام لوگوں کو نہیں ہوتے' کیونکہ ان کو کچھ خبر ہی نہیں ان بیچاروں سے جو بات کہدی گئی انہوں نے سن لی اور عمل کر لیا' اور مولویوں کو بھی یہ شبہات نہیں ہوتے' کیونکہ ان حضرات کی نظریں اصل حقیقت تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں' ہاں نیم ملا لوگوں سے جو بوجہ نیم ہونے کے کڑوے بھی ہیں' ڈر لگتا ہے کہ وہ قرآن شریف کا ترجمہ دیکھ کر یہ اعتراض نہ جڑ دیں کہ یہ آیت کو مکی ہے' اس وقت اتری ہے جبکہ آپ مکہ میں تھے' مدینہ کی ہجرت بھی نہ کی تھی اور اس وقت کی مذمت کی آیتیں کافروں کے حق میں ہیں نہ مسلمانوں کے حق میں' پھر مسلمانوں کو اس سے کیا تعلق ہے' تو اس شبہ کا جواب عرض کرتا ہوں اور میں نے یہ مضمون اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بعض جلسوں میں بیان کیا ہے۔

کوئی آیت خفگی کی کافروں کے حق میں ہو تو مسلمان کو اس سے بے فکر نہ ہونا چاہیے:

وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ یہ سن کر کہ فلاں آیت کافروں کے حق میں ہے بے فکر ہو جاتے ہیں حالانکہ اس سے بے فکر نہ ہونا چاہیے بلکہ زیادہ فکر میں پڑ جانا اور زیادہ اثر لینا چاہیے کیونکہ جب کوئی آیت خفگی کے مضمون کی کافروں کے حق میں نازل ہوتی ہے تو دیکھنا یہ چاہیے کہ یہ خفگی کافروں پر ان کی ذات کی وجہ سے ہوئی ہے یا کسی صفت کی وجہ سے ہوئی ہے ظاہر ہے کہ ذات کی وجہ سے یہ خفگی نہیں ہو سکتی کیونکہ ذات میں تو سب انسان ایک ہیں' خواہ دیندار ہوں یا بے دین ہوں' اگر ذات کی وجہ سے ہوتی تو سب پر ہوتی' معلوم ہوا کہ کسی صفت کی وجہ سے یہ خفگی ہوئی ہے اور کوئی خاص برائی ان کے اندر پائی گئی تھی جو سبب ہوئی اس خفگی کا تو اگر وہ برائی کافروں کے سوا کسی اور شخص میں بھی پائی جائے تو وہ

شخص بھی اس خفگی میں آ جائے گا' اسی آیت کو لیجئے کہ اس میں خفگی اور ناراضی کا مدار دنیا کی محبت پر ہے اگر دنیا کی محبت تمہارے اندر پائی جائے گی تو تم بھی اس ناراضی میں داخل ہو جاؤ گے پس اب اپنی حالت میں غور کر لو' اگر اپنے اندر دنیا کی محبت دیکھو تو بہت جلد اس کا علاج کرو اور اپنی حالت پر افسوس کرو کہ جو باتیں اسی زمانہ میں کافروں کے اندر ہوتی تھیں وہ آج تمہارے اندر جو مسلمان کہلاتے ہو' پائی جاتی ہیں۔

اسی طرح حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ ''یعنی جس نے بلا مجبوری کے نماز چھوڑی وہ کافر ہو گیا۔''

جب اس میں یہ تاویل[1] کی گئی کہ سچ مچ کافر نہیں ہوا بلکہ کافر جیسا ہو گیا تو لوگ بے فکر ہو گئے' حالانکہ یہ بے فکری کی بات نہیں بلکہ اگر تاویل اس میں نہ ہوتی' اور سچ مچ کافر ہونا مراد ہوتا تو ایک لحاظ سے زیادہ مرن کی بات نہ تھی' کیونکہ اگر چمار کو چمار کہہ دیا جائے تو اس کو کچھ غیرت نہ آئے گی اور اگر کسی شریف کو چمار کہہ دیا جائے تو اس کو مر جانا چاہیے' تو تاویل کرنے سے ایک قسم کی جھڑکی بڑھ گئی اور ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہو گئی' مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ سمجھ سے کام نہیں لیتے' خدا کا شکر ہے کہ ادھورے پڑھے ہوؤں کا شبہ جاتا رہا۔

آیت متعلق ایک شبہ کا جواب:

لیکن ایک شبہ تین پاؤ پڑھے ہوؤں کا رہ گیا کہ آیت میں دنیا کی محبت اور آخرت کے چھوڑنے سے وہ مراد نہیں ہے جو صرف عمل کے لحاظ سے ہو بلکہ وہ مراد ہے جو اعتقاد کے درجہ میں ہو اور ہم میں یہ بات نہیں ہے' کیونکہ ہم تو خدا کے فضل سے قیامت کو مانتے ہیں' دنیا کو چند روزہ جانتے ہیں' جواب اس کا ظاہر ہے' کہ قرآن مجید میں کہیں یہ قید نہیں ہے کہ یہ خفگی خاص اس پر ہے جس کا اعتقاد ایسا ہو' بلکہ آیت عام ہے کہ جو بھی دنیا کی محبت کرے اور آخرت کو چھوڑے' پس اس قسم کی قید لگانا قرآن کے مقصود کو باطل کرتا ہے۔ اور اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک پردیسی نے ایک جلسہ میں بیٹھ کر کہنا شروع کیا۔ میں جب یہاں آیا تو ایک عورت سے میری آشنائی ہو گئی اور میں اس کے گھر جایا کرتا تھا اور اس کا

[1] تاویل یہ ہے کہ کلام کے ظاہری معنی چھوڑ کر ایسے معنی مراد لیے جائیں جو ظاہر نہ ہوں ۱۲

گھر ایسا ایسا تھا اور اس کا شوہر ایک بار آ گیا تھا اور اس نے مجھ کو اس اس طرح چھپا دیا تھا' جس جلسہ میں یہ باتیں بیان کر رہا تھا اس جگہ عورت کا شوہر بھی موجود تھا اور اس کے پکڑنے کی فکر میں تھا' اب یہ لوگوں کے سامنے اقراری مجرم ہو گیا اور جرم ثابت ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی' اسی عورت کو کہیں اس کو خبر ہو گئی اس نے کوٹھے پر آن کر کچھ اشارہ کر دیا' جس کو یہ سمجھ گیا اور تمام قصہ ختم کر کے اخیر میں کہدیا کہ بس اتنے میں آنکھ کھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا' لوگوں نے کہا کیا یہ سب خواب تھا' کہنے لگا اور نہیں تو بھلا میں غریب پردیسی' مجھ کو کون پوچھتا ہے تو ایسی تاویل آپ ہی حضرات کو مبارک ہو' صاحبو! اگر اس قسم کی تاویلیں چل جایا کریں تو پھر تو کسی کلام کا اعتبار ہی نہ رہے اور اس سے کچھ ثابت ہی نہ ہو سکے' یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں چاہیں جس طرح چاہیں مطلب بنالیں' مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس کی ذرا پرواہ نہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ اس میں مراد صرف وہی لوگ ہیں جو اعتقاد کے اندر دنیا کو محبوب سمجھتے ہیں اور آخرت کو چھوڑتے ہیں' تب بھی آپ کو بے فکری نہ ہونی چاہئے۔ کیونکہ جس دل میں درد ہوتا ہے اس کو شبہ سے بھی اپنا فکر ہو جاتا ہے اور وہ ذرا سے تعلق سے دوسروں کی بات کو اپنے بارے میں سمجھ لیتا ہے۔

مشہور ہے کہ عشق میں حد درجہ بدگمانی ہوتی ہے' حضرت شبلی بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سبزی بیچنے والا یہ صدا لگاتا ہوا نکل کہ دس خیار ایک دانق[1] میں' خیار ککڑی کو کہتے ہیں' اور ایک معنی نیک لوگوں کے بھی ہیں کہ سبزی بیچنے والے کے مطالب تو یہ تھا کہ دس ککڑی ایک دانق میں' مگر حضرت شبلی کا خیال دوسرے معنی کی طرف گیا اور صدا سن کر انہوں نے چیخ ماری اور رونے لگے' اور فرمایا جب دس نیک آدمیوں کی یہ قیمت ہے تو ہم گنہ گار کس شمار میں ہیں۔

یہ کیفیت ہوتی ہے ان حضرات کی' بس ہر وقت دل میں وہی ایک ہی بات رچی رہتی ہے' یہ تو ایک بزرگ کا واقعہ تھا' اب صحابی کا واقعہ سنیے کہ ان کی کیا حالت تھی۔

---

[1] دانق چند پیسوں کا ہوتا ہے ۱۲۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول مقبول ﷺ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کچھ کھڑے اور کچھ بیٹھے تھے اور کچھ آ رہے تھے۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اِجْلِسُوْا یعنی بیٹھ جاؤ' اس ارشاد کو سن کر جو شخص جس جگہ تھا' اسی جگہ بیٹھ گیا' یہاں تک کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ اسی وقت مسجد میں داخل ہوئے تھے' ابھی دروازہ ہی میں تھے کہ حضور ﷺ کے ارشاد کو سن کر فوراً جوتیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے' حالانکہ جانتے تھے کہ مقصود وہ لوگ ہیں جو جگہ پر پہنچ کر بھی نہیں بیٹھے لیکن صرف اس وجہ سے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے اور تمہارے کانوں میں پڑا ہے اس لیے بیٹھ ہی جانا چاہیے خواہ دوسروں ہی کو کہا گیا ہو لیکن محبوب کی بات کو سننے والے تو تم بھی ہو' پس آپ لوگ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے حال کو حجت نہ مانیں تو جانے دیجئے' خود حدیث خود حدیث سے معلوم ہو گیا کہ دردِ دل اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے کی بات کو بھی اپنے حق میں سمجھئے' بلکہ اگر یقین بھی ہو کہ یہ دوسرے کے متعلق ہے تب بھی اپنی فکر ہو جائے' غرض اس طرح آپ چاہیں ثابت سمجھیں حدیث یا بزرگوں کے کلام سے' ہمارا مقصود ہر طرح حاصل ہے۔

اب میں آیت کا مقصود ذرا کھول کر بیان کرنا چاہتا ہوں' اس آیت میں دنیا کی محبت پر خفگی اور ملامت کی گئی ہے۔

دنیا کی محبت کے کئی درجے ہیں:

اور اس کے کئی درجے ہیں تو جس درجے کی محبت ہوگی اسی درجے کی خفگی بھی اس پر ہوگی۔

دنیا کے ساتھ انتہا درجہ کی محبت کفر ہے:

ایک درجہ تو محبت کا انتہائی ہے جس کو کفر کہتے ہیں پس اس پر خفگی بھی انتہائی ہوگی اور سزا بھی ہمیشہ کی ہوگی' خدا کا شکر ہے کہ مسلمان اس سے تو پاک ہیں' دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعتقاد تو ٹھیک ہے کہ آخرت کو مانتا ہے اور دنیا کو چند روزہ جانتا ہے' لیکن اس اعتقاد کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا کہ عمل درست ہوتا' خوف کا غلبہ ہوتا' دنیا سے دل اچاٹ ہوتا' یہ بات

نہیں ہے اس کے متعلق خدا تعالیٰ اس آیت میں ارشاد فرماتے ہیں "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ" کہ قیامت کا دن سر پر آ گیا جس میں حساب کتاب ہوگا اور ذرا ذرا سی بات کی جانچ ہوگی' مگر لوگ ابھی خواب غفلت میں مست ہیں' جو لوگ صرف اعتقاد کو کافی سمجھتے ہیں اور عمل کو ضروری نہیں جانتے وہ اس میں غور کریں اور دیکھیں کہ اب بھی ان کی رائے صحیح رہتی ہے یا نہیں۔

صاحبو! یاد رکھو کہ یہ مذہب اہل سنت کا نہیں ہے بلکہ فرقہ مرجیہ[1] کا ہے کہ عمل کی ضرورت نہیں' ہم لوگ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے اہل سنت و جماعت ہیں ہمارے نزدیک ہر چیز اپنے درجے پر ہے' اعتقاد اپنے درجے پر ہے اور عمل اپنے درجے پر ہے اعتقاد ٹھیک ہونے کی وجہ سے اگر ہمیشہ کے عذاب سے نجات مل جائے لیکن بالکل صاف نہیں بچ سکتے' اور یہ نہ سمجھو کہ عمل نہ کرنا صرف چھوٹا گناہ ہے اس لیے کچھ زیادہ فکر کی چیز نہیں' کیونکہ اول تو یہ چھوٹا گناہ نہیں ہے بلکہ بڑا گناہ ہے' دوسرے اگر چھوٹا گناہ بھی ہوتا تب بھی قابل توجہ کے تھا' اس لیے کہ چھوٹے اور بڑے گناہ کی مثال چھوٹی چنگاری اور بڑے انگارے کی سی ہے جس طرح ایک بڑا انگارہ غفلت کرنے سے عالی شان محل کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے' اسی طرح ایک چنگاری بھی تھوڑی مدت میں اس انگارے کے برابر بلکہ اس سے زائد کام کر سکتی ہے' اگر اب بھی کوئی صاحب چھوٹے گناہ سے پرہیز کرنا ضروری نہ سمجھیں تو وہ مہربانی کر کے ایک چھوٹی چنگاری اپنے گھر کے چھپر میں رکھ کر دیکھ لیں۔

صاحبو! سچ کہتا ہوں کہ تمہارے ایمان کے لیے چھوٹا گناہ ایسا ہی ہے جیسے چھپر کے لیے چھوٹی چنگاری' تو جب کہ چھوٹا گناہ ایسا خطرناک ہے تو عمل کو چھوڑ دینا تو گناہ بھی چھوٹا نہیں ہے بلکہ بڑا گناہ ہے' کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ زنا کرنا' چوری کرنا' رشوت لینا' ظلم کرنا' شریعت کے خلاف وضع رکھنا' ہمیشہ داڑھی منڈانا' ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہننا' چھوٹے گناہ ہیں کبھی نہیں' ہاں کفر سے کم ہیں' لیکن جو چیزیں کفر سے کم ہوں ان کا چھوٹا

---

[1] فرقہ مرجیہ وہ ہے جن کے نزدیک اعتقاد صحیح ہونے کے بعد کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا' فرقہ اہل سنت سے خارج ہے ۱۲۔

ہونا ضروری نہیں' کیونکہ بڑی سے بڑی چیز بھی دوسری چیز کے لحاظ سے چھوٹی ہوسکتی ہے' دیکھو آسمان عرش سے تو چھوٹا ہے لیکن خود اپنے لحاظ سے کوئی چھوٹی چیز نہیں' یا باپ تائے سے چھوٹا ہوتا ہے لیکن کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ تایا سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اپنے باپ کو صاحبزادہ سمجھنے اور کہنے لگا ہو' بلکہ تایا کی برابر ہی باپ کی عزت کی جاتی ہے بلکہ زیادہ اسی طرح عمل کا گناہ چاہے کفر سے چھوٹا ہے' لیکن اپنے لحاظ سے وہ چھوٹا نہیں' پس سب سے بڑا درجہ تو کفر ہے۔

اہل ترقی اسلام کو قومیت کے لحاظ سے مانتے ہیں نہ مذہب ہونے کے لحاظ سے

اس کے بعد مسلمان دنیا داروں کی حالت ہے خاصکر ان میں سے ایک خاص جماعت کی جن پر انگریزی تعلیم نے بیحد اثر کیا ہے اور نئی روشنی میں ان کے خیالات ایسے بدل گئے ہیں خدا اور رسول ﷺ کو بھی پوری طرح نہیں مانتے اس کو برحق مانتے ہیں لیکن ایسا مانتے ہیں کہ وہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہے' بعضے یہاں تک کہتے ہیں کہ مذہب کی ضرورت مجبور کرتی ہے کہ خدا و رسول ﷺ کو مانا جائے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ہم اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ خدا اور رسول ﷺ برحق ہیں' اس لیے ہم کو بھی ماننا چاہیے تو یہ ماننا ناگواری کے ساتھ ہے' خوشی کے ساتھ نہیں' ظاہر ہے کہ ایسا ماننا نہ ماننے کے برابر ہے بعض لوگ پھر بھی ایسے نہیں کہ صرف قومیت کی وجہ سے مذہب اور مذہب کے مسئلوں کو مانتے ہیں۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ترقی قومی ان لوگوں کے نزدیک اصل مقصود ہے اور ترقی بدون اتفاق کے حاصل نہیں ہوسکتی اور قومی اتفاق کے لیے مذہب کا ایک ہونا سب سے اچھا ذریعہ ہے' اس لیے ہم سب کو ایک مذہب ماننا چاہیے تو چونکہ قومی اتفاق مذہب کے ایک ہونے پر موقوف ہے اس مجبوری سے اس کو مانا جاتا ہے تاکہ ان کی دنیا کی ترقی آسانی سے ہو سکے اس جماعت کے نزدیک اسلام کی جو وقعت ہے وہ بالکل ہی ظاہر ہے کہ وہ مذہب اسلام کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ اسلام کو دنیاوی مقصد کا ایک آلہ بنا رکھا ہے اور آلہ خود مقصود نہیں ہوا کرتا' بلکہ اگر کبھی مقصود دوسرے طریقے سے حاصل ہو سکے تو آلہ کو

چھوڑ دیا جاتا ہے۔

پس یقینی بات ہے کہ اگر دنیا کی ترقی ان لوگوں کو بغیر مذہب کے کسی دوسرے طریقے سے حاصل ہو سکے گی تو ضرور یہ مذہب کو چھوڑ دیں گے یا کم سے کم مذہب کو غیر ضروری سمجھنے لگیں گے یا اگر دوسرے مذہب سے ترقی حاصل ہو تو ہرگز یہ لوگ مسلمان نہ رہیں گے۔

ترقی کے بعض طالب رسول ﷺ کے ماننے کو بھی ضروری نہیں سمجھتے:

چنانچہ اسی جماعت کے ایک شخص نے تھوڑے ہی دن ہوئے یہ رائے پیش کی تھی کہ دنیا میں سب کے لیے ایک مذہب ہونا چاہیے اور وہ مذہب توحید[1] جن کے مذہب میں توحید ہے وہ رسول ﷺ کے ماننے کی قید اڑا دیں' اگر کوئی شخص رسول ﷺ کو نہ مانے تو کچھ مضائقہ نہیں' اس کو مذہب کا مخالف نہ سمجھنا چاہیے' خدا کی پناہ کیا گناہ مذہب ہے کہ مسلمان تو مسلمان کافروں کو بھی جس سے نفرت آئے' انہیں لوگوں میں سے ایک دوسرے شخص نے ایک بڑے جلسہ میں کہا کہ نجات کا مدار بس توحید پر ہے۔

رسول ﷺ کا ماننا کوئی ضروری مسئلہ نہیں ہے اگر کوئی رسول ﷺ کو بھی نہ مانے گا تو اس کی نجات ہو جائے گی' تو یہ ہیں ان لوگوں کے خیالات' غرض ان لوگوں کا مذہب صرف ان کی قوم ہے۔

اہل ترقی کے کاموں میں اخلاص نہیں:

اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی کسی اسلامی خدمت سے مسلمان کا دل خوش نہیں ہوتا کیونکہ ان کی تمام خدمتیں قوم کی دنیاوی ترقی کے لیے ہوتی ہیں' اسلام کے لیے نہیں ہوتیں' اگر اسلام کے لیے ہوتیں تو اسلام کی ان کے دل میں عزت اور حرمت ہوتی' حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ مذہب کے خادموں اور عالموں کو نہایت درجہ ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں' نماز' روزہ عبادات میں شک اور شبہے پیدا کیے جاتے ہیں

---

[1] خدا تعالیٰ کو ایک جاننا۔۱۲

تو اگر یہ لوگ مذہب اسلام کو حق سمجھتے اور خدا تعالیٰ کی رضامندی کے طالب ہوتے تو ایسی حرکتیں کیوں کرتے۔

معلوم ہوا کہ صرف قوم کے لیے یہ سب خدمتیں کی جاتی ہیں اور طرہ یہ ہے کہ قوم کے لیے بھی جو کچھ نامبارک بیداری پیدا ہوئی وہ دوسری قوموں' ہندوؤں آریوں' عیسائیوں کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہے تاکہ دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں اور نامبارک بیداری اس لیے کہا گیا کہ دین سے لاپرواہی اور اعتراضات یہ اسی بیداری کا نتیجہ ہیں' ان کے لیے اس بیداری سے خواب ہی بہتر تھا۔

ہمارے پرانی وضع کے امیر نئی روشنی کے امیروں سے بہت غنیمت ہیں:

صاحبو! ہمارے پرانی وضع کے امیروں میں خواہ کتنی ہی برائیاں ہیں گنہگار ہیں بدعمل ہیں' لیکن ان میں اتنی بات اب بھی باقی ہے کہ خدا و رسول کا نام یا ان کے احکام اور فرمان سن کر شرمندہ ہو جاتے ہیں اور اپنی غلطی کا اقرار کر لیتے ہیں اور اپنے کو خطاکار سمجھتے ہیں' خدا کے نیک بندوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں وہ چاہے بھنگڑ ہی ہوں' لیکن ان میں تواضع اور انکساری اور نیک نیتی ضرور ہے' تو ایسے لوگوں کے عمل بے شک خراب ہیں لیکن وہ اپنے کو اچھا نہیں سمجھتے اور نصیحت کرنے والوں کا مذاق نہیں اڑاتے' ایک شہر ہے کہ وہاں کے سب امیر قریب قریب اسی قسم کے ہیں' ان کے بارے میں میرے ایک بزرگ کہتے تھے کہ اس جگہ کے فقیر دوزخی اور امیر سب جنتی ہیں' کیونکہ امیر تو فقیروں کو اللہ والے سمجھ کر ان سے تعلق رکھتے ہیں اور فقیر مال اور مرتبہ کے لیے امیروں سے ملتے ہیں' آجکل کے پیروں کی حالت سوچ کر مجھے ایک شخص کا خواب یاد آتا ہے کہ اس نے اپنے پیر سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری انگلیوں میں نجاست لگی ہے اور آپ کی انگلیوں میں شہد لگا ہے پیر صاحب نے کہا کہ تو دنیا کا کتا گنہگار ہے اور ہم دنیا سے منہ موڑے ہوئے خدا کے طلب گار ہیں' مرید نے کہا حضور ابھی خواب ختم نہیں ہوا' میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں آپ کو انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور آپ میری انگلیاں اس پر پیر صاحب بہت خفا ہوئے۔

خیر یہ خواب تو خواہ صحیح ہو یا غلط' لیکن آج کل کے مکار اور دنیا کے طالب پیروں کی حالت تو واقعی ایسی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ پرانی وضع کے لوگ چاہے رند اور بدچلن بھی ہوں لیکن وہ دین کا جو کچھ کام کرتے ہیں دین کا کام نیت سے کرتے ہیں تو ان لوگ میں اگرچہ بیدار مغزی نہیں بلکہ نری زندی اور اوباشی ہے' لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ ایک بھنگڑ بھی اگر ان کے سامنے خدا اور رسول کا حکم بیان کرے تو ڈر جاتے ہیں' ان لوگوں کے چاہے عمل خراب ہوں لیکن ان میں ایمان اور خوف خدا ضرور ہے اور اس ایمان ہی کی بدولت وہ ایسے پیروں سے بھی تعلق رکھتے ہیں اگرچہ اپنی جہالت اور کم علمی کی وجہ سے پیر پرستی تک نوبت پہنچادی ہے بلکہ پیروں سے گزر کر قبر پرستی تک پہنچ گئے ہیں' لیکن ان گنہگاروں میں اور ان بیدار مغز آزادوں میں مقابلہ کیجیے تو زمین و آسمان کا فرق ہے اور بالکل ایسی مثال ہے رَحِمَ اللّٰهُ النَّبَّاشُ الْاَوَّلَ کہ خدا تعالیٰ پہلے کفن چور پر رحم کرے' یہ عربی زبان کی مثل ہے۔

ایک کفن چور کی حکایت:

جس کا قصہ یہ ہے کہ مکہ میں ایک شخص کفن چورایا کرتا تھا شہر والے اس سے بہت عاجز آگئے تھے اور دعا مانگتے تھے کہ یہ مرجائے' آخر ایک روز وہ مرگیا' اس کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے نے باپ کا کام کرنا شروع کیا'' لیکن اتنی زیادتی بھی اس کام میں کی کہ کفن چرا کے مردہ کے ایک میخ بھی ٹھونک دیتا تھا' اس پر یہ مثل جاری ہوئی' اور عام ہو کر ہر ایسے موقع پر بولی جانے لگی کہ دو برے آدمیوں میں سے دوسرا پہلے سے زیادہ برا ہوا' جیسا کہ اس قصہ مین پہلا کفن چور بھی گو برا تھا' لیکن جب دوسرے نے اس پر زیادتی شروع کی تو پہلا اس کے مقابلہ میں غنیمت معلوم ہونے لگا' اسی طرح گناہ کے اعتبار سے دونوں فرقوں کی حالت افسوس کے قابل ہے' لیکن پرانی وضع کے لوگ ابھی تک ایمان کی دولت سے بالکل محروم نہیں ہوئے ہیں' ان کی اب بھی کسی قدر یہ حالت باقی ہے کہ: اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا کہ جب ان کے سامنے خدا تعالیٰ کی آیتیں پڑھی

جاتی ہیں اور اس کے حکم سنائے جاتے ہیں تو ان کے ایمان کو قوت ہوتی ہے اور اپنی بدعملی پر رنج اور افسوس ہوتا ہے' رہا یہ نیا فرقہ آزاد خیال ان کے دل میں تو ذرا خوف خدا نہیں ہوتا عمل میں تو اکثر خرافات سے پرہیز کرتے ہیں' ناچ نہیں دیکھتے' فضول رسموں کو روکتے ہیں' بیوی کو فضول زیور بنانے سے روکتے ہیں' اسی طرح اور بھی فضول خرچی کے کاموں سے منع کرتے ہیں' لیکن یہ سب باتیں بھی ان لوگوں کی دوسروں ہی کے لیے ہیں۔

دیکھئے بیوی کو تو فضول روپیہ خرچ کرنے سے روکتے ہیں' اور خود سینکڑوں روپیہ ہار مونیم وغیرہ خرافات میں برباد کر دیتے ہیں اور ان لوگوں کی اس روک ٹوک کو دیکھ کر بھولے بھالے مولوی بہت خوش ہوتے ہیں' حالانکہ یہ کوئی خوش ہونے والی بات نہیں' اس لیے کہ ان کی یہ روک ٹوک شرع کے خلاف ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اس قسم کی رسمیں عقل کے بھی خلاف ہیں اور اگر شریعت کے خیال سے یہ روک ٹوک ہوتی تو سود اور رشوت کی آمدنی کو حلال بنانے کی کوشش نہ کرتے' اس کی کیا وجہ کہ شادی غمی کی رسموں کو تو روکا جائے اور سود ورشوت کو حلال بنانے کی کوشش کی جائے۔

غرض کہ یہ جماعت ظاہری حالت کے اعتبار سے تو بڑے سلیقہ اور شعور والی ہے' مگر مذہب سے بالکل الگ ہے اور ان کا سارا اسلام صرف دنیا کی درستی کے لیے ہے' اسی وجہ سے ان کی خدمتیں بالکل قدر کے قابل نہیں' میرے نزدیک ان لوگوں کی سرحد بھی کافروں کی سرحد سے ملی ہوئی ہے' اگرچہ ملک الگ الگ ہیں' ان دونوں کی حالت میں بہت تھوڑا سا فرق ہے' اس لیے ان کی حالت نہایت خطرناک ہے' اور چونکہ یہ لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اس لیے ہم بھی خاموش ہیں' ورنہ انصاف یہ ہے کہ ان لوگوں میں کوئی بات بھی اسلام کی نہیں ہے بلکہ ہر بات اسلام کے خلاف ہے۔

اہل ترقی کے مرض کا آسان علاج:

اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ چند روز کسی اللہ والے کے پاس رہیں میں بالکل خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ اگر اپنی اصلاح کی فکر ہے اور اصلاح کو ضروری سمجھتے ہو تو چند روز کسی مولوی کے پاس رہ لو' اگر کہو کہ مولوی سب کھانے پینے کے ہوتے ہیں ان کے پاس

رہنے سے اصلاح کیونکر ہوگی تو میں کہتا ہوں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے تم سب مولویوں کے پاس تھوڑی تھوڑی مدت ٹھہر کر دیکھ لو انشاء اللہ تم کو خود اپنی غلطی معلوم ہو جائیگی اور دیکھ لو گے کہ سب ایک طرح کے نہیں' ان میں تمہیں اصلاح کرنے والے بھی ملیں گے اور اگر اس طریقے سے ان کا تلاش کرنا تم کو دشوار معلوم ہوتا ہے تو میں کہوں گا کہ اگر آپ کو کسی بازاری عورت سے محبت ہو جاتی ہے اور لوگ تم کو وصال کی امیدیں دلا کر اس کے ملا دینے کا وعدہ کرتے ہیں اور پھر دھو کے پر دھوکا دیتے ہیں اس وقت ہر ایک کے وعدہ دلانے سے اس کے ساتھ کیوں ہو لیتے اور یہ بیہودہ عذر اس وقت کہاں چلے جاتے ہیں۔

صاحبو! کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ اتنی محبت بھی نہیں اور اس سے ملنے کی اتنی کوشش بھی نہیں'

مولانا روم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب کہا ہے کہ مولے کا عشق کیا لیلے کے عشق سے بھی کم ہو گیا' صاحبو! اگر ہر چھٹی میں ایک ہفتہ ایک ایک بزرگ کے پاس رہ لیا کرو تو کیا بڑا حرج ہو جائے' پھر جب ان میں کوئی ایسا مل جائے جس سے تمہارا اطمینان ہو جائے بس اس کو لے لو۔

دنیا کی محبت کا دوسرا درجہ عمل میں کاہلی ہے اور اس کا علاج!

ایک درجہ عمل میں کوتاہی ہونے کا یہ ہے کہ عقیدے سب درست ہوں' مگر کاہلی اور آرام طلبی عمل کو نہ درست کرنے دیتی ہو اور نفس کی عیش پرستی نے دنیا میں ڈبو رکھا ہو' ایسے لوگوں کا علاج یہ ہے کہ موت کو یاد کر لیا کریں' موت وہ چیز ہے کہ اس کے یاد کرنے سے خدا نے چاہا تو سب حالت درست ہو جائے گی' کیونکہ اعتقاد تو پہلے سے درست ہے' صرف نفس کی لذتوں کو کم کرنے کی ضرورت ہے اس کا علاج موت کے یاد کرنے سے ہو جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ لذتوں کے کاٹنے والی چیز یعنی موت کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔ اس حدیث میں جو موت کی صفت پہلے ذکر کی گئی ہے کہ وہ لذتوں کے کاٹنے والی ہے' اس سے یہ بات تبلا دی کہ موت زیادہ یاد کرنے میں خاصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے

لذتوں کی جڑ اکھڑ جاتی ہے اور آسان ترکیب اس کے یاد کرنے کی یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے موت کا مراقبہ کیا کرے اور سوچا کرے کہ ایک دن میں مروں گا' دوزخ اور جنت میرے سامنے کی جائے گی' اگر میں گنہ گار مروں گا تو جنت کو مجھ سے چھپا لیا جائے گا اور قیامت تک مجھ کو قبر کا عذاب ہوتا رہے گا۔

قیامت آئے گی اور سب کے اعمالنامے ان کو دکھلائے جائیں گے' اس کے بعد حساب ہوگا' اگر خدا نہ کرے میرے گناہ نیکیوں سے بڑھ گئے تو فرشتے گھسیٹتے ہوئے دوزخ کی طرف لے جائیں گے' اس مراقبہ سے انشاء اللہ دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت کا مرض بالکل جاتا رہے گا'

دوسری حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص دن میں بیس دفعہ موت کو یاد کرے گا اس کو شہادت حاصل ہوگی' مگر موت کو یاد کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لفظ موت کو بیس دفعہ دہرا لیا جائے اس لیے کہ موت کو یاد کرنے سے شہادت کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے آپ کو بالکل خدا کی رضامندی میں سونپ دے گا اور تسلیم کر دیگا اور اس کی نفسانی لذتیں بالکل چھوٹ جائیں گی' اور یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ اس کا مراقبہ کرے اور ہر وقت اس کا خیال رکھے' تو بس موت کا یاد کرنا وہی ہے جس کا طریقہ اوپر ذکر کیا گیا' غرض کہ دنیا کی محبت کی اتنی قسمیں تو دنیا داروں کے اندر ہیں۔

دینداروں کے مرض اور ان کا علاج:

اب دینداروں کی حالت بیان کرتا ہوں ان میں ایک تو اہل ظاہر[1] ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ جو گناہ ان کی وضع کے خلاف نہیں ہیں اور ان سے لوگوں میں بدنامی نہیں ہوتی ان سے تو پرہیز نہیں کرتے' اور جن گناہوں سے ظاہری دینداری پر دھبہ لگتا ہو ان سے پرہیز کرتے ہیں' دیکھئے غیبت یعنی پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہنا کتنا بڑا گناہ ہے مگر چونکہ عام لوگ اس کو دینداری کے خلاف نہیں سمجھتے' اس لیے ایسے لوگ کثرت سے اس کا مشغلہ رکھتے ہیں'

[1] اہل ظاہر وہ ہیں جو درویشی کی خوبیوں سے کورے ہیں جیسے وہ مولوی جو دل کی اصلاح نہیں کرتے ۱۲

جب چار آدمی اکٹھے ہو کر بیکار بیٹھتے ہیں تو غیبت شکایت ضرور کرتے ہیں اور شراب پینا چونکہ دینداری کے خلاف سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کے پینے سے پرہیز کرتے ہیں اور غضب یہ ہے کہ ایسے لوگ خود بھی اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں' سبحان اللہ! یہ عجیب دینداری ہے کو کچھ ہی کر لیجئے پھر دیندار کے دیندار' تو ان لوگوں کی دینداری بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ اسے ایک مرتبہ کسی بزرگ نے وضو کرا دیا تھا' پھر ساری عمر اس ایک ہی وضو سے اس نے نماز پڑھی' تو جیسے بی بی تمیزہ کا وضو نہ پیشاب سے ٹوٹتا تھا نہ پاخانے سے' ایسا ہی ان دینداروں کی دینداری نہ غیبت سے ٹوٹتی ہے نہ شکایت سے کچھ ہی کر لیں مگر یہ اول درجہ کے دیندار بنے رہیں گے۔

صاحبو! اگر یہ اس کو گناہ نہیں سمجھتے تو یہ تو سخت غلطی ہے اور اگر گناہ سمجھتے ہیں اور بے پرواہی کرتے ہیں تو بہت ہی بڑی غلطی ہے' کیونکہ ناواقفی سے کوئی گناہ ہو جائے تو کسی درجہ میں عذر ہو بھی سکتا ہے' اور جاننے کے بعد کیا جائے تو کوئی عذر بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ چند روز کسی کامل کی صحبت میں رہیں آج تک آپ نے صرف علم کی خدمت کی ہے اور لفظوں کی بحث میں رہے ہیں اس لیے شریعت کا رنگ نہیں چڑھا' اب ذرا تھوڑے دنوں کے لیے اس کو چھوڑ کر حال پیدا کیجئے' مگر یہ بغیر اللہ والوں کی صحبت کے نہیں ہوتا' چند روز تک ان کی صحبت میں رہنے کی نہایت ضرورت ہے' اس سے انشاء اللہ سب گناہ چھوٹ جائیں گے۔

اہل ظاہر اور اہل حال کے گناہوں میں بڑا فرق ہے:

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جو صاحب حال ہیں ان سے بھی تو خود گناہ ہوتے ہیں تو ان کی صحبت سے وہ دوسروں کے گناہ کیونکر چھوٹ جائیں گے' اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ان حضرات سے گناہ بہت ''کم ہوتا ہے دوسرے اگر کبھی ایسی غلطی ہو جاتی ہے تو فوراً ان کو فکر ہو جاتی ہے' اور وہ شرم اور ندامت سے اور رو دھو کر اسے جلد معاف کرا لیتے ہیں' ہم لوگوں کو نہ فکر ہوتی ہے نہ اس پر کڑھتے ہیں' ہم کو شیطان نے سمجھا دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت بہت بڑی ہے اس لیے جو جی میں آئے کرو اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنے کو

اس عیب سے پاک سمجھتا ہوں ہرگز نہیں' بلکہ ہم واعظوں کی تو وہ حالت ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے' اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ کہ دوسروں کو تو نیک کاموں کی رغبت دلاتے ہیں اور گناہوں سے روکتے ہیں' لیکن خود اپنی خبر نہیں لیتے' اور حالت ہے' جس کے متعلق خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ☆ کہ اے ایمان والو! ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے۔

خود عمل نہ کرنے کی وجہ سے وعظ چھوڑنا بے وقوفی ہے:

یہاں بعض لوگوں کو اس میں یہ شیطانی دھوکا ہو جاتا ہے کہ وہ وعظ کہنا ہی چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب ہماری حالت خود ہی درست نہیں تو ہم دوسروں کو کس منہ سے کہیں' حالانکہ یہ دوسرا جرم ہے' کیونکہ انہوں نے عمل کو بھی چھوڑا اور دین کی باتوں کا دوسروں تک پہنچانا بھی چھوڑا

علماء ظاہر میں دنیا کی محبت کا مرض بھی ہے:

ان اہل ظاہر میں ایک کمی تو وہ تھی جس کا ابھی ذکر ہوا' اس کے ساتھ دوسری کمی یہ بھی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت ان کے دل میں رچی ہوئی نہیں ہوتی' اس سبب سے ایک قسم کی محبت مال سے ان کو ہو جاتی ہے اور اس مال کی محبت میں ایسے لوگ دنیا داروں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے اپنی حاجت ظاہر کرتے ہیں اور ان کی نظروں میں ذلیل ہوتے ہیں اور ان کی ذلت کی وجہ سے علم دین کی ذلت ہوتی ہے' ان لوگوں کو چاہیے کہ بزرگوں کے اس ارشاد کو سمجھیں بِئْسَ الْفَقِیْرُ عَلٰی بَابِ الْاَمِیْرِ، کہ جو فقیر امیر کے دروازہ پر جائے وہ بہت برا ہے۔

علماء کو دنیا داروں سے بے پرواہ رہنا چاہیے:

ان کی تو یہ حالت ہونی چاہیے کہ ایک بزرگ کے پاس ایک بادشاہ گئے' دروازہ پر خادموں کا پہرہ تھا' بادشاہ نے اندر جانے کی اجازت چاہی' خادم نے اجازت نہ دی اور کہا کہ اول میں پیر صاحب سے دریافت کرلوں اگر وہاں سے اجازت ملی تو اجازت نہ دے

دوں گا، اس نے پیر صاحب سے جا کر عرض کیا اور ان کے اجازت دینے پر آ کر بادشاہ کو اجازت دے دی' بادشاہ کو روک ٹوک کی کبھی نوبت نہ آئی تھی' سخت ناگوار گزرا اور ان بزرگ کے سامنے جا کر غصہ کے لہجہ میں کہنے لگا کہ فقیر کے دروازہ پر تو دربان نہ ہونا چاہیے اس کو سن کر اس بزرگ نے اس کے تکبر کے مقابلے میں بڑی بے پرواہی سے فرمایا کہ دربان ضرور ہونا چاہیے تاکہ دنیا کا کتا نہ آنے پائے' اور وجہ اس بے پرواہی کی یہ ہوتی ہے کہ جس کو لالچ نہ ہو وہ جو چاہے کہہ سکتا ہے۔

حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

حضرت سلیم چشتی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ پیر پھیلائے بیٹھے تھے کہ بادشاہ مع وزیر کے آیا' بادشاہ کو دیکھ کر آپ اسی طرح بیٹھے رہے وزیر کو آپ کا یہ انداز ناگوار گزرا' اس نے کہا کہ حضرت پیر پھیلا کر بیٹھنا کب سے سیکھ لیا ہے' فرمایا جب سے ہاتھ سمیٹ لیا ہے' اس کے بعد وزیر نے کہا کہ' بادشاہ آپ کے حاکم ہیں اور حاکموں سے ہاتھ سمیٹ لیا ہے' اس کے بعد وزیر نے کہا کہ بادشاہ آپ کے حاکم ہیں اور حاکموں کی تعظیم کرنے کا قرآن میں حکم ہے اس لیے آپ کو بادشاہ کی تعظیم کرنی چاہیے فرمایا کہ بادشاہ تمہارا حاکم ہوگا میرے تو غلام کا غلام ہے وزیر نے کہا حضرت یہ کیسے؟ فرمایا کہ نفس کی خواہش اور ہوس میرے غلام ہیں اور بادشاہ نفس کی خواہش اور ہوس کا غلام ہے اس لیے میرے غلام کا غلام ہوا۔

مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جب آپ لکھنو تشریف لائے تو ایک شاہزادہ خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ کو فرشی سلام کیا' آپ نے اس سلام کے جواب میں اس کو انگوٹھا دکھلا دیا' آج تو اگر کوئی معمولی زمیندار مرید ہو جائے تو بہت غنیمت سمجھا جاتا ہے اور ان حضرات کو بادشاہوں اور شاہزادوں کی بھی پرواہ نہ تھی' آخر یہ کیا بات تھی' بات یہی تھی کہ ان حضرات کے دل میں دنیا کی عزت نہ تھی' نہ محبت تھی' اور پھر یہ بھی

نہیں کہ ان حضرات کی زندگی تکلیف میں بسر ہوئی ہو' خدا کی قسم ان کی زندگی ایسے آرام میں بسر ہوتی ہے کہ دوسروں کو وہ آرام نصیب بھی نہیں ہوتا' اگر کسی کو اس میں شبہ ہو تو وہ آج بھی بزرگوں کی حالت جا کر دیکھ لے کہ وہ کس قدر آرام میں ہیں' اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان حضرات کو ظاہری بے لطفی کسی قسم کی ہوتی بھی ہے تو یہ سمجھ لو کہ ان کے دل میں ایک ایسی چوٹ لگی ہے جس سے کہ اس بے لطفی میں ان کو ہزاروں لطف ہیں' غرض اس فرقہ میں مال کی محبت کا بھی مرض ہے' اس کا علاج بھی وہی ہے کہ اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر ان کا فیض حاصل کرنا چاہیے۔

درویشوں میں بھی بعض باتیں اصلاح کے قابل ہیں:

دوسرا فرقہ دینداروں کا وہ ہے جو درویش اور اللہ والے کہلاتے ہیں' یہ لوگ اپنے دل میں بہت خوش ہوں گے کیونکہ سارے فرقوں میں تو کوتاہیاں اور عیب نکال دیئے گئے' اب صرف یہی ایک فرقہ رہ گیا ہے' تو درجہ بدرجہ ترقی ہو کر یہی فرقہ ایسا نکلے گا کہ جس میں کوئی عیب نہ ہو' اور ان کے مقابلے میں جتنے فرقے ہیں سب سے اچھے یہی ثابت ہوں گے۔ سو یہ واقعی صحیح ہے کہ یہ حضرات سب سے اچھے ہیں لیکن قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز زیادہ لطیف ہوتی ہے' اگر وہ بگڑتی ہے تو دوسری سب چیزوں سے زیادہ بدبو اس میں پیدا ہوتی ہے' یہ حضرات چونکہ سب فرقوں سے لطافت اور پاکیزگی میں بڑھے ہوئے ہیں' اس لیے اگر ان میں کچھ بھی خرابی پیدا ہوگئی تو سب سے زیادہ نازیبا اور بدنما ہوگی' سو اس فرقے میں خدا کے فضل وکرم سے وہ عیب تو نہیں ہیں جو اور فرقوں میں ہیں' مگر انصاف یہ ہے کہ یہ بھی کوتاہیوں سے خالی نہیں' چنانچہ بعض لوگوں میں یہ کوتاہی ہے کہ انہوں نے بالکل لوگوں سے علیحدگی اور یکسوئی اختیار کر کے اس کو ایسا ضروری سمجھا کہ بیچارے دنیا داروں سے بدخلقی برتنی شروع کر دی حالانکہ یہ شریعت میں پسند نہیں ہے۔

درویشوں کو خوش خلقی برتنی چاہیے:

شریعت نے بدخلقی کی سخت ممانعت کی ہے' حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے۔ کہ

دنیادار اگر فقیر سے ملنے آئیں تو فقیر کو ان سے بدخلقی نہ برتنی چاہیے' بزرگوں کا ارشاد ہے' بِئْسَ الْفَقِیْرُ عَلٰی بَابِ الْاَمِیْرِ' وَنِعْمَ الْاَمِیْرَ عَلٰی بَابِ الْفَقِیْرِ' جو فقیر امیر کے دروازہ پر جائے وہ بہت برا ہے اور جو امیر فقیر کے دروازے پر آئے وہ بہت اچھا ہے' پس جب کوئی امیر فقیر سے ملنے آتا ہے' وہ اچھا ہو جاتا ہے اور اس کی تعظیم ہم کو اس واسطے کرنی چاہیے کہ امیر ہو کر فقیر کے دروازہ پر حاضر ہوا' اس وقت امیر ہونے کی وجہ سے اس کی تعظیم نہ ہوگی بلکہ اچھا ہونے کی وجہ سے ہوگی' اور اسی وجہ سے حضرت حاجی صاحب امیروں کی بہت تعظیم فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کے ساتھ ان کے مرتبہ کے موافق برتاؤ کرو' اور میں کہتا ہوں کہ امیروں کو خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے تو امیری ملی ہے' پس ہم کو ضروری ہے کہ اس کے حق کی رعایت کریں' ہاں ان کی خوشامد نہیں کرنی چاہیے' پس برتاؤ رکھنا چاہیے کہ جو تمہارے پاس آئے خوش ہو کر جائے' صاحبو اگر آپ لوگ امیروں کو اپنے پاس نہ آنے دیں گے اور ان سے بدمزاجی برتیں گے' تو آخر وہ لوگ کہاں جائیں گے اور کس جگہ اپنا ٹھکانہ تلاش کریں گے' ہاں یہ ضرور ہے کہ تم خود ان کے دروازے پر مت جاؤ' مگر اس کی بھی ایک صورت میں اجازت ہے جب تمہیں اصلاح کی امید ہو اور تم کو امیر خود بلائیں' تو عزت کے ساتھ چلے جاؤ اور ان سے کسی بات میں دبو نہیں' اگر ایسی صورت ہو تو جانے سے ہرگز انکار نہ کرو۔

مجھ سے بعض امیروں نے یہ اعتراض کیا کہ مولوی ہماری خبر نہیں لیتے میں نے کہا' جناب کبھی آپ بھی تو توجہ کیجیے اس کے بعد دیکھئے کہ مولوی آپ کی خبر لیتے ہیں یا نہیں۔

صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ مولویوں پر خبر نہ لینے کا الزام بالکل غلط الزام ہے' امیر توجہ تو خود نہیں کرتے' حالانکہ یہ خود انہی کا کام ہے اور الزام عالموں پر رکھتے ہیں' اصل یہ ہے کہ ان کو حق کی طلب ہی نہیں ہے ورنہ ہو سکتا تھا کہ چین سے بیٹھ سکیں۔

ذکر و شغل سے کیفیات مقصود نہ ہونی چاہئیں اور اس پر ایک حکایت:

ایک کوتاہی ان میں یہ ہے کہ اکثر اللہ کا نام لینے میں اس کے طلب ہوتے ہیں کہ دل میں کچھ گرمی پیدا ہو یا کچھ نظر آنے لگے' صاحبو! یہ بڑی غلطی ہے اور ایسی کہ اس پر نظر

بھی نہیں کی جاتی اس کا علاج یہ ہے جو حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے، جب بھی کوئی شخص آ کر شکایت کرتا اور کہتا کہ حضرت مجھے اللہ کا نام لینے سے کچھ نفع نہیں ہوا، تو فرمایا کرتے کہ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم اللہ کا نام لیتے ہو اور مثنوی سے ایک قصہ سناتے کہ ایک شخص روزانہ ذکر کیا کرتا تھا، لیکن اس کو کوئی اثر نہ معلوم ہوتا تھا آخر ایک روز مایوس ہو کر بغیر ذکر کے سو گیا، خواب میں ایک فرشتہ کو دیکھا اور اس نے یہ سوال کیا کہ آج تم نے ذکر کیوں نہیں کیا کہنے لگا کچھ نفع تو ہوتا ہی نہیں نہ وہاں سے کچھ جواب ملتا ہے، ارشاد ہوا تمہارا اللہ اللہ کہنا یہی ہمارا جواب دینا ہے۔ تو حضرت حاجی صاحب اس کو ایک مثال سے سمجھایا کرتے تھے کہ دیکھو اگر تم کسی حاکم کے پاس جاؤ اور اس کو تمہارا جانا ناپسند ہو تو وہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا ظاہر ہے کہ دوسرے وقت اپنے دربار میں گھسنے بھی نہ دے گا، پس خدا تعالیٰ کا پانچوں وقت نماز کے لیے مسجد میں آنے کی توفیق دینا ذکر کی قوت بخشنا یہ دلیل ہے اس کی کہ تمہارا پہلا کام ناپسند نہیں ہوا، ورنہ کوئی ایسا سخت پہرہ ہوتا کہ تم مسجد میں گھسنے بھی نہ پاتے، اور پہرے سے مراد ظاہری پہرا نہیں بلکہ

ایک حکایت:

وہ پہرا مراد ہے جو کہ ایک نوکر اور آقا کے قصے میں ہوا تھا، کہ دونوں بازار میں کام کو چلے راستہ میں نماز کا وقت آ گیا، نوکر نمازی تھا، آقا سے اجازت لے کر مسجد میں چلا گیا اور آقا دروازے پر بیٹھا رہا، جب بہت دیر ہوئی آقا نے پکارا کہ بھائی باہر کیوں نہیں آتا، نوکر نے کہا آنے نہیں دیتا، آقا نے کہا کون نہیں آنے دیتا، کہنے لگا جو تمہیں اندر نہیں آنے دیتا، تو یہ پہرہ ہے جو ایک قدم آگے بڑھنے نہیں دیتا، اور جب کہ عمل کا برابر سلسلہ چلا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ سب مقبول ہو رہا ہے، یہ حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اور جامی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی تحقیق ہے۔

ایک اور ارشاد حضرت حاجی صاحب کا اس موقع پر یاد آ گیا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ آ کر کچھ فائدہ نہ ہونے کی شکایت کرتے تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جواب میں یہ ارشاد فرمایا کرتے

یابم اور ایا نیا بم جستجوئے ے کنم
حاصل آیدیا نیاید آرزوئے ے کنم

مطلب اس کا یہ ہے کہ اس میں اگر نفع بھی نہ ہوتب بھی برابر کوشش کرنی چاہیے اس واسطے کہ ہم مخلوق اور غلام ہیں اور غلام کو یہ حق نہیں کہ وہ کام کے معاوضہ کا امیدوار ہو۔ اگر کسی غلام سے یہ کہا جائے کہ جا کر کنویں سے پانی لے آؤ اور وہ یہ کہے کہ مجھے اس کے معاوضہ میں کیا ملے گا' تو وہ نہایت گستاخ ہے' پس ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم غلام ہیں اور اس وجہ سے ہم کو کام کرنا ضروری ہے چاہے نفع ہو یا نہ ہو۔

حکایت:

اس پر بوستاں کی ایک حکایت یاد آئی شیخ سعدی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بوستاں میں ایک شخص کی حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص روزانہ عبادت کیا کرتا' آخر ایک روز یہ آواز آئی کہ خواہ کچھ ہی کرو ہرگز قبول نہ ہوگا لیکن اس کے بعد بھی وہ عبادت ہی میں مشغول رہا' اس قصے کی خبر اس کے ایک مرید کو بھی ہوئی' اس نے کہا کہ جب وہاں مقبول ہی نہیں ہے تو عبادت کرنے سے کیا فائدہ؟ انہوں نے جواب دیا کہ بھائی دل کو اس سے بے پرواہ کر سکتے ہیں جس کے بدوں گزر ہو جانے کی امید ہو۔ اور جب کہ ان کے سوائے کوئی جگہ نہیں ہے تو میں انہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں' یہ کہنا تھا کہ فوراً دریائے رحمت جوش میں آیا اور آواز آئی کہ خیر کوئی ہنر تو تمہارے اندر نہیں ہے' لیکن چونکہ ہمارے سوا اور کوئی پناہ نہیں ہے اس لیے قبول کر لیتے ہیں تو ہمارا مذہب یہ ہونا چاہیے کہ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

کہ ہم اپنا کام کیے جائیں رہا فائدہ اس پر ذرا بھی نظر نہ ہونی چاہیے۔

ذکر سے کیفیات کا ارادہ کرنا دنیا کی محبت میں داخل ہے:

اور اگر ایسا نہ کیا تو تم بھی دنیا کے طالب ہو' کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کے نتیجہ کا وعدہ آخرت میں ہے نہ کہ دنیا میں' وہاں بے شک محرومی نہ ہوگی۔

ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ☆

اس آیت کے معنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو لوگ دین کے کام میں محنت اور مجاہدہ کرتے ہیں ان کے لیے دنیا میں تو یہ وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے راستوں پر چلنے کی توفیق دیں گے، لیکن یہ وعدہ نہیں کہ کیفیات حاصل ہوں گی اور لطیفے[1] صاف ہو جائیں گے اور آخرت میں یہ وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہوں گے اور ان کی نزدیکی حاصل ہوگی اور نزدیکی حاصل تو دنیا ہی میں ہو جاتی ہے، مگر کامل ظہور آخرت میں ہوتا ہے اگرچہ دنیا میں بھی اس کا اثر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص اپنے دل کو دیکھتا ہے کہ وہ ہر حال میں خدا سے راضی ہے جس کی بابت ارشاد ہے:

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ یعنی خدا تعالیٰ ان سے راضی ہیں مگر انہوں نے مشاہدہ آخر میں ہوگا۔

اب تمام درجے دنیا کی محبت کے معلوم ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ عمل کی توفیق دے۔

(آمین)

تَمَّتْ بِالْخَیْرِ

✿✿✿

---

[1] صوفیوں کے نزدیک انسان کے اندر ۶ لطیفے ہیں، ذکر و شغل سے ان کو صاف کیا جاتا ہے جیسا کہ دل ہے روح ہے وغیرہ۔ ۱۲ منہ

(۴۵) مصیبت سے عبرت پکڑنا

منتخب از وعظ ششم ملقب بہ تادیب المصیبت حصہ چہارم

دعوات عبدیت

خُطْبَہ مَاثُورَہ: اَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَا نَالِجَنْبِہٖ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَائِمًا فَلَمَّا کَشَفْنَا عَنْہُ ضُرَّہٗ مَرَّ کَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَا اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّہٗ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلْمُسْرِفِیْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ☆

''ترجمہ: اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی بیٹھے بھی' کھڑے بھی پھر ہم جب اس کی وہ تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لیے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا' ان حد سے نکلنے والوں کے عمل ان کو اسی طرح اچھے معلوم ہوتے ہیں۔''

اس آیت میں ایک ایسا عام مضمون بیان کیا گیا ہے جو اکثر لوگوں کی حالت کو شامل ہے' اسی وجہ سے میں نے اس آیت کو بیان کے لیے اختیار کیا ہے پھر اس وقت سے اس کو خاص مناسبت بھی ہے۔

انسان کی بے بسی:

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی انسان نہیں جس پر کوئی مصیبت نہ آئے اور کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو' کیونکہ اپنی ذات پر انسان کو خود اپنا اختیار نہیں بلکہ وہ خدا

تعالیٰ کی قدرت میں ہے وہ جو چاہتے ہیں ہوتا ہے انسان کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا' مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ انسان ہر بات میں اپنی طرف سے ایک منصوبہ گانٹھ لیتا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہیے جیسا خود اس کا اختیار ہو' اسی وجہ سے اکثر پریشان رہتا ہے کیونکہ ہر کام اس کی خواہش کے موافق نہیں ہوتا' اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتے ہیں: اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی یعنی انسان کو اس کی ہر آرزو نہیں ملتی' آرزوئیں انسان کو بہت کچھ ہوتی ہیں مگر ملتی کم ہیں' بلکہ جو خدا تعالیٰ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور وہی انسان کے لیے بہتر ہوتا ہے' اگرچہ اول اول اس کی بہتری انسان کو معلوم نہ ہو لیکن اس کے نتیجہ پر اگر غور کیا جائے تو اس کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے۔

مصیبت کی حقیقت:

اور چونکہ اول نظر میں اس کی حکمت معلوم نہیں ہوتی اس لیے خواہش کے خلاف کو مصیبت کہتے ہیں ورنہ اگر اس کی حکمت اور مصلحت کو دیکھیں تو کوئی مصیبت مصیبت نہیں' بلکہ ہر مصیبت جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے نعمت ہے' ہاں جن بلاؤں کو ہم اپنے ہاتھوں اختیار کرتے ہیں یعنی گناہ کہ اس کو اپنے اختیار سے کرتا ہے سو اس میں کوئی حکمت نہیں ہوتی اور حقیقت میں مصیبت وہی ہے' اور یہی وجہ ہے کہ اس کو گناہ قرار دیا گیا اور اس سے روکا گیا ہے اور یہی فرق ہے بندہ کے اپنے کیے ہوئے کام میں اور اس میں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو بندہ کا کام تو شر ہے جو وہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کا کام شر نہیں بلکہ جو بات بھی اس کی طرف سے ہو خیر ہے۔

مرید کو جو حالت پیش آئے سب خیر ہے:

اسی لیے اللہ والے اپنے مریدوں کو یہ سکھلاتے ہیں کہ مرید کو جو حالت پیش آئے سب کو خیر سمجھے خواہ وہ بیماری ہو یا دشمن کا اپنے اوپر غالب ہونا ہو یا غریبی اور فاقہ ہو یا کوئی اور مصیبت ہو' اس تعلیم سے ان میں ایک مضبوطی پیدا ہوگئی ہے جس سے وہ پریشان نہیں ہوتے۔

غرض کہ جو بات بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو سب بہتر ہے مگر یہ بہتری ایسی ہے جیسے دوا کی بہتری کہ ماں باپ تو جانتے ہیں کہ حلق سے اترتے ہی تریاق کا کام کرے گی لیکن بچہ نہیں سمجھتا بلکہ ماں باپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے کہ انہوں نے ایسی کڑوی دوا پلادی' یا جیسے دنبل میں نشتر لگانا کہ ماں باپ اس سے خوش ہیں مگر بچہ ان کو دشمن سمجھتا ہے نشتر لگانے والا ماں باپ سے انعام مانگتا ہے اور بچہ تعجب کرتا ہے کہ یہ کس بات کا انعام مانگتا ہے اس نے تو مجھے تکلیف دی ہے' یہ تو سزا کے لائق ہے نہ انعام کے' لیکن ہر عقلمند جانتا ہے کہ واقع میں کام انعام کا ہے لیکن بچہ نہیں سمجھتا تو جو فرق بچہ اور ماں باپ کے علم میں ہے اس سے زیادہ بندہ اور خدا تعالیٰ کے علم میں ہے پس خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ جس واقعہ کو بندہ مصیبت سمجھ رہا ہے اس میں کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں' قرآن شریف میں فرماتے ہیں عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ' یعنی شاید ایک بات کو تم برا جانو اور واقع میں وہ تمہارے لیے بہتر ہو' تو جس کی نظر اس حقیقت پر ہوگی وہ ہرگز کسی ناگوار بات کو مصیبت نہ سمجھے گا' جیسے جراح نے نشتر لگا کر مصیبت میں نہیں پھنسایا بلکہ بھلائی کی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ جو بندے کے ساتھ کرتے ہیں سب بہتر ہی ہوتا ہے مگر بندہ اس کی حکمت کو سمجھتا نہیں حالانکہ اگر ذرا غور کرے تو بعض حکمتیں معلوم ہو بھی سکتی ہیں۔

مصیبت:

جیسا کہ مصیبت میں ایک یہ بھی خاصیت ہے کہ عادات درست ہو جاتی ہیں انسان خدا کو یاد کرنے لگتا ہے توبہ نصیب ہو جاتی ہے اگر یہ خیال ہو جائے کہ فلاں گناہ کی وجہ سے ایسا ہوا تو یہ کھلے فائدے نظر آتے ہیں مگر بعض لوگ اس کو یاد نہیں رکھتے' پس اس لحاظ سے کوئی ناگوار بات مصیبت نہ کہی جائے گی' مگر ظاہر میں وہ مصیبت ہے کیونکہ مصیبت عرف میں اسی کو کہتے ہیں کہ کوئی بات طبیعت کے خلاف پیش آئے' اور چونکہ زندگی میں اکثر باتیں مرضی کے خلاف ہی ہوتی ہیں اس لیے کوئی شخص بھی مصیبت سے خالی نہیں' کوئی مال کی طرف سے پریشان ہے کوئی صحت وتندرستی کی طرف سے حیران ہے' کوئی اولاد کی طرف سے فکر مند ہے' غرض ہر شخص ایسی کسی نہ کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے لیکن اثر ہر

ایک پر الگ الگ ہوتا ہے اور ایک سرسری اثر ایسا بھی ہے کہ کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں' چاہے تھوڑی ہی دیر کے لیے ہو اور وہ اثر یہ ہے کہ کہ اپنی کمزوری اور عاجزی پر نظر ہو جاتی ہے اور اپنے گناہوں کو آدمی دیکھنے لگتا ہے بڑا ظالم ہے وہ شخص کہ اس پر کوئی مصیبت آئے اور اس پر یہ اثر نہ ہو بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ انسان ہی نہیں ہے' جو انسان ہوگا اس پر یہ اثر ضرور ہوگا اور یہ اثر بہت بڑی نعمت ہے اس سے ایسے بڑے مرض کا بھی علاج ہو جاتا ہے جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

اصل روکنے والا حق کے قبول کرنے سے تکبر ہے:

کیونکہ حق بات کے قبول کرنے سے بڑا روکنے والا یہ ہے کہ انسان اپنے کو سب سے بڑا سمجھے' اسی وجہ سے یہودی حضور ﷺ پر ایمان نہیں لائے تھے حالانکہ جانتے تھے کہ آپ سچے رسول ہیں' خدا کے نبی ہیں' بلکہ حضور ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے ہی وہ حضور ﷺ کو جانتے تھے اور مشرکوں سے کہا کرتے تھے کہ اب جلدی ہی ہم تمہاری خبر لیں گے' کیونکہ نبی آخر الزمان کا زمانہ قریب آ گیا ہے ان کے ساتھ ہو کر ہم تم کو قتل کریں گے' لیکن جب حضور ﷺ تشریف لائے تو اپنے مرتبہ میں کمی آنے کے ڈر سے آپ ﷺ کے ساتھ کفر کیا اور ایمان نہ لائے' سمجھے کہ آج تو ہم سردار اور پیشوا مانے جاتے ہیں اگر ایمان لے آئیں گے تو حضور ﷺ کا تابع ہونا پڑے گا' اور چھوٹے ہو جائیں گے' اسی طرح مکہ کے رئیس یہ کہتے تھے کہ اگر یہ خدا کا کلام ہے تو کسی بڑے شخص پر کیوں نازل نہ ہوا' ایسے شخص پر کیوں نازل ہوا جس کے ماں نہ باپ پھر یہ کہ آپ کے پاس مال بھی نہیں تھا' اپنے چچا ابو طالب کے پاس رہتے تھے اور ابو طالب کی خود یہ حالت تھی' اکثر وقت پیٹ بھرنے کے لائق بھی نہ ملتا تھا' انہوں نے جب کئی مرتبہ یہ تجربہ کیا کہ تھوڑے سے کھانے میں حضور ﷺ کی وجہ سے اتنی برکت ہوتی ہے کہ سب گھر والوں کا پیٹ بھر جاتا ہے اور اگر آپ ﷺ ہمراہ نہیں ہوتے تو سب بھوکے رہ جاتے ہیں تو انہوں نے یہ عادت کر رکھی تھی' کہ روزانہ آپ کے ہمراہ کھانا کھاتے تھے اور اگر کبھی آپ ﷺ گھر پر نہ ہوتے تو ابو طالب آپ کو ڈھونڈتے تھے کہ آپ کی برکت سے پیٹ تو بھر جائے گا۔

غرض حضور ﷺ کے گھر میں کسی قسم کی مالداری بھی نہ تھی' ہاں آپ حسب ونسب اور ذات پاک میں سب سے اعلیٰ درجہ کے تھے اور نسب کو چاہے نبوت اور خدا تعالیٰ کے یہاں مقبول ہونے میں دخل نہ ہو' مگر بات یہ ہے کہ جو حقیر نسب کا ہوتا ہے اس کی اطاعت کرنے سے اکثر لوگوں کو عار آتی ہے اور شریف کی اطاعت کرنے سے کسی کو عار نہیں ہوتی' کیونکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سے کس بات میں کم ہے تو حضور ﷺ میں یہ بات تو تھی مگر اور کوئی دنیا کی دولت نہ تھی اس لیے رئیس لوگ کہتے تھے کہ قرآن کسی رئیس پر کیوں نازل نہ ہوا' تو اس بڑا سمجھنے کی وجہ سے وہ لوگ ایمان کی دولت سے محروم رہے۔

تکبر کی مذمت:

اور اس کی بڑی مذمت آئی ہے' حدیث میں ہے کہ رائی کے برابر بڑائی بھی جس کے دل میں ہوگی' وہ جنت[1] میں نہ جائے گا' تو یہ ایسا برا مرض ہے' پر اس سے بہت کم لوگ خالی ہیں تھوڑا بہت سب میں ہوتا ہے' اسی مرض نے شیطان کو جس نے آٹھ لاکھ برس تک عبادت کی تھی' ایک پل میں مردود بنا دیا' اور اسی راز کی وجہ سے بزرگوں نے کہا ہے کہ نرے وظیفہ سے کچھ نہیں ہوتا' جب تک کہ کسی کامل کے پاس نہ رہے تا کہ وہ اس کے تکبر کا علاج کرے ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ کسی بزرگ سے اپنی اصلاح نہیں کراتے. بلکہ صرف کتابیں دیکھ کر کچھ کرتے ہیں ان کے اخلاق[2] درست نہیں ہوتے' غرض! شیطان نے تکبر ہی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے سبب ملعون ہو گیا اور خدا تعالیٰ کی درگاہ سے نکالا گیا عالموں نے کہا ہے کہ آسمان پر سب سے پہلا گناہ یہ تکبر ہی ہوا ہے' اس سے پہلے اور کوئی گناہ نہیں ہوا' تو یہ تکبر ایسی بری چیز ہے لیکن مصیبت سے ایسے بڑے مرض کا بھی علاج ہو جاتا ہے پس یہ ایسی نعمت ہے کہ تکبر بھی اس سے ٹوٹ جاتا ہے' غرض یہ ہے کوئی ایسا مسلمان نہیں جس پر مصیبت سے اثر نہ ہو' مگر فرق یہ ہے کہ بعض لوگ تو یاد رکھتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں۔

---

[1] یعنی اول جنت میں نہ جائے گا ۱۲

[2] اخلاق یعنی خصلتیں ۱۲

مصیبت پر عبرت نہ ہونا ایک مرض ہے اور اس کے کئی درجے ہیں:

اور اس بھول جانے ہی کے مرض کو اس آیت میں بیان کیا ہے اور اس مرض کے کئی درجے ہیں' کیونکہ لوگوں کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں تین قسم کے لوگ ہیں' بعض تو وہ ہیں کہ ان کو مصیبت آتے وقت بھی پوری طرح اپنے گناہوں کا خیال نہیں ہوتا' مجھے تعجب ہوا کرتا ہے اس شخص سے جو کہ مصیبت آنے پر یہ کہتا ہے کہ معلوم نہیں ہم سے کیا گناہ ہوا ہے جس کی سزا بھگت رہے ہیں' صاحبو وہ کونسا وقت ہے کہ ہم اس میں گناہ نہیں کرتے' ہمارا تو سارا وقت گناہ ہی میں گزرتا ہے' پھر یہ سوال کرنا کیا ہے کہ ہم سے کونسا گناہ ہوا ہے' سو ایک قسم کے لوگ تو یہ تھے کہ ان کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہم نے کچھ کیا ہے جس سے مصیبت آئی' دوسرے وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے یہ گناہ کیا ہے' مگر پھر بھی اس کا علاج نہیں کرتے' توبہ استغفار نہیں کرتے بلکہ بعضے تو اور زیادہ گناہ کرنے لگتے ہیں' میں نے جہاز میں دیکھا ہے کہ خاص طوفان کی شدت کے وقت نہایت پریشانی میں بعض لوگ یا علی یا علی (رضی اللہ عنہ) کہتے تھے اور بہت سے لوگ بڑے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پکارتے تھے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بزرگ اللہ میاں سے زیادہ حفاظت کرتے ہیں:

بلکہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں اتنی حفاظت نہیں کرتے جتنی بزرگ کرتے ہیں' مکہ میں ایک شاہ صاحب حضرت حاجی صاحب کے بھتیجے حافظ احمد حسن صاحب کے پاس آئے اور کچھ نقد روپیہ امانت سپرد کی' انہوں نے کہا کہ بھائی اللہ کے سپرد کردو کہنے لگے کہ یوں نہ کہو' کیونکہ اللہ میاں نے اب سب کام بزرگوں کے سپرد کر دیا ہے اور اس پر ایک بیہودہ حکایت سنائی کہ ایک دوکاندار تھا اس کو جب دوکان سے اٹھنے کی ضرورت ہوتی تو وہ دوکان کو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر کے چلا جاتا ایک روز دوکان پر اس کا بھائی تھا وہ خود نہ تھا' اسے جو دوکان سے اٹھنے کی ضرورت ہوئی تو اس نے خدا کی سپرد کر دی' اسی دن چوری ہوگئی' اس کا بھائی آیا اور اس کو چوری کا حال معلوم ہوا تو اس نے پوچھا کہ تم نے

اٹھتے وقت دوکان کس کے سپرد کی تھی۔ اس نے کہا خدا تعالیٰ کے‘ تو وہ کہنے لگا کہ یہی تو غلطی کی‘ بھائی بڑے پیر صاحب کے سپرد کرنی چاہیے تھی۔

اسی طرح کی ایک اور حکایت ہے کہ قافلہ چلا جا رہا تھا‘ راستے میں چور مل گئے قافلہ والوں نے اول اللہ میاں کو پکارا تو کچھ نہ ہوا‘ پھر ایک بزرگ کو پکارا تو چور بھاگ گئے۔

غضب یہ کہ کتابوں میں بھی اس قسم کی حکایتیں لکھ دی ہیں‘ حضور ﷺ نے ایک کافر سے پوچھا کہ تمہارے کتنے خدا ہیں اس نے کہا کہ سات ہیں چھ زمین میں اور ایک آسمان میں‘ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مصیبت کے وقت کا کون ہے اس نے کہا آسمان والا‘ تو عرب کے تو مشرک بھی مصیبت کے وقت ایک خدا ہی کو پکارتے تھے‘ مگر ہندوستان میں بعض جاہل مسلمان مصیبت کے وقت بھی دوسروں ہی کو پکارتے ہیں۔

بعض لوگ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور جب اس سے نجات ہو جاتی ہے تو آزاد ہو جاتے ہیں:

تیسری قسم وہ ہے کہ گناہ کو یاد کر کے توبہ بھی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت خدا ہی کو پکارتے ہیں لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ جب تک مصیبت رہی اللہ بھی یاد رہے رسول ﷺ بھی یاد رہے‘ اور جب مصیبت ٹلی تو ایسے آزاد جیسے خدا تعالیٰ کے قبضہ ہی سے نکل گئے‘ اسی کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں کہ انسان مصیبت کے وقت تو خدا کو خوب پکارتا ہے اور جب وہ مصیبت دور کر دیتے ہیں تو ایسے ہو جاتے ہیں جیسے کوئی تعلق ہی نہ تھا‘ آگے فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ گناہ کرتے کرتے حد سے باہر ہوگئے ہیں اور یہ خاصیت ہے گناہ میں کہ اس میں عقل میں فساد آ جانا اور طبیعت میں سلامتی نہیں رہتی تو اس وجہ سے ان کو اپنے عمل اچھے معلوم ہوتے ہیں پس سبب اس کا گناہ کی عادت کر لینا ہے کہ اس کی وجہ سے بری باتیں اچھی معلوم ہونے لگتی ہیں‘ یہ مضمون ہے اس آیت کا اس کو سن کر ہر شخص اپنی حالت کو دیکھ لے کہ سب کی یہی حالت ہے یا نہیں‘ یقیناً سب اقرار کریں گے کہ یہی حالت ہے بس کچھ تھوڑا بہت فرق ہوگا‘ مگر خالی کوئی نہیں‘

دوسری جگہ بھی ایسا ہی مضمون ارشاد ہے۔

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّا اِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ۔

''یعنی جب تم دریا کے سفر میں ہوتے ہو اور کوئی مصیبت آتی ہے تو اس وقت سب کو بھلا کر کہتے ہو کہ اگر ہمیں اس سے نجات ملے تو ہم خاص خدا تعالیٰ..... کی عبادت کریں گے' مگر جب اس سے نجات ہو جاتی ہے تو سرکشی کرتے ہو اور پہلی حالت پر لوٹ جاتے ہو۔''

آگے فرماتے ہیں:

وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا☆

''کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

اس کے بعد فرماتے ہیں:

ہم ہر طرح خدا تعالیٰ کے بس میں ہیں:

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا☆ ''یعنی کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ ہم تم کو زمین ہی میں دھنسا[1] دیں' سو ان کے نزدیک یہ بھی کوئی مشکل بات نہیں' آخر قارون کو دھنسا ہی دیا تھا' اس واقعہ پر ہمارا تو ایمان تھا لیکن بعض کو پورا اطمینان نہ تھا مگر اب چند ہی سال ہوئے کہ کانگڑے کے قریب زلزلہ میں ایک بہت بڑے حصہ کو دھنسا دیا گیا تا کہ لوگ اب بھی دیکھ لیں' آگے فرماتے ہیں یا تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دیں کہ پھر تم اپنے لیے کوئی مددگار نہ پاؤ۔

غرض ہر طرح تم ہمارے قبضے میں ہو کسی طرح بچ نہیں سکتے' بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خیر اور اندیشے ہوا کریں' مگر وہ دریا کا اندیشہ تو کٹ گیا' اس کی بابت فرماتے ہیں اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى یعنی کیا اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ تم کو پھر دریا

[1] اور اسی سال مئی ۳۰ء میں رنگون کے قریب پیکو کا ایک حصہ زلزلہ میں دھنس گیا ۱۲ ظفر

ہی کا سفر کرنا پڑے، دیکھو روز مرہ یہ بات پیش آتی ہے کہ انسان ایک جگہ جانے کی قسم کھالیتا ہے کہ وہاں ہرگز نہ جائے گا، مگر پھر مجبور ہو کر جانا پڑتا ہے، اسی طرح اگر تم کو پھر سمندر کا سفر پیش آ گیا تو ممکن ہے، اس مرتبہ اللہ تعالیٰ سخت طوفان سے تم کو غرق ہی کر دیں اور یہ اوپر بتلا دیا ہے کہ اگر دریا میں بھی نہ جانا ہو تو دوسری جگہ بھی تو ہلاک کر سکتے ہیں کیونکہ اس کی قدرت خشکی اور دریا میں برابر ہے۔

مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک ملاح سے ایک شخص نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے؟ اس نے کہا کہ دریا میں ڈوب کر، کہنے لگا اور دادا، کہا دریا میں کہنے لگا پھر بھی تم دریا میں رہتے ہو ڈرتے نہیں، ملاح نے کہا تمہارے باپ کہاں مرے کہنے لگا گھر میں، پوچھا اور دادا، کہنے لگا گھر میں، ملاح نے کہا پھر بھی تم گھر میں رہتے ہو ڈرتے نہیں، تو خدا تعالیٰ کی قدرت ہر جگہ موجود ہے، بلکہ دریا میں تو بہت سی تدبیریں بچنے کی بھی ہو سکتی ہیں، پر خشکی میں اگر کوئی آفت آئے تو اس سے بچنے کی تو کوئی تدبیر ہی نہیں، جیسے دو ریل گاڑیاں ٹکرا جائیں تو کوئی صورت بچنے کی ہو ہی نہیں سکتی، رہا جہاز اگر ٹوٹ جائے تو ڈوبتے ڈوبتے بھی اس کو بہت دیر لگ جاتی ہے، دوسرے جہاز اکثر کنارے کے قریب ہی ہوتا ہے کہ وہاں سے مدد کا آنا بھی آسان ہوتا ہے۔

آدمی ہر وقت خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہے:

تو جو شخص سمندر میں خدا سے ڈرے اور خشکی میں نہ ڈرے وہ کس قدر نادان ہے، دوسرے اگر مان بھی لیا جاتے کہ سمندر ہی میں زیادہ خطرہ ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ دوبارہ سمندر ہی میں بھیج دیں اور ایک ایسی ہوا چلائیں کہ وہ کشتی کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے کر دے، اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَ کُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی کیا اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ دوبارہ دریا کا سفر کرنا پڑے اور یہ کچھ سمندر ہی کے خطرہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر مصیبت کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ کیا پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ پھر اسی قصہ میں پھنسا دیں جس سے نکلے ہو۔

مصیبت کا سبب گناہ ہے:

صاحبو! اپنے کو کسی وقت خدا کے قبضے سے نکلا ہوا نہ سمجھو اور سب گناہوں کو چھوڑ دو دیکھو! گناہ میں مصیبت اس لیے آتی ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ ناراض ہیں اور یہ بات سب گناہوں کے اندر ہے چاہے وہ کسی قسم کا گناہ ہو خدا تعالیٰ اس پر ناراض ہوتے ہیں تو جب خدا تعالیٰ ناراض ہوئے اور ہر قسم کی مصیبت ان کے قبضہ میں ہے تو کچھ عجب نہیں ہے کہ پھر کسی مصیبت میں پھنسا دیں۔

نمرود کی حکایت:

دیکھو اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوا تو نمرود کو ایک مچھر سے ہلاک کر دیا' تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ نمرود کی یہ حالت تھی کہ جب سر پر چوٹ لگتی تھی تو چین آتا تھا' تو وہ مچھر اب بھی موجود ہے اور خدا تعالیٰ کی اب بھی تو وہی قدرت ہے' دیکھو کہاں نمرود اتنا بڑا بادشاہ اور کہاں مچھر!

خدا تعالیٰ کو ہر طرح کی قدرت ہے:

مگر خدا تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ ہمارا ایک معمولی سپاہی بھی کافی ہے ایک چیونٹی ظاہر میں نہایت چھوٹی اور معمولی چیز ہے لیکن جب خدا تعالیٰ چاہتے ہیں تو اسی سے ہلاک کر دیتے ہیں اور جب ان کی حفاظت ہوتی ہے تو کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا' میں نے بہت مرتبہ دیکھا کہ سر میں تیل ڈال کر سر کے نیچے رومال رکھ کر سو گیا ہوں اٹھ کر دیکھا تو رومال پر چیونٹیاں چڑھی ہوئی ملیں' لیکن سر میں ایک چیونٹی بھی نہیں پائی گئی۔

سو اس سے بچانے والا کون ہے سوائے خدا کے' اور اگر وہ نہ بچائے تو ادنیٰ ذرہ پریشان کرنے کو بہت ہے۔

ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس کی ناک پر بار بار مکھی آ کر بیٹھتی تھی' اس نے تنگ آ کر کہا معلوم نہیں مکھی کو اللہ میاں نے کیوں پیدا کیا ہے وزیر نے کہا کہ اس واسطے پیدا کیا گیا کہ جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں ان کا گھمنڈ اور تکبر ٹوٹے۔

حاصل یہ ہے کہ ذرا سنبھل کر خدا تعالیٰ کی مخالفت کرو تم میں تو ایک مکھی کے مقابلہ کی تاب بھی نہیں، بس اگر بچنے کی کوئی صورت ہے تو یہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے لو لگالو اور گناہوں سے توبہ کرو۔

میں نے افلاطون کی ایک حکایت دیکھی ہے کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر آسمان کمان ہو اور زمین کی مصیبتیں تیر ہوں اور خدا تعالیٰ تیر چلانے والے ہوں تو بچ کر کہاں جائے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر چلانے والے کے قریب ہو جائے کیونکہ تیر دور والے پر چلاتے ہیں' افلاطون نے کہا کہ بیشک آپ نبی ہیں کیونکہ یہ جواب سوائے نبی کے کوئی نہیں دے سکتا تو افلاطون اتنا بڑا حکیم اور فلسفی[1] وہ بھی آپ کی نبوت کو مان گیا مگر ان لوگوں کی حماقت یہ تھی کہ ان کے اپنے علم اور حکمت پر ایسا گھمنڈ تھا کہ اپنے لیے نبی کی حاجت نہ سمجھتے تھے' تو اس حکایت کو اسلیے بیان کیا کہ خدا کے ان لشکروں سے اگر بچنا چاہے تو خدا کی نزدیکی حاصل کرے' شاید اس موقع پر کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ خدا کے نیک بندوں پر بھی تو مصیبتیں آتی ہیں' پھر نزدیکی حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہوا' تو جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ وہ واقع میں مصیبت ہی نہیں کیونکہ واقع میں مصیبت وہ ہے جس سے پریشانی ہو اور پریشانی صرف گنہگاروں کو ہوتی ہے نہ اطاعت کرنے والوں کو کیونکہ ان کی نظر ہر وقت مصلحت پر ہوتی ہے اور وہ ہر حال میں راضی ہیں جو کچھ ان کو پیش آتا ہے وہ اس کو خیر سمجھتے ہیں' اس میں کچھ جسمانی تکلیف سہنی پڑے مگر دل اندر سے خوش ہوتا ہے کچھ پریشانی اور شکوہ شکایت ان میں نہیں ہوتا تو ان کی مصیبت صرف ظاہر کے اعتبار سے مصیبت ہے واقع میں مصیبت نہیں۔

حضرت بہلول کی حکایت:

حضرت بہلول سے ایک شخص نے پوچھا کہ مزاج کیسا ہے انہوں نے کہا اس شخص کے مزاج کی کیفیت کیا پوچھتے ہو کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی خواہش کے موافق ہوتا

---

[1] افلاطون حکیم اور فلسفی وہ ہے جو بہت بڑا عقل مند ہو ۱۲

ہے' کہا یہ کس طرح ہوسکتا ہے' کہا یہ تو تم جانتے ہو کہ ہر بات خدا کے ارادہ اور خواہش کے موافق ہوتی ہے اور میں نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں مٹا دی ہے اور اس کے تابع کردیا ہے اب جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ میری خواہش کے موافق ہوتا ہے۔

شاہ دولا کی حکایت:

اسی طرح ایک حکایت مشہور ہے کہ پنجاب میں ایک بزرگ تھے شاہ دولا ایک مرتبہ دریا زیادتی پر تھا اور ان کے گاؤں کی طرف چلا آ رہا تھا' لوگوں نے ان بزرگ سے کہا کہ دعا کیجیے گاؤں کے ڈوبنے کا اندیشہ ہے' ان بزرگ نے کہا کہ کل آنا ہم دعا کریں گے' اور پھاوڑے ساتھ لے آنا' لوگ پھاوڑے لے کر حاضر ہوئے تو فرمایا کہ دریا کا راستہ گاؤں کی طرف کھودنا شروع کردو' لوگوں نے کہا کہ اس طرح تو کل کی بجائے آج ہی گاؤں تباہ ہو جائے' فرمایا مجھ سے دعا چاہتے ہو تو یوں ہی کرو' کیوں جدھر مولانا ادھر شاہ دولا۔ لوگ بھی ایسے معتقد تھے کہ گاؤں کی طرف رستہ کھودنے لگے بس فورا دریا دور ہٹ گیا' یہ حکایت تو بہت بڑی ہے میرا مقصود یہ ہے کہ وہ جدھر خدا کی مرضی دیکھتے ہیں ادھر ہی ہو جاتے ہیں۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی حکایت:

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے پر ایک مقدمہ ہو گیا تھا ایک حافظ لکھنؤ کے کہتے ہیں کہ مجھ کو تعجب تھا کہ سب کے لیے تو یہ دعا کرتے ہیں پر اپنے بیٹے کے معاملے میں کچھ نہیں کرتے' بس خواب میں دیکھا کہ مولانا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے یہ عرض کر رہے ہیں کہ یا اللہ میں اپنے بیٹے کے بارے میں تو کچھ کہوں[1] گا نہیں جو آپ کی مرضی ہو اس پر راضی ہوں۔

پس جس کی یہ شان ہو کہ جو خدا کی مرضی ہو وہی اس کی مرضی ہو اس کو کوئی ناگواری کیوں پیش آئے گی' اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ والوں پر کبھی کوئی مصیبت نہیں آتی دیکھے سنکھیا ایک کے لیے زہر ہے اور دوسرے کے حق میں دوا ہے' جس نے کسی تدبیر سے اس کا

[1] مصیبت کے وقت دعا کرنا منع نہیں ہے یہ ان پر حال کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے دعا نہیں کی ۱۲

زہر مار دیا ہو پس اللہ والے اس مصیبت کا زہر مار دیتے ہیں۔
اور خدا کی محبت اور اس کی رضا پر راضی رہنے سے اس کی ساری تیزی کھو دیتے ہیں۔ اب نہ کہیں کوئی چیز کڑوی ہے نہ سنکھیا زہر ہے۔

وعظ کا خلاصہ

خلاصہ یہ کہ جو واقع میں مصیبت ہے وہ گناہ ہی سے آتی ہے پس جب کوئی مصیبت آئے فوراً توبہ کرو اور اس توبہ پر پکے رہو۔ یہ نہیں کہ شکوہ شکایت کرنے لگو' کیونکہ یہ ایک فضول بات ہے حدیث میں تو یہاں تک آیا کہ اگر حاکم وقت کی جانب سے بھی کوئی بات خلاف مرضی کے پیش آئے تو حاکم کو برا بھلا مت کہو بلکہ خدا کو راضی کرو' وہ حاکم کے دل کو بھی نرم کر دیں گے۔

دیکھئے کتنی عمدہ بات سکھلائی ہے اور کس قدر فتنہ کی روک تھام کی ہے فرماتے ہیں کہ ان کے دل تو میرے قبضے میں ہیں' جب تمہارے عمل برے دیکھتا ہوں ان کے دل سخت کر دیتا ہوں تو جب حاکم کی طرف سے سختی دیکھو مجھے راضی کرو' میں ان کے دلوں کو نرم کر دوں گا' پھر وہ تمہارے ساتھ نرمی برتیں گے' کسی نے خوب کہا ہے **عُمَّالُکُمْ اَعْمَالُکُمْ** یعنی تمہارے عمل تمہارے حاکم ہیں' نادر شاہ کے زمانہ کا ایک شخص کہتا ہے کہ نادر شاہ کی صورت میں ہمارے برے عمل ہم کو ستا رہے ہیں' پس معلوم ہوا کہ یہ ظاہری کارخانہ باطن کے کارخانہ کے تابع ہے اول حکم وہاں سے صادر ہوتا ہے' پھر اسی کے موافق یہاں ہوتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ کے زمانہ کی حکایت سنی ہے کہ ایک مرتبہ شہر کا انتظام بہت خراب و ستہ تھا' ایک شخص نے شاہ صاحب سے وجہ پوچھی' فرمایا آج کل یہاں کے صاحب خدمت ست ہیں' پوچھا وہ کون صاحب ہیں' شاہ صاحب نے کہا کہ ایک کنجڑہ بازار میں خربوزے بیچ رہا ہے وہ آج کل صاحب خدمت ہے' یہ اس کے امتحان کے لیے

گئے اور امتحان اس طرح کیا کہ خربوزے سب کاٹ کاٹ کے اور چکھ چکھ کے ٹوکرے میں رکھ دیئے اور ناپسند کر کے کھڑے ہو گئے' مگر وہ کچھ نہ بولے' چند روز کے بعد دیکھا کہ انتظام بالکل درست ہو گیا اسی شخص نے پھر پوچھا کہ اب انتظام کیوں درست ہو گیا' شاہ صاحب نے فرمایا کہ صاحب خدمت بدل گئے اس نے کہا وہ کون ہے' شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک سقہ ہے چاندنی چوک میں پانی پلاتا ہے مگر ایک پیاس کی ایک چھدام لیتا ہے' یہ ایک چھدام لے گئے اور ان سے پانی مانگا' انہوں نے پوچھا چھدام بھی اور ہے کہا چھدام تو اور نہیں انہوں نے ایک دھول رسید کی اور کہا کہ مجھے بھی خربوزے والا سمجھا ہوگا' اس شخص نے آ کر شاہ صاحب سے بیان کیا کہ اس طرح واقعہ ہوا۔ شاہ صاحب نے فرمایا دیکھ لو آج کل یہ صاحب خدمت ہیں کہ سب کو نچا رکھا ہے۔

ظاہری انتظام باطنی انتظام کے تابع ہے:

تو ظاہر کا انتظام تابع ہے باطن کے انتظام کے جب خدا کو ناراض کرو گے تو اول باطن کے محکمہ میں حکم نازل ہوگا' پھر اس کے تابع ظاہر میں۔

صاحب خدمت بزرگوں کو ڈھونڈنا بیکار ہے:

ایسے فقیروں کو ڈھونڈنے لگے' ان کو ڈھونڈنا بالکل بیکار ہے اس لیے کہ وہ خدا کے قبضہ میں ہیں ان کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے' خوانہ ان کی خدمت کرو یا نہ کرو' تو مناسب یہ ہے کہ جو ان کے منہ سے نکلواتا ہے اس کو راضی کرو' لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈتے ہیں' اسی طرح بزرگوں کی فاتحہ اس نیت سے دلانا کہ ان سے ہمارا کوئی کام نکلے گا یہ بھی سخت غلطی ہے' دیکھئے آخر فرشتے تو بھی بڑے مقبول ہیں اور ان کے متعلق بھی اس قسم کے کام ہیں مگر ان کی فاتح کوئی نہیں دلاتا' کیونکہ جانتے ہیں کہ وہ بالکل مجبور اور فرمان کے تابع ہیں' پس اسی طرح سے یہ لوگ ہیں اور اگر کہو کہ فرشتے تو زندہ ہیں ان کی فاتحہ نہیں دلاتے تو میں کہتا ہوں کہ زندہ لوگوں کو بھی تو ثواب پہنچانا جائز ہے' پس جب ان کی فاتحہ اس لیے نہیں کرتے کہ وہ بالکل خدا کے حکم کے تابع

ہیں تو سمجھو کہ یہ حضرات بھی بالکل حکم کے تابع ہیں۔

غرض صاحب خدمت اور قطب خدا تعالیٰ کے حکم کے سامنے بالکل مجبور ہوتے ہیں کہ جیسا حکم ہوا ویسا کر دیا' پس ان سے محبت تو رکھنی چاہیے مگر ان سے دنیا کا کوئی کام نکلنے کی امید رکھنا سخت غلطی کی بات ہے۔

بزرگوں سے دعا کراؤ اور فضیلت دعا کی:

ہاں بزرگوں سے دعا کراؤ وہ بھی صرف ان بزرگوں سے جن کی حالت نبیوں سے ملتی ہو کہ وہ دعا بھی کرتے ہیں اور اصلاح بھی کرتے ہیں اور دعا کرانے کے ساتھ اپنے عمل کی درستی بھی کرو' گناہوں سے توبہ کرو' کیونکہ جب تک عمل درست نہ ہوں اس وقت تک ان کی دعا سے بھی کچھ ایسا نفع نہ ہوگا اور نہ ان کی سفارش کچھ کام دے گی' اس وقت لوگوں نے اول تو عمل کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اور اگر کچھ کرتے بھی ہیں تو یہ کہ بہت سے وظیفے پڑھ لیے' حالانکہ دنیا کے لیے جو وظیفے پڑھتے ہیں ان میں وہ ثواب نہیں جو کہ دعا میں ہے' کیونکہ وظیفہ پڑھنے میں دل کے اندر ایک دعویٰ ہوتا ہے کہ یہ ضرور کام دے گا' کیونکہ مجرب عمل ہے' اسی وجہ سے ان کو تیر بہدف سمجھا جاتا ہے اور دعا میں یہ دعویٰ نہیں ہوتا بلکہ اس میں عاجزی اور تواضع ہوتی ہے اور ثواب عاجزی اور بندگی ہی میں ہے۔

غرض یہ ہے کہ عمل کی درستی کرے اور ہمیشہ اس سبق کو یاد رکھے اور پھر خدا کو ناراض نہ کرے اور ناراض نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ جس گناہ کی وجہ سے مصیبت آئی تھی' خاص اس گناہ کو چھوڑ دے بلکہ سب گناہوں کو چھوڑ دے کیونکہ یہ تو صرف اسی کا خیال ہے کہ فلاں گناہ سے مصیبت آئی' کیا خبر ہے شاید کسی دوسرے گناہ سے آئی ہو، پھر اگر پچھلی مصیبت کسی خاص ہی گناہ سے آئی ہو تو کیا ضرور ہے کہ آئندہ کسی دوسرے گناہ سے نہ آئے گی۔

دیکھو اگر بڑے انگارے سے ایک دفعہ چھپر جلا ہو تو کیا اس کے بعد چنگاری کو چھپر میں رکھ دیں گے؟ ہرگز نہیں' بلکہ چھپر کو چھوٹی چنگاری سے بھی ویسا ہی بچاتے ہیں' جیسا

بڑے انگارے سے' غرض گناہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو چھوڑ دو!

وعظ کا خاتمہ اور دعا:

چونکہ اس مضمون کی ضرورت اس وقت عام تھی' کیونکہ ہم میں کوئی ایسا نہیں جو گناہوں میں گرفتار نہ ہو اور اس پر مصیبت نہ آتی ہو اس لیے اس وقت اس مضمون کو بیان کردیا گیا اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں

خدا تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو عمل کی توفیق بخشیں۔

(امین)

بحمد اللہ

✿✿✿

(۴۶) غفلت کا دفیعہ

منتخب از وعظ ہشتم مسمّٰی بہ ازالۃ الغفلت حصہ چہارم

دعوات عبدیت

خطبہ ماثورہ

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ☆

ترجمہ: اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں اور جو ایسا کرے گا تو ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں اور ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے اس سے پہلے خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کو موت آ کھڑی ہو پھر وہ کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جب اس کی میعاد آ جاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

بیان کی ضرورت:

یہ سورۂ منافقون کی تین آیتیں ہیں ان میں خدا تعالیٰ کو ایک ضروری مضمون بیان

کرنا مقصود ہے باقی دوسرے مضمون اس کے تابع ہیں اسی کی تاکید کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور وہ مضمون ایسا ہے کہ اس کے معلوم کرنے کی اس وقت ضرورت سب کو ہے کیونکہ اس میں کوتاہی عام طور پر ہو رہی ہے اور جانتے بھی ہیں کہ ہم سے یہ کوتاہی ہو رہی ہے مگر بوجہ غور نہ کرنے کے اس کو مرض نہیں سمجھتے اور اسی وجہ سے اس کو سخت مرض کہا جائے گا'

جس مرض کے مرض ہونیکی خبر نہ ہو وہ زیادہ تباہ کرنے والا ہوتا ہے:

کیونکہ مرض دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ مرض جس کے مرض ہونے کی مریض کو خبر ہو' دوسرا وہ مرض ہے جس کے مرض ہونے کی خبر ہی نہ ہو' ایسا مرض زیادہ تباہ کرنے والا ہوتا ہے اس لیے وہ زیادہ فکر کے قابل ہوتا ہے' اس وقت جن مرضوں میں گفتگو ہے یعنی گناہ ان کی چھوٹی سی فہرست تو ہر شخص کے ذہن میں ہے' یعنی حرام کاری چوری' جھوٹ بولنا وغیرہ کہ اس کو سب گناہ جانتے ہیں۔

دنیا میں کھپ جانا تمام گناہوں کی جڑ ہے:

لیکن بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ وہ ان سب کی جڑ ہیں اور اس لیے سب سے اول گناہوں کی فہرست میں ان کا نام ہونا ضروری ہے۔ اور سب سے زیادہ ان کی فکر ہونی چاہیے مگر ہم کو ان کی طرف ذرا توجہ بھی نہیں نہ گناہوں میں ہم ان کا شمار کرتے ہیں اور یہ ہماری بہت بڑی غفلت ہے' ان آیتوں میں ایسے ہی مرض کا ذکر ہے جو ہمارے نزدیک گناہوں کی فہرست میں داخل نہیں اس کا نام سن کر ہی معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے اس کو گناہوں میں شمار نہیں کیا' اور وہ مرض دنیا میں کھپ جاتا ہے' اب جس سے چاہے دریافت کر لیجئے کہ کسی نے اس کو مرض نہیں سمجھا' نماز نہ پڑھنے کو' دوسرے کا مال دبا لینے کو' زنا کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں' مگر دنیا میں کھپ جانے کو کوئی گناہ نہیں سمجھتا' حالانکہ یہ مرض ایسا عام ہے جس میں قریب قریب سب ہی پھنسے ہوئے ہیں اور ایسا قوی مرض ہے کہ سب گناہوں کی جڑ ہے اور جتنے گناہ ہیں سب اسی کی شاخیں ہیں' دیکھیے اگر کوئی شخص نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ وہ دنیا میں ڈوبا ہوا ہے اور دین سے بے فکر ہے'

اسی طرح روزہ، حج زکوٰۃ جس چیز میں بھی کوتاہی ہو اس کا سبب یہی ہے اگر کوئی شخص بدکاری میں مشغول ہے تو اس کی وجہ بھی دین سے بے فکری اور دنیا کی لذتوں میں کھپ جانا ہے، غرض اس کے ثبوت کے لیے لمبی چوڑی تقریر کی ضرورت نہیں اگر ذرا بھی غور کیا ہوگا تو معلوم ہوا ہوگا، کہ وجہ سب گناہوں کی یہی دنیا میں کھپ جانا ہے مگر پھر بھی سوائے کاملوں اور پرہیز گاروں کے سب اس میں گرفتار ہیں۔

دینداروں کی دینداری بھی اتنی ہی ہے کہ نماز پڑھ لیں خواہ بے فکری ہی سے ہو اور داڑھی نیچی کر لیں، چاہے لوگوں کا مال دبا رکھا ہو معاملہ کے اندر دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہوں، غرض دیندار بھی آجکل اس کا نام ہے کہ صورت دینداروں کی سی ہو اور سیرت میں دین کی صرف وہ باتیں ہوں جو رسوائی سے بچائے رکھیں۔ جیسے پانچ وقت کی نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا، باقی خصلتیں چاہے کتنی ہی خراب ہوں، ایسا شخص خود بھی اپنے کو اور دوسرے بھی اس کو دیندار سمجھتے ہیں اور اس سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ اگر ایسے آدمی سے مکر وفریب وغیرہ کی کوئی بات ظاہر ہوتی ہے تو لوگ اس کو دیندار سمجھ کر اور پھر ایسے کام کرتے دیکھ کر سب دینداروں کو اسی کی مثل خیال کر لیتے ہیں اور سب سے بدگمان ہو جاتے ہیں، اور اگر کہیں یہ مولوی بھی کہلاتے ہوں تو ان کے ساتھ مولوی بھی بدنام ہوئے سو اگر ان کی شکل دینداروں کی نہ ہوتی تو ان کے بے ہودہ حرکتوں سے دیندار تو بدنام نہ ہوتے، ایسے لوگوں کے دیندار کہلانے سے ایک نقصان تو یہ ہوا کہ ان کی وجہ سے دیندار بدنام ہوئے اور ایک برا اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ ایسی حرکتیں دیکھ کر لوگوں کو دینداری سے نفرت ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم نے بڑے بڑے دیندار دیکھے سب ایسے ہی ہوتے ہیں، اور شیطان یہ سمجھاتا ہے کہ جب دیندار ایسے ہیں تو یہ دینداری بیکار ہے اور اس طرح شیطان ان کو اور بھی دنیا میں کھپا دیتا ہے کہ فائدہ ہی کیا؟ اس دینداری سے اس سے تو دنیا دار ہی اچھے کیونکہ دیندار ہوئے تو فلاں شخص جیسے ہو جائیں گے، اگر ان لوگوں میں دینداروں کی شکل نہ ہوتی تو چاہے یہ خود برباد ہوتے، لیکن کوئی دوسرا تو دھوکہ میں نہ آتا۔

صاحبو! آج بہت بڑی جماعت ان ہی نام کے مولویوں کو دیکھ کر علم دین سے

نفرت کرنے لگی ہے، جب ان سے علم دین پڑھنے کو کہا جاتا ہے تو وہ صاف یہ جواب دیتے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب جیسے ہیں ویسے ہی ہم بھی ہو جائیں گے، پھر کیا نتیجہ ہوگا کہ دنیا سے بھی کھوئے گئے اور دینداری ملی تو ایسی ملی، یہ نقصان ہوا مولویوں کے دین سے بے فکری کرنے کا کہ خود تو بگڑے ہی تھے دوسروں کے لیے بھی ایک برا نمونہ بن گئے۔

پہلے زمانہ میں مسلمان ایسے ہوتے تھے کہ ان کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کرتے تھے اور آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام سے نفرت ہوتی ہے

ہمارے بزرگوں کی تو یہ حالت تھی کہ ان کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کرتے تھے دیکھیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کیا حالت تھی کہ ان کے عمل دیکھ کر لوگوں کو اسلام کی طرف رغبت ہوتی تھی، رہا تلوار اٹھانے کا قصہ سو یہ کافروں کا غلبہ دور کرنے کے لیے تھا، خواہ ان کے اسلام لے آنے سے یا صرف اطاعت کر لینے سے نہ کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان کرنے کے لیے۔

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اس دعویٰ کی پاکیزہ دلیل:

چنانچہ تلوار سے کوئی اسلام نہیں لایا کیونکہ اسلام دل سے ماننے کا نام ہے اگر تلوار کے زور سے لوگ اسلام لاتے تو ان کے دلوں پر تلوار کا اثر کیسے ہو جاتا اور دل پر اثر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان کی خصلتیں اور عادتیں نہایت پاکیزہ اور شرع کے بالکل مطابق ہو گئی تھیں، پس معلوم ہوا کہ ان کے دل پر کوئی اثر ہوتا تھا، پس اس اثر کا سبب مسلمانوں کے معاملات تھے۔

اسلام کی عدالت شعاری کی حکایت:

مشہور واقعہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ جو چوری ہو گئی تھی ایک یہودی کے پاس ملی آپ نے دیکھ کر پہچانی اور فرمایا کہ میری زرہ ہے، یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ، اللہ اکبر!

صحابہ نے کس قدر اسلامی تعلیم کا نمونہ اپنے آپ کو بنا لیا تھا کہ جہاں رعایا کو زبان سے آزاد کیا عمل سے بھی دکھلا دیا تھا کہ یہودی کی یہ جرأت ہے کہ بادشاہ وقت سے کہتا ہے کہ گواہ لاؤ' حالانکہ یہود خود ایک ذلیل قوم تھی جس سے انہوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ سرکشی کی تھی اس وقت سے برابر ذلت اور خواری ہی کی حالت میں رہے اور اب بھی جہاں کہیں ہیں ذلیل اور خوار ہی ہیں' پس ایک تو اس کو قومی ذلت حاصل تھی پھر یہ کہ آپ ہی کی حکومت میں رہنے والا تھا' مگر اس پر بھی یہ جرأت۔

اسلام کے اندر آزادی کے معنی:

صاحبو! یہ ہے اصلی آزادی نہ وہ جو آج اختیار کی گئی ہے کہ دین سے نکل گئے خدا کو چھوڑا' رسول کو چھوڑا' آزادی یہ ہے کہ کسی صاحب حق کی زبان بند نہ کریں کسی پر ظلم نہ کریں' حضور ﷺ کی یہ حالت تھی کہ ایک یہودی کا کچھ قرض آپ کے ذمہ تھا' ایک روز اس نے حضور ﷺ کی مسجد میں آ کر سخت تقاضا کیا اور حضور ﷺ کی شان میں بے ادبی کے کچھ الفاظ کہے' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو دھمکایا' حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو روکا اور فرمایا کہ اسے کہنے دو صاحب حق کو کہنے کا حق ہوتا ہے' تو آزادی یہ ہے کہ حکومت کر کے رعایا کو اتنا آزاد کر دیں' اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے رعایا کو اتنا آزاد بنا دیا تھا' کو اس یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ یا نالش کرو' چنانچہ انہوں نے حضرت شریح کے ہاں جو اس وقت قاضی تھے' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت سے اسی عہدے پر چلے آتے تھے' جا کر نالش کی' دونوں مدعی مدعا علیہ بن کر عدالت میں گئے اور ایک جگہ برابری کے ساتھ کھڑے ہوئے اور شریح نے شرع کے قانون کے موافق دونوں سے پوچھنا شروع کیا یہ نہیں کہ امیر المومنین کے آنے سے ہل چل پڑ جائے۔

غرض نہایت اطمینان سے اس یہودی سے پوچھا کہ یہ زرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے' اس نے انکار اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا گواہ لایئے' اللہ اکبر! ذرا آزادی دیکھئے کہ ایک قاضی خود خلیفہ سے گواہ طلب کر رہے ہیں اور خلیفہ بھی کون؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ جن پر جھوٹ کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا' مگر یہ صرف قانون کی بدولت تھا۔

دوسری قوموں نے ترقی کرنا اسلام سے سیکھا:

خدا کی قسم جن لوگوں نے تمدن اور ترقی کرنا سیکھا اسلام سے سیکھا اور پھر بھی اسلام کے برابر عمل نہ کر سکے..... غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ دو گوار لائے ایک امام حسن رضی اللہ عنہ اور ایک اپنا آزاد کیا ہوا غلام جس کا نام قنبر تھا' حضرت علی اور حضرت شریح کا اس مسئلہ میں اختلاف تھا کہ بیٹے کو گواہی باپ کے لیے جائز ہے یا نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک جائز تھی' اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کر دیا' لیکن حضرت شریح۔ کے نزدیک بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہ تھی اس لیے انہوں نے امام حسن رضی اللہ عنہ کی گواہی نہیں مانی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ غلام چونکہ آزاد ہو چکا ہے اس کی گواہی نہیں مانی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ غلام چونکہ آزاد ہو چکا ہے اس کی گواہی تو مقبول ہے' مگر امام حسن رضی اللہ عنہ کی گواہی آپ کے حق میں مقبول نہیں ان کے بدلے کوئی اور گواہ لائے' حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا' اگر آج کل کے معتقد ہوتے تو حضرت شریح رضی اللہ عنہ سے لڑ مرتے لیکن حضرت شریح اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ذرا سے دنیا کے فائدہ کے لیے مذہب کو بیچ دینے والے نہ تھے۔ وہ مذہب کی ہر بات پر جان فدا کرتے تھے' اگر مذہب پر عمل کرنے کی وجہ سے کچھ دنیا کا نقصان بھی ہو گیا تو اس سے ان کو ناگواری نہیں ہو سکتی تھی اگر حضرت شریح سے پوچھا جاتا تو وہ قسم کھا کر کہہ سکتے تھے' کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سچے ہیں لیکن چونکہ شرع کا قانون اجازت نہیں دیتا تھا' اس لیے آپ نے صرف اپنی عقیدت پر فیصلہ نہیں کیا' بلکہ گواہ طلب کیے اور جب امام حسن رضی اللہ عنہ کی بجائے اور کوئی گواہ نہ ملا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا۔ آپ نے اس کا کچھ برا نہ مانا اور عدالت سے واپس چلے آئے، باہر آ کر جب یہودی نے دیکھا کہ ان پر ذرا بھی ناگواری کا اثر نہیں تو اس کو بڑا تعجب ہوا کہ آپ شیر خدا ہیں اور آپ ہی کی حکومت ہے' پھر میرے ساتھ اپنے قاضی کے اجلاس میں حاضر ہوئے اور اس نے آپ کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ اور آپ نے خوشی سے اس کو منظور کر لیا' یہ کیا بات ہے' معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مذہب بالکل سچا ہے یہ اثر اسی کا ہے' پس یہ سوچ کر وہ آپ کے قدموں میں گر پڑا اور کہا لیجئے حضرت یہ زرہ آپ ہی کی

ہے اور میں مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ آپ نے فرمایا کہ ہم نے یہ زرہ تجھی کو دی' غرض وہ یہودی مسلمان ہو گیا اور آپ ہی کے ساتھ رہا' یہاں تک کہ ایک لڑائی میں شہید ہو گیا' اب بتلایئے کہ یہ یہودی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کو سر پر دیکھ کر مسلمان ہوا تھا یا تلوار کر نیام میں دیکھ کر۔

مسائل میں اختلاف ہونا اعتراض کی بات نہیں:

اس حکایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آج اختلاف پر علماء کو جو برا بھلا کہا جاتا ہے یہ بالکل بیجا ہے' کیونکہ یہ اختلاف پہلے ہی سے چلا آ رہا ہے' دیکھئے حضرت علی اور حضرت شریح رضی اللہ عنہما میں بھی بعض مسئلوں میں اختلاف تھا مگر آج کل کی طرح ان حضرات میں برا بھلا کہنا نہ تھا ایک دوسرے پر کفر کا فتویٰ نہیں لگاتے تھے' تو جس اختلاف میں تبرے بازی یہ بے شک برا ہے' ورنہ اصل اختلاف تو ایک لازمی بات ہے' چنانچہ پہلے زمانہ کے علماء میں بھی تھا اور اسی طرح حکیموں میں بھی ایک مریض کے علاج میں اختلاف ہوتا ہے' ایک ہی مقدمہ دو وکیلوں کے پاس لے جاؤ تو ہر ایک علیحدہ رائے دے گا' مگر اس اختلاف کے ہوتے ہوئے دونوں ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے ہیں' ان میں ذرا بھی لڑائی نہیں ہوتی' پھر اس کی کیا وجہ کہ علماء میں ذرا سے اختلاف میں لڑائی ہو جاتی ہے اس کی اکثر وجہ یہی ہوتی ہے کہ بڑے تو آپس میں ملتے نہیں' چھوٹے ایک دوسرے کی بات کو بڑھا کر نقل کرتے ہیں اور بڑے ان کو ادھر کی ادھر بات پہنچانے سے روکتے نہیں' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے رد میں رسالے تصنیف ہوتے ہیں' ایک دوسرے پر تبرا ہونے لگتا ہے اور کبھی وجہ اس کی غرض نفسانی بھی ہوتی ہے' خیر یہ بات تو درمیان میں آ گئی تھی' مقصود یہ تھا کہ پہلے زمانہ کے مسلمان ایسے ہوتے تھے کہ ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ اسلام قبول کرتے تھے اور آج سب سے زیادہ مسلمان ہی بدنام ہیں' اور کافر تو کیوں بدنام کرتے خود مسلمان ہی اپنے کو بدنام کرتے ہیں' ہماری یہاں تک حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کہیں باہر جانے لگے اور اس کو دس ہزار روپیہ رکھنے کی ضرورت ہو تو کسی مسلمان پر خیانت کے ڈر کی وجہ سے بھروسہ نہیں کرے گا اور مہاجن پر بھروسہ کرے گا۔

بعض جگہ طرابلس کہ زخمیوں کے لیے چندہ جمع کیا گیا اور انگریزوں کے وسیلہ سے بھیجا گیا' میں نے خود دیکھا ہے کہ بڑے بڑے رئیس جائداد وقف کرتے ہیں اور اس کا انتظام سرکار کے سپرد کرتے ہیں اس واسطے کہ ان کو کوئی مسلمان اس کا اہل نہیں ملتا' مگر افسوس کہ ہم کو اپنی حالت کی ذرا بھی خبر نہیں' ہاں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ خیانت تو کیا روپیہ کو ہاتھ لگانے سے بھی احتیاط کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ بریلی تشریف لے گئے ایک رئیس نے بہت سارا روپیہ آپ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اس کو جہاں آپ کا جی چاہے صرف کیجیے مولانا نے فرمایا کہ میں اس روپیہ کے خرچ کرنے کے قابل نہیں ہوں اور بطور ظرافت کے فرمایا کہ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر مجھے اس قابل سمجھا جاتا تو یہ روپیہ خدا کی طرف سے مجھ کو ملتا' جب نہیں ملا تو معلوم ہوا کہ میں اس قابل نہیں ہوں' آپ خود ہی خرچ کیجیے' آخر اس نے مشورہ دریافت کیا کہ کس کام میں خرچ کروں' آپ نے رائے دی کہ اس کی جائداد خرید کر اس کی آمدنی سے ایک مدرسہ جاری کر دیجیے' تو اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں لیکن اتنی تھوڑی تعداد میں ہیں کہ اس وقت میں مولانا کے نام کے ساتھ دس پندرہ نام بھی نہ لے سکا' کیونکہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں اور پہلے زمانے میں سب ایسے ہی تھے اور خیانت کرنے والے بہت ہی کم ہوتے تھے۔ اس لیے جب اس قسم کا ذکر ہوتا تو خیانت کرنے والوں کو گنا جاتا تھا۔ اب چونکہ عام طور پر لوگ خیانت پیشہ ہیں اس لیے امانت داروں کا شمار کیا جاتا ہے۔

جس کے معنی صاف یہ ہیں کہ ان کے سوا سب خیانت والے ہیں اور غیر معتبر ہیں' غرض مسلمانوں کی عام طور پر یہ حالت ہوگئی ہے اور یہ اسی وجہ سے ہے کہ ہم سب دنیا میں کھپے ہوئے ہیں' دین کی فکر نہیں۔

دوسری جن قوموں میں تہذیب وترقی ہے وہ بھی دین ہی کی وجہ سے ہے:

اگر کہیے کہ دوسری قومیں جو آج کل ترقی کر رہی ہیں وہ تو بے حد دنیا میں ڈوبی ہوئی ہیں، لیکن پھر بھی ان کی حالت درست ہے ان میں تہذیب[1] ہے امانت داری ہے تو معلوم ہوا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ ہماری تباہی اور بدحالی دنیا میں کھپنے کی وجہ سے ہے اگر یہ وجہ ہوتی تو دوسری قومیں ہم سے زیادہ برے حال میں ہوتیں تو جواب اس کا یہ ہے کہ ان کی ظاہری تہذیب کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ان خصلتوں میں دینداروں ہی کی نقل کی ہے، پس وجہ ترقی کی وہی دین نکلا اگر اصل نہیں نقل ہی سہی تفصیل اس کی یہ ہے کہ ان کے اہل علم نے اپنی کتابوں میں اقرار کیا ہے کہ ہم نے جو کچھ تہذیب اور ترقی سیکھی وہ مسلمانوں سے سیکھی اور مسلمانوں میں یہ ترقی اور تہذیب دین کی وجہ سے ہوئی تھی جیسے سچ بولنا' ایک ایسی صفت ہے کہ سچ بولنے والے کا سب ہی اعتبار کرتے ہیں' دیکھئے اس صفت کی بدولت کافر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم امین[2] کہتے تھے' چنانچہ کعبہ شریف کے بنائے جانے کے وقت حجر اسود کے رکھنے میں جب اختلاف ہوا اور قریب تھا کہ تلوار نکل پڑے' کیونکہ وہاں تلوار کا نکل آنا کیا مشکل تھا' آخر عقلمندوں نے کہا کہ کسی کو پنچ بنالو' فیصلہ اس پر ہوا کہ جو مسجد میں سب سے پہلے آئے وہی پنچ ہے اور سب نے دعا کی کہ "اللہ"! کسی ایسے شخص کو بھیج جو مناسب فیصلہ کر دے' آخر سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے جب لوگوں نے حضور کو دیکھا تو خوشی کا نعرہ مارا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم امین آئے اگر کوئی دوسرا بھی آتا تو لوگ اس کو پنچ بنالیتے' لیکن یہ خوشی ہرگز نہ ہوتی' یہ صرف آپ کی سچائی کی بدولت تھی' غرض آپ سے فیصلہ کے لیے کہا گیا' آپ نے فرمایا کہ اس کو ایک کپڑے میں رکھ کر ہر قبیلہ کا سردار اس کا ایک کونہ پکڑے۔ اور سب اس طرح اس کپڑے کو خانہ کعبہ تک پہنچا دیں اور وہاں پہنچ کر اس کو اس کی جگہ پر رکھنے کے لیے مجھ کو اپنا وکیل بنا دیں اور چونکہ وکیل کا فعل وکیل بنانے والے کا فعل سمجھا جاتا ہے' پس میرا رکھنا تم سب کا رکھنا ہوگا' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا' تو

---

[1] تہذیب' خصلتوں کا درست ہونا ۱۲۔

[2] امین۔ امانتدار۔

حضور ﷺ پر سچائی کی وجہ سے کافروں کو بھی پورا اعتماد تھا کہ آپ ہرگز کسی کی طرفداری نہ کریں گے، لوگ کہتے ہیں کہ تجارت کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے یہ بالکل غلط ہے، صرف سچائی کی ضرورت ہے۔

دیکھئے اکثر روپیہ والوں کو بھی قرض نہیں ملتا اور بہت سے مفلسوں کو مل جاتا ہے، اور اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ روپیہ ہونا کوئی عزت کی بات نہیں، بلکہ سچائی اور اعتبار ہونا اصل عزت ہے، تو اپنی شریعت کی خوبی دیکھئے کہ ایسی چیز سکھائی کہ اگر وہ ہو تو ایک پیسہ کی بھی ضرورت نہیں، اور نہ ہو تو ہزاروں روپے بھی بیکار ہیں، تو دوسری قوموں نے دیکھا کہ مسلمان برابر ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں، یہ دیکھ کر اس کے سبب میں غور کیا، اصل راز کو سمجھ نہیں سکے کیونکہ وہ تو یہ ہے کہ مسلمان خدا کی اطاعت کرتے تھے اور جو خدا کی اطاعت کرتا ہے اس پر خدا تعالیٰ مہربان ہوتے ہیں، اس کی وجہ اس کو ہر حالت میں ترقی ہوتی ہے، یہاں تک تو ان کی نظر نہیں پہنچی، مگر یہ نیک عادتیں جو ترقی کا ظاہری سبب تھیں ان پر ان کی نظر گئی، جیسے سچائی اور دوسرے کے فائدہ کو اپنے فائدہ سے آگے رکھنا اور سب کو برابر سمجھنا کسی کو حقیر نہ سمجھنا اور ہر شخص کو آزادی دینا، مگر آزادی سے عرفی آزادی مراد نہیں ہے کہ جس کا جو دل چاہے مذہب اختیار کر لے بلکہ وہ آزادی مراد ہے جو حضرت شریح اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برتی، یعنی صاحب حق کی آزادی اپنے حق حاصل کرنے میں، تو ان عادتوں کے فائدے دیکھ کر دوسری قوموں نے ان کو اختیار کر لیا، اور ان سے جیسا چاہتے تھے وہ فائدے حاصل ہوئے اور یہ اسلام کے سچے ہونے کی دلیل ہے کہ جہاں اسلام کی سکھائی ہوئی عادتوں کی نقل ہے وہاں بھی فائدے حاصل ہو جاتے ہیں تو جہاں اصل ہو گی وہاں کیوں نہ حاصل ہوں گے، تو معلوم ہوا کہ دوسری قوموں کی ترقی کی وجہ بھی عادتیں ہیں، اور وہ اگرچہ دنیا میں کھپے ہوئے ہیں، مگر وہ لوگ عقلمندی سے ان عادتوں میں خلل نہیں ڈالتے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھئے کہ مسلمان اور غیر قوموں کے اندر بڑا فرق ہے، وہ یہ کہ مسلمانوں کی غرض تو ان خصلتوں سے صرف خدا تعالیٰ کی رضامندی ہے، مسلمان سچ اس لیے بولے گا کہ اس میں خدا تعالیٰ راضی ہیں، اور دوسری قوموں کی غرض صرف دنیا کا

حاصل کرنا ہے' ان میں سے اگر کوئی سچ بولے گا تو صرف اس لیے کہ اس سے دنیا خوب حاصل ہوتی ہے اور اس فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان کا تو سچ بولنے میں ضرر بھی ہوگا تب بھی وہ سچ ہی بولے گا' اور دوسری قوموں کو اگر سچ میں نقصان کا اندیشہ ہو اور یہ یقین ہو کہ جھوٹ کی کسی کو اطلاع بھی نہ ہوگی' تاکہ بدنامی کا اندیشہ بھی جاتا رہے' جس سے آئندہ کو نقصان پہنچتا' تو ایسے وقت میں ممکن نہیں کہ کافر سچ بولے' پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے اندر اگر یہ عادتیں ہوں تو دین ہے اور کافروں کے اندر ہوں تو دین کی نقل ہیں' اب اس اعتراض کا جواب ہو گیا کہ غیر قومیں بھی ترقی کر رہی ہیں' حالانکہ ان میں دین نہیں' جس سے شبہ ہوتا ہے کہ ترقی کا مدار دین پر نہیں' کیونکہ ان میں اگرچہ دین نہیں ہے' لیکن دین کی صورت تو ہے' تو وہاں بھی یہ ساری ترقی دین ہی کی برکت سے ہے تو مسلمان جن کا اصل میں یہ دین ہے وہ جب اس کو چھوڑیں گے تو کس طرح خراب اور بدنام نہ ہوں گے' پس معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ساری تباہی دین کے۔

دیندار کو آج کل وحشی سمجھا جاتا ہے:

چھوڑنے کی وجہ سے ہے یہ ہے وہ مرض جس کو میں کہتا تھا اور جس کی طرف سے ایسی بے خبری ہے کہ اس وقت اس شخص کو وحشی سمجھا جاتا ہے جس کو دین کی فکر ہو اور دنیا کی حرص کم ہو کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی ضرورت سے ناواقف ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین کی فکر کو حماقت سمجھا جاتا ہے' بلکہ عقلمند ان کے نزدیک صرف وہ ہے کہ سود بھی نہ چھوڑے جوئے اور رشوت کو بھی نہ چھوڑے

دلی میں ایک شخص نے کہا تھا کہ اب وہ وقت نہیں کہ مسلمان حلال وحرام کو دیکھیں' اس وقت جس طرح بنے روپیہ لینا چاہیے۔

اَللّٰہُ اَکْبَر کس قدر دنیا میں ڈوب گئے ہیں اس وقت وہ حالت ہو رہی ہے' کہ اگر کوئی شخص اس قسم کے معاملات میں احتیاط کرتا ہے تو اس کو نکما کہتے ہیں کہ اس سے کیا ہو سکے گا'۔ تو غور کیجیے کہ یہ کتنا سخت مرض ہے' جس کو صحت سمجھا جاتا ہے' یہ حالت ہے کہ آج دین سے بے فکری اور بے پرواہی کرنے کو ہنر سمجھتے ہیں' اگر کوئی بی اے پاس ہو تو وہ ترقی

پر ہے چاہے ایک وقت کی نماز بھی نہ پڑھتا ہو۔ اور اگر نماز بھی پڑھے اور شرع کا پورا پابند بھی ہو لیکن انگریزی نہ جانتا ہو تو وہ نیم وحشی اور بے وقوف ہے' تو جس قوم کا دماغ اتنا خراب ہو گیا ہو اس کے مریض ہونے میں کیا شک ہے۔

آج کل دینداری صرف تسبیح پھیرنے کو سمجھتے ہیں اخلاق کو دین سے خارج سمجھتے ہیں:

اور میں صرف دنیا داریوں ہی کو نہیں کہتا بلکہ دینداروں کو بھی کہتا ہوں وہ بھی صرف تسبیح پڑھنے کو دین سمجھنے لگے ہیں' نہ ان میں عمدہ اخلاق ہیں نہ ان کو کوئی اثر ہے صبر' توکل[1] قناعت[2] شوق وغیرہ کا ان میں پتہ بھی نہیں۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ تسبیح تو بہت پڑھتے ہیں لیکن غریبوں پر ان کو ذرا بھی رحم نہیں آتا' سر پر عمامہ بھی ہے کرتا بھی نیچا ہے مگر ظلم وستم انتہاء درجہ کا' ایک پیسہ کہیں خرچ نہ کریں گے' اپنا حق بھی نہ ہو مگر اس کو اپنا حق سمجھیں گے ایسے لوگوں نے دین کو بدنام کر دیا ہے اور ایسے ہی لوگ ہیں جو عیب کو ہنر اور ہنر کو عیب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ زیادہ تقویٰ اور پرہیز کرنے سے دنیا کا نقصان ہوتا ہے' جب ان کی یہ حالت ہے تو دنیا داروں کی کیا شکایت کی جائے' غرض یہ مرض اول تو جڑ ہے تمام گناہوں کی' پھر اس وجہ سے اور بھی سخت ہو گیا' کہ لوگ اس سے غافل ہیں اور انہوں نے اس کو صحت سمجھ رکھا ہے۔

دنیا میں کھپ جانے کا علاج اور آیت:

اس آیت میں خداوند تعالیٰ نے ہمارے اسی مرض کا علاج بتلایا ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ "اے مسلمانو' تم کو تمہارا مال اور تمہاری اولاد خدا کے ذکر سے غافل نہ کر دے۔" یہ اول آیت کا ترجمہ ہے جو کہ اس جگہ پر مقصود ہے۔

---

[1] اللہ پر بھروسہ کرنا ۱۲

[2] جس قدر مل جائے کفایت کر لینا ۱۲

دنیا کا خلاصہ مال واولاد کی محبت ہے:

اور اس آیت میں دنیا کو ایک مختصر سی فہرست میں بتلا دیا' یعنی مال اور اولاد بس! یوں سمجھو کہ دنیا کا خلاصہ یہ ہے' دیکھو جب کسی کو خوش حالی کی تعریف کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس مال بھی ہے اولاد بھی' اور یہ جو آیت میں فرمایا کہ اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردے۔

اللہ کے ذکر سے مراد اطاعت ہے اگرچہ ایک تسبیح بھی نہ پڑھے:

تو اللہ کے ذکر سے یہی صرف مراد نہیں کہ اللہ اللہ کرے' بلکہ ہر قسم کی اطاعت اور فرمانبرداری مراد ہے۔

چنانچہ حصن حصین جو حدیث کی ایک کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ کُلُّ مُطِیْعٌ لِلّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ یعنی ہر اطاعت اللہ کا ذکر ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے حکم بجالانے کے لیے کھانا بھی کھائے تو وہ بھی ذکر ہے۔ بلکہ بیوی کے پاس جانے میں بھی اگر دین کی پابندی مقصود ہو تو وہ بھی ذکر ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ ذکر کے معنی یاد کرنے کے ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ جو کام بھی ہو اس کی مرضی کے موافق ہو۔ جس کو یاد کرنے کا تم دعویٰ کرتے ہو پس ذکر صرف اسی کو نہیں کہتے کہ تسبیح لے کر بیٹھے' اگر کوئی پانچ وقت کی نماز پڑھ لے روزہ رکھا کرے اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے اور حج فرض ہو تو وہ بھی کرلے تو یہ خدا تعالیٰ کا ذکر ہے چاہے ایک تسبیح بھی نہ پڑھے' یہ دوسری بات ہے کہ تسبیح کو جو خاص برکتیں ان سے یہ محروم رہے گا' لیکن نجات میں ذرا بھی کمی نہ ہوگی' ہاں یہ شرط ہے کہ گناہوں سے بچتا رہے' جو شخص صرف فرض اور واجب پر عمل کرے اور جس کام کی ممانعت ہے اس سے بچے وہ خدا کا مقبول ہے اس کو نہ قبر میں تکلیف ہوگی نہ قیامت میں عذاب ہوگا تو حقیقت ذکر کی دینداری ہے اور وہ تسبیح پر موقوف نہیں۔

ایک مثال:

سمجھانے کے لیے ایک مثال اس کی عرض کرتا ہوں فرض کیجیے کہ ایک شخص کسی

عورت پر عاشق ہو گیا اور اس نے ملنے کی کوشش کی اور عورت نے کہا کہ میں رات میں ملوں گی' لیکن ذرا آدمیوں کی شکل بنا کر آنا' اب یہ شخص کیا کرے گا' یہ کرے گا کہ نائی کو بلا کر خط بنوائے گا' غسل کے لیے پانی تیار کرے گا اور غسل کرے گا' بازار جا کر کچھ زیور وغیرہ ہدیہ دینے کے لیے خریدے گا' صبح سے شام تک اسی دھن میں رہے گا' لیکن صبح سے شام تک نام ایک دفعہ بھی اس کا نہیں لیا' تو ظاہر میں تو محبوب سے غافل رہا' بلکہ اپنے ہی کو بنایا' سنوارا اور خریدنے بیچنے میں لگا رہا' اس وجہ سے جس کو راز کی خبر نہیں یوں سمجھے گا کہ یہ شخص عشق کے دعویٰ میں بالکل جھوٹا ہے۔ مگر جس کو دل لگی کی خبر ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے دل میں تو ہر وقت وہی محبوب بسی ہے' اگر عطر خریدا ہے تو اس لیے اس سے ملوں گا' زیور خریدا ہے' تو اسی واسطے کہ اسے پہناؤں گا۔

غرض ہر کام اسی کے لیے ہے اپنے لیے کچھ بھی نہیں ورنہ آج سے پہلے یہ سب کام کیوں نہیں کیے تھے تو جب دنیا کی محبوبہ یہ غلبہ کر سکتی ہے تو کیا اصلی محبوب کی محبت ہر چیز میں غالب نہیں آ سکتی۔

دنیا کے کام اگر اللہ کے لیے ہوں تو وہ بھی عبادت ہیں:

اگر کسی تاجر کو خدا تعالیٰ سے محبت ہو تو وہ تاجر وہی چیز لے گا جو خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہو' کھانا بھی اسی لیے کھائے گا کہ خدا کا حکم ہے' آرام بھی اسی لیے کرے گا کہ اس وقت آرام کرنے کا حکم ہے تو ظاہر حالت دیکھنے والا اگرچہ یہ سمجھتا ہے کہ دیندار نہیں مگر واقع میں وہ پکا دیندار ہے' حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی شخص دین کے لیے گھوڑا پالے تو اس گھوڑے کا کھانا پینا' سونا یہاں تک کہ دوڑنا' بھاگنا پیشاب لید کرنا' سب اس شخص کی نیکیوں میں لکھا جاتا ہے۔

دیکھیے خود اس شخص کا عمل بھی نہیں' بلکہ گھوڑے کا عمل ہے اور اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے تو جب نیک نیتی والے کے گھوڑے کا پیشاب اور لید کرنا بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا تو خود اس کے عمل جن کا دین سے تعلق ہو چاہے ظاہر کے لحاظ سے وہ دنیا ہی کے کام ہوں تو کیوں اس کے نامۂ اعمال میں نہ لکھے جائیں گے اس سے

معلوم ہوا کہ خود اس کا پائخانہ پیشاب کرنا بھی اس کے لیے ثواب کا باعث ہوگا۔ پس استنجا بھی اگر حکم شرع کے موافق ہو اور حکم شرع پر عمل کرنے کے لیے ہو وہ بھی دین ہے' اسی وجہ سے استنجے کے طریقے اور قاعدے بھی ہم کو بتلائے گئے اگر اس کو دین سے کچھ تعلق نہ ہوتا تو حضور ہم کو اس کے قاعدے کیوں سکھلاتے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی پر ایک کافر نے یہ طعنہ کیا کہ تم کو تمہارے نبی بول و براز کے طریقے بھی سکھلاتے ہیں' تو صحابی نے نہایت دلیری سے جواب دیا کہ بے شک ہمارے نبی ہم کو بول و براز کے بھی قاعدے سکھلاتے ہیں (جیسے یہ کہ داہنے ہاتھ سے استنجا نہ کریں اور تین ڈھیلوں سے کم پر کفایت نہ کریں وغیرہ وغیرہ) صحابہ کرام چونکہ حقیقت سمجھتے تھے اس لیے ایسے موقعوں میں دشمنان دین سے بچتے نہ تھے۔

ہم لوگ صریح دین کی باتوں میں لجتے ہیں:

اب ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ دین کی کھلی باتوں میں بھی لجنے لگتے ہیں۔ ایک کہتے تھے کہ میں نے ریل میں نماز اس لیے نہیں پڑھی کہ سب کے سب ہندو اس میں تھے' وہ میری نماز پر ہنستے اور اسلام کی بے عزتی ہوتی' لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ آج کل یہاں تک حالت پہنچ گئی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہم پر اتنا اثر تو نہیں ہوتا کہ نمازیں چھوڑ دیں' لیکن اتنا اثر ضرور ہے کہ اگر ہم غیروں کے سامنے کھانا کھاتے ہوں اور ہمارے ہاتھ سے ٹکڑا زمین پر گر پڑے تو اس کو اٹھا کر کبھی کھانے کی ہمت نہ ہوگی' اس کو عار سمجھیں گے اور بہت ادب اور دینداری کا غلبہ ہوگا تو کسی نوکر کو اٹھا کر دے دیں گے کہ اس کو کہیں ادب سے رکھ دو۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی حکایت

مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ حالت تھی کہ حضرت حذیفہ کہیں کے حاکم ہو کر گئے' ایک مرتبہ کہیں دورہ میں تھے کہ کھانا کھاتے وقت ایک لقمہ آپ سے گر گیا' مٹی لگ گئی' معلوم ہوتا ہے کہ دسترخوان بھی کافی آپ کے آگے نہ تھا' آپ نے اس لقمہ کو اٹھا کر صاف

کر کے کھالیا اور وہاں کے سب لوگ تعجب سے دیکھتے رہے' ایک شخص نے آپ کے خادموں میں سے اسی وقت آپ کے کان میں کہا کہ یہ لوگ ایسی باتوں کو ذلت سمجھتے ہیں آپ نے بلند آواز سے یہ جواب دیا کہ میں ان احمقوں کی خاطر اپنے نبی کریم ﷺ کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتا'

ہم کو جو کچھ ذلت ہوئی اپنے بزرگوں کے طریقہ کو چھوڑنے سے ہوئی:

صاحبو! ہم کو جو کچھ ذلت ہوئی وہ اپنے بزرگوں کے طریقے چھوڑنے سے ہوئی۔

حضرت خالد کی حکایت: ایسا ہی قصہ حضرت خالد کا ہے کہ ہامان ارمنی کے پاس جب مسلمان گئے تو وہاں ریشم کا فرش بچھا ہوا تھا' حضرت خالد نے حکم دیا کہ اس کو الٹ دیا جائے' ہامان ارمنی نے کہا کہ میں نے آپ کی عزت کی تھی' آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا' حضرت خالد نے جواب دیا کہ حضور ﷺ نے ہم کو اس سے منع کیا ہے اور تو جو یہ کہتا ہے کہ میں نے عزت کی تھی' تو سمجھ کہ زمین خدا کا فرش ہے جو تیرے ریشمی فرش سے ہزار درجے بہتر ہے' ان حضرات کے دل ایسے کھلے ہوئے تھے کہ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔

صاحبو! یہ ہے حوصلہ اور عالی ہمتی اور جب ہر چمکدار چیز کی چمک دمک سے ہماری آنکھیں چندھیانے لگیں تو دلوں سے وہ عالی ہمتی جاتی رہی۔

ایک جگہ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عیسائیوں کے ہاتھ میں قید ہو گئے' عیسائی اپنی شان و شوکت دکھلانے کے لیے ان کو ایک گرجا گھر میں لے گئے جہاں نہایت ہی زیب و زینت اور چمک دمک تھی اور وہاں حسین اور خوبصورت عورتوں کو بھی جمع کیا گیا تھا' مقصود یہ تھا کہ ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر ان کی طرف رغبت ہوگی' اور ان کے ملنے کے شوق میں ہمارا دین قبول کر لیں گے' صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب اس سامان کو دیکھا تو انہوں نے زور سے اللہ اکبر کے نعرے لگائے' لکھا ہے کہ اس تکبیر کی ہیبت سے گرجا گھر میں ہلچل پڑ گئی اور وہاں کے قندیل آپس میں ٹکرانے لگے۔

صاحبو! آج ہم لوگوں کی تکبیروں سے قندیل کیوں نہیں ٹکرا جاتے' خدا کی قسم ہم

لوگ بالکل گر گئے ہیں کسی کام کے نہیں رہے۔

مولوی عبدالجبار صاحب کی حکایت:

مولوی عبدالجبار صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ جب میں لارڈ دفرن سے ملا ہوں تو اس نے میری عبا کا دامن پکڑ کر کہا کہ اس لباس میں آپ شہزادہ معلوم ہوتے ہیں اور ہم تو اپنی وضع سے مجبور ہیں' میں اس قول کو نقل کر کے کہا کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے نزدیک عالموں کا فتویٰ قابل عزت نہیں تو صاحب وائسرائے کا فتویٰ تو ضرور قابل عزت ہونا چاہیے۔

غرض ہمارے دلوں میں ہر چمکدار چیز کی عزت ہے معمولی ہو یا غیر معمولی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں صرف خدا کی عزت تھی۔

گرے ہوئے لقمے کو اٹھا کر کھا لینے کا راز مع اس کی مثال کے:

اب میں گرے ہوئے لقمے کو اٹھا کر کھا لینے کا راز بتلاتا ہوں' سمجھے کہ اگر کوئی بادشاہ اپنے دربار میں بلا کر آپ کو کھانے کے لیے کچھ دے اور کہے کہ میرے سامنے بیٹھ کر کھاؤ اور کھانے کے وقت آپ سے ایک لقمہ زمین پر گر جائے تو اس وقت آپ کیا کریں گے کیا اس لقمہ کو پھینک دیں گے' ہرگز نہیں بلکہ جلدی سے اس کو اٹھائیں گے اور اور اٹھا کر صاف کر کے کھا لیں گے تاکہ بادشاہ خوش ہو کہ ہماری دی ہوئی چیز کی اس نے قدر کی' افسوس کیا خدا کی عزت دنیا کے بادشاہ کی عزت کے برابر بھی نہیں رہی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل میں خدا کی عزت تھی اس وجہ سے ان کے دیئے ہوئے رزق کی بھی عزت کرتے تھے' اور ہمارے نزدیک بادشاہ کی دی ہوئی چیز کی کچھ عزت نہیں' افسوس کہ دل کی آنکھیں جاتی رہیں' ہر چیز میں عیب نکالا جاتا ہے کہ یہ تو کچی رہ گئی ہے اور اس میں تو نمک نہیں ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ کچی کھایا کرو' اگرچہ عقل کا فتویٰ تو یہی ہے کہ کچی بھی کھا جاؤ' کیونکہ بادشاہوں کے بادشاہ کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ لیکن قربان ہو جایئے شریعت پر کہ اس

نے ہم پر رحم کیا اور اس کے چھوڑ دینے کی اجازت دی۔

عقل ہم کو دشوار راستہ پر لے جانا چاہتی ہے اور شریعت آسان راستہ پر:

اور یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ عقل ہماری دشمن ہے ہم کو سخت اور دشوار راستہ پر لے جانا چاہتی ہے لیکن شریعت آسانی کر کے نرم راہ بتاتی ہے اور عقل کے فتویٰ کو موقوف کرتی ہے' اے عقل کے پوچھنے والو! تم عقل پر عمل کرو' ہم شریعت پر عمل کرتے ہیں' جنہوں نے عقل اور شریعت کے فتویٰ کا مقابلہ کر لیا ہے وہ کہتے ہیں

آزمودم عقل دور اندیش را

بعدازاں دیوانہ سازم خویش را

یعنی عقل کو تو بہت آزمالیا' اب شریعت پر عمل کریں گے' خیر یہ بات تو درمیان میں آ گئی تھی' مقصود یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ کیفیت تھی کہ وہ دین کو حقیقت سمجھتے تھے' ان کے نزدیک دین صرف نماز اور روزہ ہی کا نام نہ تھا بلکہ جو کام بھی اللہ کے لیے کیا جائے اس کو وہ دین سمجھتے تھے، چاہے وہ ظاہر میں دنیا ہی کی حاجت ہو۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے کہ جس وقت پیشاب پاخانہ کا تقاضا مجبور کر رہا ہو' مسئلہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایسے وقت میں نماز پڑھنا حرام ہے اور استنجے سے فراغت کرنا واجب ہے۔

اگر عبادت بھی قاعدہ کے خلاف کی جائے تو ناجائز ہے؟

یہاں سے ایک اور بات کام کی ذہن میں آئی وہ یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی فاتحہ اور تیجے وغیرہ کو حرام بتاتے ہیں...... میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو نماز کو منع فرماتے ہیں' اس کے جواب میں یوں کہو گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے منع نہیں فرماتے بلکہ بے ڈھنگے پن سے منع فرماتے ہیں۔

عملی رسوم کا جائز طریقہ:

اب اگر کہو کہ اچھا ڈھنگ کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ ڈھنگ وہ ہے جو صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کرتے تھے' کیا ان کے رشتہ دار نہ مرتے تھے' تو ان سے تیجا اور فاتحہ کرنا کہیں ثابت ہوتا ہے؟ کہیں بھی نہیں' بلا کسی قید کے ثواب بخشتے تھے' تم بھی ایسا ہی کرو۔ ہم نے جو ثواب پہنچانے کے لیے دن اور تاریخ مقرر کر رکھے ہیں یا اور طرح طرح کی قیدیں لگا رکھی ہیں' چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے پابند نہ تھے اس لیے ہم کو بھی یہ چھوڑ دینا چاہئیں۔

رسوم کے متعلق عوام کے عذر کا جواب:

اخیر عذر لوگوں کا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو تو نیک کاموں کی رغبت نہیں رہی اس وجہ سے ضرورت ہے کہ دن اور تاریخ مقرر کر دیئے جائیں اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں کلمہ شریف قرآن شریف پڑھنے کا ثواب ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ پڑھنا دنیا کے لیے ہوتا ہے' جب پڑھنے والے ہی کو ثواب نہ ملا تو بخشے گا کیا؟ پس وہ نفع کہاں ہوا۔

دوسرا شریعت کا قاعدہ ہے کہ اگر ایسے کام میں جس کا شریعت میں حکم نہیں' مصلحت اور فساد دونوں جمع ہو جائیں تو فساد کی وجہ سے اس کام کو چھوڑ دیں گے' نفع کا اعتبار نہیں کریں گے اور ان کاموں میں فساد یہ ہے کہ عام لوگ ان کو دین کا جزو سمجھ گئے ہیں' جس طرح ان کے نزدیک نماز روزہ وغیرہ دین کی باتیں ہیں اسی طرح فاتحہ اور تیجہ بھی ہے اور غیر دین کو دین سمجھنا نہایت برا ہے' کیونکہ اپنی مقرر کی ہوئی رسم کو خدا تعالیٰ کا حکم بتلاتا ہے۔

بدعت کے گناہ ہونے کا راز:

اس کی ایسی مثال سمجھو کہ اگر کوئی شخص یہ ڈھنڈورا پیٹ دے کہ صاحب کلکٹر کا حکم ہے کہ ہر شخص ایک آنہ دے اور اس کو جمع کر کے کھانا پکوایا جائے اور فقیروں کو کھلا کر سرکار کے لیے دعا کی جائے' حالانکہ صاحب کلکٹر نے یہ حکم نہیں دیا تھا تو اس منادی کرانے میں چاہے سرکار کا فائدہ ہی ہو مگر پھر بھی جرم ہوگا کہ اس منادی نے ایسی چیز کو سرکار کا حکم بتلایا جو واقع میں سرکار کا حکم نہیں' خواہ اس میں مصلحت بھی ہو' اسی طرح تیجہ وغیرہ کو دین میں داخل کرنے والوں نے بھی ایسی چیز کو خدا تعالیٰ کا حکم قرار دیا جو واقع میں خدا تعالیٰ کا حکم

نہیں ہے خواہ اس میں مصلحت بھی مان لی جائے۔

ثواب بخشی کی رسموں میں لوگوں کے اعتقاد صحیح نہیں اور اس پر چند حکایتیں:

آپ اس میں غور کرلو کہ لوگ اس رسم کو شرع کا حکم سمجھتے ہیں یا نہیں، میں نے کانپور میں ایک شاہ صاحب کو یہ کہتے سنا کہ گیارہویں اٹھارہویں تاریخ تک جائز ہے پھر جائز نہیں اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دن اور تاریخ وغیرہ کی قید کو بھی شرع کا حکم سمجھتے ہیں۔

اور لیجیے کانپور کی کسی مسجد میں دو طالب علموں میں بحث ہو رہی تھی ایک کہتا تھا کہ نیاز دلانے والوں کا عقیدہ اچھا نہیں ہوتا کیونکہ نیاز خدا کی ہونی چاہیے اور وہ نیاز بزرگوں کی کرتے ہیں، دوسرا کہتا تھا کہ ان کا عقیدہ اچھا ہوتا ہے، مقصود ان کا صرف بزرگوں کو ثواب بخشنا ہے اور نیاز خدا ہی کی دلائی جاتی ہے، اتفاق سے اسی وقت ایک بڑھیا ایک دونے میں مٹھائی لے کر آئی کہ مولوی صاحب اس پر بڑے پیر صاحب کی نیاز دے دو، جو طالب علم ناجائز بتلا رہے تھے انہوں نے اس بڑھیا سے پوچھا کہ بڑی بی! نیاز اللہ میاں کی دے دیں اور ثواب بڑے پیر کو بخشش دیں وہ بڑھیا کہنے لگی نہیں بیٹا! اللہ میاں کی نیاز تو میں دلا چکی ہوں یہ تو بڑے پیر صاحب کی نیاز ہے، وہ طالب علم اس دوسرے طالب علم سے کہنے لگے کہ سن لیا آپ نے آپ کی اماں آپ کی تاویل کو نہیں مانتیں، تو عوام کے اس قسم کے اعتقاد ہیں۔

پڑھے لکھے لوگ عوام کے فعل کی تاویل تو کر لیتے ہیں لیکن واقع میں وہ تاویل چل نہیں سکتی، جیسا کہ اس واقعہ سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا،

خواص کے کسی جائز فعل سے اگر عوام کا عقیدہ بگڑتا ہو تو خواص کو بھی اس کا کرنا جائز نہیں:

ممکن ہے کہ اس کے جواب میں کوئی یہ کہے کہ ہمارا تو یہ عقیدہ نہیں پس ہمارے لیے تو جائز ہونا چاہیے تو سمجھو کہ شریعت کا یہ مسئلہ ہے کہ اگر خواص کے کسی کام سے عوام کا

عقیدہ بگڑتا ہوتو خواص کا بھی اس فعل کر کرنا جائز نہ رہے گا' اس کی مثال ہے کہ اگر حکیم منع کر دے کہ بچے کو حلوانہ دنیا تو ماں باپ کو بھی حلوا پکانا یا کھانا نہ چاہیے کہ ان کو دیکھ کر بچہ ضد نہ کرنے لگے' بلکہ بچے کی حرص کے خیال سے ماں باپ خود ہی اس کو گوارا نہیں کریں گے۔

صاحبو! اسی طرح اگر تم کو مسلمانوں سے محبت ہوتو سمجھ میں آ جائے کہ اگر ہمارے کسی کام سے کوئی بگڑے تو ہم کو بھی اس کے کرنے کی کچھ ضرورت نہیں بلکہ اجازت نہیں۔

ثواب پہنچانے کی اگر صورت بدل دی جائے جس میں بدعت کا شبہ نہ ہوتو وہ جائز ہے:

اگر وہ کام کرنا ہی ہے تو یہ کرو کہ اس کی صورت بدل دو تا کہ عوام پر اس کا برا اثر بھی نہ پڑے اور کام بھی ہو جائے' میری ہمشیرہ کا جب انتقال ہوا تو طالب علموں نے کہا کہ اگر اجازت ہوتو ہم جمع ہو کر قرآن شریف پڑھ دیں' میں نے کہا کہ پڑھو بلکہ ہر شخص اپنے حجرے میں بیٹھ کر جتنا جی چاہے پڑھ دے اور اس میں راز یہ ہے کہ جو کام خدا کے لیے نہیں ہوتا وہ مقبول نہیں ہوتا' اور ثواب بخشنے کی حقیقت یہ ہے کہ اپنا ثواب دوسرے کو دیا جائے تو جب اپنے ہی کو ثواب نہ ملے گا تو دوسرے کو کیا چیز دی جائے اور جب جمع ہو کر پڑھا جائے گا تو چار آدمی تو اللہ کے واسطے پڑھیں گے اور دس آدمی محض شکایت سے بچنے کے لیے' ان کی نیت ہوگی اگر ہم نہ پڑھیں گے تو یہ اپنے دل میں سمجھیں گے کہ دیکھو ان کو ہم سے تعلق کم ہے تو ایسے لوگوں کو خود ہی ثواب نہیں ملے گا' پھر وہ اس مرحومہ کو کیا بخشیں گے' اس لیے اگر تم پڑھنا چاہو تو حجرے میں بیٹھ کر پڑھو اور پھر پڑھنے کے بعد بھی مجھے خبر نہ کرو کہ کس نے پڑھا اور کتنا پڑھا کیونکہ خبر کرنے سے پھر میری خوشی کا خیال ہوگا' اس کے جواب میں لوگ کہتے ہیں کہ یوں تو کوئی بھی نہ پڑھے گا' میں کہتا ہوں رسم کے طور پر ہونا بھی تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر اگر مان لو کہ کسی نے بھی نہ پڑھا تو کیا نقصان ہو گیا'

[1] تاویل یہ کہ کسی بات کا ظاہر کے خلاف مطلب لیا جائے ۱۲

ثواب اب بھی نہ ہوگا' اس وقت بھی نہ ہوتا' ایک شخص مجھ سے کہنے لگا کہ آپ کی کتاب اصلاح الرسوم[1] سے مردوں کا بہت ہی نقصان ہوا' میں نے کہا مردوں کو تو نقصان نہیں ہوا لیکن زندوں کو نفع ہو گیا'

ثواب بخشی کی رسموں میں دکھلاوا زیادہ ہوتا ہے:

کیونکہ لوگ جو کچھ کرتے تھے دکھاوے کے لیے کرتے تھے اور اس سے ان کے نقصان کے سوا مردے کو کچھ بھی نفع نہیں ہوتا تھا' اور دکھاوے کے لیے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ فلاں شریف آدمی کو جو بہت غریب ہے پچاس روپیہ دے دو لیکن خفیہ دینا ورنہ وہ نہیں لے گا تو کوئی دینے والا بھی اس کو گوارہ نہیں کرے گا' اور دل میں کہے گا کہ واہ اتنا روپیہ بھی خرچ ہو اور کسی کو خبر نہیں ہوئی' تو جب وہ کام مخلوق کو دکھلانے کو ہوا تو یقینی بات ہے کہ اس میں ثواب تو نہ ملا پھر اس کے نہ دینے سے مردوں کا کیا نقصان ہوا' ہاں زندوں کا نفع ہو گیا' کہنے لگے واقعی سچ کہتے ہو' تو یہ ایسی صاف باتیں ہیں کہ ہر شخص سمجھتا ہے ع

اگر اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے

ان رسموں کی ممانعت پہلے بھی مولوی کرتے آئے ہیں کوئی نئی بات نہیں ہے:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلے بھی تو مولوی تھے انہوں نے کیوں منع نہیں کیا' میں کہتا ہوں کہ پہلے بھی منع کیا ہے یہ بالکل غلط ہے کہ پہلے عالموں نے منع نہیں کیا کتابوں میں موجود ہے ہم لوگ حنفی ہیں' حنفی عالموں کی کتابوں میں دیکھ لیجیے کہ ہمارے امام صاحب کا فتویٰ کیا ہے اور انہوں نے کیا اصول اور قاعدے بیان فرمائے ہیں' ان چیزوں سے جو منع کیا جاتا ہے یہ بالکل انہیں قاعدوں کے موافق ہے۔

غرض جب ایک وقت میں نماز بھی منع ہو جاتی ہے تو رسمیں کس شمار میں ہیں' پس

[1] اصلاح الرسوم کے اندر حضرت مولانا نے اس قسم کی تمام رسموں کی خرابیاں بیان کی ہیں بڑی عمدہ کتاب ہے ۱۲۔

جب ان کی وجہ سے عوام کے عقیدے خراب ہوتے ہیں تو ان کا چھوڑ دینا ضروری ہے' آخر وہ نماز سے بڑھ کر تو نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ پیشاب پاخانہ کے دباؤ کے وقت نماز کے منع ہو جانے سے معلوم ہوا کہ ایک وقت پر استنجا بھی عبادت ہے حالانکہ صورت اس کی عبادت نہیں۔

دین نام اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کا ہے' دنیا اللہ تعالیٰ سے غفلت کا نام ہے:

اس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کام جو ظاہر میں عبادت نہ ہو شرع کے حکم کے موافق کیا جائے وہ بھی عبادت ہے۔

یہ مطلب ہے اس کلام کا کُلُّ مُطِيْعٍ لِلّٰهِ فَهُوَ ذَاكِرٌ یعنی ہر اطاعت کرنے والا اللہ کا ذکر کرنے والا ہے' پس دین خدا کے راضی کرنے کا نام ہے اگر صبح...... سے شام تک کوئی ایک تسبیح نہ پڑھے لیکن ہر حکم میں ان کی اطاعت کرے تو وہ دیندار اور ذکر کرنے والا ہے' دنیا دار اور غافل نہیں ہے کسی[1] نے خوب کہا ہے کہ دنیا خدا سے غافل ہونے کا نام ہے' بیوی بچوں اور مال و دولت کا نام نہیں۔

تجارت میں شرع کے حکموں کی رعایت رکھو:

صاحبو! مال کے کمانے کی ممانعت نہیں شوق سے ملازمت کرو تجارت کرو لیکن شرع کے حکم کی رعایت رکھو' سودے میں کوئی عیب ہو تو اس کو ظاہر کر دیا کرو' یہ کہدو کہ یہ دوا اصلی ہے اور یہ نقلی' اگر وبا کے دن ہیں تو ایسا نہ کرو کہ ایک ہی بوتل سے عرق بادیان اور گلاب اور سپید مشک سب نکلتا چلا آئے' اسی طرح برسوں کی رکھی ہوئی دوا نہ ہو' اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم سچ بولیں تو تجارت کیسے چلے' اول تو یہ غلط ہے کہ سچ بولنے سے تجارت نہ چلے گی' دوسرے نہ بھی چلے تو تمہارا کیا حرج ہے' خدا دوسرے طریقہ سے رزق دے گا۔

---

[1] چیست دنیا از خدا غافل بودن — نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ایک تاجر کے سچ بولنے کی برکت کی حکایت:

کانپور میں ایک شخص نے بانس کی تجارت شروع کی' جب کوئی خریدار آتا تو صاف کہہ دیتے کہ یہ بانس چار برس چلے گا' یہ سن کر خریدار واپس چلا جاتا۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ اور سچ بولو' کہنے لگے کہ نہ بکے گا تو میرا کیا حرج ہے خدا تعالیٰ دوسرے طریقہ سے دے گا' آخر ان کا ایسا اعتبار بڑھا کہ ان کے ہاں مال ہوتے ہوئے دوسروں کا مال بکنا کم ہوگیا۔

ایک طالب علم کے سچے توکل کی حکایت:

مولانا فتح محمد صاحب کے ہاں ایک طالب علم مثنوی پڑھنے کے لیے آیا' مولانا نے فرمایا' اول روٹیوں کا انتظام کرلو پھر پڑھنا' اس نے کہا روٹی تو اللہ تعالیٰ دیں گے اور جب نہ دیں گے اپنی جان لے لیں گے اس کی کیا فکر' لوگوں کو اس کی کہیں خبر ہوگئی' پھر ان کی دعوتیں ہونا شروع ہوئیں تو کئی مہینے تک خوب مزہ دار کھانے دو وقت ملتے تھے اور جتنا ان کو پڑھنا تھا' خوب اطمینان سے پڑھ لیا' غرض کہ رزق تو قسمت میں لکھا جاچکا ہے وہ تو کسی نہ کسی طرح ملے ہی گا۔

رزق اگر قسمت کا نہیں تو ملکر بھی کام نہیں آتا:

اور اگر قسمت کا نہیں تو تم کو مل کر بھی تمہارے کام نہ آئے گا' جیسے ایک حکیم نے کہا کہ دو تولہ یخنی کھایا کرو زیادہ کی اجازت نہیں' اب اگر ہوس سے زیادہ پی لیں گے تو وہ دستوں کی راہ سے نکل جائے گی۔

لکھنؤ کے ایک نواب کی حکایت:

ایک واقعہ ہے کہ لکھنؤ میں ایک نواب کو کوئی بیماری معدہ کی ہوگئی اس کی وجہ سے چند تولہ قیمہ چوسنے کی اجازت تھی اور زیادہ ہضم بھی نہ ہوتا تھا' ایک مرتبہ انہوں نے ایک لکڑ ہارے کو دیکھا کہ اس نے سر پر سے لکڑیوں کا بوجھ اتار کر ان کے گھر کے سامنے رکھا اور چادر میں سے دو موٹی روٹیاں نکال کر پیاز یا چٹنی سے کھا کر پانی پی کر زمین ہی پر لمبا

ہو کر سو گیا اور خراٹے لینے لگا' نواب صاحب اس کو دیکھ کر کہنے لگے کہ میں دل سے راضی ہوں کہ میری نوابی اس کو مل جائے اور اس کا آرام اور چین مجھے دے دیا جائے۔

غرض جب رزق کی یہ حالت ہے تو اس کے لیے جھوٹ بولنا' دغا کرنا بالکل حماقت ہے' خلاصہ یہ کہ تجارت کرنا' کھیتی کرنا' جب کہ شرع کی حد کے اندر ہو سب دین ہے' اس لیے میں یہ نہیں کہتا کہ کچھ نہ کرو یہ کہتا ہوں کہ دغا فریب نہ کرو' جھوٹ نہ بولو اور یہ نہ سمجھو کہ رزق جھوٹ ہی بول کر ملے گا'

خدا تعالیٰ کی رضامندی سے رزق میں برکت ہوتی ہے:

صاحبو! کیا خدا کو ناراض کر کے رزق ملے گا عجیب خیال ہے اور اگر کہو کہ اس دلیل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ فرمانبرداری میں زیادہ ملے مگر دیکھا یہی جا رہا ہے کہ نافرمانی میں زیادہ ملتا ہے۔

فرمانبرداروں کی مفلسی صرف ظاہری ہے معہ حکایت شاہ ابوالمعالی صاحب

تو صاحبو! اگر کہیں ایسا ہے بھی تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ فرمانبرداروں کی ناداری اور مفلسی صرف ظاہری ہے واقع میں ان کو کچھ تکلیف نہیں'

مثال کے طور پر ایک واقعہ سناتا ہوں' اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ دینداروں کی مفلسی کس قسم کی ہوتی ہے' ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ شاہ ابوالمعالی کے پیران کے ہاں مہمان ہوئے اس روز شاہ صاحب مکان پر نہ تھے' اور گھر میں فاقہ تھا بیوی کو فکر ہوئی ادھر ادھر سے قرض لینا چاہا تو قرض بھی نہ ملا پیر صاحب کو اس حالت کا پتہ چل گیا' انہوں نے ایک روپیہ دیا اور کہا کہ اس کا اناج لے کر ہمارے پاس آؤ' چنانچہ لایا گیا' آپ نے اس کو ایک برتن میں رکھ کر ایک تعویذ اس کے اندر رکھ دیا اور فرمایا جب ضرورت ہوا کرے اس میں سے ضرورت کے موافق نکال لیا کرو مگر تعویذ اس کے اندر رہے' یہ فرما کر پیر صاحب تو دو ایک روز رہ کر چل گئے لیکن اس اناج میں تعویذ کی وجہ سے ایسی برکت ہوئی کہ وہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا' چند روز کے بعد حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب واپس تشریف

لائے اور مدت تک کوئی فاقہ نہ ہوا' تو ایک روز تعجب سے فرمانے لگے کہ کیا بات ہے کہ بہت دنوں سے کوئی فاقہ نہیں ہوا' بیوی نے پیر صاحب کے آنے کا اور تعویذ رکھنے کا قصہ بیان کیا' حضرت کو اس سے بہت فکر ہوئی کہ اب کیا کیا جائے' اگر تعویذ اسی طرح رہنے دیا جاتا ہے تو بھی فاقہ کی نعمت...... نصیب نہ ہوگی اور اگر نکالا جاتا ہے تو پیر کے دیئے ہوئے تعویذ کی بے ادبی ہوتی ہے' آخر بہت سوچ کر آپ نے فرمایا کہ اس برتن کو میرے پاس لاؤ چنانچہ لایا گیا' آپ نے تعویذ نکال کر اپنے سر میں رکھا اور فرمایا کہ حضرت کے تبرک کا مستحق تو میرا سر ہے اور اناج کے لیے حکم دیا کہ سب فقیروں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اگلے وقت سے پھر فاقہ شروع ہو گیا اور فرمایا کہ ہمارا فقر و فاقہ اختیاری ہے مجبوری کا نہیں ہے سو آپ ان کو نادار سمجھتے ہیں' مگر یہ لوگ دولت اسی کو سمجھتے ہیں۔

فرمانبردار کو ناداری میں وہ چین اور اطمینان ہوتا ہے جو سلطنت میں بھی نہیں ہے:

مطلب یہ ہے کہ فرمانبرداری میں بھی اس قدر چین اور اطمینان ہوتا ہے' کہ حرام کھانے والوں کو بادشاہت میں نہیں ہوتا اور اصل دولت یہی چین اور اطمینان ہے' مال سے بھی یہی مقصود ہے' سو فرمانبرداروں کو وہ بدوں مال کے بھی میسر ہے' پس اصل دولت اور راحت اطاعت ہی سے ملتی ہے' دیکھئے اگر غذا بہت سی ملے لیکن سب دستوں کے راہ نکل جائے تو بے کار ہے اور اگر غذا کی روح بلا غذا کے مل جائے تو کھانے کی ضرورت نہیں ہے' پس میرا دعویٰ ثابت رہا' اگر طاعت کرو گے تو اور بھی زیادہ ملے گا یعنی غذا کی روح ملے گی اور چین اور اطمینان جو اصل مقصود ہے وہ حاصل ہوگا۔

آخرت کی ترغیب:

غرض شکایت یہ ہے کہ اس وقت لوگ جس طرح سے دنیا ہاتھ آتی ہے لیتے ہیں جائز ناجائز کا خیال نہیں کرتے گناہ سے نہیں ڈرتے اس کی اصلاح ہونی چاہیے اور دینداری پیدا کرنی چاہیے' خواہ تہجد اور تسبیح نہ ہو کیونکہ رحمت خدا تعالیٰ کچھ تسبیح اور تہجد پڑھنے

والوں کے ساتھ خاص نہیں' بلکہ ان کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہوا ہے جس کا دل چاہے حاصل کر لے۔

آخرت کی دولت حاصل کرنے کا طریقہ:

مگر افسوس تو یہ ہے کہ کوئی لیتا ہی نہیں اور لینے کی صورت یہی ہے کہ دینداری اور پرہیز گاری اختیار کرو۔

لوگوں کے حقوق کی زیادہ فکر ہونی چاہیے:

بندوں کے حق جہاں تک ہو سکے ادا کرو' اس وقت دوسروں کے حقوق کا ذرا خیال نہیں کرتے' یاد رکھو کہ اگر کسی کے تین پیسے بھی کسی کے ذمہ رہ گئے تو اس کی سات سو نمازیں اس صاحب حق کو دلوائی جائیں گی۔

آج کل دوسرے کا حق ادا کرنا ایسا گراں ہوتا ہے جیسا اپنے گھر سے دے رہے ہیں' یہاں تک کہ بعض وقت صاحب حق کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اللہ کے واسطے دے دو' اور اسی سبب سے دوسروں کو قرض دینے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور اسی لیے قرض میں اٹھارہ گنا ثواب ملتا ہے اور صدقہ خیرات کرنے میں دس گنا ثواب ملتا ہے۔ اٹھارہ کا حساب اس طرح ہوا کہ اصل میں قرض کا ثواب خیرات کے ثواب سے دو گنا ملا تھا' یعنی ایک کے مقابلے میں دو' مگر جب اصل روپیہ واپس مل گیا تو اس کے مقابلہ میں دو کٹ گئے اور اٹھارہ رہ گئے' آخر ہمارے اس برتاؤ کا نتیجہ ہوا کہ اکثر لوگوں کو قرض نہیں ملتا آج مسلمانوں میں بہت سے لوگ اپنے بھائیوں کا کام نکال سکتے ہیں' کیونکہ مال دار ہیں' کسی وجہ سے خود تجارت نہیں کرنا چاہتے اور چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس رقم کو کام میں لگائے تاکہ حفاظت سے بچیں' مگر اس خوف سے نہیں دیتے کہ اس سے وصول کون کرے گا اس وجہ سے مسلمانوں کو ضرورت کے وقت مہاجن سے قرض لینا پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز کے بعد تمام گھر بار کا مالک مہاجن ہی ہو جاتا ہے اور یہ صرف مسلمانوں کے لیے اعتباری کی وجہ سے ہے' مظفر نگر میں میرے ایک دوست سے ایک شخص نے دس روپیہ

یہ کہہ کر قرض لیے کہ آج میرے مقدمہ کی تاریخ ہے اور گھر سے دن کے دن منگا نہیں سکتا' تم اس وقت دے دو میں وطن جاتے ہی بھیج دوں گا' غرض انہوں نے جب وطن جا کر بھی مدت تک نہ بھیجا تو انہوں نے تقاضا شروع کیا اول تو وہ ٹلاتے رہے جب زیادہ تقاضا ہوا تو کہنے لگے کہ آپ کیسے روپیہ مانگتے ہیں' کیا آپ کے پاس ہمارا کوئی رقعہ ہے' یہ آخر صرف کر کے بیٹھ کہے' تو قرض لینے والوں کی یہ حالت ہے اور پھر غضب یہ کہ اس حرکت کو دینداری کے خلاف بھی نہیں سمجھتے۔

صاحبو! یہاں دوسروں کا قرضہ نہیں دیتے ہو تو کیا قبر میں جا کر دو گے' کیسا ظلم ہے کہ اپنے سارے کام کرتے ہیں مگر دوسروں کا قرض نہیں دیتے اور اگر کوئی مانگتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ کیا قرض مار میں ہے اور اس سب کی وجہ وہی ایک مرض ہے جو جڑ ہے تمام مرضوں کی کہ دین کی فکر نہیں۔

ریل میں قانون سے زیادہ اسباب لے جانیکی ممانعت:

بہت سے مسلمانوں کو دیکھا ہے کہ ریل میں زیادہ مال لے جاتے ہیں اور ذرا پرواہ نہیں کرتے' بلکہ بعضے تو کہتے ہیں کہ کافر کا حق مار لینے میں کچھ ڈر نہیں حالانکہ کافر کا حق مارنا بھی ایسا ہی حرام ہے جیسا کہ مسلمان کا' بلکہ ایک بزرگ تو یہ کہتے تھے کہ مسلمان کا حق تو چاہے لے لو لیکن کافر کا حق نہ لو کیونکہ مسلمان سے تو یہ بھی امید ہے کہ وہ قیامت میں معاف کر دے۔ اور کافر سے تو یہ بھی امید نہیں' دوسرے اگر معاف نہ کیا تو خیر' اپنی نیکیاں اپنے ہی بھائی کے پاس جائیں گی' دشمن کے پاس تو نہ جائیں گی۔

میراث میں آج کل بہت گڑ بڑ ہے:

خاص کر میراث میں تو ایسی گڑ بڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ' جس کے ہاتھ جو آ گیا وہ اس نے دبا لیا' اکثر دیکھا گیا ہے کہ بیوی مہر معاف کر دیتی ہے' لیکن خاوند کے انتقال کے بعد وارثوں سے لڑ جھگڑ کر وصول کر لیتی ہے' بعض لوگ حیلے ڈھونڈ کر وارثوں کو نہیں دینا چاہتے۔

چنانچہ ایک صاحب میرے پاس آئے کہنے لگے کہ میری بہن سنی تھی اور اس کا خاوند شیعہ تھا' اب اس بہن کا انتقال ہوگیا ہے تو اس خاوند کو اس کے مال میں سے حصہ نہ ملنا چاہیے' کیونکہ سنی عورت سے شیعہ مرد کا نکاح درست نہیں ہوتا۔

شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شیعوں کے متعلق کفر کا فتویٰ لکھا ہے' میں نے عزت دار! آج جائداد کے بچاؤ کے لیے شاہ صاحب کا فتویٰ نظر آ گیا اور دس ۱۰ برس تک جو بہن سے حرام کرایا اس وقت اس فتویٰ پر عمل نہ کیا اب تو میں یہی کہوں گا کہ نکاح ہو گیا تھا' اور میں نے کہا ایمان سے بتلاؤ کہ تمہاری بہن سے پہلے یہ شخص مر جاتا اور بہت سی جائداد چھوڑ جاتا' تب بھی تم یہی کہتے کہ نکاح نہ ہوا تھا' اس لیے بہن کو میراث نہ ملنی چاہیے ہرگز بھی نہ کہتے' تو لوگوں کا یہ حال ہے حیلے نکال نکال کر شریعت کو بدلنا چاہتے ہیں گویا خدا تعالیٰ کو بھی پھسلانا چاہیے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ

''یعنی دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو اور نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنے نفسوں کو۔''

افسوس کہ بعض لوگوں نے دین کو نفس کی خواہشوں کے لیے آڑ بنالیا ہے' چنانچہ یہاں تک مشہور ہو گیا کہ دیندار لوگ اپنے مطلب کے مسئلے نکال لیتے ہیں' خدا کی قسم دینداروں کا تو یہ مذہب ہے کہ اگر کھلا مسئلے نکال لیتے ہیں' خدا کی قسم دینداروں کا تو یہ مذہب ہے کہ اگر کھلا ہوا گناہ کریں تو اس سے اچھا ہے کہ دین کے پردے میں گناہ کریں غرضکہ میراث میں یہ گڑ بڑ ہو رہی ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کو میراث دینا نہیں چاہتا' حالانکہ میراث کا مسئلہ ایسا نازک ہے کہ ایک بزرگ اپنے دوست کی بیمار پرسی کے لیے گئے' جب ان کا انتقال ہوگیا تو آپ نے فوراً چراغ گل کر دیا اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگایا اور فرمایا کہ یہ تیل اب تمام وارثوں کا ہو گیا تھا اور سب وارثوں سے اجازت ملنی دشوار تھی اس لیے میں نے چراغ گل کر دیا' آج یہ حالت ہے کہ اللہ واسطے دینے میں بھی احتیاط نہیں کہ جہاں کہیں کوئی مرا فوراً اس کے کپڑے مسجد یا مدرسہ میں بھیج

دیئے' حالانکہ جس وقت تک وارثوں میں تقسیم نہ ہو جائیں اس وقت تک اس میں سب وارثوں کا حق ہے' پس بدوں سب کی خوشی اور اجازت کے اس کا دینا جائز نہیں ہے اور اگر ایک وارث دے دے گا تو شرع کی رو سے اسی قدر اس کے ترکہ میں سے اس کا حصہ کم ہو جائے گا' مگر لوگوں نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے' جو جی میں آیا کر لیا' شریعت سے کچھ بحث ہی نہیں' پھر غضب یہ کہ بعضے اس کی بھی اتنی کوشش کرتے ہیں کہ نفسانی خواہشوں کو مولویوں سے جائز کرالیں۔

مولویوں سے ہر بات کے جائز کرانے کی مثال:

میں نے اس کی ایک مثال میرٹھ میں بیان کی تھی کہ مولویوں سے ہر بات کے جائز کرانے کی کوشش کرنا ایسا ہے' جیسا مشہور ہے کہ ایک رئیس کی عادت تھی کہ وہ اکثر بے تکی باتیں کہا کرتا تھا لوگ اس پر ہنسا کرتے تھے' آخر اس نے ایک شخص کو اس کام کے لیے نوکر رکھا' جو کچھ ہم کہا کریں تم ہماری بات کو بنا دیا کرو چنانچہ وہ ملازم اس کام کے لیے خدمت پر مقرر ہو گیا' ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ آج ہم شکار کو گئے' ہرن پر جو فائر کیا تو گولی اس کے کھر میں لگ کر پیشانی کو توڑتی ہوئی نکل گئی' لوگ ہنسنے لگے' خادم نے عرض کیا حضور بجا ہے' وہ ہرن اس وقت کھر سے پیشانی کھجلا رہا تھا' تو جیسے کام کے لیے اس رئیس نے نوکر کو مقرر کیا تھا' ویسا ہی کام آج ہمارے بھائی مولویوں سے لینا چاہتے ہیں۔

اس سے تو یہ بہتر ہے کہ کھلم کھلا گناہ کرے لیکن ناجائز کو جائز تو نہ بنائے غرض جب تک خواہش نفسانی کو مغلوب نہ کرو گے' ایمان میں تازگی نہ آئے گی۔

خواہش نفسانی کو کم کرنے کا مطلب:

مگر خواہش نفسانی کو کم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ کھانا پینا کم کر دیں اسوقت تو درویشوں کو بھی کھانا کم نہ کرنا چاہیے' حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ خوب کھاؤ اور نفس سے خوب کام لو اس واسطے کہ خوش دل مزدور کام زیادہ کیا کرتا ہے' تو کھاؤ پیو' کپڑا پہنو' ہنسو بولو مگر شرع کی حد سے باہر مت نکلو' ہر چیز میں جائز ناجائز کا لحاظ رکھو' آمدنی آئے

تو اس کو دیکھ لو کہ حرام طریقہ سے تو نہیں آئی' ریل میں سفر کرو تو دیکھ لو کہ اسباب قانون کی اجازت سے زیادہ نہیں ہے' دوسرے یہ کہ ہم ریل میں بیٹھے ہیں تو ہم نے شریعت کے موافق جگہ گھیری ہے یا زیادہ جگہ گھیری ہے۔

صاحبو! دین ریل میں' کچہری میں سب جگہ تمہارے ساتھ ہے' رعایا کسی وقت قانون سے آزاد نہیں ہو سکتی' سونے کے وقت دیکھ لو کہ پیر قبلہ کی طرف تو نہیں ہیں بے نماز پڑھے نہ سور ہو اور اگر سونے لگو اور خود جاگنے کی توقع نہ ہو تو کسی کو مقرر کر دو کہ وہ تم کو نماز کے وقت جگا دے اور شریعت نے جیسے دین کی مصلحت کی رعایت کی ہے اسی طرح دنیوی مصلحت کا بھی لحاظ رکھا ہے' چنانچہ یہ بھی قانون ہے کہ بے روک والی چھت پر نہ سور ہو پس شریعت صرف گرانی کا نام نہیں ہے' بلکہ اس نے تمہاری ہر طرح کی مصلحت کی رعایت کی ہے۔

دینداری اس کا نام ہے کہ ہر حال میں خدا تعالیٰ کی رضامندی کا لحاظ رکھو!

شرع کی پابندی اس کا نام ہے کہ ہر حال میں خدا تعالیٰ سے تعلق رکھو دنیا یا دین کا جو کام ہو شرع کے موافق کرو' اسی کو فرماتے ہیں لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ یعنی تمہارے مال اور اولاد تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے گا تو ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں' آگے اس کی تاکید کے طور پر فرماتے ہیں کہ خرچ کرو اس چیز سے کہ دیا ہم نے تم کو' یہ حکم عام ہے ہر کار خیر میں خرچ کو' اس عام حکم میں علم دین کے اندر خرچ کرنا بھی داخل ہے' اگر ضرورت ہو تو علم دین کے حاصل کرنے کے لیے بھی خرچ کرو' اور اس کو خصوصیت کے ساتھ میں نے اسلیے بیان کیا کہ یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ دین کو دنیا پر غالب رکھنا ضروری ہے' لیکن دین کا غالب رکھنا دین کے علم پر موقوف ہے مگر یہ اس بات سے کوئی یہ مطلب نہ سمجھ جائے کہ میں سب کو مولوی بنانا چاہتا ہوں۔

جواب اس شبہ کا' علماء سب کو مولوی بنانا چاہتے ہیں:

بلکہ جن عالموں کی نسبت آپ یہ خیال کرتے ہیں وہ خود ہی سب کو مولوی بنانے

سے منع کرتے ہیں' کیونکہ اس سے دو نقصان ہوں گے ایک تو یہ کہ جب تمام لوگ مولوی بن جائیں گے تو کھیتی اور تجارت سب برباد ہو جائے گی' حالانکہ معاش کی حفاظت کرنا بھی فرض ہے اگر سب چھوڑ دیں اور اس سبب سے سب مر جائیں تو سب گنہ گار ہوں گے' تو واجب ہے کہ ایک جماعت کھیتی کے لیے رہے اور ایک تجارت کے لیے اور ایک دین کی خدمت کے لیے جس کو لوگوں نے اڑا دیا ہے' دوسرا نقصان یہ ہے کہ اگر سب مولوی بنیں تو چونکہ اکثر طبیعتوں میں حرص اور لالچ غالب ہے اور ذریعہ معاش سے بھی اکثر لوگ فارغ نہیں ہیں' تو انجام یہ ہوگا کہ مولوی کہلائیں گے اور دنیا کی حرص میں دین کو تباہ کریں گے۔ اور دین کو دنیا کے حاصل کرنا کا ذریعہ بنائیں گے' ان کا تو یہ نقصان ہوگا' اور دوسرے لوگ ان کو اس ذلیل حالت میں دیکھ کر دین کو بھی ذلیل سمجھنے لگیں گے' یہ دوسروں کا ضرر ہوگا پہلے بزرگوں کا اسی وجہ سے یہ دستور تھا کہ جو شخص امیروں سے زیادہ ملتا تھا اس کو علم نہ سکھاتے تھے اور درس[1] کے حلقہ میں شریک ہونے سے روک دیتے تھے۔

علم کی ضرورت ہر طبقہ کو ہے اور ہر طبقہ کے لیے مقدار تعلم کی جداگانہ ہے:

غرض میرا تو یہ مطلب نہیں کہ سب کے سب پورے مولوی بنیں لیکن یہ ضروری ہے کہ کچھ لوگ پورے مولوی بنیں اور کچھ لوگ درمیانے درجہ تک پڑھ لیں' اور ان کو جس مسئلہ کی ضرورت پیش آتی جائے بڑے عالموں سے معلوم کر لیا کریں۔

صاحبو! اس وقت تو ایک آنہ میں کلکتے تک سے ہر بات دریافت ہو سکتی ہے' دیکھئے اگر ایک ہفتے میں چار مسئلے معلوم ہوں تو ایک ماہ میں کس قدر ہو جائیں' پھر ایک سال میں ان کی کتنی تعداد ہو جائے اور چند سال میں کتنا ذخیرہ اپنے پاس ہو جائے' یہ تو ان کے لیے ہے جو لکھے پڑھے ہیں اور جو پڑھے لکھے نہیں ہیں ان کے لیے یہ کیا جائے کہ کسی ایک شخص کو مقرر کیا جائے جو ان کے ہر ہفتہ میں مسئلے سنا دیا کرے اور یہ نہ ہو سکے تو ہر مہینے میں ایک بار تو ضروری سنا دیا کرے اور وہ لوگ اپنی عورتوں کو سنا دیا کریں' مگر اس کے لیے ایک مولوی کی ضرورت ہوگی کہ وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے اور اس کا یہ کام ہو کہ صرف

[1] درس' تعلیم دنیا۔۱۲

مسئلوں کا وعظ کہا کرے اس لیے میں نے اس وقت یہ آیت پڑھی وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ یعنی خرچ کرو اس چیز سے کہ دیا ہے ہم نے تم کو پس لوگ اس کی طرف توجہ کریں اور ہمت کر کے ایک مولوی کو مناسب تنخواہ پر اس کام کے لیے رکھ لیں۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی حاصل ہوئی کہ یہاں یہ انتظام ہوا ہے۔

مدرسہ اسلامیہ جاری ہونے کی آسان تدبیر:

اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ روزانہ جب کھانا پکانے بیٹھو تو آٹے کی ایک چٹکی نکال کر علیحدہ کسی برتن میں ڈال دیا کرو اسی طرح جب روپے کے پیسے لو تو اس میں سے ایک پیسہ نکال اس مد کے لیے رکھ دیا کرو اسی میں بستی کے ہر ایک شخص کو شریک کرلو۔

مدرسہ کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے:

اور جب مدرسہ کی صورت ہو جائے تو اس میں تین چیزوں کی ضرورت ہوگی' ان کو جاری کرو' ایک تو یہ کہ قرآن شریف پڑھنا چاہیے' جو لڑکے ناظرہ پڑھیں ان کے ساتھ تو یہ طرز رکھو کہ جب بیس پارے قرآن کے بڑھ لیں تو ان کو مسئلوں کی کوئی اردو کی کتاب شروع کرادو اور جو لڑکے حفظ پڑھیں ان کے ساتھ یہ طرز رکھو کہ جب تک قرآن شریف ختم نہ ہو جائے کسی دوسرے کام میں نہ لگاؤ' دوسرا کام یہ ہے کہ ایک شخص کو ملازم رکھو کہ وہ عربی کی شروع کی کتابیں پڑھا دیا کرے' تیسرا کام یہ ہے کہ ایک وعظ کہنے والا مدرسہ میں رکھا جائے کہ وہ ہر ہفتہ وعظ کہا کرے اور قریب اور نزدیک کے گاؤں میں بھر کبھی کبھی جا کر مسئلے سکھایا کرے تو اس کی کوشش کرنا بھی اسی خرچ میں داخل ہے جس کا اس آیت میں حکم دیا گی ہے' اور دیکھئے خدا تعالیٰ نے خرچ کرنے کے حکم کے ساتھ یہ فرما کر کہ ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرو' یہ بتلا دیا کہ ہم نے ہی تو دیا ہے' پھر بخل کیوں کرتے ہو اور یہ بھی تسلی فرمادی کہ ہم سارا مال نہیں مانگتے بلکہ اس میں سے کچھ حصہ خرچ کر دیا کرو۔ آگے فرماتے ہیں مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ یعنی اس سے پہلے خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو۔

دنیا کی محبت دل سے جانے کا ایک آسان علاج:

یہ وہ تعلیم ہے کہ اگر روز پندرہ بیس ۲۰ منٹ بھی اس کو سوچ لیں تو دنیا کی محبت دل سے بالکل جاتی رہے یعنی یہ سوچ لیا کریں کہ ایک دن ہم نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد ہم سے ہر ہر بات کے متعلق ایک دن سوال ہوگا' انصاف کی ترازو کھڑی کی جائے گی' اگر ہماری نیکیاں غالب آ گئیں تو خیر ورنہ دوزخ ہے اور ہم ہیں اور وہاں یہ حالت ہوگی لَایَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰیO یعنی (عذاب کی سختی سے) نہ مرے گا نہ جیے گا' آگے فرماتے ہیں کہ اگر خرچ نہ کرو گے تو موت آنے کے وقت یہ کہو گے' رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ...... الصّٰلِحِیْنَO کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں مہلت کیوں نہ دی کہ خیر خیرات دے لیتا۔ اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا۔

دوسری آیت میں اس مہلت کے طلب کرنے کے جواب میں ہے وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا یعنی جب موت کا وقت آ جائے گا تو ہرگز مہلت نہ ملے گی' اس کے بعد غفلت سے ڈراتے ہیں وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ☆ یعنی اللہ کو تمہارے سب کاموں کو پوری خبر ہے۔

اس آیت میں لفظ خَبِیْرٌ فرمایا' جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو دل تک کی خبر ہے' اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ دین کی درستی یہ ہے کہ باطن[1] بھی درست کرو۔

خلاصہ وعظ کا:

حاصل ہے کہ ان آیتوں میں ہم کو دنیا کی محبت کے مرض سے بچالیا گیا ہے اور اپنی یاد میں لگنے کا شوق دلایا ہے' کیونکہ اصل فکر دین ہی کی فکر ہے۔ اور تمام فکریں اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ عمل کی توفیق بخشیں۔

(آمین) تَمَّتْ بِالْخَیْرِ

---

[1] اندرونی حالت

(۴۷) آرزو کا چھوڑنا

منتخب از وعظ نہم ملقب بہ قطع التمنی حصہ چہارم دعوات عبدیت

خطبہ ماثورہ:

اَمَّابَعْد! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَعَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝

ترجمہ: ''ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے واسطے بہتر ہو۔ (اسی طرح) ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور واقع میں) وہ تم کو نقصان دینے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ (ہر اچھی چیز کو) جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔''

بیان کی ضرورت:

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں اللہ پاک نے ایک ایسا مضمون جس کے یاد رکھنے کی ہم کو ہر وقت ضرورت ہے۔ ارشاد فرمایا ہے۔ اور ایک بڑی غلطی کو جس میں ہم سخت پھنسے ہوئے ہیں دور فرمایا ہے۔ اور وہ ایسی غلطی ہے کہ اس میں اکثر عالم اور جاہل بڑے اور چھوٹے قریب قریب سبھی گرفتار ہیں۔ بلکہ اس کے غلط ہونے کی طرف بھی توجہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہم لوگوں کے نزدیک گناہوں کی فہرست میں بڑی بڑی باتیں اور کھلے کھلے گناہ تو شمار ہوتے ہیں مگر جن میں ذرا بھی باریکی اور کسی قدر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ان کو گناہ نہیں سمجھتے جس کی وجہ قرآن مجید میں غور نہ کرنا ہے۔

قرآن مجید میں غور نہ کرنے کا مرض بھی عام ہے:

اور مسلمانوں میں ایک یہ بھی کمی ہے کہ وہ قرآن مجید کے اندر غور نہیں کرتے۔

چنانچہ ہم میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ عوام اور خواص۔ سو عوام تو ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ ہی کو پڑھتے ہیں اور معنی کو نہیں سمجھتے اگر چہ یہ بھی بیکار نہیں۔ بلکہ اس پر بھی ثواب ملتا ہے لیکن کامل ثواب اسی وقت ملتا ہے جب کہ معنی سمجھ کر تلاوت کی جائے۔

قرآن مجید کی تلاوت بغیر سمجھنے کے بھی بے فائدہ نہیں:

اور جو لوگ بغیر سمجھے تلاوت کرنے کو بے کار اور بے فائدہ قرار دیتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ جس طرح معنی کا سمجھنا یہ ایک فائدہ ہے۔ اسی طرح ثواب ملنا بھی ایک فائدہ ہے مگر ثواب کو تو آج کل لوگ بہت ہی بے وقعت سمجھتے ہیں۔

ثواب کو آجکل بہت حقیر سمجھتے ہیں:

افسوس ہے کہ اگر کسی کو تنخواہ ہزار روپیہ کی ہو تو اس پر کیسا فخر کیا جاتا ہے اور ثواب کو جو کہ ہزار درجہ بہتر ہے ایسی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ خبر بھی ہے کہ تنخواہ کی کیا حقیقت ہے تنخواہ کی حقیقت ہے کام کا عوض۔ بس یہی حقیقت ثواب کی ہے۔ پھر افسوس ہے کہ دنیا کی ناپائیدار تنخواہ پر تو فخر کیا جائے جس میں سینکڑوں کرورتیں ہیں۔ اور جس میں ترقی کے بعد کمی بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ پنشن میں ظاہر ہے اور پھر بالکل ہی موقوف ہو جاتی ہے جب کہ مرنے کے وقت ظاہر ہے تو ایسی تنخواہ پر تو ناز کیا جاتا ہے اور خدا کے گھر کی تنخواہ جس میں سدا زیادتی اور پھر ہمیشہ رہنے والی اس کو حقیر سمجھا جائے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ خدا کی قدر نہ کی جیسا کہ قدر کرنے کا حق تھا (کیونکہ خدا کے نام کی لگی ہوئی چیز کو ایسا حقیر سمجھا) غرض خدا تعالیٰ کے ہاں تنخواہ کو ثواب کہا جاتا ہے مگر اس وقت ایسی حالت بگڑ گئی کہ لوگ اس آخرت کے معاوضہ کو ذلیل سمجھتے ہیں۔

میں بریلی ایک مرتبہ گیا تو صاحب جنٹ نے ملاقات کی رغبت ظاہر کی۔ میں ان سے ملا۔ اول سوال انہوں نے یہ کیا کہ میں نے سنا ہے۔ آپ نے کوئی تفسیر لکھی ہے۔ میں نے کہا ہاں لکھی ہے۔ پوچھا آپ کو اس میں کتنا روپیہ ملا۔ میں نے کہا ایک بھی نہیں۔ کہا پھر آپ نے اتنی محنت کیوں کی۔ میں نے کہا آخرت کے ثواب کے لیے کہنے لگا۔ کیا

ابھی مسلمانوں میں ایسے خیال کے لوگ موجود ہیں۔ میں نے کہا بہت کثرت سے۔

ثواب کو حقیر سمجھنے کا مرض مسلمانوں میں یورپ والوں سے آیا ہے۔

مقصود اس حکایت کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ میں آخرت کو حقیر اور دنیا کے مقصود سمجھنے کی جڑ بتلادوں کہ یہ خیال مسلمانوں میں غیر مسلم قوموں سے آیا ہے اور یہ لوگ یورپ والوں کی شاگردی کرتے ہیں مگر وہ لوگ تو مادہ پرست ہیں۔ نہ پیدا کرنے والے کو مانتے ہیں نہ قیامت کو مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے بس ان کا دنیا کو مقصود اصلی سمجھنا زیادہ عجیب نہیں۔ مگر مسلمانوں پر کیا آفت آئی کہ قیامت کو مانتے ہوئے پھر بھی دنیا کے فائدہ کو مقصود سمجھے اور آخرت کے فائدے کی کچھ قدر نہ کرے۔ اس وقت لوگ جنت کا بھی بہت حقارت سے ذکر کیا کرتے ہیں۔

بعض ناقص صوفی بھی جنت کی تحقیر کرتے ہیں۔

دنیاداروں سے تو یہ بات عجیب نہیں غضب تو یہ ہے کہ بعض صوفی بھی اس کا حقارت سے ذکر کرتے ہیں۔

چنانچہ کانپور میں ایک صوفی صاحب میرے پاس تشریف لائے کہنے لگے مجھے دس روپے کی ضرورت ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کسی تذکرہ میں کہنے لگے ہمیں کیا ضرورت ہے جنت کی اور کیا پرواہ ہے دوزخ کی۔ میں نے کہا' ہوش کی دوا کرو۔ تم دس روپے سے تو بے پرواہ نہیں جنت سے تو ضرور ہی بے پرواہ ہوگے۔ وجہ اس ساری کی یہ ہے جنت کو ابھی دیکھا نہیں ہے۔ جب دیکھو گے تو ہائے ہائے کر کے مرجاؤ گے۔

جنت تو بڑی چیز ہے انسان تو معمولی ضرورتوں سے بھی بے پرواہ نہیں:

سمجھ لو کہ جنت تو بڑی چیز ہے انسان اپنی معمولی ضرورتوں سے تو بے پرواہ ہو ہی نہیں سکتا۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ کھانا کھا کر یہ دعا فرمایا کرتے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا۔ اور دعا کے اخیر میں یہ الفاظ بھی ہیں غیر مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنِیٍ عَنْهُ رَبَّنَا۔ یعنی اے اللہ! اس کھانے کو نہ ہم رخصت کرتے ہیں اور نہ ہم اس سے بے

پرواہ ہیں۔

صاحبو! حضور ﷺ سے کوئی شخص افضل تو کیا کوئی آپ ﷺ کے برابر بھی نہیں ہے۔ آپ ﷺ خدا کے سب سے زیادہ مقبول ہیں اور کھانا پینا ظاہر میں بے پرواہ نہیں۔ کیونکہ جس وقت تک زندہ ہیں دونوں وقت اس کے محتاج ہیں تو اس حدیث سے پتہ چلا کہ بندہ کسی وقت بھی بے پرواہ نہیں ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مجھے صحت کی ضرورت نہیں یا بیوی کی ضرورت نہیں ہے یا کھانے پینے کی ضرورت نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے انسان کو ہر چیز کی ضرورت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ بندہ کسی وقت بے نیاز نہ ہو۔ ہر وقت اس سے احتیاج ظاہر ہوتی رہے۔

دوا کے مسنون ہونے کی حکمت:

اور عجب نہیں کہ اسی وجہ سے دوا کو مسنون کیا ہو۔ ورنہ اگر دوا نہ بھی کی جائے تب بھی مرض کا دفعیہ ہو سکتا ہے۔ ایسے بہت لوگ دیکھنے میں آئے ہیں جو دوا بالکل نہیں کرتے اور ان کو شفاء بھی ہوتی ہے مگر باوجود اس کے پھر بھی جو دوا کو سنت قرار دیا۔ شاید اس میں یہی مصلحت ہو کہ اس سے احتیاج ظاہر ہوتی ہے اور یہی راز ہے اس کا جو بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ وہ بھوک میں رونے لگے۔ کسی نے کہا کیا بچے ہو کہ بھوک میں روتے ہو۔ فرمایا کہ تم کیا جانو اگر مجھ کو بھوکا اسی لیے کیا ہو کہ میرا رونا دیکھیں۔

حکایت:

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیمار تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ کیسی طبیعت ہے فرمایا' اچھی نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ ایسا فرماتے ہیں فرمایا سُبْحَانَ اللّٰہ خدا تعالیٰ تو مجھے بیمار کریں تاکہ میری کمزوری ظاہر ہو اور میں اپنی بہادری ظاہر کروں۔ جب خدا نے بیمار اسی واسطے کیا ہے تو کیوں نہ اس کو ظاہر کروں۔ کوتاہ نظر لوگ تو ان قصوں پر بہت ہی تعجب کریں گے۔

مگر جو حقیقت سمجھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ مقصود ان حضرات کا ان باتوں سے اپنی

عاجزی اور احتیاج کا ظاہر کرنا تھا۔

عالموں پر معاش کے چھوڑنے کا مشورہ دینے کا الزام غلط ہے:

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ عالموں کی جب اس حقیقت پر نظر ہے۔ اور وہ ہر چیز کو ضروری اور اپنے کو اس کا محتاج سمجھتے ہیں تو اس کا ان پر کب شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ معاش کے ذریعوں کو مثل تجارت و ملازمت کے چھوڑ دینے کی رائے دیں۔ جیسا کہ ان کو بدنام کیا جاتا ہے۔ اصل سبب اس بدنام کرنے کا یہ ہے کہ ان اعتراض کرنے والوں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ادھوری بات دور سے سن کر بدگمان ہو جاتے ہیں۔

جن لوگوں کو عالموں پر اعتراض ہیں ان کے اطمینان کا آسان طریقہ:

اس لیے ایسے لوگوں کے اطمینان کا ایک آسان طریقہ تھوڑے دنوں سے سمجھ میں آیا ہے۔ وہ یہ کہ جس شخص کو دین کے پیشواؤں پر اعتراض ہو وہ چالیس دن ان میں سے کسی کے پاس صرف رہ لیں۔ آپ ہی دیکھ لیں گے کہ ان کے سامنے کسی شبہ کے پیش کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوگی' خود رہنے ہی سے انشاء اللہ اس مدت میں سب شبہے حل ہو جائیں گے اور اگر کوئی کہے کہ صرف پاس رہنے سے بلا سمجھائے کس طرح شبہے جاتے رہیں تو لیجئے! میں اس کی وجہ بھی بتلائے دیتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ جب پاس رہے گا' تو ہر وقت ان کے معاملات دیکھے گا۔ ان سے دین کے قاعدے سنے گا۔ اس سے وہ شبہے خود بخود جاتے رہیں گے۔ یہ تو ظاہر پرستوں کے سمجھانے کی بات ہے جن کی نظر صرف ظاہر پر ہوتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے دل خدا کے نور سے روشن ہیں۔ ان کے پاس رہنے سے دل میں نور آتا ہے اور جب نور آتا ہے تو ظلمت بھاگ جاتی ہے۔ پس اس نور سے ہر چیز کی حقیقت کھل جاتی ہے اور شبہ جاتا رہتا ہے۔ تو یہ خاصیت ہے اہل نور کے پاس رہنے میں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو بدوں پاس رہے صرف ان حضرات کا دیکھ لینا ہی کافی ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس درجہ کی سلامتی نہ ہو تو البتہ پھر چند دنوں کی صحبت کی

بھی ضرورت ہے۔ ہاں یہ شرط ہے کہ دل پر مہر لگنے کی نوبت نہ آ گئی ہو۔ اور خدا کا شکر ہے کہ کسی مسلمان کی یہ حالت ہوتی بھی نہیں۔ ورنہ وہ مسلمان ہی کیوں ہوتا۔ غرض جو لوگ دین کے پیشواؤں پر اعتراض کرتے ہیں ان کے شبہات کا میں نے یہ عملی جواب اختیار کیا ہے یعنی ان کے پاس رہنا۔ کیونکہ صرف زبانی جواب سے اگرچہ دوسرا خاموش ہو جائے مگر دل کو تسلی نہیں ہوتی۔ لیکن اس عملی جواب میں اتنی شرط ضرور ہے کہ ان کی طرف سے دل میں بداعتقادی اور انکار رکھ کر وہاں نہ رہے۔ اگر پورا اعتقاد نہ ہو تو کم سے کم دل میں اتنی گنجائش تو ضرور ہو کہ شاید ان کی بات صحیح ہو۔ اس کے بعد انصاف کے ساتھ غور سے کام لے۔

میں وعدہ بلکہ خدا کے فضل پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرتا ہوں کہ کوئی بھی مرض اس قسم کا نہ رہے گا۔

دنیاداروں کے مولویوں پر یہ الزام رکھنے کی وجہ کہ مولوی ہم سے دنیا چھڑاتے ہیں:

مگر آج لوگوں نے ہر چیز کا ست نکالنا شروع کر دیا ہے۔ تو مولوی جو گناہوں کے چھوڑنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اس کا ست نکالا کہ یہ دنیا کو چھڑاتے ہیں اور بالکل غلط ست نکالا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ معاش کی ضرورتیں ایسی چیز ہیں کہ کسی وقت بھی ان سے بے پروائی کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ بس مولوی جو کہ اس بات کو سمجھتے ہیں۔ کیا بچے ہیں کہ وہ حاجت کی چیزوں کو چھڑائیں گے۔ البتہ مولوی اتنا اور کہتے ہیں کہ جب دنیا سے بے پروائی نہیں تو آخرت سے بے پروائی کیوں کی جاتی ہے۔

غرض مولویوں پر معاش کے چھڑانے کا انتظام کسی طرح صحیح نہیں ہے لیکن دنیاداروں پر یہ الزام بالکل صحیح ہے کہ وہ جنت و آخرت کے ثواب سے چھڑاتے ہیں جیسا کہ ان کے عمل اور بات چیت سے ظاہر ہے کہ اس کی وقعت و عزت نہ خود ان کے دل میں ہے نہ اوروں کے دل میں پیدا ہونے دیتے ہیں۔ دیکھ لیجئے جس کام میں کوئی دنیا کا نفع نہ ہو صرف ثواب ہی ہو تو کہتے ہیں اس میں کیا فائدہ ہے۔ میں نے اسی کے جواب میں

تنخواہ کی مثال دی تھی۔ کہ جس کام پر تنخواہ ملے اس کو تو مفید سمجھتے ہیں۔ تو بس ثواب بھی ایک قسم کی تنخواہ ہی ہے۔ مگر وہ ایسی تنخواہ ہے جو ہمیشہ بڑھتی رہے گی۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ قرآن کی تلاوت بغیر معنی سمجھے بے کار ہے۔ اگرچہ فائدے تو اس میں بہت ہیں۔ مگر اس وقت ان سب کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے ان میں سے صرف ایک ہی فائدہ یعنی ثواب کو بیان کر دیا ہے۔ (اس واسطے کہ اگر دوسرے فائدے نہ بھی ہوں تو یہی ایک فائدہ شوق دلانے کے لیے کافی ہے تو اگرچہ بغیر سمجھے ہوئے بھی قرآن مجید کی تلاوت کرنے میں ثواب ہوتا ہے۔

صرف لفظوں...... کی تلاوت پر کفایت نہ کرنی چاہیے۔

لیکن صرف لفظوں کی تلاوت پر کفایت نہ کرنی چاہیے۔ جیسا عوام نے اختیار کیا ہے بلکہ سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ ثواب پورا اسی وقت ہوتا ہے۔ جب کہ اس پر عمل ہو۔ اور عمل موقوف ہے۔ سمجھنے پر اس لیے میں شکایت کرتا ہوں کہ اس وقت عوام اور مولوی سب اس کے اندر کوتاہی کرتے ہیں۔ عوام نے تو صرف لفظوں کا پڑھنا کافی سمجھا۔ اور مولویوں نے صرف ترجمہ قرآن کا معلوم کر لیا۔ باقی قرآن کی جو اصل غرض تھی۔ یعنی سمجھنا اور غور کرنا۔ اس پر ان کی بھی نظر نہیں۔ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْۤا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ☆ یعنی یہ کتاب نازل کی ہے ہم نے آپ ﷺ کی طرف مبارک ہے تاکہ لوگ غور کریں اس کی آیتوں میں اور تاکہ نصیحت پکڑیں عقل والے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نازل ہونے سے اصل مقصود یہی غور کرنا اور نصیحت حاصل کرنا ہے۔ لیکن اس کا کسی کو خیال نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کھلی کھلی باتیں موجود ہیں۔ لیکن بعض اہل علم کو بھی نظر نہیں آئیں۔ چنانچہ اس آیت میں بھی ایک ضروری مسئلہ ہے جس کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اس وقت اس کو اختصار کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْــٴًـا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْــٴًـا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ۔ یعنی ممکن ہے تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور (واقع

میں) وہ تمہارے واسطے بہتر ہو۔ اسی طرح ممکن ہے تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور واقع میں) وہ تم کو نقصان و دینے والی ہو۔ اور ممکن ہمارے اعتبار سے فرمایا مطلب یہ ہے کہ تم جب کسی چیز کو اچھا یا برا سمجھو تو اس بات کا بھی خیال رکھو کہ شاید واقع میں یہ ایسی نہ ہو۔ اس کی وجہ آگے فرماتے ہیں وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کہ اللہ تعالیٰ (ہر اچھی بری چیز کو) جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔ اس ترجمے کے سننے سے معلوم ہوا ہوگا۔ کہ یہ آیت ہمارے ایک بڑے مرض کی اصلاح کر رہی ہے جس کو ہم بہت ہی ہلکا سمجھتے ہیں یعنی آرزوئیں کرنا۔ ہماری نظر تو اس طرف جاتی ہی نہیں۔ لیکن آیت بتلا رہی ہے کہ ہم جو یہ کہا کرتے ہیں کہ یوں نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اور یوں ہوتا تو اچھا ہوتا۔ یہ سب بری بات ہے۔ اور یہاں سے غلطی کو ظاہر فرما رہے ہیں کہ تم نے اچھا سمجھا ہے وہ واقع میں نقصان دینے والی ہو۔ یہاں تک تو صرف اس کا ممکن ہونا ہی بتلایا کہ تمہارا کسی چیز کو اچھا یا برا سمجھنا ہو سکتا ہے کہ واقع میں غلط ہو۔ آگے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ (نفع اور نقصان کی چیز کو) جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔ پس جب خدا تعالیٰ نے جو واقعی نفع اور نقصان کو جانتے ہیں۔ اس چیز کو واقع کر دیا۔ جس کو تم نہ چاہتے تھے۔ تو ان کا واقع کرنا دلیل اس کی ہے کہ یہی بہتر تھا۔ تو اب یقین ہو گیا کہ تمہارے رائے ضرور غلط تھی۔ اگر اس میں مصلحت ہوتی تو خدا تعالیٰ اس کو واقع فرماتے۔

غرض اس آیت کے ترجمے سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو ہماری ایک غلطی پر خبردار فرمایا ہے۔ اب یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ آیا ہم میں یہ غلطی ہے یا نہیں۔ سو اس کا ہم میں ہونا تو اس قدر ظاہر ہے کہ شاید ہی کسی شخص کا دل اس قسم کی آرزوؤں سے خالی ہو۔ اور یہ مرض اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ جو واقعات روز مرہ ہوتے رہتے ہیں ان سے گذر کر یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ شریعت کے حکموں میں بھی اپنی خواہش کو داخل کرنے لگے کہ یہ احکام یوں نہ ہوتے اور یوں ہوتے تو اچھا تھا۔

خدا تعالیٰ کے حکموں کی دو قسمیں ہیں:

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم تو احکام شریعت

ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا، چوری، زنا، جھوٹ، ظلم، فخر، دکھلاوہ، بخل کا حرام ہونا۔

دوسری قسم واقعات ہیں۔ جیسے مرنا، جینا، قحط پڑنا۔ طاعون یا اور کوئی وبا کا آنا۔ مال کا تلف ہو جانا۔ آگ لگ جانا۔ کیونکہ چیزیں بھی خدا تعالیٰ کے ارادہ و حکم سے ہوتی ہیں۔ غرض کہ خدا تعالیٰ کے حکموں کی یہ دو قسمیں ہیں۔ اور ہم کو یہاں تک آرزو کا ہیضہ ہوا ہے کہ دونوں قسموں کے متعلق آرزو میں کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح یہ کہتے ہیں کہ فلانا اور جیتا تو اچھا ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ روزہ فرض نہ ہوتا۔ سود حرام نہ ہوتا۔ تو خوب ہوتا۔ فرق اتنا ہے کہ جو علم دین پڑھے ہوئے ہیں وہ شریعت کے حکموں میں ایسی بے باکی نہیں کرتے۔ اور جو آزاد اور بے باک ہیں وہ دونوں قسموں میں بے باکی کے ساتھ ایسی آرزوئیں کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک نوجوان نے تو یہاں تک نوبت پہنچائی کہ نماز کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ اگر اسلام میں نماز نہ ہوتی تو اسلام کو خوب ترقی ہوتی۔ کیونکہ نماز سے اکثر لوگ گھبراتے ہیں لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ معلوم ہوتا ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کو بھی رائے دیتے ہیں۔ لیکن اول تو آپ چیز ہی کیا ہیں۔ دوسرے وہاں کثرت رائے پر کب عمل ہے۔ کیا وہاں بھی سلطنت جمہوری ہے؟ جان لو کہ خدا تعالیٰ کے ہاں کسی کی مجال نہیں کہ دخل دے سکے۔ پھر آپ کو کیا منصب ہے کہ نماز کے بارے میں رائے دیں۔ یہ تو نماز میں حال تھا۔

روزہ میں قمری مہینہ کے ہونے کی حکمت:

ایک صاحب نے روزہ کے بارہ میں یہ رائے دی کہ روزہ اگر فروری[1] کے مہینہ میں ہوتا تو اچھا ہوتا کہ آسانی ہوتی۔ حالانکہ اس عقلمند نے یہ نہ سوچا کہ روزہ صرف اس کے لیے تو نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی آسانی دیکھ لیتے۔ وہ تو ساری دنیا کے لیے ہے کہ ساری دنیا میں فروری کے مہینے میں یہ حالت رہتی ہے جو کہ یہاں رہتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ

[1] فروری کا مہینہ ہمارے ملک میں ہمیشہ سردیوں میں آتا ہے۔ اور بعض دوسرے ملکوں میں ہمیشہ گرمیوں کے موسم میں آتا ہے۔۱۲

مولوی بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کو واقعات کی خبر نہیں کہ یہ خود کون سے گنبد میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ فروری کے مہینے میں دوسرے ملکوں کے اندر کیا حالت ہوتی ہے۔ اور اگر معلوم ہے تو اور بھی زیادہ افسوس کی بات ہے کہ جان بوجھ کر پھر ایسی بے ہودہ رائے دیتے ہیں کس قدر بے انصافی کی بات ہے کہ صرف آپ اور آپ کے چند بھائی تو آرام میں رہیں اور ساری دنیا مصیبت میں رہے۔ خدا تعالیٰ کو آپ سے ایسی کیا دوستی اور دوسروں سے کیا عداوت ہے۔ اس وقت تو تمام ملکوں کی رعایت ہے۔ کیونکہ رمضان المبارک کا مہینہ چاند کے حساب سے ہے۔ ہر ایک کے اندر اس میں کبھی سردی ہوتی ہے کبھی گرمی کبھی بڑا دن ہوتا ہے کبھی چھوٹا دن۔ تو اس میں کبھی ایک جگہ کے لوگوں کو آرام رہتا ہے کبھی دوسری جگہ کے لوگوں کو اس سے سب کی رعایت ہوگئی تو حکمت کی بات یہ ہے یا وہ ہے۔

قربانی کے متعلق ایک شخص کی غلط رائے

اسی طرح قربانی کے متعلق یہ رائے دی جاتی ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ روپیہ پیسہ نہیں تھا۔ اور مویشی ان لوگوں کے پاس کثرت سے ہوتے تھے اس لیے خیرات کا یہ طریقہ مقرر گیا تھا کہ ذبح کرو اور تقسیم کرو۔ اور اب چونکہ روپیہ کثرت سے موجود ہے اور نقد سے خیرات کر سکتے ہیں۔ اس لیے اب اس وحشی عبادت کو چھوڑ دینا چاہیے۔ خدا کی پناہ! یہ رائے ایک صاحب لندن سے بیٹھے ہوئے خط میں لکھ رہے ہیں۔ ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ آپ کے پاس اس کی دلیل بھی ہے یا نہیں اگر نہیں تو صرف گمان سے کیا کام چل سکتا ہے۔ آگے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اس رائے کے غلط ہونے پر دلیل موجود ہے۔

یہ دیکھئے کہ قربانی میں اصل مقصود ذبح کرنا ہے یا مسکینوں کو کھلانا۔ سو یہ بات ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص ذبح کر کے سارا گوشت خود کھا جائے۔ اور ایک بوٹی بھی کسی کو نہ دے۔ تب بھی اس کو پورا ثواب قربانی کا ملے گا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود صرف جانور کا ذبح کرنا ہے نہ کہ کھلانا۔ جیسا کہ اس عقلمند نے دعویٰ کیا۔ رہی یہ بات کہ خود ذبح کرنا خدا تعالیٰ کے نزدیک کیوں عبادت ہے۔ سو اس کی وجہ ہم کو معلوم ہونا ضروری

نہیں۔ نہ ہمارا دعویٰ ہے کہ احکام شرع کی حکمتیں ہم جانتے ہیں۔ پھر یہ بھی سوچتے کہ اگر دوسروں کو نفع پہنچانا ہی ہوتا تو زندہ بھی تو دیا جا سکتا تھا۔ تو جس زمانہ میں قربانی کا حکم ہوا تھا اس وقت زندہ دینے کی کیوں اجازت نہ ہوتی' بلکہ زندہ کی قیمت زیادہ اٹھتی ہے تو اس سے مسکینوں کا زیادہ فائدہ ہوتا۔

پس معلوم ہوا کہ صرف ذبح کرنا ہی مقصود ہے۔ غرض اس طرح ہر حکم کے متعلق اپنی خواہشیں ظاہر کی جاتی ہیں۔

بعض ترقی پر جان دینے والے سود کے حلال ہونے کی فکر میں ہیں:

چنانچہ سود میں بھی اول تو یہی آرزو ہوئی کہ سود حلال ہوتا تو اچھا تھا۔ مگر اب اس پر تو قدرت نہیں رہی۔ اس لیے دوسری خواہش ہوئی کہ مولوی اس میں تاویل کر دیں تو بہتر ہو۔ جب اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو خود ہی اس میں اصلاح شروع کر دی اور طرح طرح کی تاویلیں کر کے سود کو جائز بتلانے لگے۔ اور اس کے لیے کتنی ہی کتابیں چھاپ ڈالیں۔ اسی قسم کے بہت سے واقعات میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات اس قسم کی سننے میں آتی رہتی ہے۔

نکاح کے متعلق جانوروں کی تقلید کرنے کا فیصلہ:

ایک مرتبہ میں کڈکی میں تھا کہ میں نے سنا۔ آج یہاں چند عقلمندوں میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ نکاح کی رسم کو اٹھا دینا چاہیے۔ جیسے بازار کی تمام چیزوں کا معاملہ خریدنے اور بیچنے والے کی رضامندی سے ہوتا ہے۔ اسی طرح مرد اور عورت میں بھی جس سے جس کی موافقت ہو جائے وہ آپس میں مل جائیں جیسے جانوروں میں ہوتا ہے۔ پھر رضامندی نہ رہے تو جدا ہو کر دوسرے سے رضامند ہو جائیں۔ بلکہ صاحب کا تو یہاں تک مضمون اخبار میں لکھا دیکھا ہے کہ خود اسلام کی بھی ضرورت نہیں۔ اس اسلام اور غیر اسلام کے اختلاف سے آپس میں جھگڑا اور فساد ہوتا ہے۔ اور یہ راء دی کہ ساری دنیا مل کر ایک نئے مذہب کو اختیار کرے۔ جس کا نام توحید کا مذہب ہو۔ اس میں خدا تعالیٰ کا ایک ماننا تو ضروری ہو۔

رہا رسول کا ماننا۔ سو جس کا جی چاہے مانے جس کا جی چاہے نہ مانے۔ ماننے اور نہ ماننے دونوں ایک مذہب کے سمجھے جائیں گے۔ خدا کی پناہ کہاں تک یہ لوگ پہنچے ہیں۔ اور اس قسم کی رائیں گندہ پن کی وجہ سے اس قابل بھی نہیں کہ اان کو نقل کیا جائے۔ کیونکہ ان کے ذکر سے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔ اس واسطے میں اس کے اندر کلام کو طول دینا نہیں چاہتا۔ مگر یہ بتلاتا ہوں کہ شریعت کے حکموں میں یہ گڑبڑ لوگوں نے مچا رکھی ہے۔ گویا شریعت کے مٹانے کی فکر میں ہیں۔

واقعات کے متعلق بھی لوگ آجکل اپنی رائے دیا کرتے ہیں:

اب دوسرے قسم کے احکام رہ گئے ہیں۔ یعنی واقعات' اور اس وقت انہیں بیان کرنا زیادہ مقصود بھی تھا۔ ان کے متعلق آرزوئیں کرنے اور رائے دینے کا مرض دیندار اور دنیا دار سبھی کے اندر ہے۔

کسی کے مرنے کے وقت کیا کیا آرزوئیں کی جاتی ہیں:

چنانچہ میں واقعات یاد دلاتا ہوں جس سے آپ کو میرے اس دعویٰ کی سچائی کا یقین ہو جائے گا۔

دیکھئے! جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ اگر دس برس اور زندہ رہ جاتا تو بچوں کی پال ہو جاتی۔ کوئی کہتا ہے کہ ابھی مرنے کی عمر تھی۔ ایک کہتا ہے کہ اہل وعیال کی کس طرح گزر ہوگی۔ دوسرا کہتا ہے۔ ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔ ایسی ایسی بے ہودہ باتیں کہتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اگر کبھی یکسو ہو کر ان باتوں میں غور کیا جاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ان باتوں کا کس کو سنانا مقصود ہے۔ اگر مخلوق کو سنانا ہے تو بالکل بے کار ہے۔ کیونہ ان کے سنانے سے کیا کام چلے گا۔ جو بات ان کے اختیار میں ہو وہ ان کو سناؤ۔ باقی مارنا جلانا یہ تو خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس لیے مخلوق کو سنانا مقصود نہیں ہو سکتا۔ پھر سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کس کو سنانا مقصود ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ سب ان ہی کی قدرت میں ہے۔ تو گویا یہ شخص خدا تعالیٰ کو رائے دیتا ہے کہ اس وقت

فلانے کا مرنا تو کچھ نامناسب سی بات ہے۔

اب غور کیجیے کہ اس گستاخی کا کیا درجہ ہے۔ اسی طرح بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ابھی تو اس کی عمر مرنے کی نہ تھی۔ صاحبو! اگر اس بات کی تاویل نہ کی جائے۔ تو دیکھئے کہ آیت قرآنی کے کس قدر خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ** ☆ یعنی جب اس کی میعاد آتی ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اور اگر تاویل کی جائے تو وہ تاویل بھی ہو سکتی ہے کہ اس عمر میں مرنا بے موقع ہوا۔ تو گویا یہ مطلب ہے کہ خدا تعالیٰ نے نامناسب کام کیا۔ یہ وہی اعتراض ہے جو کہ شیطان نے کیا تھا اور اس کی بدولت کافر ہوا۔

شیطان سجدہ کو حکمت کے خلاف کہنے سے کافر ہوا ہے:

کیونکہ شیطان صرف سجدہ نہ کرنے سے کافر نہیں ہوا۔ بلکہ سجدہ کو نامناسب اور حکمت کے خلاف بتلانے سے کافر ہوا۔ جیسا اس کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے **ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا**☆ یعنی کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ میں ان سے بہتر ہوں۔ اور جو بہتر ہو اس کا ادنی کے سامنے جھکنا اور اس کی اطاعت کرنا نامناسب اور حکمت کے خلاف ہے۔ پس یہی مطلب اس شخص کا بھی ہوتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ ابھی تو اس کی عمر مرنے کی نہ تھی۔ تو یہ وہی اعتراض ہوا جو شیطان نے کیا تھا۔ اور بعض لوگ اس سب سے بڑھ کر یہ کرتے ہیں کہ جب کوئی افسوس ظاہر کرتے ہوئے اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ کی ذات بڑی بے پرواہ ہے۔

دیکھئے! کس قدر گستاخی کی بات ہے۔ اگر ذرا سمجھ سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائے کہ اس موقع پر بے پرواہ کہنے کے معنے سوائے اس کے کیا ہو سکتے ہیں کہ وہ موقع بے موقع کو نہیں دیکھتے۔ انتہاء درجہ کی بے پروائی کے سبب جو چاہتے ہیں کر ڈالتے ہیں۔ تو اس حساب سے تو خدا تعالیٰ ان کے نزدیک توبہ توبہ ایسے ہوئے جیسے انیاؤ نگر کا راجہ تھا۔ ان نیاؤ کی معنی بے انصافی کے ہیں۔ پس انیا نگر کے معنے ہوئے بے انصافی کا شہر۔

انیاؤنگر کے راجہ کی حکایت:

وہاں کے متعلق مشہور ہے کہ ایک مرتبہ گرو اور ایک چیلہ کا وہاں گزر ہوا' نیا شہر تھا۔ حالات دریافت کیے۔ بھاؤ بھی اکثر چیزوں کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ اناج بھی سولہ سیر گھی بھی سولہ سیر اور لکڑیوں کا بھاؤ بھی سولہ سیر گھی بھی سولہ سیر اور لکڑیوں کا بھاؤ بھی سولہ سیر۔ غرض ہر چیز سولہ سیر کی تھی۔ گرو نے کہا' یہاں ادنی اعلیٰ سب برابر ہیں۔ اس جگہ رہنا ٹھیک نہیں۔ یہاں سے جلدی بھاگ چلو چیلے نے کہا کہ واہ قسمت سے تو ایسی جگہ ملی ہے جہاں گھی سولہ سیر کا ہے' یہاں ضرور ٹھہرو' خوب گھی شکر کھائیں گے' موٹے ہوں گے۔ غرض وہاں رہ پڑے۔ ایک روز بطور سیر کے پھرتے پھرتے راجہ کی کچہری کی طرف جانکلے۔ دیکھا ایک خلقت اکٹھی ہے اور ایک مقدمہ پیش ہو رہا ہے۔ مقدمہ یہ ہے کہ ایک چور ایک مہاجن پر دعویٰ کرتا ہے کہ میں اور میرا ایک ساتھی جس کی لاش سامنے پڑی تھی۔ اس کے گھر چوری کرنے گئے۔ نقب دیا۔ نقب کے اندر میرا ساتھی گھستا تھا کہ دیوار اوپر سے آرہی۔ اب مجھ کو خون کا بدلہ ملنا چاہیے۔ راجہ صاحب نے کہا کیوں؟ ایسی کمزور دیوار کیوں بنائی تھی راجہ نے مہاجن سے پوچھا کہ تو اس کا کیا جواب دیتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو معمار کی خطا ہے اس سے پوچھنا چاہیے۔ اس نے کہا' مزدور کی خطا ہے اس نے گارا پتلا کر دیا۔ مزدور بلایا گیا۔ اس نے کہا کہ سقہ نے پانی زیادہ چھوڑ دیا تھا۔ یہ اس کی خطا ہے۔ وہ بلایا گیا۔ اس نے کہا' سرکاری ہاتھی بھاگا ہوا آتا تھا ڈر کے مارے مشک کا منہ زیادہ کھل گیا' فیلبان کو بلایا...... اس نے کہا' ایک عورت پازیب پہنے سامنے سے گزری تھی' اس کی آواز سے ہاتھی بھڑک گیا۔ عورت حاضر کی گئی۔ اس نے کہا یہ سنار کی خطا تھی' اس نے باجا ڈال دیا تھا۔ سنار بلایا گیا۔ وہ کوئی بات نہ بنا سکا۔ آخر اس کے لیے پھانسی کا حکم ہوا۔ جب پھانسی پر چڑھانے لگے تو حلقہ پھانسی کا اس کے گلے میں ٹھیک نہ آیا کیونکہ سنار دبلا تھا۔ راجہ کو اس کی خبر کی گئی کہ پھانسی کا حلقہ چوڑا ہے' سنار کے گلے میں ٹھیک نہیں آتا۔ حکم ہوا کہ اچھا کسی موٹے کو پکڑ کر پھانسی دے دو۔ دیکھا گیا تو اس مجمع میں چیلے سے زیادہ

کوئی موٹا نہ نکلا۔ کیونکہ خوب گھی شکر کھا کر موٹا ہوا تھا۔ حکم ہوا کہ اسی کو پکڑ کر پھانسی دے دو۔ اب تو چیلے صاحب بڑے گھبرائے اور گرو سے کہا' کسی طرح بچاؤ تو یہاں سے بھاگیں گرو کو رحم آیا اور یہ ترکیب کی کہ فوج کے افسروں کی خوشامد کرنا شروع کی کہ مجھ کو پھانسی دے دو۔ اس پر سب کو تعجب ہوا۔ راجہ کو خبر پہنچی۔ اس نے وجہ پوچھی تو گرو نے کہا کہ یہ گھڑی ایسی ہے کہ اس میں جس کو پھانسی ہو وہ سیدھا بیکنڈ میں جائے گا۔ راجہ نے کہا تو بس مجھ کو پھانسی دے دو۔ آخر اس کو پھانسی دے دی گئی۔ اور اس سے اس طرح زمین پاک ہوئی۔ یہ ایک قصہ ہے انیاؤ نگر کا۔

کیا ہمارے بھائی بند خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی تو بہ ایسا ہی اعتقاد رکھتے ہیں جو ان کی شان میں اس قسم کی باتیں کہا کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں نہیں ہے جو منہ میں آیا بک دیا۔

خدا تعالیٰ کے بے پرواہ ہونے کے معنی:

صاحبو! وہ بے پرواہ ہے۔ مگر اس کے بے پرواہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی اس کی عبادت نہ کرے تو اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اور اگر کرے تو اس کا نفع نہیں۔ تو مطلب اس کا یہ ہوا کہ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس کے بے پرواہ ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ بے رحم ہے مصلحت نہیں دیکھتا' بے سمجھے جو چاہتا ہے کر بیٹھتا ہے۔

صاحبو! یہ عقیدہ نہایت گمراہی کا ہے اس سے توبہ کرنی چاہیے۔

ہم بیوقوفوں کی گستاخیوں پر تو خدا تعالیٰ درگزر فرماتے ہیں لیکن بزرگوں کی ذرا سی بات میں پکڑ ہو جاتی ہے:

اور ہم بے وقوفوں کی ان حماقتوں اور گستاخیوں کو برداشت بھی کر لیا جاتا ہے کہ فوراً سزا نہیں ملتی۔ باقی جن کی بڑی شان ہے ان کے کلام میں تو اگر ذرا اس کا شبہ بھی ہو جائے تو اسی وقت ان کی پکڑ ہو جاتی ہے۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ جب نہایت موقع پر بارش ہوئی تو ان کی زبان

سے نکل گیا کہ آج کیا موقع پر بارش ہوئی۔ فوراً عتاب ہوا کہ او بے ادب بے موقع کس دن ہوئی تھی جو تو یہ کہتا ہے کہ آج موقع پر ہوئی۔ یہ آج کی قید کیسی۔ وہ بزرگ یہ خفگی سن کر تھرا گئے۔

تو دیکھئے کہ یہ بات انہوں نے تعریف کے طور پر کہی تھی' مگر اس میں چونکہ ایک اعتراض کا پہلو بھی نکلتا تھا خواہ دور ہی کا سہی اس وجہ سے ان پر ڈانٹ پڑ گئی۔ صاحبو! وہ خدا ہے کوئی برابر کا دوست نہیں کہ جو چاہو کہہ لو۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ مگر خدا جانے کس نے مشہور کر دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ دیوانہ رہو۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوشیار۔

اس کلام کے معنی کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ دیوانہ رہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوشیار

اگر اس کے یہی معنیٰ ہیں جو اس کلام سے ظاہر ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ادب کا لحاظ ضروری نہیں تب تو یہ بڑی سخت بات ہے۔ اور اگر اس میں کوئی مناسب تاویل کر لی جائے تو خیر اور وہ تاویل یہ ہے کہ حال کے غلبہ میں کوئی بات خدا تعالیٰ کے معاملے میں نکل جائے تو وہ معاف ہے' مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہرگز ایسا نہ ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ تاویل نہ کی جائے تو سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ بے ادبی کرنی کچھ معمولی بات نہیں۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ[1] بے ادب تنہا خود ہی تباہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے ایک جہاں میں آگ لگا دی۔ اسی پر ممکن تھا کہ بعض لوگ کہہ دیتے کہ ہم کو کہیں بھی آگ لگی نظر نہیں آتی۔ تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اگر آگ نہیں لگی تو پھر یہ دھواں کیسا ہے اور یہ دل سیاہ کیونکر ہو گئے۔

پس یاد رکھو کہ ادب کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ مگر لوگ اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ اس قسم کی باتیں کہہ دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کو رائے دیتے ہیں۔

---

[1] شعر یہ ہیں:

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد ۔۔۔ بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

آتشے اگر نامدت ایں دود چیست ۔۔۔ جاں سیہ گشت و رواں مردود چیست

اس آیت میں آرزو کی بالکل جڑ کاٹ دی خواہ شریعت کے حکم میں ہو یا واقعات میں

تو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں ان سب باتوں کی جڑ کاٹ دی اور فرمایا کہ بہت ممکن ہے کہ جس چیز کو تم برا سمجھو وہ واقع میں تمہارے لیے بہتر ہو۔ اس میں ہر چیز آ گئی خواہ واقعات میں سے ہو یا شریعت کے احکام میں سے ہو۔ کسی کے متعلق ایسا کہنے کی اجازت نہیں کہ ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا یا ایسا ہوتا تو اچھا تھا۔ کیونکہ اچھے برے کا ہمیں کیا علم ہے اس کا علم تو خدا تعالیٰ کو ہے۔ انہوں نے جیسا کر دیا وہی بہتر ہوگا۔ اور جب مصلحت اسی میں ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کے خلاف کی آرزو کرنا کس قدر بے وقوفی ہوگی۔ لیکن آج کل کثرت سے ایسی آرزوئیں کی جاتی ہیں اور اس کی چند مثالیں عرض کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

باغ کی بہار پھلنے سے پہلے بیچنے کی ممانعت اور اس کی مصلحت:

دیکھئے شرع کا حکم ہے کہ جب تک پھل نہ آ جائے بہار کا بیچنا حرام ہے بہت لوگ اس کی آرزو کرتے ہیں کہ یہ جائز ہوتا تو اچھا ہوتا۔ لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ ناجائز ہو۔ دیکھئے بعض وقت پھل نہیں آتا تو خریداروں کو کس قدر خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ باقی اگر شبہ کیا جائے کہ اس میں خریدار کی مصلحت کی تو رعایت ہوئی مگر بیچنے والے کی مصلحت تو جاتی رہی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک عام فائدہ کے مقابلہ میں خاص لوگوں کے فائدہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ ہر سلطنت میں اس پر نظر کی جاتی ہے۔

دیکھئے بعض مرتبہ حکومت کی طرف سے امرود وغیرہ کھانے کی ممانعت ہو جاتی ہے اور اس کے بیچنے سے بھی روک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں بیچنے والوں کا نقصان ہے اور ان کی مصلحت کے خلاف ہے مگر چونکہ ممانعت میں تو صرف انہیں سو پچاس آدمیوں کا نقصان تھا باقی ان کے سوا سب کا فائدہ اور اجازت میں سب کا نقصان تھا اور صرف انہی

کا فائدہ تھا' اسی لیے سب لوگوں کی مصلحت کے مقابلے میں چند لوگوں کی مصلحت کی کچھ پرواہ نہیں کی گئی اور پھر کوئی شخص حکومت کے اس فیصلہ کو عقل کے خلاف نہیں سمجھتا پس اسی طرح یہ حکم ہوا کہ بہار سے پہلے پھل نہ بیچو' اگر مان لو کہ اس میں کسی ایک کا نقصان بھی ہو' تو ہوا کرے۔ عام لوگوں کا تو بچاؤ ہو گیا۔ اور اول تو بیچنے والے کا نقصان بھی تو یقینی نہیں۔ بلکہ پھل آنے کے بعد زیادہ دام ملنے کی امید ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ دس برس سے تو مجھے نقصان کا تجربہ ہو رہا ہے تو خیر آخر بات یہی ہے کہ بہت سے تو بچ گئے نقصان تو ایک ہی کا ہوا۔ لیکن اور خریداروں کو تو نقصان سے بچالیا کہ اگر پھل کم آتا تو ان کا کتنا نقصان ہوتا۔ تو اب ایک کی مصلحت کو دیکھا جائے یا پچاس کی مصلحت کو اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو خود معاملہ کی صورت ہی اس کو ناجائز بتلا رہی ہے۔ کیونکہ جو چیز موجود نہ ہو اس کے بیچنے کو خود عقل بھی ناجائز کہتی ہے۔ خدا جانے ان موقعوں پر عقل کہاں چلی جاتی ہے۔ اگر بیچنے کو بغیر موجود ہونے پھل کے جائز رکھتے ہیں تو پھل آنے کی مدت تک کھانے کو بھی بغیر پھل آئے جائز رکھیں اور یوں بیٹھے ہوئے منہ چلایا کریں اور نور سے پیٹ بھر لیا کریں۔ جو شخص بغیر کھانے کی چیز سامنے ہوئے کھا کر دکھلائے گا۔ میں اس کو بغیر پھل آئے بیچنے کی بھی اجازت دے دوں گا۔ غرض عقل بھی اس کو حرام کہتی ہے۔ تو اگر کوئی مصلحت بھی نہ ہوتی تب بھی اس سے بچنا ضروری تھا۔ اب ایک بیہودہ عذر یہ ہے کہ صاحب اس مدت تک کون انتظار کرے۔ کیونکہ اگر بڑھنے تک انتظار کریں تو اس وقت تک باغوں کی خرید ہی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ خریدار اس قدر نہیں ٹھہرتے۔ اس کا جواب میں صرف یہی دیتا ہوں کہ اگر گورنمنٹ کا یہی قانون ہو جائے جواب شریعت کا ہے تو اس وقت کیا کرو گے۔ اور اگر اس پر بھی سمجھ نہ آئے تو میں یہ کہوں گا کہ خدا کے حکم کی آپ کے نزدیک وہ وقعت بھی نہیں۔ جو گورنمنٹ کے حکم کی ہے۔

صاحبو! صرف دنیا ہی کمانا تو مقصود نہیں۔ دنیا کماؤ۔ مگر خدا کو راضی رکھ کر' اور اس کی فکر نہیں ہے تو پھر حاکموں کو راضی رکھنے کی بھی فکر چھوڑ دو اور ڈکیتی بھی شروع کر دو۔ افسوس کہ حاکموں کی ناراضی کی تو اتنی فکر اور خدا کی ناراضی کی پرواہ بھی نہ ہو۔ کیا خدا تعالیٰ

حاکم نہیں ہیں۔

جواب اس شبہ کا کہ شریعت نے آمدنی کے بہت سے دروازے بند کر دیئے:

ان باتوں کو سن کر بعض لوگ کہتے ہیں کہ شریعت نے آمدنی کے بہت سے دروازے بند کر دیئے ہیں میں کہتا ہوں کہ سرکار کے قانون بھی عقل میں آتے ہیں انہیں ان کی نسبت تو ضرور کہو گے کہ وہ عقل کے موافق ہیں۔ تو ان ہی میں ایک قانون یہ بھی ہے کہ ڈکیتی ناجائز ہے۔

دیکھئے کتنا بڑا ذریعہ تھا آمدنی کا اور اس کو حرام کر دیا۔ اور اگر کہیے کہ اس سے عام لوگوں کے امن میں خلل پڑتا تھا۔ اس لیے اس کو جرم قرار دے دیا تو میں کہتا ہوں کہ اسی طرح شرع نے جن چیزوں کو منع کیا ہے۔ ان سے بھی عام لوگوں کی مصلحت میں خلل پڑتا ہے جس کا کسی قدر اوپر بیان بھی کیا گیا۔

اول شریعت کے احکام کی وقعت دل میں پیدا کرو پھر حکمتیں بھی اس کی سمجھ میں آنے لگیں گی

صاحبو! اصل بات یہ ہے کہ شرع کے حکموں کی دل میں کچھ عزت نہیں ورنہ اگر عزت اور وقعت ہو تو خود بخود مصلحتیں سمجھ میں آنے لگیں گی۔ پس اگر مصلحتیں حکموں کی سمجھنا چاہتے ہو تو ان کو وقعت دل میں رکھو۔ اور ساتھ ساتھ عمل بھی شروع کر دو۔ اور عمل میں خلوص[1] پیدا کرو۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ بقدر اپنی طاقت کے خود بخود دراز ے کھل جائیں گے۔ اور اگر نہ بھی کھلیں۔ سو یہ تو معلوم ہے کہ خدا کا حکم ہے۔ عمل کرنے کے لیے یہی کافی ہے۔ دیکھئے! اگر ہم نوکر سے کہیں کہ یہ چار پائی فلاں جگہ سے اٹھا کر فلاں جگہ رکھ دو تو اس کو مصلحت دریافت کرنے کا حق نہیں۔ اور اگر وہ پوچھے بھی کہ حضور وہاں آدمی ہی کہاں ہے جس کے لیے چار پائی بھیجی جاتی ہے تو کہیں گے احمق۔ اول تو مصلحت پوچھنے والا کون ہوتا ہے۔ پھر کیا مصلحت صرف یہی رہ گئی ہے کہ وہاں آدمی ہوں۔ بلکہ کبھی یہاں کی جگہ کا

---

[1] خلوص یہ ہے کہ خالص اللہ کے لیے کام کیا جائے ۱۲

خالی کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ تو کیا خدا تعالیٰ کو اتنے جواب کا بھی حق نہیں۔ اور سمجھو کہ خدا تعالیٰ کے علم کے سامنے آپ کے علم کو اتنی بھی نسبت نہیں جو ماں باپ کے سامنے بچہ کے علم کو ہوتی ہے۔ مگر اس پر بھی باوجودیکہ بچہ نشتر سے ڈرتا ہے۔ اور نشتر کو اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔ لیکن آپ اس کی اس رائے کی ذرا پرواہ نہیں کرتے۔ اور ضرورت کے وقت اس کے نشتر لگادیتے ہیں۔ صرف اسی لیے کہ بچہ کا علم آپ کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح تمہارا علم خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تو پھر وہ تمہاری رائے کی کیوں پرواہ کریں۔ اسی کو اس آیت میں فرماتے ہیں کہ تمہیں کیا خبر ہے۔ شاید جس چیز کو تم برا سمجھتے ہو وہ واقع میں تمہارے لیے بہتر ہو۔

واقعات میں آرزو کرنے کی مثال:

یہ مثال تو شریعت کے حکم کی تھی اب وقعات میں آرزو کرنے کی مثال لیجئے۔ کہ بعض لوگ ہمیشہ بیمار رہتے ہیں اور وہ اس کی شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو بیماری نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ مگر یہ نہیں سمجھتے کہ اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں ثواب ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بیماری سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ بیماری سے اکثر خصلتیں درست ہو جاتی ہیں۔ عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح امنگیں جاتی رہتی ہیں اور امنگوں کا دفع کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ دنیا میں اس طرح ہو جیسے کوئی مسافر ہوتا ہے یا راستہ چلنے والا۔ تو ایسی حالت کا رہنا جس میں یہ مصلحتیں ہوں واقع میں بڑی رحمت ہے۔ دوسرے ممکن ہے کہ تندرستی میں کچھ گناہ ہو جائے۔ بیماری میں اس سے بچ گیا۔ جیسا حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ ہے کہ انہوں نے ایک بچہ کو قتل کر دیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس پر بہت غصہ آیا تھا۔ آخر حضرت خضر علیہ السلام نے یہی مصلحت بیان فرمایا کہ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ (الآیۃ) یعنی لڑکا کافر تھا۔ ماں باپ اس کے مومن تھے اگر یہ زندہ رہتا تو انہیں بھی کافر بنا دیتا۔ تو سب کے حق میں یہی رحمت ہوا کہ وہ مر گیا۔ اس کے لیے تو اس واسطے بچپن میں مرا (جس سے امید ہے کہ اس کی نجات ہو جائے) اور ماں باپ کے لیے اس واسطے کہ

اگر وہ زندہ رہتا اور کفر کرتا تو ان پر بھی اثر پڑتا۔ وہ بھی بچے۔

خلاصہ یہ کہ بیمار رہنے میں یہ بھی حکمت ہوتی ہے کہ گناہ سے بچاؤ ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی بہرہ اپنے بہرے پن پر افسوس کرے اور یہ آرزو کرے کہ مجھ میں سننے کی قوت ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ لیکن اس کو کیا خبر ہے کہ اس وقت کیا حالت ہوتی ممکن ہے کہ وہ گانا بجانا سننے میں مشغول ہو جاتا۔ غیبت سنا کرتا۔ تو اس کے لیے کانوں کا نہ ہونا ہی خیر ہو گیا۔ اسی طرح آنکھوں کی بیماری کہ اس میں بھی بہت سے گناہوں سے حفاظت ہے۔ ممکن ہے کہ آنکھیں ہونے کی صورت میں یہ بہت زیادہ گناہوں میں گرفتار ہو جاتا۔ یہی حال مفلسی اور ناداری کا ہے کہ بعض وقت مالدار ہونے سے زیادہ گناہ ہونے لگتے ہیں۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے کہ جو تم کو مالدار نہیں بناتا وہ تمہاری مصلحت تم سے زیادہ جانتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز میں اسی قسم کی مصلحتیں ہیں۔ پس ضرور ہے کہ یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ حکمت والے ہیں اور بڑے رحم والے بھی ہیں۔ اس لیے وہ جو مناسب ہو گا وہی کریں گے۔

بڑے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید کا قصہ:

حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا۔ اس کو یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک روز جو سویا تو اس کو احتلام ہو گیا۔ فوراً اٹھ کر غسل کیا۔ پھر سویا تو پھر احتلام ہوا۔ غرض ایک رات میں ستر بار احتلام ہوا اور ہر بار میں نئی اجنبیہ عورت کو دیکھتا تھا۔ اس کو خیال ہوا کہ میرے اوپر شیطان کا جب اس قدر غلبہ ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید میں مردود ہو گیا۔ بڑے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نہایت رنجیدہ حاضر ہوا۔ آپ نے مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ خدا کا شکر کرو۔ مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ تمہاری قسمت میں ستر عورتوں سے زنا کرنا لکھا تھا میں نے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اس سے بچائیے۔ خدا تعالیٰ نے میری دعا کو قبول فرمایا اور اس کو بیداری سے خواب میں کر دیا کہ تقدیر[1] بھی پوری ہو گئی

[1] تقدیر کی ایک قسم تقدیر معلق ہے وہ بدل سکتی ہے۔ لیکن یہ ایک باریک مسئلہ ہے اس کو اگر سمجھنا ہو تو کسی مولوی سے زبانی سمجھنا چاہیے۔ ۱۲

اور تم گناہ سے بھی بچے رہے۔

تو دیکھئے! واقع میں تو یہ حالت رحمت تھی اور وہ شخص اس کو عذاب سمجھ رہا تھا۔

حضرت حاجی صاحب کی ایک عجیب تحقیق:

ہمارے حاجی صاحب کے پاس ایک شخص آیا۔ اور آ کر یہ عرض کیا کہ میں بیمار ہو گیا تھا۔ اتنی مدت تک مجھ کر حرم شریف کی نماز نصیب نہیں ہوئی۔ حضرت نے اپنے خاص لوگوں سے فرمایا کہ عارف[1] ان باتوں سے رنجیدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ مقصود تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ان کی نزدیکی ہے۔ اور جس طرح کہ قدرت رکھنے کی حالت میں حرم شریف کی نماز خدا تعالیٰ کی نزدیکی کا ایک طریق ہے۔ اسی طرح ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بیمار ہو جائیں اور بیماری کا ثواب ملے۔ جو تندرستی میں حرم شریعت کے اندر ملتا تھا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بندہ جو کام تندرستی میں کیا کرتا تھا۔ بیماری میں بھی اس کا برابر ثواب ملتا رہتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ بندہ کو مولا پر فرمائش کرنے کا حق نہیں کہ مجھ کو فلاں طریقہ سے مقصود حاصل ہو۔ دونوں رشتے خدا تک پہنچے کے ہیں وہ جس طریقہ سے چاہے پہنچائے۔ بندے کو کیا حق ہے کہ ایک راستہ کو اپنی رائے سے مقرر کرلے اور اس کی فرمائش کرے۔ خوب کہا ہے ع

کفراست دریں مذہب خود بینی وخود رائی

یعنی اس راستہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے۔ ع

درطریقت ہرچہ پیش سالک آید خیراوست

یعنی جو حالت پیش آئے اور جس طرف سرکار لے جائیں بالکل خیر ہے مگر اس سے وہ حالت مراد ہے جو خود پیش آئے نہ وہ کہ اپنے ارادے سے لادے۔ کیونکہ حالتیں دو قسم کی ہیں ایک تو غیر اختیاری ہوتی ہیں وہ سب خیر ہیں۔ دوسرے اختیاری ہیں۔ ان میں سے بعض خیر ہیں اور شر بھی ہیں۔ وہ اس جگہ مراد نہیں۔ اور اس سے ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ یہ کہ اگر کوئی کہے کہ ہم سود لیتے ہیں اور یہ بھی ایک حالت ہے جو ہم کو پیش آتی

---

[1] عارف کامل اور جو دین کی پوری سمجھ رکھتا ہو ۱۲۔

ہے تو اس میں بھی خدا تعالیٰ کی مصلحت ہوگی۔ تو اس قاعدے سے اس شبہ کا جواب ہو گیا۔ یعنی یہ قاعدہ خدا تعالیٰ کے کاموں میں ہے تمہارے کاموں میں نہیں ہے۔ پس ہمارے اختیاری کاموں میں تو اچھے برے دونوں ہوں گے۔ اور خدا تعالیٰ کے جتنے کام ہوں گے وہ سب خالص رحمت ہیں جیسے کسی عزیز کا مر جانا یا قحط ہونا یا طاعون ہونا۔

طاعون رحمت ہے:

اور اگر کوئی کہے کہ قحط تو گناہوں سے آتا ہے اسی طرح طاعون بھی۔ سو وہ رحمت کیسے ہوا۔ تو صاحبو! یہ بھی تو رحمت ہے کہ تم گناہوں سے صاف ہو گئے۔ اسی واسطے حدیث شریف میں ہے کہ طاعون مومن کے لیے رحمت ہے کیونکہ اس کو اس سے پاکی حاصل ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ہر بیماری سے گناہ دور ہوتے ہیں بلکہ یہاں تک آیا ہے کہ اگر کوئی چیز رکھ کر بھول جائے تو اتنی پریشانی سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں غرض ہر چیز جو ہمارے اختیار سے باہر ہو وہ ہمارے لیے رحمت ہے۔

مصیبتوں پر تسلی دوسرے عنوان سے:

پھر ایک بات سمجھو کہ ہم خدا کے ہیں یا اپنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم خدا کے ہیں۔ اسی واسطے ارشاد فرمایا۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ یعنی اپنے نفسوں کو مت قتل کرو۔ اگر ہم اپنے ہوتے تو ہم کو ہر تصرف اپنے نفس میں جائز ہوتا۔ اور جب ہم خدا تعالیٰ کے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی چیز میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔ عقل کا فتوے تو یہی ہے کہ ضرور ہونا چاہیے اور اسی واسطے مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰه کہنے کا حکم ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے مملوک[1] ہیں وہ جو چاہیں ہمارے اندر تصرف کریں، ہم ہر طرح راضی ہیں۔ پس اگر ان حکموں میں کوئی مصلحت نہ بھی ہوتی تب بھی ہم کو اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیے تھا۔ تو جبکہ ہر مصیبت میں نفع اور مصلحت بھی ہے پھر اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔ یہاں تک تو ظاہری مصیبتوں کا ذکر تھا۔

---

[1] یعنی وہ ہمارے مالک ہیں ۱۲

ذکر وشغل کرنے والے کو اگر کیفیات حاصل نہ ہوں تو اس کو صبر کرنا چاہیے:

ان کے علاوہ ایک اور باطنی مصیبت ہے جو ان لوگوں کو پیش آتی ہے جو ذکر وشغل کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ محنت بہت کرتے ہیں۔ مگر کوئی نفع ان کے خیال میں نظر نہیں آتا۔ اس واسطے کہ عبادت کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ ذوق[1] اور شوق نہیں ہوتا۔ اور اسی قسم کی دوسری کیفیات حاصل نہیں ہوتیں جس سے وہ اس قدر تنگ ہوتے ہیں کہ اگر بے اختیاری کی حالت میں ایسا کہنا جائز نہیں۔ اس آیت سے اس کا بھی علاج سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ایسی صورت میں یہ خیال کر لینا چاہیے کہ ممکن ہے جس حالت کو ہم مفید سمجھے وہ مفید نہ ہو بلکہ اس موجودہ حالت ہی میں مصلحت ہو۔

کیفیات حاصل نہ ہونے میں مصلحت:

چنانچہ نمونہ کے لیے ایک مصلحت تو میں بتلاتا ہوں کہ جب کیفیتیں حاصل نہیں ہوتیں اور ذوق وشوق پیدا نہیں ہوتا تو اس وقت اپنا نکما ہونا نظر کے سامنے ہو جاتا ہے اور اپنے کو کسی قابل نہیں سمجھتا۔ اور اگر کیفیتیں حاصل ہو جاتی ہیں تو بعض وقت اپنے اوپر نظر ہو جاتی ہے اور اپنے کو سمجھنے لگتا ہے کہ اب تو ولی ہو گئے۔ تو اس صورت میں کیفیات حاصل نہ ہونے میں نجات ہے۔ اور حاصل ہونے میں ہلاکت ہے۔

ذکر وشغل کرنے والوں کے اس شبہ کا جواب کہ مجاہدہ سے گناہ کی خواہش دفع نہیں ہوتی

بعض کہتے ہیں کہ ہم ذکر وشغل کرتے ہیں نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے ہیں مگر ہم سے گناہ کی خواہش دفع نہیں ہوتی۔ اور اس کو مصیبت سمجھتے ہیں۔ تو خوب سمجھ لو کہ اگر خواہش کے ساتھ ہمت بھی گناہ سے بچنے کی ہو تو یہ بڑا بھاری مجاہدہ ہے۔ اور مجاہدہ جتنا زیادہ ہوتا ہے اس میں ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے تو یوں سمجھو کہ خدا تعالیٰ کو ثواب زیادہ دینا منظور ہے۔ سو یہ خدا کی رحمت ہے کہ ثواب بڑھانے کے واسطے یہ خواہش پیدا کر دی غرض

---

[1] عبادت میں مزہ آتا ہے ۱۲

کام کیے جاؤ اور گناہ سے بچو۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کا علاج توبہ اور استغفار کو بتلایا ہے بعض وقت شیطان سالک[1] پر بڑا قبضہ کر لیتا ہے کہ شرم کے مارے توبہ نہیں کرتا اور محروم رہ جاتا ہے۔

صاحبو! گناہ پر فقط رنج کرنا کافی نہیں' بلکہ توبہ اور استغفار کرنا چاہیے اور خالص توبہ کر لینے کے بعد پھر قصد کر کے ان گناہوں کو یاد نہ کرے کہ بعض وقت اس سے کیفیت مایوسی کی پیدا ہو کر آدمی ہمت ہار دیتا ہے۔ اور اگر بلا قصد کے یاد آئے تو پھر توبہ کرے اور توبہ میں ہر ہر گناہ کو سوچنے اور فہرست میں گننے کی بھی ضرورت نہیں۔ دیکھیے حضور ﷺ نے جو استغفار کے الفاظ سکھلائے ہیں' ان میں خود اس طرف اشارہ موجود ہے۔ اور وہ یہ ہیں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ یعنی اے اللہ میرے تمام گناہ بخش دے اگلے پچھلے (کھلے) اور چھپے اور وہ کہ اس کی آپ کو خبر ہے اور مجھے خبر نہیں۔ تو دیکھیے اس میں عام الفاظ کو کافی قرار دیا جس میں سب گناہ داخل ہو گئے۔ اور ایک ایک گناہ کے نام لینے کو ضروری نہیں بتلایا۔ قربان جایئے آپ کے کہ ہم کو کس قدر تنگیوں سے بچالیا ہے اور کسی آسان راہیں بتلائی ہیں۔ لیکن اگر کوئی کام ہی نہ کرے تو کچھ علاج ہی نہیں۔

خلاصہ مطلب آیت کا:

خلاصہ یہ کہ جو بات ایسی بات پیش آئے کہ اپنے اختیار سے باہر ہو' اس کو مصلحت سمجھے اور اس پر خدا کا شکر کرے۔ خواہ ظاہری بلا ہو یا باطنی بلا ہو۔ یہ تھا بیان آرزوؤں کے مرض کا جس میں دنیا دار تو گرفتار تھے ہی پر صوفی بھی اس سے بچ نہ سکے۔ اس کی ممانعت اس حدیث میں بھی ہے کہ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں اِیَّاکُمْ وَاللَّوْفَاِنَّ لَوْ یَفْتَحُ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ یعنی ایسا نہ کہا کرو کہ اگر یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا یا یوں ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اس واسطے کہ ایسا کہنا شیطانی کاموں کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ غرض کہ اس آیت میں اس مرض کی جڑ کاٹ دی گئی۔ ہم نے ہزاروں مرتبہ یہ آیت پڑھی ہوگی۔ لیکن آج جو بات اس سے

[1] سالک:۔ صوفی یعنی اللہ کا نام لینے والا اور اس کے راستہ میں محنت اور مجاہدہ کرنے والا ۱۲ منہ

سمجھ میں آئی وہ آج تک سمجھ میں نہ آئی تھی۔

دعا کی ترغیب اور آرزو کرنے کی ممانعت:

اور ایک بڑی رحمت اس کے ساتھ یہ فرمائی کہ انسان کی طبیعت کا بھی لحاظ فرمایا۔ اور وہ اس طرح کہ آرزو چونکہ خود بخود طبیعت میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سے طبیعت کو روکنا دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سہولت فرمادی کہ دعا کو جائز کردیا کہ اگر کسی چیز کی آرزو پیدا ہوتو بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کو رائے دو۔ وہ ارمان اس طرح نکالو کہ دعا کرلیا کرو کہ آرزو کرنے سے وہ بہتر ہے کیونکہ آرزو کے معنی تو خدا کو رائے دینا ہے کہ اس طرح کرنا مناسب تھا۔ لیکن دعا میں یہ بات نہیں بلکہ وہ درخواست ہے خدائے تعالیٰ کے درگاہ میں اور ساتھ ہی اس پر رضامندی بھی ہے کہ اگر یہ کام اس طرح نہ ہوگا تو میں اسی کو مصلحت سمجھوں گا۔ اور یہی مقصود ہے اس آیت کا۔ پس دعا دل کا غبار نکالنے میں تو آرزو کے ہم پلہ ہے۔ مگر حقیقت میں بہتر ہے کیونکہ اس میں درخواست ہے خدا تعالیٰ سے اور آرزو میں رائے دینا ہے ان کو۔

اس مثال سے سمجھئے کہ جب کوئی شخص بیمار ہوتو اس کو چاہیے کہ صحت کی دعا کرے۔ اسی طرح صبر کی بھی درخواست کرے۔ اور جو پسند آئے دعا مانگے۔ اس سے دل کا غبار نکل جائے گا۔ اور حسرت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر یہ آرزو کرے گا کہ بیمار نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اس میں حسرت ہوگی۔ پس دعا فائدہ میں بھی آرزو سے اچھی ہوئی اور حقیقت کے لحاظ سے بھی کیونکہ آرزو اکثر گزری ہوئی بات پر ہوتی ہے کہ یوں نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یا یوں ہوتا تو اچھا ہوتا۔ سو یہ خدا تعالیٰ کے ارادہ میں دخل دینا ہے اور ان کے کیے ہوئے کام پر اعتراض کرنا ہے اور دعا چونکہ آئندہ کے لیے ہوتی ہے اس میں خدا تعالیٰ کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے دعا کرنا اس کے ساتھ مقابلہ نہیں ہے بلکہ درخواست ہے اور ساتھ ہی ان کے حکم رضامندی بھی ہے کہ اگر اس طرح نہ ہوگا تو میں اسی کو مصلحت سمجھوں گا۔ اس سے دعا اور آرزو کا فرق معلوم ہوگیا۔ اور اگر اس مضمون پر یہ شبہ ہو کہ ہم گزری ہوئی بات

پر آرزو نہ کریں گے بلکہ آئندہ کے کام پر کریں گے تو اس میں کیا قباحت اور حسرت ہوگی۔ تو میں کہتا ہوں کہ پھر دعا ہی کیوں نہ کروں تا کہ رائے دینے کا شبہ ہی نہ ہو اور دعا کے مفید اور جائز ہونے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ آئندہ واقعات کا پوشیدہ رہنا۔ اور کشف[1] نہ ہونا ہی بہتر ہے کیونکہ کشف ہونے کے بعد پھر کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اس واسطے کہ کشف کے خلاف دعا کرنے سے ضرور اندر سے جی کھٹکتا ہے۔

سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اپنی ہمکلامی میں لذت بخشنے کے لیے واقعات کو پوشیدہ رکھا پھر چاہے کام ہو یا نہ ہو۔ لیکن دعا کی برکتیں تو حاصل ہوگئیں (کہ ان کے ساتھ ہمکلامی نصیب ہوئی اور دل کی تسلی کی بھی صورت ہوگئی۔ پھر ثواب علیحدہ رہا۔ اب رہی یہ بات کہ اگر دعا کی اور مقصود حاصل نہ ہوا تو پھر دعا کرنا چھوڑ دے یا جب تک حاصل نہ ہو اس وقت تک برابر دعا ہی کیا کرے۔ اور اس کی بات حکم یہ ہے کہ دعا تو نہ چھوڑے لیکن جب تک مقصود پورا نہ ہو۔ صبر کے ساتھ رہے۔ پس صبر اور دعا دونوں رکھے۔

وعظ کا خلاصہ:

خلاصہ یہ کہ دعا کرنا تو جائز ہے۔ چنانچہ بہت سی آیتوں میں اس کا حکم فرمایا ہے اور آرزو کرنا ناجائز ہے جیسا کہ اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے۔ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (الآیۃ) کہ شاید تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور واقع میں تم کو نقصان دینے والی ہو۔

اس وقت اس مضمون کو کس لیے اختیار کیا:

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے جتنے حکم ہیں وہ واقعات میں سے ہوں یا شریعت کے حکموں میں سے' ان کے خلاف آرزو نہ کرے۔ بلکہ ان پر صبر کرے۔ اور جو دل میں کوئی آرزو پیدا ہو' بجائے اس کے دعا کرتا رہے۔ میں نے اس وقت اس مضمون کو اس لیے زبان بیان کیا کہ یہاں ایک[2] واقعہ ہو گیا ہے' جس سے اکثر لوگوں کے دل پر اثر

[1] کسی پوشیدہ بات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہو جانا۔۱۲

[2] منشی خلیل الرحمن صاحب کاندھلوی تحصیلدار بھوپال کی وفات ہوئی تھی ۱۲

ہوگا۔ اور اثر ہونا کچھ عجیب نہیں۔ کیونکہ واقعہ کا بھی مثل نشتر کے اثر ہوتا ہے۔

دیکھو اگر ایک نشتر لگاتے ہیں تو کھال میں کتنا اثر ہوتا ہے۔ لیکن ہم کو اعتراض کا کوئی حق نہیں' کیونکہ ہم اللہ میاں کے کوئی رشتہ دار نہیں ہیں کہ ان کے حکموں کی حکمتیں دریافت کر سکیں۔ باقی حکمتیں ہیں ضرور۔ پھر مصیبت ختم ہونے کا طریقہ یہ نہیں کہ ان حکمتوں کی تلاش کی جائے بلکہ مصیبت کے ختم ہونے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کو سوچے نہیں اور تذکرہ نہ کرے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کئی کئی مہینے کے بعد بھی مصیبت زدہ کے پاس آ کر برابر رنج وصدمہ کا تذکرہ کر کے اس کو تازہ کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ تین دن کے بعد تعزیت[1] نہ کرے کیونکہ وہ واقعہ میں تعزیت ہی نہیں اس واسطے کہ تعزیت کی حقیقت ہے تسلی دینا۔ اور اس میں بجائے تسلی کی دونی آگ بھڑکتی ہے۔ بس اس کا طریقہ تو یہی ہے کہ پھر ایسے قصوں کو یعنی ان واقعات کو خود بیان نہ کرے۔ ہاں البتہ مردے کو نفع پہنچانے کو یاد کرے۔ اور جو حق اس کے ذمہ پر ہیں وہ ادا کرے۔ اس سے اس کو نفع ہوگا اور اپنی تسلی اور اطمینان کے لیے اللہ کے ذکر میں مشغول رہے کہ ذکر سے دل کو تسلی ہوگی۔ اور مردے کو آرام پہنچانے میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ جو کچھ مال چھوڑ گیا ہے اس میں گڑ بڑ نہ کرے۔ کیونکہ امام سیوطی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ زندوں کے عمل کی مردوں کو خبر کی جاتی ہے پس اس کو اپنے مال کے متعلق شرع کے خلاف کام کرنے سے تکلیف ہوگی۔ اگر کوئی شخص کہے کہ مردے کی تکلیف سے مجھ کو کیا۔ میں اپنا فائدہ اس وجہ سے کیوں چھوڑوں۔ میں کہوں گا کہ شرع کے خلاف کرنے سے تم کو تو بھی عذاب ہوگا۔ اگر اس کا خیال نہ کرو تو اپنا خیال تو کرنا چاہیے۔

علاوہ اس کے اگر عذاب بھی نہ ہوتا تب بھی خدا کی مرضی کی تو پرواہ کرنا ضرور تھا۔

غرض مردے کا نفع اس میں ہے کہ اس کو اس طریقہ سے یاد کرو۔ نہ یہ کہ واقعہ اور مصیبت کو سوچتے رہو۔ اور اپنی تسلی کے لیے ایک تدبیر یہ ہے کہ کسی کام میں لگے رہو' کیونکہ بے کاری میں سب قصے یاد آتے ہیں۔ اگر دین کا کام نہ ہو تو دنیا ہی کے کام میں

---

[1] تعزیت ماتم پرسی یعنی مرنے والے کا پرسا دینا ۱۲

لگ جاؤ۔ مگر جائز کام ہو۔ غرض غم کو ہلکا کرنا چاہیے۔ ورنہ جب غم زیادہ ہوتا ہے تو تقدیر خداوندی سے دل میں تنگی ہونے لگتی ہے اور شکایت کے خیال آنے لگتے ہیں۔

پس اس کے علاج کے لیے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے:۔

(کہ تم واقعات پر غم نہ کیا کرو۔ اس واسطے کہ) ممکن ہے کہ جس چیز کو تم برا سمجھتے ہو وہ تم کو نقصان دینے والی ہو۔

وعظ کا خاتمہ اور دعا

ایک میں وعظ ختم کرتا ہوں۔ اپنے لیے بھی توفیق کی دعا کیجئے۔ اور مردوں کے لیے بھی دعا کیجئے۔

تمت

بِالْخَيْرِ وَبِكَ نَسْتَعِيْنُ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

❁❁❁

(۴۸) اصلاح کی آسانی

منتخب از وعظ دہم ملقب بہ تیسر الاصلاح حصہ چہارم دعوات عبدیت

خطبہ ماثورہ:

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًاO

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًاO

ترجمہ: ''لیکن جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ (گناہوں کا) بخشنے والا ہے' مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور عمل نیک کرے پس بے شک وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔''

یہ دو آیتیں ہیں۔ جن میں اول آیت پہلی آیت کی محتاج ہے۔ اور حقیقت میں اسی کا ایک ٹکڑا ہے مگر جو مضمون اس وقت مقصود ہے اس کے لیے چونکہ یہ بھی کافی ہے۔ اس واسطے پہلی آیت کو تلاوت نہیں کیا گیا۔ اور اس کی تلاوت کی ضرورت نہیں سمجھتی۔

بیان کی ضرورت:

ان دونوں آیتوں میں سے اول آیت میں ایک بہت بڑے مرض کا ایک نہایت ہی آسان علاج فرمایا ہے۔ ہم میں مرض تو بڑے بڑے سخت ہیں۔

عقل کا مقتضا یہ تھا کہ ہمارے سخت مرضوں کا علاج بھی سخت ومگر شریعت نے آسانی کی اور یہ اس شریعت کی خاص فضیلت ہے:

اس لیے عام قاعدہ کے موافق ان کے علاج بھی سخت ہونے چاہیں تھے مگر یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ سخت سے سخت مرضوں کے علاج نہایت آسان رکھے۔ اور یہ بھی ایک فرق ہے۔ ہمارے حضور ﷺ کی شریعت میں اور دوسری شریعتوں اور اصلاح کے طریقوں میں کہ اس شریعت میں سخت سے سخت مرض کے لیے بھی نہایت آسان علاج بتلائے گئے ہیں۔ ورنہ تمام دنیا کا قاعدہ ہے کہ جس درجہ کا مرض ہوتا ہے اسی درجہ کا علاج بھی کیا جاتا ہے۔ اگر مرض سخت ہے تو اس کا علاج بھی سخت ہوگا۔ اور اگر مرض ہلکا ہے تو علاج بھی ہلکا ہوگا۔

غرض کہ یہ فضیلت خاص ہمارے حضور ﷺ ہی کی شریعت کو حاصل ہے کہ سخت سے سخت روحانی بیماریوں کا علاج بھی آسانی سے کیا گیا ہے۔

روحانی بیماریاں گناہ ہیں:

اور روحانی بیماریوں سے مراد گناہ ہیں۔ خواہ کبھی کبھی ہو جاتے ہوں یا ان کی عادت پڑگئی ہو۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ گناہ بھی ایک قسم کی بیماری ہے اور اس میں دو درجے ہیں ایک تو بغیر عادت کے اتفاقیہ طور پر گناہ ہو جانا۔ دوسرے گناہ کی عادت پڑ جانا کہ اس سے توبہ میسر نہ ہو تو گناہ کا بیماری ہونا تو ظاہر بات ہے۔ اس کے اندر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس میں ایمان ہوگا وہ اس کو ضرور ہی مانے گا۔

گناہ کے روحانی بیماری ہونے کی وجہ:

کیونکہ بیماری کی حقیقت ہے مزاج کا مناسب حالت سے نکل جانا اور جس طرح طبیعت کی ایک مناسب حالت ہوتی ہے اسی طرح روح کی بھی ایک مناسب حالت ہے جس کو شریعت نے بتلایا ہے کہ انسان کو اس حالت پر رہنا چاہیے کہ نہ اس میں کمی ہو اور نہ زیادتی ہو۔ تو جیسے کمی اس کے اندر ناجائز ہے ایسے ہی زیادتی کو بھی جائز نہیں رکھا۔ پس یہ

جو سمجھا جاتا ہے کہ عبادت میں جتنی بھی زیادہ کوشش ہو تو اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں بلکہ مناسب حالت ہونی چاہیے۔

دین کے متعلق لوگوں نے دو قسم کی غلطیاں کی ہیں:

سو اس میں دو غلطیاں لوگوں کو واقع ہوئی ہیں بعض نے تو اتنی کمی کی کہ دین کو بالکل ہی اڑا دیا اور بعض یہ سمجھے کہ عبادت میں خوب کوشش کرو۔ جتنی کوشش زیادہ ہوگی اتنا ہی اچھا ہوگا۔

پہلی غلطی بڑے نتیجے:

اس کا ایک بڑا نتیجہ تو یہ ہے کہ عام لوگوں کو یہ سن کر دین سے وحشت اور گرانی پیدا ہوگی۔ دوسرا برا اثر یہ ہوگا کہ جو معتقد ہوں گے وہ اس کو قبول کر کے عبادت میں ایسے مشغول ہوں گے کہ دنیا کے تمام کاروبار کو چھوڑ کر اور سارے تعلقات اور رشتوں سے منہ موڑ کر بیٹھ رہیں گے خواہ وہ تعلقات واجب ہی کیوں نہ ہوں۔ جیسے بیوی بچوں وغیرہ کے تعلقات اور حقوق۔ اور اس کا نام رکھا ہے دنیا سے آزاد ہو جانا کہ ہم کو خدا کے سوا کسی سے غرض نہیں۔ نہ بیوی سے نہ بچوں سے اور اس کا نتیجہ آخر یہ ہوا کہ بیوی اور بچوں وغیرہ کے جو حق ان کے ذمہ پر واجب تھے وہ بھی ضائع ہو گئے۔ مگر ان لوگوں نے یہ نہ سمجھا کہ آزادی اس حد تک جائز ہے جہاں تک شریعت نے اجازت دی ہے اور جہاں شریعت نے پابند کر دیا ہے وہاں پابند ہی رہنا چاہیے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ بندہ کو ایسا ہونا چاہیے کہ جب باندھ دیں بندھ جائے اور جب کھول دیں تو اچھلتا کودتا پھرے۔ دیکھیے گھوڑا شائستہ اور اصیل وہی ہے کہ جب اس کو باندھ دیا جائے تو بندھا رہے اور جب کھول کر چلایا جائے تو کھل کر چلے۔ اور اگر وہ کھولنے پر بھی بندھ جائے اور چل نہیں یا باندھنے کے بعد بھی اچھلے کودے تو وہ شریر گھوڑا ہے بس اطاعت یہی ہے کہ باندھنے سے بندھ جائے اور کھولنے سے کھل جائے۔

اس وقت دنیا داروں نے تو بالکل اپنے گلے سے پٹا ہی نکال دیا۔ اور دینداروں

نے اپنے کو ایک کونے میں جکڑ لیا ہے تو یہ سخت غلطی ہے اور بہت لوگ اس میں گرفتار ہیں اور اس غلطی سے یا تو دین س وحشت اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور یا دنیا کے سب کاروبار اور تعلقات چھوٹ جاتے ہیں۔ اسی غلطی کی نسبت قرآن شریف میں فرماتے ہیں: یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ۔ یعنی اے ماننے والو پہلی کتابوں (یعنی توریت اور انجیل) کے دین کے اندر حد سے مت گزر جاؤ۔ پس ہر چیز میں سخت ضرورت ہے حد کے اندر رہنے اور مناسب حالت اختیار کرنے کی دنیا میں بھی اور دین میں بھی۔ اور جب معلوم ہوا کہ دین میں بھی مناسب انداز پر رہنا مقصود ہے تو جو اس انداز سے نکلے گا وہ روحانی بیمار سمجھا جائے گا۔ اس تقریر سے تو گناہ کا اپنی حقیقت کے اعتبار سے مرض ہونا ثابت ہوا۔

گناہ کا اثر کے اعتبار سے مرض ہوتا ہے۔

اب اثر کے اعتبار سے لیجئے کہ مرض کا اثر یہ ہے کہ اس سے طبیعت کمزور اور ست ہو جاتی ہے۔ اسی طرح گناہ میں بھی طبیعت ست ہو جاتی ہے اور اس سے پریشانی اور روحانی کمزوری بڑھتی ہے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ گنہگار ہر وقت پریشان اور مرجھایا ہوا رہتا ہے۔ کبھی اس کو اطمینان نصیحت نہیں ہوتا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عبادت کے بعد دل میں ایک نور پیدا ہوتا ہے جو عبادت کرنے والے کو معلوم بھی ہوتا ہے۔ اور گناہ کے بعد سیاہی اور کدورت پیدا ہوتی ہے جس سے دل مرجھا کر رہ جاتا ہے۔ دیکھو نمازی کی نماز اگر قضا ہو جائے تو اس کو کس قدر رنج ہوتا ہے۔ اور اگر اپنے وقت پر ادا ہو جائے تو کیسی فرحت اور خوشی ہوتی ہے دیکھئے اگر کسی کو نماز سے محبت ہو جائے تو چاہے اس کی حالت اللہ والوں کی سی نہ ہو لیکن پھر بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر اس کو کوئی ایک ہزار روپیہ دے اور یہ کہے کہ تم ایک وقت کی نماز مت پڑھو تو قیامت تک نہ مانے گا۔ بلکہ اگر تمام دنیا کی سلطنت بھی اس شرط پر اس کو دی جائے۔ اس پر بھی لات مار دے گا تو اس شخص کو نماز میں آخر کوئی لذت تو ہے جس کی وجہ سے دنیا کی بادشاہت کو بھی اس کے عوض لینے میں ہیچ[1] سمجھتا ہے کہ یہی روحانی فرحت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ نماز چھوڑنے سے یہ فرحت جاتی رہے گی۔ اور دل

[1] حقیر ۱۲

میں اس کی جگہ ایک کدروت اور زنگ پیدا ہو جائے گا۔

عبادت سے نور اور گناہ سے زنگ پیدا ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عبادت سے ایک نور پیدا ہوتا ہے۔ اور گناہ سے ایک قسم کی کدورت پیدا ہوتی ہے۔

اطاعت کا نور قوت بخشتا ہے اور گناہ کی کدورت کم ہمتی پیدا کرتی ہے:

اور اس نور میں بھی خاصیت ہے کہ وہ قوت بخشتا ہے اور اس طرح اس کدورت کا خاصہ ہے کہ وہ کم ہمت اور کسل مند کر دیتے ہے۔

آپ دیکھ لیجئے! اگر دو شخص قوت میں برابر ہوں۔ مگر ان میں ایک دیندار ہو اور ایک دیندار نہ ہو تو ان دونوں کے کاموں میں غور کرنے سے یہ فرق نظر آئے گا کہ دیندار سے جو کام ہمت کا ہو سکے گا وہ غیر دیندار سے نہ ہو گا۔ اور ہر کام میں جو ہمت دیندار سے ظاہر ہو گی وہ غیر دیندار سے کبھی نہ ہو سکے گی۔ اور یہی راز ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ دبلے پتلے اور بے سر و سامان تھے۔ اپنے مقابل کافروں پر باوجود ان کی قوت اور شوکت کے غالب آ گئے۔ یہاں تک فارس والے کیسے طاقتور لوگ تھے جن میں [1] رستم جیسا شخص موجود تھا جو اپنے زمانہ کا بڑا زبردست پہلوان سمجھا جاتا تھا۔ اور ادھر ان کے مقابلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے دبلے پتلے کمزور، مگر جب کام کا وقت آیا تو یہ کمزور قوی ثابت ہوئے اور طاقتور کمزور نکلے تو یہ قوت اسی نور کی تھی جو عبادت کی وجہ سے ان کے دل میں، بلکہ رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا۔ اور یہی نور ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَّفِيْ عَصَبِيْ نُوْرًا وَّفِيْ لَحْمِيْ نُوْرًا وَّفِيْ دَمِيْ نُوْرًا وَّمِنْ تَحْتِيْ نُوْرًا وَّمِنْ فَوْقِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَمِيْنِيْ نُوْرًا وَّعَنْ شِمَالِيْ نُوْرًا وَّاجْعَلْنِيْ نُوْرًا۔ ''ترجمہ اے اللہ! میرے دل میں، رگ و ریشہ میں، گوشت پوست میں، خون میں نور پیدا کیجیے اور مجھ بھی سراپا نور کر دیجئے۔''

---

[1] یہ دوسرا رستم ہے۔ مشہور رستم نہیں ہے ۱۲ منہ

اور واقع میں اطاعت اور عبادت سے ایک نور پیدا ہو جاتا ہے اور عبادت کرنے والے کو بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر معلوم نہ بھی ہوتا تب بھی ہم کو صرف حضرت کے ارشاد کے وجہ سے ایمان لانا چاہیے۔ اور اگر کوئی کہے کہ ہم کو دو کبھی نور معلوم نہیں ہوا۔ تو میں کہوں گا کہ اس لیے نہیں معلوم ہوا کہ ابھی آپ نے وہ دینداری اور پرہیز گاری اختیار نہیں کی جس سے نور پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ آپ دیکھتے کہ کیسا نور آپ کے دل میں پیدا ہوتا ہے جس کے سامنے کسی قسم کا ضعف ہی نہیں رہتا۔ اسی بارہ میں فرماتے ہیں كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ یعنی کتنی ہی چھوٹی جماعتیں خدا تعالیٰ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں۔ تو اس کی وجہ وہی دل کی قوت ہے جو اطاعت کے نور سے حاصل ہوتی ہے۔

اطاعت سے نور وقوت پیدا ہونے کی مثال:

اس کی مثال واقعات میں دیکھنا چاہیں تو لیجئے میں عرض کرتا ہوں کہ اگر کسی شخص کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی کیا حالت ہو جاتی ہے کہ محبوب کے کسی کام میں بھی اس کو تھکن نہیں ہوتی۔ پھر اگر کسی کو اللہ تعالیٰ سے اور اس کی اطاعت سے محبت ہو جائے تو اس کی دلی قوت کا کیا ٹھکانا۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بڑھاپے میں بھی یہ زور نہیں گھٹتا بلکہ اور اور زیادہ ہو جاتا ہے، کیونکہ شراب جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی تیز ہو جاتی ہے۔ پس عشق الٰہی کی شرب کیونکر تیز نہ ہوگی تو اس نور سے باوجود جسمانی کمزوری کے روحانی قوت بڑھتی جاتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ایک درجہ قوت اور صحت کا روحانی بھی ہے اور اس سے نکلنے کا نام مرض ہے اور اسی کو گناہ کہتے ہیں پس معلوم ہو گیا کہ گناہ بھی سب ایک قسم کے مرض ہیں اور اسی کو گناہ کہتے ہیں۔ پس معلوم ہو گیا کہ گناہ بھی سب ایک قسم کے مرض ہیں اور اس میں کلام کو بہت زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ خدا کا شکر ہے کہ ہر مسلمان اس کو سمجھتا ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں۔ یہ تو گناہوں کے مرض ہونے کا بیان تھا۔

روحانی مرضوں کے بھی مثل جسمانی مرضوں کے علاج ہیں اور ان میں لوگ بے تدبیری کرتے ہیں

اب ان کے علاج بھی معلوم کرنے چاہئیں۔ کیونکہ ان مرضوں کے علاج کے خاص خاص طریقے مقرر ہیں جو کہ حضرت ﷺ نے بیان فرمائے ہیں۔ اگر خاص اس طریقہ سے علاج کیا جائے تب تو ان سے چھٹکارا ہوتا ہے ورنہ نہیں مگر اکثر لوگ علاج کے طریقوں سے بے خبر ہیں۔ اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گناہ کو چھوڑنا چاہتے ہیں مگر چھوڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ اس کے چھوٹنے کا طریقہ اور علاج ان کو معلوم نہیں۔ دیکھو اگر کوئی اچھا ہونے کا آرزومند ہو۔ مگر اس کا طریقہ معلوم نہ ہو۔ یا جان بوجھ کر اس کا استعمال نہ کرے تو کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح آج کل بعض لوگ بڑی آرزوئیں کرتے ہیں کہ ہم سے گناہ چھوٹ جائیں۔ لیکن بعضے تو طریقے ہی نہیں جانتے۔ اور بعضے جان کر بھی عمل نہیں کرتے۔ بڑی فکر کی۔ تو بس یہ کر بزرگوں سے کہتے ہیں کہ کچھ توجہ کر دیجئے۔ مطلب یہ کہ ہم کو کچھ نہ کرنا پڑے۔

صاحبو! ہر کام اس کے طریقہ ہی سے ہوا کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۖ کہ گھروں کے اندر ان کے دروازوں سے داخل ہو تو ہر مقصود ایک گھر ہے اور اس کا طریقہ ایک دروازہ ہے۔ اگر اس سے داخل ہوا جائے تو گھر میں پہنچ سکتا ہے ورنہ نہیں تو نری آرزو مقصود تک نہیں پہنچا سکتی اور نہ ہر آرزو کا پورا ہونا ضروری ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر علم (اور اسی طرح عمل) آرزو سے حاصل ہو جاتا تو دنیا میں کوئی بھی جاہل نہ رہتا۔

عرفی کہتا ہے کہ اگر صرف رونے سے وصال میسر ہو سکتا تو سو برس رونا بھی آسان تھا۔ آج کل بعض لوگ دو آنسو گرا لیتے ہیں اور اس کو کافی سمجھتے ہیں۔ غرض خدا تعالیٰ کی عادت اسی طرح جاری ہے کہ ہر ایک کام کے لیے ایک تدبیر رکھی ہے کہ جب اس تدبیر سے کام لیا جائے تو اس میں کامیابی ہوگی ورنہ نہیں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف دعا ہی

پر اکتفا کرتے ہیں۔

صاحبو! دعا میں برکت ضرور ہے۔ لیکن ہر جگہ نری دعا سے کام نہیں چلتا۔

بعض کام اسباب پر موقوف نہیں اور بعض کام اسباب پر موقوف ہیں

قسم اول میں دعا کا اثر:

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مقصود دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کا اسباب سے کچھ تعلق نہیں ان میں تو دعا کا یہ اثر ہے کہ اگر قبول ہوگی تو مقصود بلا تدبیر حاصل ہو جائے گا۔

قسم ثانی میں دعا کا اثر کیا ہے؟

اور بعض کام تدبیر پر موقوف ہیں ان میں دعا کا صرف یہ اثر ہوگا کہ اگر تدبیر کی جائے گی تو اس تدبیر میں برکت ہوگی۔ اور اگر تدبیر نہ کر جائے گی تو کچھ بھی نہ ہوگا۔ ہاں معجزہ یا کرامت کے طور پر ہو جائے تو اس کا ذکر نہیں۔ لیکن عادت الٰہی اس طرح جاری ہے کہ ایسے مقاصد میں تدبیر کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور دعا کا فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ تدبیر میں برکت ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ شبہ ختم ہو گیا کہ جب ان کاموں کا مدار تدبیر پر ہے تو پھر دعا کا ان میں کیا دخل اور اثر ہوگا۔

جو کام اسباب پر موقوف ہیں ان میں بھی دعا بے اثر ہے:

سو وہ اثر یہ ہوا کہ تدبیر میں برکت ہوگئی۔ اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے کھیتی کہ اگر کوئی بیج ہی نہ ڈالے اور دعا کیا کرے کہ غلہ پیدا ہو جائے۔ تو عادت الٰہی یہی ہے کہ ہرگز پیدا نہیں ہوگا۔ تو وہاں اس کی ضرورت ہے کہ اول زمین کو جوتے' بیج ڈالے۔ اس کے بعد دو حالتیں ہیں۔ پیدا ہونا یا نہ پیدا ہونا۔ اور یہ دونوں خدا تعالیٰ کے قدرت اور ارادہ میں ہیں تو یہاں اس لیے دعا کی جائے گی کہ آپ اس میں اپنی قدرت سے غلہ پیدا کر دیں۔ اور یہی حالت ہے گناہ کے چھوڑنے اور عمل کی اصلاح کرنے کی کہ اس میں بھی صرف دعا کو کافی سمجھنا سخت غلطی ہے۔ آج کل لوگ اصلاح چاہتے ہیں مگر تدبیر نہیں کرتے صرف دعا پر کفایت کرتے ہیں تو صاحبو! تدبیر کرو اور دعا بھی کرو تو کامیابی ہوگی۔ اب آپ نے

سمجھ لیا کہ دعا کا کیا اثر ہے۔ اور یہ بھی معلوم کرلیا کہ وہ بعض جگہ بلا تدبیر کے بے کار ہے اور انہیں میں سے عمل کی اصلاح کی تدبیر بھی ہے کہ اس کے لیے تدبیر کی ضرورت ہے۔ مگر لوگوں نے یہ ناکافی تدبیریں مقرر کر رکھی ہیں کہ دعا کرلی یا بہت کیا رو لیے یا کسی بزرگ سے توجہ کے طالب ہوگئے۔

امراض روحانی کا صلی علاج قرآن وحدیث میں ہے مگر لوگ تلاش نہیں کرتے:

ان باتوں سے کام نہیں چل سکتا۔ کافی تدبیریں اس کی وہی ہیں جو قرآن اور حدیث میں بتائی گئی ہیں۔ مگر ہم لوگ ان کو بالکل نہیں ڈھونڈتے۔ اور یہ بہت بڑا علم ہے۔ جو عام مسلمانوں سے چھپا ہوا ہے۔ بلکہ بہت سے مولوی بھی کتابوں میں غور نہیں کرتے اس لیے وہ علم ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ جو لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں وہ بھی اس نظر سے نہیں پڑھتے کہ اس سے روحانی بیماریوں کے علاج سمجھیں۔ حالانکہ اس میں بڑے عجیب عجیب علاج ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں بھی ایک سخت مرض کا ایک آسان علاج بتلایا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ لوگوں کو صرف اس وجہ سے قدر نہیں کہ بہت آسان علاج ہے کیونکہ لوگوں کی کچھ عادت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ جو چیز آسان طریقہ سے حاصل ہو اس کی قدر نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ انبہٹہ میں ایک دولتمند شخص کو سخت مرض تھا کہ سودا[1] کا بہت زور ہو گیا تھا۔ مولانا کو بلایا گیا تو مولانا نے اس کے لیے افتیموں بتلائی۔ ان لوگوں نے سستی دوا سمجھ کر ٹال دیا۔ وہاں ایک اندھے حافظ جی رہتے تھے ان سے علاج پوچھا گیا۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ افتیموں ہی بتلاتے ہیں۔ انہوں نے لوگوں سے ذکر کیا۔ لوگوں نے حضرت مولانا سے ذکر کیا۔ مولانا خوش مزاج بہت تھے۔ حافظ جی سے پوچھا' خواب میں کہیں میں تو نہ تھا تو حافظ جی کہتے

[1] سودا انسان کے ایک قوت ہے ۱۲

ہیں جی ہاں آواز تو ایسی ہی تھی۔ غرض جب خواب سے بھی یہی دوا معلوم ہوئی تب کہیں اس کی قدر ہوئی۔ اور پھر اس کا استعمال کیا گیا۔ یہ مثال اس پر یاد آ گئی کہ یہ نسخہ چونکہ نہایت آسان تھا اس لیے اس کی قدر نہیں کی گئی۔ اسی طرح مولانا نے ایک شخص کو جامن کی کوپل بتلائی تھی۔ وہ بڑے آدمی تھے اس لیے کچھ توجہ نہ کی۔ غرض جو علاج آسان ہوتے ہیں ان کی قدر نہیں کی جاتی۔ اس لیے حکیم بعض وقت دوا کی قدر بڑھانے کو چاندی یا سونے کا ورق بڑھا دیتے ہیں تاکہ مریض کو دوا کی قدر ہو جائے۔

جو چیز زیادہ ارزاں ہے زیادہ مفید ہے:

مگر سستے ہونے سے کسی چیز کے نفع کو معمولی سمجھنا خود یہی غلطی ہے۔ کیونکہ اکثر تو یہی ہے کہ جس قدر کوئی چیز زیادہ نفع کی ہے اسی قدر وہ زیادہ سستی ہے جیسے ہوا کہ نفع تو اس کا اس قدر کہ زندگی کا مدار اسی پر ہے اور سستی اتنی کہ بالکل بے قیمت' ہوا کے بعد پانی ہے کہ وہ نفع میں ہوا کے برابر نہیں۔ اسی لیے اتنا سستا بھی نہیں۔ لیکن دوسری تمام چیزوں سے نفع میں بڑھا ہوا ہے۔ اس لیے اور سب چیزوں سے سستا ہے تو اسی طرح سوچتے چلے جایئے۔ معلوم ہوگا کہ جتنی کوئی چیز بے کار ہے اتنی ہی مہنگی ہے۔ یہاں تک کہ سب سے زیادہ مہنگے جواہرات ہیں۔ پھر دیکھ لیجئے کہ ان کا فائدہ سوائے نام نمود کے اور کیا ہے۔ ہزاروں غریبوں نے کبھی موتی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ چنانچہ خود میں نے عمر بھر میں اب تک کل ایک مرتبہ یہ جواہرات دیکھے ہیں وہ بھی اس طرح کہ لکھنؤ میں ایک سوداگر سے درخواست کی تو اس نے دکھلائے۔

غرض جواہرات جو سب سے نکمے ہیں وہ سب سے مہنگے ہیں۔ قربان جایئے خدا تعالیٰ کی شان رحیمی کے۔ کہ عقل تو یہ چاہتی تھی کہ معاملہ یوں ہوتا کہ جتنی زیادہ ضرورت کی چیز ہوتی اتنی ہی مہنگی ہوتی لیکن چونکہ اس میں سخت دشواری ہوتی۔ اس رحمت خداوندی نے معاملہ بالکل پلٹ دیا کہ ضرورت کی چیزوں کو سستا بنا دیا اور بے کار چیزوں کو مہنگا کر دیا۔ بلکہ جو سب سے زیادہ ضرورت کی چیز ہے اس میں طلب کی بھی ضرورت نہیں۔ دیکھو سانس جو کہ ایک ہوا ہے اور ہر وقت ضروری ہے اگر اس کو بھی پانی کی طرح قصد کر کے

لینا پڑتا تو ہر وقت کی مصیبت تھی۔ خاص کر سونے کے وقت تو مر ہی جایا کرتے۔ کیونکہ سوتے میں تو سانس لینے کا قصد ممکن نہ تھا تو خدا تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ اس کو کیسا آسان کر دیا کہ لینے کا قصد کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کا سستا ہونا اس کی بے وقعتی کی دلیل نہیں۔ پس روحانی بیماریوں کا علاج بھی ایسا ہی ہے کہ سب سے زیادہ ضروری اور سب سے بڑھ کر آسان۔ یہ پہلے سے میں نے اس لیے سنا دیا کہ اس جگہ پر مرض کی دشواری اور علاج کی آسانی دیکھ کر اس علاج کی بے قدری نہ ہو۔

علاج کی ترغیب:

اب سنو کہ وہ علاج کیا ہے اور سننے کے بعد اس کو برتو' اور پہلے اس بے وقعتی نہ کرو۔ ہاں اگر برتنے سے بھی مفید ثابت نہ ہو تو اس وقت بے شک بے کار اور غیر مفید...... ہونے کی خبر کر کے ہم سے جواب لو۔

دیکھو! اگر حکیم کوئی علاج بتلائے تو اول اس کو برتا جاتا ہے پھر بعد میں اس کی نسبت مفید یا غیر مفید ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ نسخہ سنتے ہی اس کو ردی کر دیا جائے۔ اسی طرح جو علاج یہاں بتلایا جا رہا ہے' اول اس کو استعمال کرو' اس کے بعد پھر شبہ کرو۔

اب میں وہ مرض اور علاج بتلاتا ہوں اور نعمت کے شکریہ کے طور پر یہ بھی ظاہر کرتا ہوں کہ ان آیتوں سے جو بات اس وقت بیان کرتا ہوں۔ اس سے پہلے یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ تھوڑا ہی زمانہ ہوا کہ یہ علم دیا گیا ہے اور چونکہ علم بے حد مفید تھا اس لیے جی چاہا کہ دوسروں کو بھی اس سے محروم نہ رکھا جائے۔

ایک سخت مرض کا بیان کہ انسان گناہ کو چھوڑنا چاہتا ہے مگر چھوڑ نہیں سکتا:

سو وہ مرض یہ ہے کہ اکثر اوقات انسان گناہ کو چھوڑنا چاہتا ہے لیکن وہ چھوڑ نہیں سکتا۔ دیکھئے دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں کہ گناہ کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔ اور بعض وہ ہیں کہ گناہ کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن وہ پھر ہو جاتا ہے پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور

اس کے بعد پھر قدم پھسل جاتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کی تمام عمر اسی میں گزر جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ان سے نہیں چھوٹتا۔ سواول تو گناہ خود مرض ہے۔ دوسرے اس کا بار بار لوٹنا دوسرا مرض ہے تو یہ حقیقت میں کتنا سخت مرض ہوا۔ پھر اثر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں کلفت بھی بے انتہاء ہے۔ کیونکہ اول تو خود گناہ سے بھی کلفت ہوتی ہے اور جب چھوڑنے کی کوشش کرتا ہے' اس میں ناکامی کی وجہ سے دوسری کوفت ہوتی ہے اور یہ جسمانی تکلیفیں ہیں۔ پھر چونکہ یہ سلسلہ لمبا اتنا ہے کہ عمر بھر نہیں ختم ہوتا۔ اس وجہ سے عمر بھر یہ کلفتیں جمع رہتی ہیں۔

چنانچہ مجھ سے ایک بوڑھے شخص نے اپنی حالت بیان کی کہ میں ایک مرض میں شروع عمر سے گرفتار ہوں اور اس وقت قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں۔ لیکن ابھی تک وہ مرض موجود ہے۔ وہ بے چارے کہتے شرماتے تھے' مگر چونکہ اس کے نقصان کو جانتے تھے۔ اس لیے باوجود شرم کے کہہ رہے تھے۔ کیونکہ حکیم سے کیسا ہی مرض کیوں نہ ہو' چھپایا نہیں جاتا۔ میں حکیم ہونے کا دعوے نہیں کرتا۔ لیکن وہ ایسا ہی سمجھتے تھے اور جب کوئی خیر خواہ جاننے والا مل جائے تو ایسے موقع پر پھر مرض کو چھپانا نہ چاہیے۔ کیونکہ چھپانا یا تو اس لیے ہوتا ہے کہ یہ شخص ہم کو حقیر سمجھے گا۔ اور یا اس لیے ہوتا ہے کہ دوسروں سے کہتا پھرے گا۔ سو ان حضرات پر ان دو باتوں میں سے ایک کا بھی شبہ نہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں سے کہنے میں کچھ اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور گناہ کے ظاہر کرنے سے جو ممانعت آئی ہے وہ اس وقت ہے جب کہ ظاہر کرنا بے باکی سے ہو۔ جیسے بعض لوگ فخریہ کہا کرتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو' بلکہ علاج کے لیے ظاہر کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

غرض اس بزرگ نے اپنا ایک مرض جو کہ بچپن سے اخیر عمر تک تھا' بیان کیا اسی طرح بعض لوگوں کو جھوٹ بولنے کا ایسا مرض ہو جاتا ہے یا نظر بازی[1] کا کہ' کبھی نہیں چھوٹتا۔ بعض وقت تو یاد نہیں رہتا بھولے سے ہو جاتا ہے اور بعض وقت یاد ہوتا ہے۔ لیکن نفس کے تقاضا سے آدمی مغلوب ہو جاتا ہے پھر کر کے شرمند ہوتا ہے اور آئندہ اس سے

[1] لڑکوں یا غیر عورتوں کی طرف نظر کرنا ۱۲۔

بچنے کا قصد کرتا ہے مگر وہ پھر ہو جاتا ہے۔

غرض ہر گناہ جس کی عادت پڑ جاتی ہے اس میں ایسا ہی ہوتا ہے سو عقل کے موافق اس کا علاج بھی سخت ہونا چاہئے تھا۔

اہل عقل نے اس مرض کے بہت سخت علاج لکھے ہیں۔

چنانچہ اہل عقل نے جو اخلاق کی درستی کے طریقے بتلائے ہیں۔ انہوں نے اس کے لیے سخت سے سخت علاج مقرر کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے نفس کی خواہش کو توڑنا اور نفس کے خلاف محنت مجاہدہ کرنا۔ جیسے تکبر اور غرور کا علاج یہ کیا ہے کہ جس کو تکبر ہو اس سے چھوٹوں کی تعظیم کرائی' اور مدت تک ایسے کاموں پر مجبور کیا جن میں نفس کو ذلت ہو۔ تو اصل قاعدہ کے موافق تو یہی علاج ہے کہ مدت دراز تک مجاہدہ[1] کیا جائے۔ اسی قسم کے علاج سے تمام تصوف کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور یہ اس قسم کے علاج ہیں کہ ایک ایک مرض کے علاج کو ایک عمر چاہئے۔ اسی لیے پچھلے بزرگوں نے ان علاجوں کی جگہ دوسرا اس سے آسان علاج اختیار کیا۔ اور وہ خلوت[2] میں رہنا اور ذکر کی کثرت کرنا ہے۔ مگر پھر بھی وہ اتنا آسان نہیں کہ ہر شخص اور ہر کامی آدمی اس کو اختیار کر سکے۔ جیسے ایک تاجر ہے کہ وہ خلوت اور تنہائی میں نہیں رہ سکتا۔ تو ان دونوں طریقوں میں سے اس کے لیے ایک بھی کار آمد نہیں۔ پس اگر اس کے سوا کوئی علاج نہ ہو تو یہ بے چارہ محروم ہی رہا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے کرم کا دسترخوان تو سب کو عام ہے۔

اس سخت مرض کا ایک نہایت آسان اور مجرب علاج:

تو ایسوں کے لیے کون سی تدبیر ہونی چاہیے جو ان کو بھی آسان ہو۔ سو خدا کا شکر ہے کہ اول خدا تعالیٰ نے وہ تدبیر بلا کسی کے واسطہ کے دل میں ڈالی اور پھر اس پر اس قدر اطمینان ہوا کہ اس میں ذرا شک وشبہ باقی نہ رہا۔ جس کے بعد اپنے بہت دوستوں کو بتلایا اور خود بھی اس کو برتا اور آزمایا۔ سو خدا کا شکر ہے کہ بالکل اکسیر نکلا۔ اور کامل یقین ہو گیا

---

[1] مجاہدہ۔ نفس کی خواہش کے خلاف کرنا ۱۲

[2] خلوت۔ لوگوں سے الگ رہنا ۱۲۔

کہ یہ نہایت مفید ہے۔ دوسرا فضل یہ ہوا کہ ابھی تک اس میں جو ایک کمی تھی کہ وہ صرف اپنا تجربہ اور اپنی سمجھ میں آئی ہوئی بات تھی۔ قرآن شریف سے ثابت نہ تھی آج وہ کمی بھی جاتی رہی۔ اور آج ہی قرآن مجید میں اس علاج کا مفید ہونا صاف طور پر مل گیا۔ تو وہ تدبیر وہ ہے جو اس آیت میں بتلائی گئی ہے۔ اب میں اول آیت کا ترجمہ کرتا ہوں۔ اس آیت سے پہلے بعضے گناہ کرنے والوں کی حالت اور ان کی سزا اور عذاب کا بیان ہے۔

آیت کی تفسیر اور اس سے علاج کا ثبوت:

اس کے بعد فرماتے ہیں اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ (الآیۃ) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کا علاج توبہ ہے۔ مگر اس کو سن کر آپ بداعتقاد نہ ہو جائیں کہ یہ تو معمولی بات نکلی۔ کیونکہ ابھی پوری بات تم نے سنی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے تو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں توبہ کرنے والوں کے بارہ میں دو شرطوں کے ساتھ یہ وعدہ فرمایا کہ ان کی برائیاں نیکیوں سے بدل دی جائیں گی۔ پہلی شرط تو ایمان ہے کیونکہ کافر کی توبہ مقبول نہیں۔ اور دوسری شرط نیک عمل ہے مگر یہ دوسری شرط توبہ کے قبول ہونے کے لیے نہیں ہے' کیونکہ سب کا اتفاق ہے کہ خود گناہ کے معاف ہونے میں اس کی ضرورت نہیں کہ دوسرے نیک عمل بھی کرے۔ بلکہ جو گناہ کیا ہو' صرف اس سے توبہ خالص طور پر کر لینا کافی ہے لیکن یہ جو وعدہ ہے کہ برائیاں نیکیوں کے ساتھ بدل دی جائیں گی۔ اس کے لیے اس دوسری شرط کی ضرورت ہے۔ اور تبدیلی کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک تفسیر تو اس کی یہ ہے کہ قیامت کے دن بعض بندوں کے سات یہ معاملہ کیا جائے گا کہ اول ان کے بعضے گناہ ظاہر کیے جائیں گے' جن کو سن کر وہ ڈریں گے کہ اب دوسرے گناہوں کی نوبت آئے گی' مگر اسکے' بعد رحمت سے ان کو کہا جائے گا کہ اچھا ہم نے گناہوں کو معاف کیا اور ان کے برابر نیکیاں تم کو دیں۔ اس وقت وہ بندہ عرض کرے گا کہ یا الٰہی میں نے تو اور بھی گناہ کیے ہیں جن کا یہاں ذکر نہیں آیا۔ تو بعض عالموں نے چونکہ حدیث میں یہ قصہ آیا ہے اس لیے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے کہ آخرت میں گناہوں کے بدلے توبہ کرنے والوں کو نیکیاں دی جائیں گی۔ مگر میں جو علاج بیان کرنا

چاہتا ہوں۔ وہ اس تفسیر سے نہیں لیا جا سکتا۔ بلکہ دوسری تفسیر سے لیا گیا ہے جو میں عرض کرتا ہوں پہلی تفسیر میرے نزدیک کمزور ہے۔ کیونکہ خود اس حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ سب کے ساتھ نہ ہوگا۔ اور اس آیت میں ہر توبہ کرنے والے کے لیے یہ حکم فرمایا گیا ہے پس بہتر تفسیر وہی ہوئی جو میں عرض کرتا ہوں۔ اور وہ بھی بزرگوں سے منقول ہے۔ صرف میری رائے نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی پہلی تفسیر کو بھی اختیار کرے' تو ہمارے مقصود میں کوئی خلل نہیں آتا۔ کیونکہ اس علاج کا مفید ہونا تجربہ سے بھی ثابت ہو چکا۔ اور وہ تفسیر یہ ہے کہ توبہ اور نیک عمل سے گناہ کی عادت کو نیکیوں کی عادت سے بدل دیا جاتا ہے۔

ہر کام کے اندر دو مرتبے ہوتے ہیں:

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر کام کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس کو تکلف سے کیا جائے یا وہ اتفاقیہ طور پر ہو جائے دوسرے یہ کہ اس کی مشق ہو جائے اول کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بچہ اتفاق سے ایک جیم نہایت اچھی لکھ دے تو یہ مہارت نہیں۔ اتفاقیہ بات ہے۔ میرے ایک عزیز نے ایک مرتبہ بے ساختہ[1] ایک شعر لکھ دیا تھا۔ جو کہ نہایت ہی لاجواب تھا۔ لیکن ایک کے بعد دوسرا کتنا ہی سوچا' مگر نہ لکھ سکے۔ وہ شعر یہ تھا نظر جب سے آئی نہیں تیری صورت: عجب قابل دید ہے میری صورت تو یہ شعر اتنا عجیب ہے کہ اس کے ساتھ کا دوسرا شعر ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر چونکہ ان کو شاعری کے اندر مہارت نہ تھی' اس لیے انہیں خود اس کی خبر نہ تھی۔ آخر جب دوسرے شعر سے عاجز ہو کر تنگ ہو گئے تو اپنے استاذ سے جا کر عرض کیا۔ انہوں نے کہا' ظالم! اس میں تیری میری قافیہ ہے۔ دوسرے شعر کے لیے تو یہ قافیہ کہاں سے لائے گا۔ اسی طرح میرے ایک دوست نے اپنے وعظ میں لکھنؤ کے ایک سقے کا مصرعہ سنایا تھا۔

اگر یوں ہی پانی برستا رہے گا

تو اس سقے نے فوراً جو دوسرا مصرعہ کہا: کہ

---

[1] بے سوچے ۱۲ منہ

کہ تو کاہے کو گلیوں میں رستہ رہے گا

یہ سب اتفاقیہ باتیں ہیں یا اسی طرح کبھی کوئی تکلیف کر کے طبیعت پر زور ڈال کر کہہ دے تو وہ ہر دفعہ نہ کہہ سکے۔ یہی حال نیک کاموں کا ہے کہ کبھی تو تکلف سے ادا ہوتے ہیں جیسے بعض کو نماز کی عادت نہیں ہوتی مگر مارے باندھے پڑھ لیتے ہیں۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم ایک مرتبہ تہجد کے وقت مسجد میں تشریف لائے۔ سب پڑے سوتے تھے' آپ نے ان کو ڈانٹا کہ کم بخت! پڑے سوتے ہو تہجد نہیں پڑھتے تو سب کے سب خوف سے اٹھ کر بے وضو ہی پڑھنے لگے۔ لیکن چونکہ عادت نہ تھی۔ بس ایک ہی دن میں ختم بھی کر دی۔ یا جیسے ساڈھورے کے ایک پیرزارے کا واقعہ ہے کہ ان کو ایک مولوی صاحب نے زبردستی نماز میں کھڑا کیا' نیت بندھوائی۔ تو اس پیرزادے نے نیت میں یہ بھی کہا کہ نماز ظہر کی منہ طرف قبلہ کے ظلم ان مولوی صاحب کا۔

واقعی بعض لوگ تو صرف ظلم ہی سے نماز پڑھتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے بعضے کالج ایسے ہی ہیں کہ وہاں کے اکثر طالب علم صرف ظلماً ظلمی نماز پڑھتے ہیں تو یہ عمل تکلف سے تھا۔ اور ایک عمل ہوتا ہے مشق اور مہارت کے بعد' جس سے دل میں خود تقاضہ نیکی کا پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح گناہ سے بچنا بھی' کہ اس میں کبھی تو مہارت ہو جاتی ہے اور کبھی طبیعت کو مجبور کر کے گناہ سے روکا جاتا ہے۔ تو گناہ کرنا بھی دو طرح کا ہوا ایک اتفاقیہ ہو جانا۔ دوسرے عادت پڑ جانا اور اس سے بچنا بھی دو طرح ہوا۔

جو کام بغیر مہارت کے ہوگا اس میں پائیداری نہ ہوگی:

پس جو کام بغیر مہارت اور بغیر عادت کے ہوگا اس میں پائیداری نہ ہوگی۔ اس کی حالت یہ ہوگی کہ آج ہے تو کل نہیں۔ اور جس کام کی عادت اور مہارت پڑ جاتی ہے وہ ہمیشہ رہتا ہے۔ عراقی رحمۃ اللہ علیہ اسی کو آرزو میں کہتے ہیں

صنما رہِ قلندر سزدار بمن نمائی — کہ وراز دور دیدم رہ و رسم پارسائی

یعنی وہ محبت اور عشق کا راستہ دکھا دیجیے جس سے عمل کرنے میں آسانی ہو۔ اور یہ تکلف کی پارسائی کا راستہ تو بہت دور و دراز ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک گاڑی کو تو

مزدور لے جائیں۔ تو وہ زیادہ دور تک نہیں جاسکتی۔ کیونکہ جب مزدور چھوڑ دیں گے کھڑی ہو جائے گی۔ اور ایک کو انجن لے جائے جس میں اسٹیم بھری ہو تو وہ برابر بھک بھک کرتی چلی جائے گی۔ بس یہی فرق ہے تکلف میں اور عادت ہو جانے میں۔

اب سمجھئے کہ ہر شخص میں جس میں ذرا بھی دینداری ہوگی' گناہ کو چھوڑنا چاہے گا۔ مگر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ پھر بھی نہیں چھوٹ سکتا۔ بلکہ نفس میں کشاکشی ہوتی ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ گناہ کی تو مہارت ہے اور اس سے بچنے کی مہارت حاصل نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ بچنا نہایت دشوار ہوگا کیونکہ عادت تو ہے اور بات کی اور کوشش کرتا ہے اس کے خلاف کی۔ تو دشواری آپ ہی ہوگی۔

گناہ کے زائل کرنے کی اصلی تدبیر:

پس اصل تدبیر یہ ہے کہ اول گناہ کی عادت کم کی جائے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ زیادہ کھانے سے گناہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے بلکہ اصل وجہ وہی ہے کہ گناہ کی عادت کو نہیں مٹایا' اس واسطے گناہ ہوتے ہیں تو اس کو دور کرو۔ اور اس کے دور کرنے کے لیے قاعدہ تو اس کو چاہتا ہے کہ ایک عمر چاہیے۔ کیونکہ جتنا پرانا مرض ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ زمانہ اس کے دور ہونے کے لیے چاہیے۔ وہ جلدی نہیں جاسکتا۔

سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک بت پرست کی حکایت:

مشہور ہے کہ جب محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں آئے تو سومنات میں ایک ہندو کو ایک بت کے سامنے مراقبہ[1] کیے بیٹھا ہوا دیکھا۔ ایک سپاہی نے للکار کر اس سے کہا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ ورنہ تلوار سے گردن اڑائے دیتا ہوں۔ اس نے کہا ذرا ٹھہر و کہتا ہوں۔ جب تلوار ہٹالی تو چپ ہو رہا۔ کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ سپاہی نے کہا' تو کئی مرتبہ حیلے کر چکا ہے اب کی بار ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ ورنہ کلمہ پڑھ۔ تب اس ہندو نے کہا' کہ سپاہی چاہو مارو' چاہو چھوڑ و اتنی جلدی تو کلمہ نہیں پڑھ سکتا دیکھو میری عمر نوے برس کی ہے تو نوے برس کا رام تو نکلتے نکلے گا۔ مسلمان تو ہو جاؤں گا مگر مجھے دو چار دن کی مہلت دو۔ دیکھو پرانا

مرض دشواری سے جاتا ہے۔

ایک چور کی حکایت:

ایک اور کایت یاد آئی کہ ایک چور کسی بزرگ کا مرید ہوگیا اور چوری سے توبہ کرلی۔ اور خانقاہ میں رہنا شروع کیا۔ جب طبیعت بہت بے چین ہوتی تو رات کو اٹھتا اور تمام لوگوں کے جوتے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کر دیتا پھر سو جاتا۔ صبح تمام لوگ سخت پریشان ہوتے۔ مگر پتہ نہ چلتا کہ یہ کام کس کا ہے۔ آخر ایک دن لوگوں نے مشورہ کیا کہ آج رات جاگ کر دیکھنا چاہیے کہ یہ کس کے کرتوت ہیں۔ چنانچہ ایسا کیا تو یہ حضرت پکڑے گئے اور ان کو پیر صاحب کے پاس لے گئے۔ پیر صاحب نے پوچھا' بھائی یہ کیا حرکت ہے تو نے تو توبہ کرلی تھی۔ کہنے لگا' جناب میں نے چوری سے توبہ کی ہے ہیرا پھیری سے نہیں کی۔ بات یہ ہے کہ میں چوروں کا سردار ہوں۔ پچاس برس کی بری عادت ہے۔ ہر روز رات کو دل میں چوری کا تقاضا پیدا ہوتا ہے مگر چونکہ آپ سے عہد کیا ہے اس لیے رکتا ہوں۔ جب تقاضا سے مجبور ہوتا ہوں تو نفس کو اس پر راضی کرتا ہوں کہ لوگوں کے جوتے ادھر سے ادھر کردوں یہ بھی ایک قسم کی چوری ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے اگر آپ اس کو چھڑائیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ میں پھر چوری کرنے لگوں گا۔ پیر صاحب نے کہا کہ اچھا تم کو ہیرا پھیری کی اجازت ہے۔ تو جس چیز کی عادت اور مہارت پڑ جاتی ہے وہ ضرور بار بار لوٹتی ہے۔

سالک کو کامل ہونے کے بعد بھی گناہ کی طرف رغبت ہوتی ہے
مع دفع شبہات

اور یہاں پر ایک بڑی کام کی بات بتلائے دیتا ہوں۔ اگر چہ وہ پہلے مضمون سے علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ لیکن بات میں بات آ گئی ہے۔ وہ یہ کہ کبھی صوفی کو خلوت میں رہنے اور بڑے بڑے مجاہدہ کرنے کے بعد بھی گناہوں کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ اور اس میں

[1] مراقبہ کسی چیز کے ساتھ دھیان لگا کر بیٹھنا ۱۲

آ کر صرف مرید ہی نہیں بلکہ پیر بھی پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر و شغل محنت و مجاہدہ سب بے کار گئے۔ ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

سو یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ذکر و شغل مفید ہوا۔ لیکن اس کا نفع یہ نہیں کہ گناہوں کی خواہش بھی نہ رہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس سے پہلے جو تقاضا گناہوں کا ہوتا تھا اس کا دفع کرنا اور مقابلہ کرنا دشوار تھا۔ اب مقابلہ آسان ہے۔ باقی خواہش گناہ کی کبھی کبھی ہو سکتی ہے جیسے گھوڑا سدھارے جانے کے بعد بھی کبھی کبھی سرکشی کرنے لگتا ہے لیکن آسانی ہی سے قابو میں آ جاتا ہے) تو خواہش باقی رہنے سے یہ نہ سمجھئے کہ ذکر و شغل نیا نیا شروع کیا جاتا ہے تو ابتداء کی حالت میں گناہ کی خواہش بالکل نہیں رہتی۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ جب شروع میں یہ حالت ہے تو انتہاء میں ضرور ہونی چاہیے مگر یہ سمجھ کی غلطی ہے اس واسطے کہ صوفی کو اول اول میں بڑا جوش و خروش ہوتا ہے تو ان دنوں میں اس کو گناہ سے سخت نفرت ہو جاتی ہے اور خیال بھی نہیں آتا۔ اس لیے اس وقت ذکر کی لذت کا غلبہ ہوتا ہے اور پھر یہ لذت اخیر تک نہیں رہتی۔ جیسا ہر کام کا قاعدہ ہے کہ شروع میں اس میں لذت ہوتی ہے غلبہ ہوتا ہے' اخیر میں پھر عادت ہو جاتی ہے۔ اور وہ پہلی سی لذت نہیں رہتی۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عجیب ارشاد:

اسی مضمون کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال دے کر فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مرید نے آپ سے شکایت کی کہ جیسی لذت ذکر میں پہلے تھی اب نہیں۔ تو آپ نے جواب میں بطور لطیفہ کے فرمایا کہ میاں پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ تھا کہ لذت کا جوش جو شروع میں ہوتا ہے وہ اخیر میں نہیں رہتا پس بیوی کے متعلق اتنا ہی کام رہ جاتا ہے کہ ماں کی طرح وہ ان کی خدمت کرے۔

ایک بھولے نواب کی حکایت:

ایک بھولے سیدھے نواب صاحب کی حکایت سنی ہے کہ ان کی بیوی مرگئی تھی۔

کلکٹر صاحب ماتم پرسی کے لیے آئے اور کہنے لگے کہ ہم کو افسوس ہوا کہ آپ کی بیوی مرگیا۔ اس پر نواب فرماتے ہیں کہ جناب وہ بیوی ہی نہ تھا۔ ہماری لماں تھا، ہماری خدمت کرتا تھا' ہم کو روٹی پکا کر کھلاتا تھا۔

ابتدائے ذکر میں گناہ کی طرف میلان نہیں رہتا:

اسی طرح شروع میں ذکر کی لذت کا جوش ہوتا ہے۔ اس وقت گناہوں کا تو کیا ذکر سے بیوی بچوں تک کے چھوڑنے کی سوجھتی ہے مگر اس جوش کی مثال صبح کاذب[1] کی سی ہوتی ہے کہ اس میں روشنی تو صبح صادق[2] سے زیادہ ہوتی ہے مگر اس روشنی کی پائیداری نہیں ہوتی۔ اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں کہ تم تو صبح کاذب پر فریفتہ ہو رہے ہو۔ اس کو چھوڑ دو اور کاذب اور صادق کی پہچان پیدا کرو۔ دیکھو ایک پھول وہ ہوتا ہے جو آ کر جھڑ جاتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر اصلی پھول آتا ہے جس پر پھل آتا ہے اسی طرح ایک حالت پائدار ہوتی ہے اور ایک عارضی جو دیر تک نہیں ٹھہرتی۔ تو شروع میں جو حالت ہوتی ہے وہ باقی رہنے والی نہیں ہوتی۔ ہاں جب مدت تک برابر ذکر کرتا رہے گا تو اس کے بعد جو حالت پیدا ہوگی وہ سچی اور پائدار ہوگی۔ اور اس حالت کو مقام کہا جاتا ہے' مگر اس میں جوش وخروش اور ولولہ نہ ہوگا۔ اس کی حالت پکی ہوئی ہانڈی کی سی ہوگی کہ اس میں نہ جوش ہوتا ہے نہ شور ہوتا ہے۔

حضرات کاملین کی شان:

اسی لیے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ کمال تک پہنچ جانے کی کیا علامت ہے تو فرمایا کہ پہلی سی حالت ہو جانا۔ مطلب یہ کہ ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ عام لوگ تو یہ سمجھیں کہ یہ عوام میں داخل ہیں۔ اور خواص واقف کار یہ جانیں کہ یہ خواص میں سے ہیں۔ جیسے نبیوں کی حالت تھی کہ وہ عوام میں ملے جلے رہتے تھے۔ بازاروں سے جا کر ترکاری بھی لے آتے تھے۔ تو انتہاء میں جوش خروش تو جاتا رہتا ہے۔ لیکن ایک

[1] پہلی صبح جس کے بعد پھر اندھیرا ہو جاتا ہے
[2] دوسری صبح جس کے بعد چاند پھیل جاتا ہے ۱۲

دوسری قسم کی لذت نہایت لطیف پیدا ہوتی ہے۔ پہلی حالت کی مثال تو گڑ کی شیرینی کی سی ہے۔ اور دوسری حالت کی مثال قند کی شیرینی کی سی ہے۔ گڑ کی مٹھاس تو ہر عامی شخص کو لذیذ معلوم ہوتی ہے لیکن قند کی مٹھاس چونکہ لطیف ہے۔ اس کی لذت ہر شخص کو نہیں معلوم ہوتی۔ صرف لطیف مزاج والوں ہی کو معلوم ہوتی ہے۔

دیوبند میں شیخ نہال احمد صاحب مرحوم نے اپنے بیٹے کی شادی کی' تو اس میں چماروں کو بھی جو کہ بیگار میں آئے تھے' کھانا دینے کو حکم دیا۔ کھانوں کے ساتھ فرینی بھی تھی۔ جب فیرینی سامنے مئی تو اسے چکھ کر چمار کہتے ہیں کہ یہ تھوک سا کیا ہے۔ تو جیسے اند چماروں نے فرینی کی شیرینی کو نہیں سمجھا' اسی طرح عام لوگ بھی کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ کامل میں جوش خروش نہیں رہتا۔ اور چونکہ یہ جوش خروش اور لذت کا غلبہ ہی گناہ کی رغبت کو روکنے والا تھا۔ اور یہ کامل میں رہتا نہیں۔ اس لیے اس کو کبھی کبھی گناہوں کی طرف رغبت ہو جاتی ہے۔ اور ناواقفی سے اس وقت صوفی کو سخت رنج ہوتا اور دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ میری محنت اور مجاہدہ بالکل بے کار ہوا۔ حالانکہ اس کو رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔

گناہ کی طرف طبعی طور پر رغبت ہونا عیب نہیں:

کیونکہ گناہ کی طرف رغبت ہونا عیب نہیں۔ بلکہ خود گناہ کرنا عیب ہے اور چونکہ گناہ میں بڑا پھنسانے والا اس کا تقاضا ہے اس لیے اس کو بھی مٹایا جاتا ہے۔ اور محنت اور مجاہدہ کے بعد اگرچہ رغبت باقی رہتی ہے لیکن تقاضا باقی نہیں رہتا۔ اور جب تقاضا باقی نہیں رہا تو معلوم ہوا کہ یہ ناکام نہیں رہا۔ بلکہ کامیاب ہے۔ ہاں اگر پھر تقاضہ ہونے لگے تو پھر مجاہدہ[1] کرے۔

خیر! یہ درمیان میں ایک بات یاد آ گئی تھی' اس کو بھی عرض کر دیا۔ مقصود یہ تھا کہ قاعدہ کے موافق تو بڑے مجاہدوں کے بعد عادت کے بدلنے میں کامیابی ہوتی ہے مگر ظاہر ہے کہ کہ ہر شخص مجاہدہ کے لیے آمادہ نہیں ہے۔

[1] مجاہدہ۔ نفس کی خواہش کے خلاف کرنا ۱۲

اس مرض کا علاج توبہ ہے:

تو پھر ایسے لوگوں کے لیے کیا تدبیر ہے۔ ان کے لیے بھی عادت بد۔لنے کی کوئی تدبیر ضرور ہونی چاہئے۔ کیونکہ بدوں اس کے گناہوں سے بچنا سخت دشوار ہے۔ سو خدا کا فضل ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اس آیت سے یہ سمجھ میں آیا کہ توبہ کرنے میں بھی وہی خاصیت ہے جو مجاہدہ میں ہے جس طرح مجاہدہ سے گناہ کی عادت اور اس کا تقاضہ بدل جاتا ہے اسی کا کام دینے والی یہ ایک بے مشقت بوٹی ہے یعنی توبہ جس کے لیے کہیں جانا بھی نہیں پڑتا۔ اس آسان نسخہ کی نسبت خدا کا شکر ہے کہ امتحان سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس میں وہی اثر ہے جو مجاہدہ میں ہے۔ اور مجھے افسوس ہوتا ہے۔ جب دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ علاج نہیں آتا۔

صاحبو! امتحان تو کرو۔ اگر کام نہ دے تو اس وقت اعتراض کرنا۔ میں نے تو خدا کا شکر کیا ہے اپنے دوستوں پر اس کا امتحان کر کے آپ صاحبو کے سامنے پیش کیا ہے اور امتحان اس طرح کیا گیا کہ خاص دوستوں کو یہ کہا گیا کہ جب گناہ ہو جایا کرے توبہ کر لیا کرو۔ اگر پھر ہو جائے پھر توبہ کرلو۔ پھر ہو جائے پھر توبہ کرلو۔

غرض ہر گناہ پر توبہ کرنا لازم کرلو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ آئے گا کہ گناہ کا مادہ بالکل نکل جائے گا۔ دیکھئے اس میں نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری۔ اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ بار بار جو توبہ کرنے کا حکم ہے اس میں یہ بھی ایک مصلحت ہے افسوس ہے کہ بعض لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کو قرآن شریف نے یہ ایک کھیل ہم کو بتلایا ہے۔

صاحبو! اس علاج کا اثر یہ ہے کہ وہ گناہ ساری عمر چلے ہی گا نہیں۔ کیونکہ ہرگز ممکن نہیں کہ آدمی بار بار توبہ کرے اور پھر گناہ چلتا رہے۔ بار بار توبہ کی نسبت فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا۔

یعنی جو لوگ کہ کوئی بڑا بے حیائی کا کام کرتے ہیں یا معمولی ظالم اپنے نفسوں پر کرتے ہیں تو یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ (کے عذاب) کو پس بخشش چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ سے (کیونکہ جانتے ہیں کہ) نہیں بخشا گناہوں کو مگر اللہ اور وہ گناہ پر اڑے نہیں رہتے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

مَآ اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً۔

"یعنی جس نے ہر گناہ کے بعد توبہ کرلی وہ گناہ پر نہیں اڑا رہا۔ خواہ اس نے ایک دن میں ستر بار گناہ کیا ہو۔

صاحبو! کیا یہ بھی کوئی مشکل بات ہے کہ جب گناہ ہو گیا توبہ بھی کرلی۔ دیکھو جب گناہ کرتے ہو تو کس وجہ سے کرتے ہو کہ پیر بھی ہلاتے ہو ہاتھ بھی ہلاتے ہو۔ ارادہ بھی کرتے ہو۔ اگر توبہ میں بھی ذرا زبان اور دل کو حرکت دے لیا کرو۔ تو کیا دشوار ہے اصل یہ ہے کہ جب شیطان نے دیکھا کہ یہ تو بڑا چلتا ہوا نسخہ ہے اور سب ہی اس کا استعمال کر لیں گے اور میری ساری کوشش جو گناہ کرانے میں ہوئی تھی مٹ جائے گی۔ تو اس نے ہم کو اس طرح سے گمراہ کیا کہ اس علاج کی وقعت ہی دلوں سے نکال دی اور یہ سمجھا دیا کہ جب پھر گناہ ہو جائے گا تو توبہ سے کیا فائدہ۔ چنانچہ عام طور سے سب اسی دھوکہ میں گرفتار ہیں کہ توبہ اس وقت کرتے ہیں جب کہ بالکل ہی اس کے چھوٹنے کا یقین کر لیتے ہیں۔ اور جب تک یہ اندیشہ رہے کہ پھر ہو جائے گا۔ توبہ ہی نہ کریں گے۔

صاحبو! توبہ ہر حالت میں کرنا ضروری اور مفید ہے۔ کیا خوب کہا ہے:۔

ایں درگاہ ما درگہ نومیدی نیست: صد بار اگر توبہ شکستی باز آ۔

یعنی ہماری بارگاہ نا امیدی کی نہیں ہے۔ اگر سو بار بھی توبہ ٹوٹ چکی ہو تب بھی لوٹ آؤ' مایوس نہ ہو...... علاوہ اس کے میں کہتا ہوں کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ جس صورت میں آئندہ گناہ پھر ہو جانے کا اندیشہ ہو تو توبہ مفید نہ ہوگی۔ جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے تب بھی توبہ کر لینے میں کوئی حرج بھی تو نہیں۔ اور اس سے نقصان بھی تو نہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ اگر ایک شخص دن میں پانچ مرتبہ شراب پیتا ہے اور ہر دفعہ توبہ کرے تو

اس کا نقصان کیا ہوا۔

غرض آخری بات یہ ہے کہ اگر آپ کے خیال کے موافق اس میں کوئی نفع نہیں تو کوئی نقصان بھی تو نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ایسی اکسیر کی پڑیا' مگر شیطان برتنے نہیں دیتا۔ صاحب! یہ عمل پانچ دس مرتبہ کر کے دیکھو۔ خدا کی قسم ضرور گناہ چھوٹ جائیں گے۔ میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ جس گناہ کو کوئی شخص چھوڑنا چاہے اس کے لیے یہ کافی تدبیر ہے کہ جب وہ ہو جایا کرے' فوراً ہی اس سے توبہ کر لیا کرے۔ کیا کسی نے کبھی ایسا آسان علاج سنا ہے۔ یہ ہیں قرآن مجید کے علم جو حضور ﷺ کی امت کو دیئے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہر گناہ کے بعد ضرور توبہ کر لیا کرے۔ اس سے ان کی بری عادتیں نیک عادتوں سے بدل جائیں گی۔ اسی کو فرماتے ہیں:۔

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ کہ ان لوگوں کی برائیاں اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دیں گے۔ یعنی گناہ کے تقاضا کی جگہ نیکیوں کا تقاضہ پیدا کر دیں گے۔ یہ وعدہ ہے جو قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ اور اگرچہ یہ وعدہ ان آیت سے صرف ایک تفسیر پر نکلتا ہے۔ اور اس وجہ سے یقین نہیں ہے۔ لیکن یہ تفسیر دوسری تفسیر سے بہتر ہے۔ اور دوسری تفسیر اس کے مقابلہ میں ناقص ہوئی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

اب بتلائیے اس علاج میں کیا دشواری ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں یہ مرض عام ہے کہ وہ گناہ کے چھوڑنے کو سخت دشوار سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں نے اس کا یہ علاج بتلا دیا کہ بار بار توبہ کر لیا کرو۔

توبہ کا طریقہ:

مگر توبہ بھی اسی طرح کی ہو جس طرح سے ذات پاک نے ہم کو بتلائی ہے۔ اور اس کی تعلیم ہم کو رسول مقبول ﷺ کے واسطے سے پہنچی ہے۔ اور وہ طریقہ موافق حدیث کے یہ ہے کہ اول وضو کرو۔ اور دو رکعت نماز پڑھو اور خوب دل لگا کر دعا مانگو۔ اور دل لگانے کا ارادہ کرو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ دل بھی لگنے لگے گا۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد کی حکایت:

باقی یہ سوال کہ اگر دل نہ لگے تو کیا کریں اس کے جواب میں یہ کہوں گا۔ یہ اگر ایسا ہے جیسا کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد کا تھا کہ ایک مرتبہ امام صاحب مسئلے بیان کر رہے تھے اور شاگردوں کی سمجھ میں جو بات نہ آتی تھی' وہ اس کو درمیان میں پوچھتے جاتے تھے۔ مگر ایک شاگرد بالکل خاموش بیٹھا تھا وہ کچھ نہ پوچھتا تھا امام صاحب نے اس سے کہا کہ تم کچھ نہیں پوچھتے۔ کہنے لگے۔ اب پوچھوں گا۔ امام صاحب نے اتفاق سے اس کے بعد یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ جب سورج چھپ جائے تو روزے کے افطار میں دیر نہ کرے۔ آپ سن کر فرماتے کیا ہیں کہ کیوں حضرت اگر کسی دن سورج نہ چھپے تو کیا کرے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا' ہاں بھائی۔ تمہارا چپ رہنا ہی اچھا ہے (میری غلطی تھی کہ تم سے بولنے کو کہا۔)

اسی طرح ایک حساس بہو کی حکایت مشہور ہے کہ بہو بالکل ہی نہیں بولتی تھی۔ ساس نے کہا کہ بہو بولا کرو ورنہ لوگ گونگا کہیں گے۔ آخر کہنے سننے سے بولی تو یہ کہ اماں تمہارا لڑکا مرگیا تو میرا دوسرا بیاہ بھی کرا دو گی۔ اس نے کہا بس بی بی! ایسی کا تو چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ غرض کہ جیسا کہ امام صاحب کے شاگرد کا اگر تھا۔ وہی اگر آپ کا بھی ہے۔

صاحبو! پہلے عمل کر کے دیکھو۔ پھر دیکھنا دل لگتا ہے یا نہیں۔ ممکن نہیں کہ ایک شخص خدا تعالیٰ کے سامنے دیر تک متوجہ ہو کہ بیٹھے اور دل نہ لگے انشاء اللہ تعالیٰ ضرور دل لگے گا اور جب دل لگنے لگے تو توبہ اور استغفار کرو۔ اور فارغ ہو جاؤ۔ اور اگر وہ گناہ پھر ہو جائے پھر ایسا ہی کرو۔ اس کے بعد دیکھو کہ وہ گناہ کیسا رفو چکر ہوتا ہے۔

صاحبو! غضب ہے کہ اگر ایک نسخہ کوئی بڑا بھاری حکیم بتلائے تو یقین کر لو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے نسخہ پر یقین نہ کرو تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد توبہ! توبہ! حکیم کی رائے سے بھی کم ہے۔ غرض کہ اس میں ہرگز شک نہ کرو اور نہیں تو آزمانے ہی کے لیے چند روز تک کر دیکھو۔

اس علاج کے مفید ہونے کا راز:

اب رہی یہ بات کہ اس علاج کی یہ تاثیر کس واسطے ہے اور اس سے یہ مرض کیوں جاتا رہتا ہے۔ آخر اس کا راز کیا ہے۔ سو اول تو راز اور حکمت کے جاننے کا ہم نے دعویٰ کب کیا ہے۔ دوسرے اگر ہم جانتے بھی ہوں تو کیوں بتلائیں کیونکہ مریض کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں کہ گل نبفشہ کی یہ تاثیر کیوں ہے۔

دوسری مثال لیجئے کہ اگر کوئی بادشاہ کسی کو کچھ روپیہ عنایت فرمائے اور وہ سوال کرے کہ یہ بتلایئے یہ روپیہ ٹکسال میں کس طرح بنتا ہے تو اس کو گستاخ اور بے ادب سمجھا جائے گا۔ لیکن ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی میں آپ کو اس کا راز بتلائے دیتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ نفس کو عبادت کا کرنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ اور تو بہ خاص کر نفلوں کے ساتھ۔ یہ ایک بھاری عبادت ہے۔ پس جب کوئی شخص اس کی پابندی کرلے گا کہ جب گناہ ہو جایا کرے ہر دفعہ توبہ بھی کرلیا کرے اور اس کے لیے وضو کیا کرے اور نفلیں پڑھا کرے تو نفس اس سے سخت پریشان ہوگا اور آسانی سے اس پر صلح کرلے گا کہ میں گناہ نہ کروں گا۔ اس کی بالکل ایسی حالت ہے جیسے شریر لڑکا جو کسی طرح نہ مانتا ہو۔ لیکن جب اس کے لیے میاں جی یہ سزا مقرر کردیں کہ اس کے گلے میں اتنا بھاری پتھر ڈالو کہ اس سے اٹھ ہی نہ سکے۔ تو وہ فوراً سیدھا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نفس بھی عبادت کو چونکہ بوجھ سمجھتا ہے۔ اس لیے اس بوجھ کے رکھتے ہی گناہ سے باز آجاتا ہے۔ اور اس کو عبادت سے یہاں تک گرانی ہوتی ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت:

کہ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے بیان کیا کہ میں کسی جگہ پر روپیہ دفن کر کے بھول گیا ہوں۔ ہر چند یاد کرتا ہوں۔ کسی طرح یاد ہی نہیں آتا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ تم جا کر نفلیں پڑھنا شروع کرو۔ اور جب تک روپیہ یاد نہ

آئے برابر نفلیں پڑھتے رہو۔ اس ترکیب سے انشاء اللہ بہت جلد یاد آ جائے گا۔ چنانچہ اس نے جا کر نفلیں شروع کیں۔ چند ہی نفلیں پڑھی تھیں کہ بہت جلد روپیہ کی جگہ یاد آ گئی۔

بات یہ تھی کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عقل سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ شیطان نے اس کو پریشان کرنے کے لیے روپے کی جگہ بھلا دی ہے جب یہ نفلیں پڑھے گا تو شیطان کو اس کا نفلیں پڑھنا کسی طرح گوارا نہ ہوگا۔ پس نفلوں سے...... روکنے کے لیے فوراً اس جگہ کو یاد دلا دے گا۔ مگر یہ معلوم کر لینا بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا کام تھا کہ شیطان نے بھلایا ہے۔ ورنہ یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر بھول شیطان ہی کی طرف سے ہو کبھی حافظہ کی خرابی سے بھی ہوتی ہے۔ غرض کہ نفس اور شیطان عبادت سے بہت گھبراتے ہیں۔

دوسری مثال اس کی ایسی ہے جیسے بچے کے دودھ چھڑانے کے وقت اکثر چھاتیوں کو ایلوا لگا دیتے ہیں۔ پس وہ دودھ ہی کو چھوڑ دیتا ہے اسی طرح چونکہ عبادت بھی نفس کو سخت ناگوار ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی ناگواری کے اندیشہ سے وہ اپنی شوق کی چیز یعنی گناہ ہی کو چھوڑ دیتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب:

لیکن اس میں اتنا شبہ رہا کہ جب یہ سبب ہے تو نفس کو تو ہر نیک کام میں گرانی اور ناگواری ہوتی ہے۔ تو پھر توبہ ہی کی کیا خصوصیت رہی۔ دوسرے نیک کاموں کا بھی یہی اثر ہونا چاہیے۔

جواب یہ ہے کہ اول تو اوپر آ چکا ہے کہ بری عادت کے بدلے جانے میں توبہ کے ہمراہ دوسرے نیک کاموں کی بھی شرط ہے۔ دوسرے توبہ میں یہ ضرور کہنا پڑھتا ہے کہ میرا قصور معاف کر دیجئے۔ آئندہ ایسا ہرگز نہ کروں گا۔ اور یہ طبعی بات ہے کہ جب کوئی اپنے بڑے سے بار بار معافی چاہے اور آئندہ اطاعت اور تابعداری کا عہد کرے تو پھر اس کے خلاف کرتے ہوئے شرماتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ توبہ صرف زبان ہی سے نہ ہو بلکہ دل سے ہو۔ کیونکہ اسی سے عہد کی یاد پختہ ہوتی ہے۔ اور جب اپنا عہد ہر وقت یاد رہے گا تو طبعی بات عہد کے یاد پختہ ہوتی ہے۔ اور جب اپنا عہد ہر وقت یاد رہے گا تو طبعی بات ہے کہ

اس کے خلاف کرتے ہوئے شرم آئے گی۔ تیسری وجہ ایک اور ہے جو کہ قرآن شریف سے سمجھ میں آئی۔ اور وہ یہ کہ اگلی آیت میں فرماتے ہیں وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا○ ترجمہ: یہ ہے کہ جو توبہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ) نیک عمل (بھی) کرتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اب اس آیت کے ساتھ اس حدیث کو ملایئے۔ مَنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا (الی آخرہ) یعنی خدا تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ جو شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے' خدا تعالیٰ اس سے زیادہ اس شخص کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ اور ان کی توجہ سے وہ فاصلہ جو عاجز بندہ اور عرش کے مالک میں تھا جس کی وجہ سے بندہ کو اس تک پہنچنا مصیبت تھا وہ جاتا رہتا ہے۔ اور یہ فاصلہ اگرچہ خدا تعالیٰ کی توجہ سے دور ہوتا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کو توجہ کی شرط یہ ہے کہ بندہ متوجہ ہو۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بچہ ہے کمزور' اور وہ باپ سے دور کھڑا ہے۔ اب اگر وہ باپ تک پہنچنا چاہے تو بدو اس کے ممکن نہیں کہ خود باپ آگے بڑھ کر اس کو اٹھالے کیونکہ درمیان کے راستہ کو وہ بچہ طے نہیں کر سکتا۔ لیکن بعض وقت باپ کی توجہ کی یہ شرط ہوتی ہے کہ بچہ ہاتھ پھیلا کر آنے کی کوشش کرے تو اسی طرح بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ بندہ کے طے کرنے سے طے نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ راستہ جب طے ہوگا۔ خدا تعالیٰ ہی کی عنایت سے طے ہوگا۔ مگر اس کے لیے شرط ہے کہ بندہ کی طرف سے توجہ ہو۔ جیسا کہ اس حدیث میں فرمایا گیا پس اس طرح خدا تعالیٰ اس کو رحمت کی گود میں لے لیتے ہیں۔ غرض پہلی بات تو آیت سے ثابت ہوئی کہ جو توبہ کرے گا وہ خدا کی طرف متوجہ ہوگا۔ اور دوسری بات حدیث سے ثابت ہوئی کہ خدا تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو توبہ کرے گا خدا تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ اب سمجھ لیجئے کہ جس کی طرف خدا تعالیٰ متوجہ ہوگا' شیطان اس کو کس طرح زک[1] پہنچا سکے گا۔ چنانچہ شیطان کو خود اقرار ہے کہ ایسے لوگوں پر میرا بس کچھ نہیں چلتا لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ یعنی سب اولاد آدم کو گمراہ بنادوں گا۔ سوائے آپ کے خالص بندوں کے (کہ وہ میرے

[1] نقصان۔ تکلیف ۱۲ منہ

جال میں نہ آئیں گے) تو جب شیطان سے یہ محفوظ ہو جائیں گے تو ظاہر بات ہے کہ گناہ سے بھی آئندہ کو اندیشہ نہ رہے گا۔ اور گناہ سے اندیشہ نہ رہنا جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ گناہ کی عادت کو نیکیوں کی عادت سے بدل دل جائے۔ پس توبہ اور نیک عمل پر اس طرح یہ تبدیلی ثابت ہوگئی۔ اور یہی معنی ہیں اس آیت کے کہ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ترجمہ لیکن جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے تو اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں (کی عادت) کو نیکیوں کی عادت سے بدل دے گا۔ اب اس مسئلہ میں کوئی شک اور شبہ نہیں رہا۔ ہر طرح اچھی طرح ثابت ہو گیا۔

علاج کا خلاصہ:

اب میں دوبارہ اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں تا کہ یاد رہنا آسان ہو۔ اور اسی پر بیان کو ختم کردوں گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص محنت مجاہدہ نہ کر سکے۔ اس کے لیے بھی خدا تعالیٰ نے گناہ کے چھوڑنے کا علاج بیان فرمایا ہے جو نہایت آسان ہے۔ یعنی جو گناہ چھوڑنا چاہتا ہو اور محنت اور مجاہدہ پر قدرت نہ رکھتا ہو وہ یہ کرے کہ جب گناہ ہو جایا کرے فوراً توبہ کرلیا کرے۔ اور اگر دوبارہ ہو جائے پھر توبہ کرے۔ یہ ہے وہ علاج' اور اگر اس آسانی پر بھی کوئی اس کو اختیار نہ کرے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی قسمت میں ہی محرومی ہے وہ اپنی اصلاح ہی نہیں چاہتا تو اس کے لیے یہ کہا جائے گا کہ

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

وعظ کا خاتمہ:

اب حق تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہم کو سمجھ عنایت فرمائے (آمین)

تمت

(۴۹) خوش تدبیری

منتخب از احسان التدبیر دعوات عبدیت جلد پنجم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خطبہ ماثورہ:

اَمَّا بَعْد: فرمایا اللہ تعالیٰ نے

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَO

''ترجمہ: اور داخل ہو گھروں میں ان کے دروازوں سے۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے امید ہے کہ تم کامیاب رہو گے۔''

بیان ضرورت وعظ:

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں دو باتوں کا ذکر ہے جن کو آگے انشاء اللہ بیان کیا جائے گا۔ اس سے پہلے یہ بتلا دینا مناسب ہے کہ یہ آیت اتری تو ہے ایک خاص معاملہ میں مگر مقصود اس سے ایک عام مضمون کا بتلانا ہے اور اسی عام مضمون میں یہ مضمون بھی داخل ہے جس کو اس وقت میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اگر چہ اس وقت قصد ایک دوسرے مضمون کے بیان کا تھا۔ لیکن چونکہ اس وقت یہ مضمون زیادہ ضروری معلوم ہوا اس لیے اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ آج کل ہمارے گردونواح میں بارش کا کہیں پتہ نہیں اور لوگوں کو قحط کا اندیشہ ہے۔ بلکہ لوگوں کو اسی وقت سے بارش نہ ہونے کے سبب تکلیف شروع ہوگئی ہے۔ خاص کر ان لوگوں کو جن کے پاس نہ غلہ ہے نہ اس قدر زیادہ روپیہ ہے کہ وہ اس سے اپنی ضرورت پوری کر سکیں۔ البتہ جن لوگوں کے گھر میں غلہ

بھرا پڑا ہے یا جو لوگ روپیہ والے ہیں۔

امیروں کی سنگدلی اور بے رحمی کی شکایت:

وہ البتہ اس تکلیف سے بچے ہوئے ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے اور ان کو کسی قسم کی قسم کی فکر بھی نہیں۔ کیونکہ قحط کے آثار اور تکلیفوں سے بچنے کا سامان ان کے پاس موجود ہے نہ اپنی فکر ہے۔ اور یہ بھی شکایت کا محل نہیں اور نہ پرائی۔ اور یہ شکایت کا محل ہے کیونکہ یہ خاصیت جانور کی ہے کہ دوسروں کی اس کو کچھ فکر ہی نہیں ہوتی۔ دیکھ لیجئے کہ طوفان میں ہر جاندار کو اپنے یا دوسروں کے ڈوبنے کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن بط کو ذرا بھی اس کی فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ پانی کتنا ہی اونچا ہو جائے میں بہر صورت اس سے اونچی رہوں گی۔ اسی طرح نادار لوگوں کی حالت کا امیروں کو کچھ بھی خیال نہیں۔ ان کی بلاء سے نادار لوگ بچیں یا مریں۔ ان کے پاس تو غلہ بھرا پڑا ہے۔ وہ بے فکر ہیں اس لیے کہ ہم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی، گھر میں سے نکال لیں گے اور کھالیں گے۔ اور یہی وہ لوگ ہی کہ جن کی سنگدلی بہت بڑھ جاتی ہے اور دوسروں پر رحم کرنے کا پتہ بھی ان میں نہیں رہتا۔

ہمدردی اور محبت کی تعلیم وترغیب:

لیکن ہے یہ بہت بڑی غلطی اور انسانیت کے خلاف حدیث شریف میں آیا ہے کہ اولاد آدم ایک دوسروں کے لیے اعضاء کے مانند ہیں۔ یعنی جو حالت ایک انسان کے اعضاء کی ہوتی ہے کہ اگر پیر میں درد ہو تو سر میں بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ آنکھیں بھی تکلیف میں شریک ہوتی ہیں۔ اسی طرح تمام اولاد آدم کا حال بھی ہونا چاہیے۔ خاص کر مسلمانوں کا کہ ان کو ایک دوسرے کی ضرور مدد کرنی چاہیے۔ اور ہر شخص کو دوسرے کے غم سے غمگین ہونا چاہیے اور اس کے دور کرنے کی تدبیروں میں لگنا چاہیے۔ جس قسم کی تدبیر بھی ممکن ہو۔ کیونکہ تدبیریں مختلف ہوتی ہیں۔ کسی کام کی تدبیر یہ ہے کہ اس کے لیے دعا کی جائے۔ کسی کی تدبیر یہ ہے کہ ظاہری سبب اور ذریعہ کو اختیار کیا جائے۔ ایک کو دوسرے سے غافل ہرگز نہ رہنا چاہیے۔ یہ ہے انسانیت جس کو حضور ﷺ نے بیان فرمایا

ہے۔ شریعت نے باہمی ہمدردی کی یہاں تک رعایت کی ہے اور اس کی تعلیم دی ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہوتا ہے۔ جب گوشت پکایا کرو تو اس میں شوربا زیادہ کرلیا کرو۔ اور اس کے بعد اس کا سبب بیان فرماتے ہیں وتعاهد واجیر انکم اور خیال رکھا کرو اپنے پڑوسیوں کا۔ اللہ اکبر! شریعت نے کس قدر رعائتیں کی ہیں اور کیسی پاکیزہ تعلیم دی ہے۔

شوربا زیادہ کرنے کی حدیث میں ایک عجیب فائدہ:

اس حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہمدردی کی تعلیم کے ساتھ ایک دوسری بہت باریک بات کی کس قدر رعایت فرمائی ہے۔ یعنی اس حکم کے ساتھ کہ شوربا زیادہ کر لیا۔ اور خود ہی سب بھون کر مت کھا جایا کرو۔ ایک ایسی حکمت کی رعایت کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے سوا دوسرے کے کلام میں اتنی باریک رعایت ممکن نہیں۔ اور ایسی رعایتیں نبی کے کلام میں اس لیے ہوا کرتی ہیں کہ ان حضرات کو خدا تعالیٰ خود بغیر واسطہ کے علم و ادب سکھلاتے ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَاَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبِیْ (ترجمہ) علم سکھلایا مجھ کو میرے رب نے پس عمدہ تعلیم دی اور ادب سکھلایا مجھ کو میرے رب نے پس ادب اچھا سکھلایا۔ اور وہ حکمت یہ ہے کہ انسان کی ایک طبعی خواہش کی رعایت فرمائی ہے وہ یہ کہ انسان خواہ کتنا ہی ہمدرد ہو اور خیر خواہی کی صفت اس میں کتنی ہی غالب کیوں نہ ہو۔

آدمی ہر امر میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرتا:

لیکن اس میں یہ پیدائشی خصلت بھی ضرور ہوتی ہے کہ وہ ہر امر میں دوسرے کو اپنے برابر نہیں رکھ سکتا۔ اور اپنے خاص ذاتی فائدوں میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ اور یہی اس کی اصل پیدائش کی خاصیت ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی اس کی اجازت دی گئی ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ غالباً ہر آسمانی شریعت میں اس کی اجازت ہوگی۔ سو قرآن مجید میں ارشاد ہے هَلْ لَّكُمْ مِّمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْمَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ترجمہ: کیا تمہارے غلاموں میں کوئی شخص تمہارا اس مال میں جو ہم نے تم کو دیا

ہے۔ شریک ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر ہوں۔ خدا تعالیٰ اس آیت میں اپنے شریک اور ساجھی کی نفی بیان فرما رہے ہیں۔ اور اس کی فصاحت کے لیے ایک مثال دیتے ہیں کہ تم لوگ خدا کی ملک کو خدا کی برابر کیسے قرار دیتے ہو۔ حالانکہ اگر تمہارا کوئی غلام ہو جس کے تم مالک ہو تو کیا تم اس کو اپنے برابر سمجھ لو گے۔ یعنی دنیا کی لذتوں اور فائدوں کے حاصل کرنے میں تم ان کو اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ اس مثال کو ذکر کر کے اس کو رد نہ فرمانا۔ بلکہ اپنے دعوے شریک کی نفی پر اس سے دلیل قائم کرنا۔ آقا اور غلام میں برابری نہ ہونے کی اجازت صاف طور سے ثابت ہوتی ہے اور یہ برابری شریعت میں واجب بھی نہیں ہے۔ اور حکمت اس کے واجب نہ ہونے کی یہ ہے کہ اس پر بہت کم آدمی عمل کر سکتے۔

اسی طرح اس حدیث سے بھی اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر غلام سے اچھا کھانا پکواؤ تو بہتر تو یہ ہے کہ اس کو اپنے ساتھ کھلاؤ۔ لیکن اگر ایسا نہ کر سکو تو کم سے کم اتنا تو ضرور کرو۔ کہ ایک لقمہ بنا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دو۔ اس حدیث میں علاوہ ہمدردی کی تعلیم کے ایک بڑی حکمت انتظام کی بھی فرمائی ہے کہ اس پر برتاؤ سے چوری کی بندش بالکل ہو جائے گی۔ کیونکہ جب غلام یہ سمجھے گا کہ آقا خود مجھے دیدے گا تو چوری نہ کرے گا۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی جس تعلیم کو دیکھئے اس میں بڑی بڑی باریک حکمتوں کی رعایت ہے اگر چہ اس وقت وہ حکمتیں حضور ﷺ کو مقصود نہ ہوں۔ جیسے اس مقام پر بھی گو چوری کی بندش کی غرض سے ایسا نہ فرمایا ہو۔ اور محض ہمدردی کے لیے ایسا فرمایا ہو۔ لیکن تعلیم اتنی پاکیزہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے چوری کی بھی بندش ہو جائے گی۔ غرض اس حدیث میں ہمدردی کی بھی رعایت ہے اور انسان کی طبعی خواہش کی بھی رعایت ہے کہ بہتر تو ساتھ کھلانے کو فرمایا (جس میں غایت درجہ کی ہمدردی ہے اور ساتھ ہی اس کی اجازت دے دی کہ الگ سے تھوڑا سا کھانا دے دو۔ کیونکہ نفس میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ جب کماتا ہوں تو دوسرا اس میں برابر کیوں شریک ہوا۔ اسی طرح قرآن شریف میں اَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ فرمایا یعنی کیا تم غلاموں کو اپنے برابر بنا لو گے۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ آپس میں برابر نہیں ہو سکتی۔

اوپر کے مضمون پر ایک شبہ اور اس کا جواب:

اگر کسی کو شبہ ہو۔ کہ ایک حدیث میں آیا ہے اَلْبِسُوْهُمْ مِمَّا تَلْبِسُوْنَO وَاَطْعِمُوْهُمْ مِمَّا تُطْعِمُوْنَ۔ (ترجمہ) غلاموں کو ایسے کپڑے پہناؤ جیسے تم پہنتے ہو۔ اور ایسا کھانا کھلاؤ جیسا تم کھاتے ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں کو اپنے برابر رکھنا چاہیے تو جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ اس حدیث سے برابری کا ضروری ہونا سب لوگوں کے حق میں ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک خاص واقعہ حضور ﷺ نے ایسا فرمایا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ جو کہ اعلیٰ درجہ کے صوفی مشرب صحابی ہیں۔ اور ان کی شان دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے دنیا کے مال و دولت میں بالکل جدا ہے۔ ایک مرتبہ یہ ایک غلام سے لڑ رہے تھے۔ اسی اثناء میں انہوں نے اس کے نسب پر طعن کیا۔ اس نے حضور ﷺ سے جا کر شکایت کر دی۔ حضور ﷺ نے ان کو بلایا اور خفا ہو کر یہ فرمایا۔ کہ اِنَّكَ اِمْرَءٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ (ترجمہ) بے شک تم میں جاہلیت کا اثر ہے۔ (کیونکہ نسب طعن کرنا زمانہ جاہلیت[1] کے لوگوں کا شیوہ تھا' اور فرمایا: کہ خدا تعالیٰ نے ان غلاموں کو تمہارے قبضہ میں کر دیا ہے (اس کو قدرت ہے کہ تم کو ان کے قبضہ میں کر دے۔ اس لیے) ان کو حقیر نہ سمجھو۔ بلکہ جو خود کھاؤ' وہ ان کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ۔ تو اس واقعہ میں ممکن ہے کہ حضور ﷺ نے خاص ان کے لیے اصلاح کی غرض سے ایسا فرمایا ہو۔ اس پر حضرت ابودر غفاری رضی اللہ عنہ نے بھی یہاں تک عمل کیا کہ ایک مرتبہ ان کے پاس دو چادرے تھے جن کے مجموعے کو عربی میں حلہ کہتے ہیں۔ انہوں نے ایک تو خود پہنا اور ایک اپنے غلام کو دے دیا۔

ایک شخص نے ان کو ایک چادرے میں دیکھا تو کہا اے ابوذر رضی اللہ عنہ! یہ چادرے دونوں تم رکھتے تو پورا حلہ ہو جاتا اور اچھا معلوم ہوتا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ تو تم سچ کہتے ہو۔ لیکن حضور ﷺ نے ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ۔ اس روز سے میں اپنے اور غلام کے کھانے اور کپڑے میں کچھ فرق

[1] حضور ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے زمانہ کے زمانہ جاہلیت کہتے ہیں ۱۲۔

نہیں کرتا۔ یہ جواب کی تقریر تو اس وقت ہے کہ حدیث کے حکم کو ان کے لیے خاص مان لیا جائے۔ اور اگر ان کے ساتھ خاص نہ مانا جائے۔ بلکہ سب کے لیے یہ حکم عام مانا جائے اور ظاہر بھی یہی ہے تو جب بھی اس سے یہ حکم ضروری ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کا برتاؤ کرنا بہتر ہے اور دلیل اس کی وہی پہلی حدیث ہے کہ کم سے کم ایک لقمہ ہی دے دیا کرو۔ ورنہ دونوں حدیثوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ غرض کہ میری تقریر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپس میں فرق کرنا تو جائز ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ بالکل ہی رحم نہ کیا جائے اور خبر ہی نہ لی جائے۔

شوربا والی حدیث کی حکمت کا بقیہ:

بس اسی باہمی فرق کے جائز ہونے کی رعایت سے حضور ﷺ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر گوشت پکایا کرو تو شوربا زیادہ کر لیا کرو۔ مطلب یہ کہ اگر اپنے برابر دوسروں کو بھنا ہوا گوشت نہ کھلا سکو تو خیر! ان کو کچھ شوربا ہی دے دیا کرو۔

بعض بزرگوں کا عمل بھی اس کے موافق سنا گیا ہے کہ جب ان کے یہاں گوشت پکتا تو شوربا بڑھا کر پڑوسیوں کو بھی دے دیتے تھے۔ یہ ایسا آسان حکم ہے کہ عمل کرنے والے کو اس میں ذرا بھی گرانی نہیں ہو سکتی۔ اور اصلاح کرنے والے کی بھی شفقت و دانائی ہے کہ مشکل سے مشکل کام کا آسان طریقہ بتلا دے سو حضور ﷺ سے بڑھ کر دانا اور شفیق کون ہو سکتا ہے غرضیکہ ان حدیثوں سے یہ معلوم ہوا کہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کی سخت ضرورت ہے

جانوروں کے ساتھ بھی ہمدردی کا حکم ہے:

بلکہ بعض حدیثوں سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی ہمدردی کرنا ضروری ہے اور ان کو ستانا جائز نہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اگر سواری کو ٹھہرا کر بات کرنا ہو تو اس سے اتر پڑو۔ اس پر چڑھے چڑھے زیادہ باتیں مت کرو۔ یہاں تک کہ جن جانوروں کے ذبح کرنے

اور قتل کرنے کی اجازت دی ہے' ان کے ذبح اور قتل کرنے کے قاعدے بتلا دیئے ہیں اور ان پر ظلم کی اور ترسانے ستانے کی ممانعت فرمائی ہے اور اس پر عذاب سے ڈرایا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ عورت نے بلی پالی تھی اور اس کو باندھ کر رکھ چھوڑا تھا۔ نہ کچھ کھلاتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ خود کچھ کھا کر گزر کرنے یہاںتک کہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ حضور ﷺ نے جب عالم برزخ کا معائنہ فرمایا تو دیکھا کہ وہ عورت دوزخ میں جل رہی ہے اور وہ بلی اس پر مسلط ہے۔ اور نوچ رہی ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب بلی آگ میں تھی تو سزا اس کو بھی ہوئی تو پھر اس نے بدلہ کیا لیا تو جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو یہی ضرور نہیں کہ جو چیز آگ میں ہو وہ جلا ہی کرے۔ اس لیے کہ آگ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جلاتی ہے تو ممکن ہے کہ کسی کے حق میں خدا کا حکم جلانے کا نہ ہو۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اس بلی کی صورت میں کوئی دوسری چیز اس پر مسلط کی گئی ہو۔ اور بلی کی صورت اس لیے بنا دی گئی ہوتا کہ اس عورت کو یاد آ جائے کہ میرے فلاں عمل کی سزا مجھ کو مل رہی ہے اور اس کے دل میں شکایت پیدا نہ ہو۔ تو معلوم ہوا کہ جانوروں کو بھی ستانا جائز نہیں۔ البتہ جو جانور ستاتے ہوں ان کو مار ڈالنا جائز ہے۔ لیکن جلدی سے مار ڈالنا چاہیے۔ ستا ستا کر مارنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ذبح کے جانور کے لیے فرمایا کہ چھری کو تیز کر لیا کرو۔ اور جلدی سے ذبح کر دیا کرو۔ جب چاروں رگیں کٹ جائیں تو پھر آگے چھری چلانا بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ چاروں رگوں کے کٹنے کے بعد فوراً تو جان نکلتی نہیں۔ تو اگر اب چھری چلائی جائے گی تو بلا ضرورت اس کو تکلیف ہوگی اور یہ حرام ہے۔

غیر قوموں کا مسلمانوں پر بے رحمی کا اعتراض بالکل غلط ہے:

افسوس ہے کہ آج کل دوسری قومیں مسلمانوں کو بے رحم بتلاتی ہیں۔ وہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ مسلمانوں میں کس قدر رحم ہے۔ اور اگر اس کا نام بے رحمی ہے تو دنیا میں کوئی بھی رحم کرنے والا نہیں۔ کیونکہ تمام قومیں اپنی ضرورت میں آدمی کے قتل کر ڈالنے تک کو بھی جائز کہتی ہیں۔ چنانچہ ملکی لڑائیوں میں اور مذہبی جنگوں میں ہزاروں آدمی تلوار کی گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ جو لوگ تہیہ کرتے ہیں وہ بھی بکری وغیرہ کو سانپ کو بچھو کو

مار ڈالتے ہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ ہم تو کسی کو نہیں مارتے تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جب آپ کے گھر میں بہت سے چوہے ہو جاتے ہیں اور وہ آپ کو ستاتے ہیں تو آپ ان کا کیا علاج کرتے ہیں۔ بعض یہ کہیں گے کہ ہم ان کو پکڑ کر دوسرے محلہ میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اور بعض ایسا کرتے بھی ہیں تو نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس محلہ کے مسلمان خوب اچھی طرح جوتوں سے مار مار کر ان کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ تو صاحبو! کیا کوئی عقلمند اس کو رحم کہے گا کہ جن چیزوں کو اپنا دیوتا سمجھا جاتا ہے ان کو ایسے لوگوں کے حوالہ کر دیا جائے جن کو بے رحم سمجھا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی مصلحت سے دوسرے کی جان لینا جائز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی اجازت اپنی مصلحت سے بڑھ کر ہے تو خدا تعالیٰ کی اجازت سے دوسرے کی جان لینا کیوں ناجائز ہو گا۔ اور جب جائز ہے تو مسلمانوں پر بے رحمی کا اعتراض بالکل غلط ہے۔ اور اگر اب بھی وہ بے رحم ہیں تو آپ ان سے زیادہ بے رحم ہیں کیونکہ ان کے ہاتھ سے بے رحمی کراتے ہیں۔

غرض جانور کے ذبح کو بھی بے رحمی بتلانا سخت غلطی ہے۔ ہاں ذبح کرنے میں اس کو تکلیف دینا' ستانا یہ بے رحمی ضرور ہے۔ تو شریعت نے اس کی کہیں اجازت نہیں دی۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل ذبح کرنے والے اکثر اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ بعض تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی کھال کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔

خیر! قصائیوں کو اختیار ہے جو چاہیں کریں خود بھگتیں گے۔ لیکن دوسرے لوگ ذبح کرتے ہیں۔ وہ تو ذبح میں تکلیف نہ پہنچنے کا انتظام کر سکتے ہیں' کیونکہ یہ ان کا فعل ہے ان کے اختیار میں ہے جس طرح چاہیں کریں ذبح کر سکتے ہیں خدا بھلا کرے ہمارے بزرگوں کا کہ انہوں نے قصائیوں کو قربانی میں ذبح کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس میں منجملہ اور مصلحتوں کے ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اکثر سخت دل ہوتے ہیں پس دوسرے لوگ ذبح کرنے میں کچھ تو رحم کریں گے۔ صاحبو! ہر جانور کے ساتھ رحم کرنا چاہیے۔ خاص کر قربانی کے جانوروں میں تو لوگوں کو بہت ہی احتیاط کرنے کی ضرورت

ہے کیونکہ وہ خالص اپنی ملک ہیں۔ قصائیوں کا ان میں کوئی اختیار نہیں۔ پس جب تک وہ ٹھنڈے نہ ہو جائیں۔ ہرگز کھال نہ نکالنے دیں۔ تو جب شریعت میں جانوروں کو ستانے کی اجازت نہیں اور ان پر رحم کرنے کا حکم ہے اور اس رحم پر ثواب بھی ملتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک بدکار عورت چلی جارہی تھی راستہ میں اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ پیاس کے مارے سسک رہا ہے۔ اس عورت کو بہت قلق ہوا۔ اور اس نے کتے کے لیے پانی تلاش کرنا شروع کیا۔ آخر ایک کنواں ملا لیکن اس کنویں پر نہ رسی تھی نہ ڈول تھا۔ اس عورت نے اپنا چمڑے کا موزہ اتارہ اور اپنی اوڑھنی سے رسی کا کام لے کر پانی نکالا اور اس کتے کو پلایا۔ خدا تعالیٰ نے اس عمل کی بدولت اس کے عمر بھر کے گناہ بخش دیئے اور بے حساب اس کو جنت میں داخل کر دیا۔ اس حدیث کو سن کر لوگوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! کیا جانوروں کو پانی پلانا ثواب ہے۔ آپ نے فرمایا ہر جاندار کو آرام پہنچانے میں ثواب ہے۔ غرض جب شریعت میں جانور تک کو آرام دینے کا حکم ہے تو کیا اس میں انسان کو آرام پہنچانے کا حکم نہ ہوگا۔ یا انسان کا کوئی حق اس شریعت میں نہ رکھا گیا ہوگا۔

رحم اور ہمدردی کی تعلیم:

افسوس ہے کہ آج کل اکثر لوگ جانوروں پر تو رحم کرتے ہیں۔ لیکن اپنے بھائی مسلمانوں پر رحم نہیں کرتے۔ بعض کی تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان کے گھر میں چیزیں رکھی رکھی سڑ جائیں گی۔ لیکن کبھی یہ توفیق نہ ہوگی کہ پڑوسیوں کو یا کسی دوسرے حاجت مند کو اس میں سے دے دیں۔ اور اگر کسی کو دیں گے بھی تو ایسے شخص کو جس کو دینے سے ان کا نام ہو۔ یا ان کا کوئی کام نکلے تو یہ دنیا واقع میں اپنے ہی کو دنیا ہے باقی رحم کھا کر بہت کم لوگ ہیں کہ وہ کسی کو کچھ دیتے ہوں۔ اور ایسے لوگ زیادہ تر وہ ہیں جو کہ خود نہایت آرام میں ہیں۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تکلیف کس چیز کا نام ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سات برس کے مسلسل قحط میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ اور جب دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج کل قحط کا زمانہ ہے لوگ بے وقت میرے

پاس آتے ہیں اگر میں پیٹ بھر کر کھاؤں گا تو مجھ کو ان کی تکلیف کا اندازہ نہ ہو سکے گا۔ تو ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی شخص غلہ لینے آئے اور میں دینے سے انکار کردوں اور بھوکا رہوں گا تو ہر وقت یہ معلوم رہے گا کہ بھوک کی تکلیف ایسی ہوتی ہے اس کو بھی ایسی ہی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ اس سے معلوم ہو گا کہ جو شخص خود آرام میں ہو اس کو دوسرے کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اور یہی سبب تھا کہ پہلے زمانہ میں میاں جی اور استاد شاگردوں کو اصلاح کی غرض سے کچھ تکلیف بھی دیا کرتے تھے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ کسی بادشاہ کا لڑکا ایک میاں جی کے سپرد تھا اور وہ اس کو پڑھاتے لکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ جو بادشاہ مکتب میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ میاں جی سوار ہو کر فلاں جانب کو گئے ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ خود بھی اسی جانب چل دیا۔ رستہ میں دونوں ملے۔ مگر اس حالت میں کے میاں جی گھوڑے پر سوار ہیں اور شاہزادہ سائیس کی طرح گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا آرہا ہے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کو نہایت غصہ آیا۔ لیکن اس وقت تحمل سے کام لیا۔ لیکن بعد میں انہوں نے میاں جی سے اس کی وجہ دریافت کی انہوں نے کہا یہ شہزادہ ہے خدا اس کی عمر میں برکت کرے ایک دن بادشاہ ہوگا اور تخت پر بیٹھے گا' ہزاروں آدمی اس کی خدمت میں ہوں گے سوار ہو گا تو جلوس میں بھی سینکڑوں آدمی ہونگے سو میں نے اس وقت اس پر اس واسطے مشقت ڈالی تا کہ یہ اپنی...... بادشاہی کے زمانہ میں دوسروں کی مشقت کا بھی اندازہ کر سکے۔ اور لوگوں کو تحمل سے زیادہ تکلیف نہ دے۔ بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور انعام واکرام دیا۔ تو جو لوگ آسودہ ہیں اور اتنا کھاتے ہیں کہ ان کو ہضم کے واسطے نمک سلیمانی اور سوڈا واٹر کی ضرورت ہو' ان کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ دوسروں پر کیا گزرتی ہے۔ ایک جماعت تو ان بے رحموں کی ہے لیکن ایسے بہت کما ہیں۔ اس لیے کہ ایسے لوگ اکثر امیر اور مالدار ہیں۔ اور امیروں کی تعداد خود بہت کم ہے۔ دوسری جماعت وہ ہے اور یہی تعداد میں زیادہ ہے کہ جن کو ابھی سے قحط کے اثرات سے تکلیف ہونے لگی ہے اور ان کو اس کے دور ہو جانے کی تمنا ہے۔ اور مجھے اس وقت زیادہ تر اس جماعت کے متعلق ایک مضمون بیان کرنا ہے۔ وہ یہ کہ جن لوگوں کو ظاہر

میں قحط کی طرف سے فکر لگی ہوئی ہے ان میں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ کیا صرف ان کی زبانوں پر اس کا ذکر ہی ہے۔ یا کوئی تدبیر بھی کر رہے ہیں۔ اور اگر تدبیر کر رہے ہیں تو واقع میں یہ تدبیر مفید ہے۔ یا نہیں اور اس کو تدبیر کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔

قحط کی تدبیر میں لوگ غلطیاں کرتے ہیں:

تو ان سب لوگوں کی حالت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس میں دو غلطیاں کر رہے ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں کہ وہ کوئی تدبیر ہی نہیں کرتے اور نہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ جس طرح ان کی مجلس اور دنیا بھر کی باتوں کا تذکرہ ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اس کا تذکرہ بھی ہو جاتا ہے ان کو اس کی خبر ہی نہیں کہ قحط نہ پڑنے کی کوئی تدبیر بھی ہے یا نہیں۔ اور بعض ایسے ہی ہیں کہ وہ تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں اور تدبیر بھی کرتے ہیں لیکن وہ تدبیر صحیح نہیں ہوتی اور ہزاروں میں دو چار آدمی ہی ایسے نکلیں گے جو صحیح تدبیر سمجھ سکتے ہوں اس لیے وہ بھی گویا بے تدبیری ہی کرتے ہیں۔ مجھ کو اس وقت اسی بے تدبیری کے متعلق کہنا ہے لیکن میں نے اس وقت جو آیت پڑھی ہے وہ کچھ اسی کام کی ہے تدبیر کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس کام کی بے تدبیری اور ہر کام کی بے تدبیری کو عام ہے۔ آیت یہ ہے وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ ترجمہ: اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرو۔ امید ہے کہ تم کامیابی حاصل کر لو گے۔

مناسبت اس آیت کی آج کے مضمون سے انشاء اللہ تعالیٰ ابھی ظاہر ہو جائے گی۔

آیت وَاْتُوا الْبُيُوْتَ الخ کے نازل ہونے کا واقعہ:

اس آیت کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں منجملہ اور بے ہودہ رسموں کے ایک رسم یہ بھی تھی کہ حج کے زمانہ میں احرام باندھنے کے بعد گھر میں نہ جاتے تھے۔ اور اگر بہت ہی ضرورت گھر میں جانے کی ہوتی تو گھر کی پشت سے اندر آتے۔ اور دروازے سے مکان میں جانے کو ان دنوں میں حرام سمجھتے تھے۔ خدا تعالیٰ اس

آیت کو نازل فرما کر اس رسم کو مٹا رہے ہیں اور اس کا لغو ہونا ظاہر فرما کر مکان میں دروازے سے داخل ہونے کا حکم فرماتے ہیں۔ اس کے بعد تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں جس سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اصل چیز تقویٰ ہے یعنی جن باتوں سے خدا تعالیٰ ناراض ہوں ان کو چھوڑ دینا۔ باقی یہ گھڑی ہوئی رسمیں ہیں۔ سو یہ کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ محض نفس کی خواہش کے مخالف کرنے سے خدا تعالیٰ کی رضامندی نہیں حاصل ہوتی۔ جیسا وہ لوگ سمجھتے تھے کہ گھر میں پشت کی طرف سے جانا نفس پر شاق ہے اس لیے یہ عبادت ہے اور ایسا مرض ہے کہ آج کے صوفی بھی اس میں گرفتار ہیں۔ یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر نفس کی مخالفت ہو گی اور اس پر مشقت ڈالی جائے گی۔ خدا تعالیٰ زیادہ راضی ہوں گے۔ اگر چہ وہ نفس کی مخالفت کرنا شریعت کے خلاف بھی ہو۔

بعض صوفی مباح کو حرام کر لیتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے:

جیسے بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر گوشت کھانا حرام کر لیتے ہیں۔ گویا کہ خدا تعالیٰ کے خزانے میں ان کے اس فعل سے بہت زیادتی ہو گئی۔ اسی طرح بعض لوگ سرد پانی نہیں پیتے۔ بعض چارپائی پر نہیں سوتے۔ اور بعض لوگ جو اسلام سے محروم ہیں وہ تو یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ اپنے اعضاء تک سکھلا دیتے ہیں۔

چنانچہ ایسے جوگی سنے گئے ہیں کہ انہوں نے اپنا ہاتھ سکھلا دیا۔ میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ گرمی کے دنوں میں چاروں طرف آگ جلا رکھی ہے اور اس کے بیچ میں خود بیٹھا ہے۔ گویا یہیں دکھلا رہا ہے کہ میں دوزخی ہوں۔ یہ سب بے تمیزی اور جہالت کے باتیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا اِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (ترجمہ:) ”بے شک تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور یقیناً تیری آنکھ کا تجھ پر حق ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اتنی مشقت نہ اٹھاؤ کہ پھر بالکل کام ہی سے جاتے رہو۔ پس معلوم ہوا کہ کوئی خاص کام اپنی طرف سے تراش کر اس کی مشقت برداشت کرنا تقویٰ نہیں ہے۔

بزرگوں نے جو مجاہدے کیے ہیں وہ خلاف شریعت نہ تھے۔

لیکن اس سے ان بزرگوں پر شبہ نہ کیا جائے جنہوں نے اپنے نفس کی اصلاح کے لیے بڑے بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کی ہیں کہ ایک زمانہ تک کھانا پینا اور سونا آرام کرنا وغیرہ قریب قریب بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے کہ اول تو وہ حضرات جواز کی حد سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ پھر وہ بھی اس کو بطور نفس کے علاج کے کرتے تھے خود اس کو ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے اس قسم کے مجاہدے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص گل بنفشہ پینے لگے یا کسی مرض کی وجہ سے کچھ خاص کھانے چند دن کے لیے چھوڑ دے۔ کیونکہ وہ اس دوا پینے کو اور کھانے سے پرہیز کرنے کو عبادت نہیں سمجھا' بلکہ صحت کے حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اوز اگر کوئی نادان اس کو ثواب سمجھ کر پینے لگے تو یقیناً گنہگار ہو گا۔ اس واسطے کہ اس نے شریعت کے قانون میں ایک دفعہ اپنی طرف سے زیادتی کر دی۔ کیونکہ خالص ثواب کا کام شریعت کا قانون ہوتا ہے۔

بدعت کی برائی کا سبب:

اور بدعت کی برائی کا یہی سبب ہے کہ اگر اس میں غور کیا جائے تو پھر بدعت کے منع کرنے میں ذرا بھی تعجب نہ ہو۔ دنیا کے روز مرہ معاملات اور برتاؤ میں اس کی مثال دیکھئے۔ اگر کوئی مطبع والا گورنمنٹ کے قانون کو چھاپے اور اخیر میں اپنی طرف سے ایک دفعہ زیادہ کر دے اور وہ ملک اور سلطنت کے لیے بھی مفید ہو۔ تب بھی اس کے اس فعل کو جرم سمجھا جائے گا۔ اور یہ شخص سزا کا مستحق ہوگا۔ پس جب دنیا کے قانون میں ایک دفعہ کا زیادہ کرنا جرم ہے تو شریعت کے قانون میں ایک دفعہ کا زیادہ کرنا جس کو شریعت کے محاورہ میں بدعت کہتے ہیں کیوں جرم نہ ہوگا۔ لیکن ہمارے ان حضرات نے ایسا نہیں کیا بلکہ محض علاج کی غرض سے کھانے پینے وغیرہ میں ترک کیا ہے۔

بخلاف اس کے جاہل صوفیوں کے کہ وہ اس کو دین اور عبادت اور خالص ثواب کا کام سمجھ کر کرتے ہیں۔ بہر حال نفس کو راحت پہنچانا اور اس کے حقوق کا ادا کرنا بھی

ضروری ہے اس لیے کہ شریعت نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر دی ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ صحابی کا واقعہ ہے کہ وہ رات کو بہت جاگتے تھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کو روکا۔ آخر یہ قصہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان رضی اللہ عنہ سچ کہتے ہیں۔ اور ارشاد فرمایا۔ اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا اِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (ترجمہ:) بے شک تمہارے نفس کا تم پر حق ہے اور بے شبہ تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے۔ اس وجہ سے رات کو اچھی طرح سو کر ان کو راحت پہنچانا ضروری ہے۔ غرض کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ منجملہ اور تکالیف کے ایک تکلیف اپنے نفس کو یہ بھی دے دیتے تھے۔ خدا تعالیٰ اس کو فرماتے ہیں کہ اصل چیز تقویٰ ہے اس کو اختیار کرو۔ اور گھر میں پشت کی طرف سے آنا کوئی تقویٰ اور ثواب کا کام نہیں ہے۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا۔

آیت کی بقیہ تفسیر اور مقصود کا ثبوت:

اور گو اس آیت میں ایک خاص شے کا حکم بیان کیا ہے مگر مراد حکم عام ہے اور وہ حکم عام یہ ہے کہ جس کام کا جو طریقہ ہے اسی طریقہ سے اس کام کو کرو بے طریقہ نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم عام ہے۔ پس آیت کے معنی عام ہو گئے اور وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ جو آگے فرماتے ہیں اس سے یہ معنی عام طور سے ثابت ہو رہے ہیں کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ جو کام تقوے سے نہ ہوگا اور بے قاعدہ ہو۔ گو وہ ظاہر میں ثواب کا کام نظر آتا ہو اس سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور تمہارے گھروں کے اندر پشت کی طرف سے آنا تقویٰ سے نہیں۔ اس لیے یہ بھی کامیابی کا ذریعہ نہیں جو تمہارا مقصود ہے یعنی حق تعالیٰ کی خوشنودی۔ اب آیت کا مضمون خیال میں رکھ کر اپنی حالت کو دیکھئے کہ ہم اکثر کام اس طرح کرتے ہیں جس میں کامیابی نہیں ہوتی۔ اور اس سے میری مراد اس وقت دنیا کے کام نہیں کیونکہ اس کا کامیابی کے طریقے بتلانا ہمارا کام نہیں۔ ہم سے یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ ہم دنیا کے کاموں کی اجازت دے دیتے ہیں۔

صاحبو! ہم سے دنیا کی تدبیروں کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اس دھندے کی فرصت ہمیں کہاں۔ ہم کو دین کی باتوں کے سوا کچھ یاد نہیں رہا اور ہم دنیا کی باتیں کچھ نہیں جانتے اور اگر جانتے تھے تو اب بھول گئے۔ غرض اس وقت گفتگو دین کے کاموں کے متعلق ہے کہ ان میں بھی وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں آخرت کی کامیابی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ جیسے یہی عمل جس کا ذکر آ چکا ہے۔

اپنے نفس کو زیادہ تکلیف دینا قرب کا سبب نہیں اور ایک جاہل فقیر کی حکایت:

کہ اپنے نفس کو تحمل سے زیادہ تکلیف دینا خدا تعالیٰ کے قرب اور خوشنودی کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس پر مجھے ایک جاہل فقیر کی حکایت یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ عالم کے صاحبزادے گھر سے خفا ہو کر چلے گئے۔ ایک مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں پہاڑ پر ایک فقیر رہتا ہے۔ ان کو چونکہ دین سے اور اہل دین سے خاندانی تعلق اور لگاؤ تھا اس لیے ان کو اس فقیر سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ایک شخص ہے جس نے ایک آنکھ پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ناک کا ایک نتھنا نجاست بھری بتی سے بند کر رکھا ہے۔ انہوں نے اس حرکت کا سبب پوچھا تو اس فقیر نے کہا کہ ناک میں گو کی بتی تو اس لیے رکھی ہے کہ یہاں پھولوں کے درخت بہت ہیں' ہر وقت خوشبو سے دماغ معطر رہتا ہے اور اس سے نفس پھولتا ہے تو میں نے نفس کا علاج کرنے کے لیے ایک طرف ناک میں نجاست کی بتی دے رکھی ہے تاکہ اس کی تکلیف سے نفس خوش ہو کر نہ پھول جائے۔ اور آنکھ پر پٹی اس واسطے باندھ رکھی ہے کہ کام تو ایک آنکھ سے بھی چل سکتا ہے۔ پھر بلا ضرورت دوسری آنکھ سے کیوں کام لوں۔ یہ سن کر اس مسافر نے کہا کہ فقیر صاحب میں خود عالم نہیں ہوں۔ لیکن عالموں کی صحبت میں رہا ہوں ان سے جو کچھ سنا ہے اس کی بناء پر کہتا ہوں کہ نہ تو آپ کا وضو ہوتا ہے نہ نماز ہوتی ہے کیونکہ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہے۔ وہ جگہ ہمیشہ خشک رہتی ہوگی اور اس سے وضو نہیں ہوتا۔ اور بے وضو نماز نہیں اس لیے آج تک کی نمازیں آپ کی سب برباد ہوئیں۔ چونکہ وہ فقیر حقیقت میں حق کا طالب تھا۔

ناواقفیت کی وجہ سے اس غلطی میں پڑ گیا تھا۔ اس کو سن کر بہت رویا اور توبہ کی واقعی جہالت بھی ہے بری چیز۔

ایک اور جاہل فقیر کی حکایت:

ہمارے تھانہ بھون کا واقعہ ہے کہ یہاں ایک فقیر رہتا تھا بالکل جاہل' اور محلہ کے اکثر لوگ اس کے معتقد تھے۔ یہاں تک کہ ہمارے نانا صاحب بھی چونکہ دینداروں اور فقیروں سے ان کو خاص تعلق تھا وہ بھی معتقد تھے۔ محلہ بھر میں صرف ایک شخص ایسا تھا کہ وہ اس فقیر کا معتقد نہیں تھا۔ اور یہی کہتا تھا کہ جاہل آدمی کی کیا فقیری۔ اس کی حرکت پر تمام اہل محلہ ان کو ملامت کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اس شخص کو یہ شرارت سوجھی کہ اخیر رات میں تہجد کے وقت کسی طرح اس کے مکان کی چھت پر جا بیٹھا اور جب وہ تہجد کی نماز کے لیے اٹھا تو نہایت سریلی آواز سے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے اپنا نام سنا تو پوچھا کون پکارتا ہے۔ آپ فرماتے ہی کہ میں ہوں اخی جبرائیل علیہ السلام۔ جب یہ سنا تو نہایت غور سے متوجہ ہوا اور کہا کیا ارشاد ہے! اس نے جواب دیا کہ خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے تجھے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اب تو بوڑھا ہوگیا ہے ہم کو تیری کبڑی کمر دیکھ کر شرم آتی ہے اس لیے ہم نے تجھ سے نماز کو معاف کر دیا۔ یہ کہہ کر آپ وہاں سے چلا آیا۔ اس فقیر نے جواخی جبرئیل کی زبان سے معافی کا پروانہ سنا تو پھر فوراً لوٹا رکھ دیا اور پڑ کر سو گئے۔ اب تہجد بھی غائب' صبح بھی ظہر کے وقت۔ معتقدین نے جو دیکھا کہ بڑے میاں کئی وقت سے مسجد میں نہیں آئے تو ان کو فکر ہوئی۔ ادھر ادھر تذکرہ شروع ہوا۔ آخر گھر پہنچے تو دیکھا کہ اندر سے بند ہے۔ بہتری آوازیں دیں جواب ندارد' آخر بڑی مشکل سے دروازہ کھلا۔ بڑے میاں سے نماز میں نہ آنے کا سبب پوچھا۔ تو اول تو مارے نخوت اور بڑائی کے آپ نے کچھ جواب ہی نہیں دیا لیکن جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو آپ نے کہا کہ اخی جبرائیل میرے پاس آئے تھے' وہ فرما گئے کہ خدا تعالیٰ نے تجھے تمام معاف کر دی۔ یہ سن کر وہ شخص جو معتقد نہ تھا اور جس نے یہ حرکت کی بہت ہنسا۔ لوگوں کو اس کے ہنسنے سے شبہ ہوا کہ اس نے یہ حرکت کی ہے۔ پوچھا

گیا تو اس نے کہا کہ دیکھ لیجئے آپ ان کو فقیر اور بزرگ بتلاتے تھے۔ حقیقت میں جاہل کی فقیری ہی کیا۔ اور جب وہ فقیر نہیں ہوسکتا تو پیر اور مقتدا کو کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

ایک اور حکایت جاہل فقیر کی:

ایک اور جاہل فقیر یہیں تھانہ بھون میں تھے ایک مرتبہ انہوں نے وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی کی تفسیر فرمائی تھی کہ اے نفس تیری یہی سجا (سزا)۔

صاحبو! یہ سب جہالت کے کرشمے ہیں۔ اور یہ نامعقول پیٹ ان جاہلوں سے اس قسم کی کرتوتیں کراتا ہے۔ زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی تمیز نہیں واقع میں فقیر ہے یا مکار ہے۔ اور بعض بعض مقامات کی تو یہ حالت ہے کہ وہاں فاسقوں اور فاجروں کے بھی معتقد ہو جاتے ہیں۔

ایک نفس پرست پیر کی حکایت:

چنانچہ ایک مشہور شہر کی نسبت ایک معتبر آدمی سے سنا ہے کہ ایک ایسے نامعقول پیر کے پاس ان کا مرید بیٹھا ہے اور اس کی بیوی بھی بیٹھی ہے اور حضرت پیر صاحب اس کا منہ چوم رہے ہیں اور مرید صاحب اس پر خوش ہو رہے ہیں اور بیوی سے ہنس ہنس کر فرماتے ہیں کہ اب تمہارا منہ بڑے رتبہ کا ہو گیا۔ اب ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اس میں تصرف کریں۔

میرے ایک خاندانی بزرگ اس شہر کی نسبت فرماتے ہیں کہ وہاں کے فقیر تو دوزخی اور امیر جنتی ہیں کیونکہ امیر تو فقیروں سے ان کو اہل اللہ سمجھ کر تعلق رکھتے ہیں اور فقیر ان سے دنیا حاصل کرنے کے لیے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیروں کو بھی جنتی کہنا مشکل ہے کیونکہ جو شخص اتنا جاہل ہو کہ بددین اور دیندار میں تمیز نہ کر سکے۔ یہ کیا جنتی ہونے کے کام کرے گا۔

یہ مقولہ غلط ہے کہ پیر کے فعلوں سے کیا کام:

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ پیر کے فعلوں سے کیا کام؟ اس کی تعلیم سے کام تو میں

کہتا ہوں کہ شیطان کے مرید کیوں نہیں ہو جاتے۔ اس لیے کہ اس سے بڑا عالم اور واقف تو کوئی فقیر بھی نہ ملے گا۔ وہ تو عالموں سے بھی بڑھ کر عالم ہے۔

دلیل اس کی کہ شیطان بڑا عالم ہے:

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ وہ عالموں کو بھی علم کی باتوں میں بہکالیتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ عالموں کو بہکانے والا علم میں زیادہ ماہر ہونا چاہیے تا کہ وہ بہکا سکے۔ کیونکہ غیر ماہر کا ماہر کو بہکانا مشکل ہے۔

غرض کہ جاہل کی پیری فقیری کا کچھ اعتبار نہیں۔ چنانچہ وہ پہاڑ کا رہنے والا اگرچہ فقیر تھا لیکن جہالت سے اس نے یہ خرافات کی کہ آنکھ پر پٹی باندھ لی اور ناک میں بتی دے لی تا کہ نفس کو مشقت ہو۔ اور اس کو اطاعت وعبادت سمجھا۔ صاحبو! اگر نفس کو مشقت ہی میں ڈالنا قرب اور ثواب کا ذریعہ ہوتا تو لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ نہ فرمایا جاتا۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ اپنی جانوں کو قتل مت کرو۔ کیونکہ خود کو قتل کرنا تو بہت بڑی تکلیف ہے۔ اس سے بہت زیادہ قرب ہونا چاہیے تھا نہ کہ ممانعت۔

ثواب دین کا کام طریقہ کے موافق کرنے سے ہوتا ہے۔

غرض قرب ہوتا ہے صرف دین کا کام طریقہ کے موافق کرنے سے۔ حالانکہ لوگ اس میں بہت بے ڈھنگا پن کرتے ہیں جیسے آج کل رمضان شریف آ رہا ہے۔ اس میں اکثر لوگ قرآن شریف تراویح میں سنائیں گے۔ لیکن اس قدر تیزی سے پڑھیں گے کہ سوائے یَعْلَمُوْنَ اور تَعْلَمُوْنَ کے کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تراویح قرب کا ذریعہ ضرور ہے لیکن اس کو ایسے بے ڈھنگے پن سے ادا کیا گیا کہ وہ بجائے قرب کے گناہ کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اور پھر غضب یہ کہ اپنی ان حرکات پر ندامت نہیں ہوئی۔ بلکہ اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہم نے اتنا زیادہ دین کا کام کیا۔ خدا تعالیٰ ایسوں ہی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ○ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ○ ترجمہ: آپ کہیے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں۔

جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارہ میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کری کمائی محنت سب گئی گزری ہوئی اور وہ اس خیال میں ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے اَفَرَءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰاهُ۔ ترجمہ: سو کیا آپ ﷺ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش کو بنا رکھا ہے۔

اہل بدعت کا حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ کو حجت میں پیش کرنا صحیح نہیں:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث شریف میں آیا ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ (ترجمہ) اعمال کا حصر ہے نیتوں پر۔ اور ہماری نیت ہر ہر عمل میں درست ہوتی ہے۔ پس ہمارا ہر عمل درست ہوگا۔ اور اس سے قرب حاصل ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں اعمال سے مراد جائز اعمال ہیں نہ کہ جائز۔ اور غیر جائز دونوں۔ پس گناہ میں نیت نیک کرنے سے کچھ ثواب نہیں ملتا بلکہ وہاں تو یہ نیت اور بھی زیادہ وبال کا سبب ہے۔ کیونکہ نافرمانی کو قرب اور ثواب کا اعتقاد کیا۔ اور یہ اعتقاد شریعت کے خلاف تو ہے عقل کے بھی خلاف ہے۔ جیسا ظاہر ہے۔

شب برات میں بدعت کیا ہے اور سنت کیا ہے؟

ایسے ہی اب شب برات آ رہی ہے۔ اس میں حلوا پکانے کی عام رسم ہے اور اس کو دین کو بات سمجھتے ہیں۔ اور اگر کوئی مولوی منع کرتا ہے تو اس کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ بے چارے مولویوں پر بہتان لگایا جاتا ہے کہ صاحب یہ لوگ حلوے کو منع کرتے ہیں۔

صاحبو! میں صاف کہتا ہوں کہ خود حلوے کو کوئی منع نہیں کرتا۔ بلکہ اس کو صرف اس لیے منع کیا جاتا ہے کہ اس دن پکانے کو ثواب سمجھتے ہیں جس کی کوئی اصل نہیں۔ حدیث شریف سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس رات کو حضور ﷺ قبرستان میں تشریف لے گئے تھے۔ اور وہاں آپ ﷺ نے مردوں کے لیے دعا فرمائی۔ اس سے ممکن ہے کہ کسی

نے یہ سمجھ کر اس رات میں مردوں کو نفع پہنچانا حضور ﷺ کے اس فعل کہ کسی نے یہ سمجھ کر اس رات میں مردوں کو نفع پہنچانا حضور ﷺ کے اس فعل سے ثابت ہو ہی گیا۔ نفع پہنچانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ محتاجوں کو کھانا دے کہ ثواب پہنچا دیا جائے تو یہاں تک تو قیاس کی گنجائش ہے۔ اس کے بعد تو طوفان بے تمیزی برپا ہوا ہے کہ خدا کی پناہ کہیں حلوے کی تخصیص ہے اور کہیں مسورہ کی دال کی قید ہے خدا جانے ان دونوں میں کیا جوڑ ہے۔ اور شہروں میں تو غضب کرتے ہیں گھر کا سامان گروی رکھ کر اور سودی قرض لے کر یہ رسمیں پوری کی جاتی ہیں۔

چنانچہ میں جس زمانہ میں کانپور میں رہتا تھا۔ ایک ماما ہمارے یہاں رہتی تھی۔ ماما کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ شب برات جو آئی تو اس نے برتن گروی رکھے اور کچھ سودی قرض لیا۔ اس کے بعد اس نے ایک جگہ کو خوب اچھی طرح لیپا اور حلوا پکایا۔ ایک اور طرہ بھی ہے کہ اکثر لوگ فاتحہ کے لیے بہت سے پتوں میں علیحدہ علیحدہ رکھ کر مردوں کو ثواب بخشتے ہیں اور غالباً علیحدہ علیحدہ پتوں میں رکھنے کی رسم پیرزادوں نے اس لیے نکالی ہے تاکہ پیر جی صاحب کو زیادہ ملے گا۔ اور اسی لیے زیادہ تر مولویوں پر خفا بھی یہی پیر جی لوگ ہوتے ہیں۔

بدعات کی بندش کی ایک عمدہ تدبیر:

اسی وجہ سے میں بطور لطیفہ کے اس کے متعلق اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم کو چاہیے کہ عوام الناس کو دفعتہً ان چیزوں سے منع نہ کرو۔ کیونکہ بگڑتے ہیں بلکہ ان سے یوں کہو کہ تم پیر جی کو حصہ دے کر ان سے ثواب بخشواتے ہو یہ ثواب نہیں پہنچتا اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا ہے اجرت لے کر پڑھا ہے اور اجرت لینے کے بعد ثواب ملتا نہیں۔ تو جب پیر جی کو خود ہی ثواب نہیں ملا تو تمہارے مردوں کو ثواب کیسے مل جائے گا اس لیے تم پیر جیوں سے پڑھوا لیا تو کرو مگر ان کو کچھ دیا مت کرو۔ اور اس طرح پیر جیوں سے کہو کہ فاتحہ خوانی کرو نیاز بھی لیکن حصہ نہ لیا کرو نہ اور کوئی اجرت لیا کرو۔ جب پیر جیوں پر محنت تو پڑے گی پوری اور ملے گا ایک پیسہ بھی نہیں۔ تو دیکھ لینا انشاء اللہ تعالیٰ خود یہ

پیر جی ہی بہت جلدی اس کو حرام کہنے لگیں گے اور بدعت کا فتویٰ لگادیں گے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس کام سے زیادہ بدعت کیا کام ہوگا کہ جن کو دن میں دس دس دفعہ کرنا پڑے اور ایک پیسہ بھی نہ ملے۔ ایسے کاموں کے سنت ہونے کا دعویٰ تو صرف اس لیے کیا تھا کہ کچھ وصول ہو جاتا تھا۔

میانجیوں کے عوام سے وصول کرنے کے کئی قصے:

اور وصول ہونے کے لیے زیادہ تر ان لوگوں نے اپنی ہوشیاری سے ثواب پہنچانے کے ایسے طریقے ایجاد کیے تھے جن کو سوائے ان کے دوسرا کوئی عام لوگوں میں سے جان نہیں سکتا کہ اول قُلْ هُوَ اللّٰهُ ہو پھر تبَارَكَ الَّذِیْ ہو اور پھر یہ ہو اور پھر وہ ہو اور بعض چیزوں پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور بعض پر نہیں یہ ایسی بات ہے کہ اس کو مولوی بھی نہیں جانتے تو یہ طریقہ وہی لوگ جانتے ہیں۔ اس لیے مجبوراً عام لوگ ان کے محتاج ہو کر انہیں کے پاس جاتے ہیں اور اس طرح سے ان کو ملتا ہے اور پھر غضب یہ ہے کہ یہ لوگ اس میں اور بھی بڑی بڑی چالاکیاں کیا کرتے ہیں۔ ایک تھانہ دار صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ میں کسی تھانہ میں تھا کہ میرے پاس ایک شخص یہ رپٹ لکھوانے آیا کہ کوئی میری فاتحہ چرالے گیا۔ میں سخت پریشان ہوا کہ فاتحہ چرانے کے کیا معنے' اس شخص سے پوچھا تو اس نے کہا کہ موقع پر چلیے۔ آخر موقع پر جا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک نلکی میں پیر جی ایک سال کے لیے فاتحہ پڑھ کر بند کر جاتے ہیں اور کہہ جاتے ہیں کہ جب ضرورت ہو اس میں سے تھوڑی سی جھاڑ لینا۔ فی نلکی وہ ایک روپیہ لیا کرتے ہیں۔ اتفاق سے کسی شخص کے پاس روپیہ تھا نہیں اور اس کو فاتحہ کی ضرورت ہوئی تو اس نے اس شخص کی نلکی چرالی۔ اس سے میری نلکی دلوادو۔

اسی طرح ایک اور صاحب سناتے تھے کہ کسی مسجد میں ایک ملاجی امام تھے۔ محلہ کے لوگ ان سے فاتحہ وغیرہ دلاتے تھے۔ ایک عورت ایک دن کھانا لے کر آئی۔ اتفاق سے ملاجی اس وقت مسجد میں موجود نہ تھے۔ ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر مقصود تو ثواب ہے چلو مسافر ہی کو دے دو۔ اس کو کھانا دے کر چلی مسجد کے دروازے سے نکلی ہی

تھی کہ ملاجی آ گئے۔ پوچھا کیسے آئی تھی۔ اس نے سب واقعہ کہہ دیا۔ آپ جلدی سے مسجد میں آئے اور ایک لاٹھی لے کر تمام مسجد کے فرش کو پیٹنا اور لوٹوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ اور پیٹتے پیٹتے تھوڑی دیر میں دھم سے مسجد کے فرش پر گر پڑے۔ لوگوں نے جو شور وغل سنا تو سب آ کر جمع ہو گئے۔ پوچھا کہ ملاجی کیا ہوا؟ کہنے لگے ہوا کیا۔ یہ ہوا کہ اب ہم اس مسجد میں نہیں رہ سکتے پوچھا گیا' کیوں؟ کہنے لگے کہ بھائیو! میں تو مدت سے یہاں رہتا ہوں سب مردوں سے واقف ہوں انہیں کو ثواب بخش دیتا ہوں۔ یہ نیا آدمی ہے خدا جانے اس نے کس کس کو ثواب بخش دیا۔ یہاں کے سب مردے مجھے آ کر لپٹ گئے۔ میں نے ان کو بہت کچھ بھگایا۔ لیکن میں تنہا تھا کہاں تک لڑتا۔ آخر تھک کر گر گیا۔ دو ایک دفعہ ایسا ہوا تو میں مر ہی جاؤں گا۔ اس لیے اس کہیں جاتا ہوں۔ لوگوں نے ان سے کہا' ملاجی آپ کہیں نہ جایئے۔ ہم آپ ہی کو ہر چیز دیا کریں گے۔

ان رسموں کے دین سے خارج ہونے کی ایک ظاہر علامت:

تو جب بناء ان رسموں کی یہ غرضیں ہیں تو جب فاتحہ کے عوض ان کو کچھ نہ ملے گا تو الگ الگ پتہ پر پڑھنا خود ہی ان کو مشکل ہو گا۔ اور اسی طرح بہت جلدی اس کی بندش ہو جائے گی۔ اور یہ بھی ایک علامت ہے ان رسموں کے اصلی دین نہ ہونے کی۔ کیونکہ اصلی چیز کی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر حالت میں حفاظت ہوتی ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں طاعون کی کثرت ہوتی ہے تو تیجہ اور چالیسوں دسواں وغیرہ سب چھوٹ گئے تھے۔ صرف وہی چیزیں باقی رہ گئی تھیں جو شریعت میں ضروری تھیں۔ بعض لوگوں سے جو میں نے کہا کہ اب وہ رسمیں کیوں نہیں ہوتیں۔ تو کہنے لگے کہ صاحب کس کس کی رسمیں کریں یہاں تو روز تیجہ ہی رہتا ہے۔ میں نے کہا کہ دیکھو اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں محض زائد اور دین سے خارج ہیں ورنہ موتوں کی اس کثرت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مردے کو بغیر کفن اور نماز پڑھے دفن کر دیا ہو۔ اور تیجہ دسواں بہت مردوں کا نہیں ہوا۔ غرض یہ کہ دین کے کاموں میں بھی عجیب عجیب طریقے ایجاد کیے ہیں جن سے دینی کامیابی یعنی خدا تعالیٰ کی خوشنودی کوسوں دور ہے۔

قحط کے متعلق لوگوں کی غلط تدبیر:

چنانچہ ان میں سے ایک یہ موقع بھی ہے کہ آج کل قحط کے آثار معلوم ہوتے ہیں سو اس کے متعلق بعض تو تدبیر ہی نہیں کرتے بلکہ ایک شغل کے طور پر محض اس کے تذکرہ کو ہی کافی سمجھتے ہیں حالانکہ نرا افسوس کرنا بھی کچھ مفید نہیں۔ محض تذکرے سے تو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ سمجھ کر کہ اس کا سبب گناہ کے کام اور گناہوں کا کفار نیک کام ہے ہو سکتا ہے۔ پس کوئی نیک کام اختیار کرنا چاہیے تاکہ خدا تعالیٰ کا غضب دور ہو اور اس بلا سے نجات ملے۔ یہ سمجھ کر اس کی تدبیر کی تو اس کی تجویز میں غلطی کی۔ یعنی یہ کیا کہ بہت سا اناج اکٹھا کر لیا اور تنور میں روٹیاں پکوا کر تقسیم کر دیا۔ گویا اس تدبیر سے میکائیل علیہ السلام جن کے متعلق رزق کا انتظام سپرد ہے ان کے محکمہ کو خرید لیں گے۔ اور جیسا یہ لوگ ان سے کام لینا چاہیں گے وہ وہی کر دیں گے اور اگر کبھی اس کی بابت کچھ کہا جاتا ہے تو دو جواب ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دیکھئے ایک نیک کام سے روکتے ہیں۔

صاحبو! اگر کوئی شخص ظہر کے فرضوں کی پانچ رکعتیں پڑھنے لگے تو اس کو کیوں منع کیا جاتا ہے، آخر پانچویں رکعت بھی تو نماز ہی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی حکیم پانچ ماشہ گل بنفشہ تجویز کرے تو دس ماشہ استعمال کرنے سے کیونکہ روکتے ہو۔ حالانکہ پانچ ماشہ زائد بھی گل بنفشہ ہی ہے۔ اس کی بھی یہی خاصیت ہے۔ صرف اسی لیے تو منع کیا جاتا ہے کہ طب کی مقرر کی ہوئی حد سے زائد ہے اور حد سے آگے بڑھنا جائز نہیں ہے۔

پس افسوس ہے کہ شریعت کی مقرر کی ہوئی حدوں کی آپ کے نزدیک اتنی بھی وقعت نہیں ہے تو جب پانچویں رکعت زائد کے پڑھنے والا اس لیے بدعتی ہے کہ شریعت کی حد سے آگے بڑھ گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر نیک کام کرنے کی ہر اعتبار سے اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اس شرط سے اجازت ہے کہ شریعت کی حد کے اندر ہو۔ اور اگر تم کو شریعت کی حدود کی خبر نہیں ہے تو تم کو اس کہنے کا کیا مجاز ہے کہ یہ نیک کام ہے اور یہ بدکام۔ یہ حق عالموں کا ہے یا انبیاء علیہم السلام کا تھا۔ کم علم یا بے علم لوگ عالموں کے سامنے شریعت کے مسئلوں میں ایسے ہی ہیں جیسے کسی وکیل کے سامنے دیہاتی آدمی جس طرح

ایک دیہاتی آدمی کسی وکیل کے سامنے یہ کہہ نہیں سکتا کہ مقدمہ میں اس طرح کر لینے میں کیا حرج ہے اسی طرح آپ کو یہ حق نہیں۔ اور جس طرح وہ ہر کام میں وکیل سے مشورہ لینے کا محتاج ہے اسی طرح آپ بھی ہر دینی کام میں عالموں سے مشورہ لینے کے محتاج ہیں۔ پس طریقہ اس کا یہ ہے کہ جو کام کرو اول عالموں سے مسئلہ پوچھ لو۔ اور اگر وہ وجہ نہ بتلائیں تو سعادت مندی یہ ہے کہ اس کو اپنی سمجھ سے باہر سمجھ کر خاموش رہو۔ اور اگر بیان کر دیں تو ان کا احسان سمجھو کیونکہ مولویوں کے ذمہ مسئلوں کا بتلا دینا ہے۔ وجہ بیان کرنا۔ یہ ان کا منصب نہیں اور بعض لوگ اس سے بھی چلتا ہوا ایک دوسرا جواب دیا کرتے ہیں وہ یہ کہ کیوں صاحب یہ آج تک ہوتا چلا آیا ہے۔ کیا یہ کرنے والے سب بے وقوف ہی تھے۔ صاحبو! یہ سب نادانی کی باتیں ہیں۔

قحط کے زمانہ میں چندہ جمع کر کے کھانا تقسیم کرنے میں کیا کیا خرابیاں ہیں:

اب اپنی اس رسم کی حقیقت شروع سے سمجھئے سب سے پہلے اناج وصول کرنا شروع کیا جاتا ہے۔ یعنی دو آدمی اٹھے اور گھر گھر جا کر انہوں نے مانگنا شروع کیا اور لوگوں نے جمع کر دیا۔

سو دیکھنا یہ ہے کہ یہ اناج لوگوں نے خوشی سے جمع کیا ہے یا محض ان کے لحاظ سے اور دباؤ سے۔ کہ جب یہ مانگنے آئے ہیں تو ان کو خالی کیا جانے دیں جس نے لوگوں کی حالت میں کچھ غور کیا ہوگا۔ یا کم سے کم اپنی حالت میں غور کیا ہو گا کہ ہم نے خوشی سے دیا ہے یا محض لحاظ سے' یا اگر خود اناج تو خوشی سے دیا ہے لیکن یہ خاص مقدار پانچ سیر یا دس سیر خوشی سے دیا یا لحاظ سے۔ تو یہ شخص خوب اندازہ کر لے گا کہ اکثر محض آنے والے کے لحاظ سے یا محلہ میں بدنامی کے خیال سے دیا جاتا ہے۔ یعنی چونکہ یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر نہ دیں گے تو تمام محلے والے ہم کو کنجوس فقیر کہیں گے اور مانگنے والے بدنام کرتے پھریں گے اس لیے مجبوری دیا جاتا ہے۔

صاحبو! اس طرح وصول کرنے کی نسبت حدیث شریف میں صاف آیا ہے فرماتے ہیں لَایَحِلُّ مَالَ اِمْرَءٍ اِلاَّ بِطِیْبٍ مِنْ نَفْسِہٖ یعنی کسی کا مال بدوں اس کے جی کو خوشی

سے لینا جائز نہیں ہے۔ اور اگر ایک دو مثالیں ایسی بتلا بھی دو کہ فلاں شخص نے خوشی سے دیا تو زیادہ سے زیادہ چار من میں چار سیر حلال نکلے گا۔ باقی سب حرام۔ اب شریعت کا حکم اس کے متعلق سنیے کہ حلال اور حرام کا مجموعہ جب کہ حرام زیادہ ہو جیسا کہ آج کل اس چندہ میں اکثر یہی ہے حرام ہوتا ہے۔ اور اگر اب بھی سمجھ میں نہیں آتا تو یہ کیجئے کہ جس محلے سے اب تک وصول نہیں ہوا اس میں سب سے کہہ دو کہ اس کام کے لیے اناج جمع کیا جارہا ہے اور اعلان کر کے ایک کوٹھی کسی موقعہ پر رکھ دو۔ اور اس میں قفل لگا دو اور کہہ دو کہ چار دن کے بعد جس قدر اناج جمع ہو جائے گا اس کو پکا کر تقسیم کیا جائے گا۔ پھر پانچویں دن اس کوٹھی کو کھول کر دیکھو۔ انشاء اللہ ایک چوتھائی اناک بھی اس میں نہ ہوگا۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ خوشی سے لوگ کتنے دیتے ہیں اور مسلمانوں کے پاس رکھا ہی کیا ہے کہ وہ خوشی سے اتنا دے سکیں۔ ان بے چاروں کو خود تو کھانے کو ملتا ہی نہیں دوسروں کو کہاں دیدیں گے تو ایسے وقت سب سے اول تو یہ لغو اور بے ہودہ حرکت کی جاتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ اگر پانی برسنے والا بھی ہو تو نہ برسے کیونکہ ایک تو گناہ دوسرے بندے کی حق تلفی جس سے خدا تعالیٰ کی ناگواری اور زیادہ ہو کر پانی برستے رک جاتا ہے۔ دوسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ جن لوگوں نے خوشی سے بھی دیا ہے انہوں نے اپنا مال دیا ہے یا دوسرے کا۔ اور اگر دوسرے کا مال دیا ہے تو اس کی اجازت سے دیا ہے یا بلا اجازت۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میاں کا مال بغیر اجازت بیوی نے دے دیا اور شوہر بمجبوری سن کر خاموش رہا، اور بعض جگہ ناخوشی کو ظاہر بھی کر دیتا ہے۔

چنانچہ کانپور میں ایک مرتبہ مدرسہ میں جلسہ ہوا۔ ایک صاحب کے گھر سے بعض حقہ باز مہمانوں کے لیے حقہ منگایا گیا۔ بیوی نے شوہر کا مراد آبادی حقہ بھیج دیا۔ شوہر کو جو خبر ہوئی تو انہوں نے بیوی کو خوب پیٹا اور اگر اب بھی سمجھ میں نہیں آیا تو انتظار کیجئے۔ تھوڑے دنوں میں خدا تعالیٰ خود سمجھا دیں گے۔ یعنی بعد موت کے۔ کیونکہ اس وقت اپنے کاموں کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس کے بعد اناج پینے کا وقت آتا ہے اس میں وہ گڑبڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پینے والی نہیں ملتی تو رئیسوں سے کام لیا جاتا

ہے تو ان کے ذریعہ سے چماریوں کو بے گار میں پکڑ کر ان سے پسوایا جاتا ہے اور اگر ان کو پسائی دی بھی جاتی ہے تو بہت ہم کم۔ اور اگر پوری ہی دے دی تب بھی تو کسی سے زبردستی کام لینا حرام ہے۔ اس کے بعد اس کے پکانے کا وقت آتا ہے۔ پکوانے کے انتظام کرنے والے اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں کہ نہ ان کو خدا تعالیٰ کا خوف نہ حلال وحرم کی پرواہ۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اندھا بانٹے شیرینی اپنے اپنے کو دے یا جس کو جی چاہا دیا۔ جس کو چاہا انکار کر دیا۔ اکثر بھنگی چمار چماریاں اس کھانے کی مستحق سمجھی جاتی ہیں اور چیلیں گوشت کی حقدار سمجھی جاتی ہیں۔ اور ویسے بھی مریض کے لیے صدقہ دینے میں چیلوں کے کھلانے کی رسم ہے۔ اور شہروں میں ہم نے صدقہ کے متعلق بعض خاص رسوم دیکھی ہیں عین اکثر لوگ اڑد اور تیل اور پیسے تقسیم کرتے ہیں اور اکثر بھنگیوں کو دیتے ہیں۔ اس کی وجہ غور کرنے سے یہ سمجھ میں آئی کہ عوام الناس بلا کو کالی سمجھتے ہیں۔ اس لیے چھانٹ کر کالی کالی چیزیں دیتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے بلا دفع ہوگی۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کھانوں کا حقدار بھنگیوں اور چماروں کو سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ لوگ بھی اکثر کالے ہوتے ہیں۔ گویا جب وہ کھائیں گے تو ساری بلا ان کے پیٹ میں چلی جائے گی۔ مگر وہ ایسے بلانوش ہیں کہ ان کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح اکثر ایسے لوگ بھی اس کھانے کو لے جاتے ہیں جو خود بھی خوش حال ہوتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے محلہ میں ایک مرتبہ کھانا پکا تھا۔ ایک بڑے میاں کو میں نے دیکھا کہ کھانا لیے چلے آ رہے ہیں، میں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا۔ کہنے لگے کہ یہ کھانا ذرا مزیدار ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ جناب آپ کو لینا جائز نہیں۔ تب ان کی سمجھ میں آیا۔ اور ان خرابیوں کے سبب میں تو ایسے کھانے کو کسی کے لیے بھی پسند نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ ہمارے مدرسے کے طالب علموں کی بھی دعوت کی گئی تھی۔ لیکن میں نے اس کو منظور نہیں کیا کیونکہ یہ جائز نہیں ہے۔

غرض کہ آج کل چندوں کے جمع کرنے میں اس قدر خرابیاں ہوتی ہیں جس سے اکثر چندے ناجائز ہو جاتے ہیں۔ اکثر مدرسوں کے چندوں میں بھی اس کا خیال نہیں کیا

جاتا اور پھر اپنی اس حرکت پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہم نے خوب کوشش کی کوشش یہ کہ خوب چمٹ کر وصول کیا۔ اور بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے دین کے کام میں کوشش کر کے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیا۔

صاحبو! خدا تعالیٰ نے کب کہا تھا کہ تم لوگوں کو چمٹ کر اور پریشان کر کے وصول کرنا اور ہمارے حکموں کو چھوڑ دینا۔ بعض لوگ اس کے جواب میں کہا کرتے کہ صاحب ہم نے اپنے لیے تو نہیں کیا۔ خدا تعالیٰ کے کام کے لیے کیا ہے۔

صاحبو! یہ عذر تو نہایت برا ہے۔ کیونکہ اگر اپنے لیے کرتے تو خیر کچھ تو ملتا دینا ہی سہی۔ اور اب تو سوائے گناہ کے اور کچھ نہیں ملا۔ اور یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے جو محض دین کا کام سمجھ کر چندہ کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی غرض کے حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ پس قحط سے بچنے کی یہ تدبیریں نہیں۔

قحط کے رفع کی صحیح تدبیر اور دستور العمل:

تدبیر اس کی اور ہے اور اس کا سمجھنا ایک بات کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ وہ یہ کہ ہر مصیبت سے آدمی اس وقت بچ سکتا ہے کہ جب اس مصیبت کا سبب دریافت کیا جائے پھر اس سبب کو دور کیا جائے۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اس موقع پر بھی اول بارش نہ ہونے کے اسباب دریافت کرنے چاہئیں اور پھر بارش نہ ہونے۔اور ہونے کے اسباب کو دور کیا جائے۔ سو بارش نہ ہونے کا ظاہری سبب تو گناہ ہے اور اصلی وحقیقی سبب خدا کی مشیت اور ارادہ ہے۔ اور بارش ہونے کا ظاہری سبب تو طاعت اور عبادت ہے اور اصلی سبب خدا کی مشیت ہے۔ یہ سب باتیں قرآن وحدیث سے ثابت ہیں تو تدبیر بارش ہونے کی یہ ہوئی کہ گناہوں کو بالکل چھوڑ دیں اور نیک کاموں کو پوری طرح اختیار کریں۔ یہ تو بارش ہونے کا سبب ظاہر ہے جس کا اختیار کرنا ضروری ہے اور ہمارے قبضہ میں بھی ہے رہا حقیقی اور اصلی سبب جو کہ خدا تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہے تو یہ بات اگرچہ ہمارے قبضہ میں نہیں مگر اس کے حاصل کرنے کا بھی طریقہ بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ اے اللہ! آپ بارش عطا فرما دیجیے۔ وہ دعا کو قبول فرما کر اپنی مشیت سے

کام پورا فرما دیتے ہیں۔

تو حاصل ساری تدبیر اور دستور العمل کا تین عمل ہوئے۔ ایک تو گناہ نہ کرنا کہ اس میں ہم لوگ بہت زیادہ مبتلا ہیں۔ اور ستم یہ ہے کہ ایک نہیں دو نہیں۔ طرح طرح کے گناہ پوشیدہ اور علانیہ نہایت بے باکی سے کرتے ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو بالکل پاک صاف سمجھتے ہیں جس سے توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی اور گناہ بھی معاف نہیں ہوتے۔

بزرگوں کی تواضع وانکسار کے واقعات:

حالانکہ ہمارے بزرگوں کی یہ حالت تھی کہ باوجود بالکل پاک وصاف ہونے کے وہ اپنے کو گنہگار سمجھتے تھے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ شہر مدین میں قحط پڑا۔ لوگ ان کے پاس دعا کرانے کے لیے گئے تو آپ نے فرمایا کہ بارش گناہوں کے سبب نہیں ہوا کرتی۔ اور سب سے زیادہ گنہگار شہر میں میں ہوں۔ اس لیے مجھے شہر سے نکال دو تو بارش ہو جائے گی۔ اور یہی نہیں کہ محض زبانی کہہ کر خاموش ہو گئے بلکہ آپ اس شہر سے چلے بھی گئے۔

افسوس! ہم لوگ رات دن گناہوں میں مبتلا رہیں لیکن ہم کو کبھی اس کا وہم بھی نہیں ہوتا کہ یہ قحط ہمارے اعمال کی شامت ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی جو بڑے پیر صاحب کے نام سے مشہور ہیں جن کی بزرگی وعظمت کو سب لوگ جانتے ہیں۔ ان کی ایک دعا شیخ سعدی نے گلستان میں نقل کی ہے کہ۔

من نگویم کی طاعتم بپذیر
قلم عفو برگنا ہسم کش

''ترجمہ: میں یہ نہیں کہتا کہ میری طاعت وعبادت کو قبول فرمالیجیے اس لیے کہ میرے پاس طاعت ہی کہاں ہے۔ صرف یہ التجاء ہے کہ میرے گناہوں کو بخش دیجیے۔ دیکھیے اس دعا سے ان کی کیسی تو تواضع وعاجزی ٹپکتی ہے۔ تو جب یہ حضرات اپنے کو ایسا سمجھیں' تو ہمیں کیا حق ہے کہ ہم اپنے کو جنید رحمۃ اللہ علیہ وقت

سمجھیں اور اگر جنید رحمۃ اللہ علیہ ہی سمجھیں تب بھی اپنے کو گنہ گار سمجھنا چاہیے' کیونکہ جنید رحمۃ اللہ علیہ تو اپنے کو بہت گنہگار سمجھتے تھے نہ کہ بالکل پاک وصاف۔

ہمارے تقویٰ کی مثال:

مگر ہمارا تقوے ایسا لو ہے جڑا ہے کہ فسق وفجور جیسے گناہوں سے بھی نہیں جاتا۔ کچھ بھی کریں مگر پھر بزرگ کے بزرگ۔ ہمارے تقوے کی وہ حالت ہے کہ جیسے بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ وہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔

اس کا قصہ مثنوی میں لکھا ہے کہ بی بی تمیزہ ایک عورت فاحشہ اور بازاری تھی۔ کسی بزرگ نے اس کو نصیحت کی اور نماز پڑھنے کی تاکید کی اور وضو بھی کرا دیا۔ اس نے نماز شروع کر دی۔ ایک مدت کے بعد جوان بزرک کا وہاں گزر ہوا تو بی بی تمیزہ بھی ملیں۔ انہوں نے پوچھا کہ بی نماز بھی پڑھا کرتی ہو کہنے لگی' جی ہاں! پڑھتی ہوں۔ انہوں نے کہا اور وضو بھی کرتی ہو۔ کہنے لگی کہ آپ نے اس دن کرا نہیں دیا تھا۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قصہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ہم لوگوں کا تقوے ایسا ہی ہے جیسا بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ وہ نہ زنا سے ٹوٹتا ہے نہ اور کسی فعل سے اسی طرح ہم لوگ اپنے ایسے معتقد ہیں کہ اپنا کوئی عیب ہی نظر نہیں آتا۔ البتہ دوسروں پر طعن کرنے میں خوب پختہ ہیں۔

اس بات کی تعلیم کو اپنے عیبوں پر نظر ہونا چاہیے:

کیوں صاحبو! کیا ہم کو اپنے گناہوں کے معاف کرانے کی ضرورت نہیں ہے جو اس کو چھوڑ کر دوسروں کے پیچھے پڑ گئے۔ کیا ہم آنکھ' ناک کان' ہاتھ پیر کے گناہوں میں مبتلا نہیں ہیں۔ کیا ہمارے ذمہ دوسروں کی زمین نہیں دبا رکھی۔ کیا بہت سے لوگ موروثی زمین نہیں دبائے بیٹھے۔ کیا ہم میں زنا کاری نہیں یا رشوت ستانی سودخوری نہیں۔ باوجود اس کے پھر ہم میں سے بعض لوگ بارش نہ ہونے پر' یا کسی دوسری بلا آنے پر تعجب کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم کس گناہ میں پکڑے گئے۔

صاحبو! آپ کو تو اس پر تعجب ہونا چاہیے کہ ہم کو جو دونوں وقت روٹی دی جاتی ہے یہ کون سی طاعت سے مل جاتی ہے۔ اس واسطے کہ باغیوں کو تو روٹی نہیں ملا کرتی اور رات دن نافرمانی کرنا۔ یہ بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ تو تعجب مصیبت نہ آنے پر کرنا چاہیے نا کہ مصیبت آنے پر۔

غرض ایک تدبیر تو یہ ہے کہ یہ سارے گناہ چھوڑ دو۔ اور صدق دل سے توبہ کرلو۔

دوسری تدبیر قحط کی طاعت کو اختیار کرنا ہے

اور دوسری تدبیر یہ ہے کہ نیک کاموں کو اختیار کرو۔ جن لوگوں کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہے وہ زکوۃ دیں۔ جن پر حج فرض ہے وہ حج کریں۔ اور پختہ قصد کرلیں کہ انشاء اللہ عید کے اگلے دن یا جب تک جہاز ملنے کی توقع ہو اس دن ضرور حج کو چلے جائیں گے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ سالہا سال سے ان کا ارادہ حج کا ہے لیکن آج تک پورا ہی نہیں ہوا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ ان کو لگا رہتا ہے۔ ہر سال ارادہ کرتے ہیں لیکن پورا نہیں ہوتا۔

تیسری تدبیر قحط کی دعا ہے

اور تیسری تدبیر یہ ہے کہ دعا کریں لیکن دعا کا یہ طریقہ نہیں کہ جماعت میں سے کسی ایک نے پکار دیا کہ بارش کے لیے دعا کرو۔ اور دوسروں نے کہہ دیا کہ اے اللہ! باران رحمت نازل فرما دیجیے حالانکہ نہ دل میں درد ہے نہ قلب کو توجہ ہے۔

دعا کا طریقہ:

بلکہ درد کے ساتھ خوب دل لگا کر دعا کرو۔ اور اگر درد اپنے اختیار میں نہیں ہے تو دل لگا کر توجہ کے ساتھ دعا کرنا تو اپنے اختیار میں ہے۔ اور کم سے کم اتنی توجہ تو ہو جتنی حکام سے التجا کرتے وقت ہوا کرتی ہے۔

صاحبو! جو دعا توجہ کے ساتھ کی جاتی ہے وہ اکثر قبول ہوتی ہے۔ اور یہ میں احتیاطا کہہ رہا ہوں۔ ورنہ ایسی دعائیں سب ہی قبول ہوتی ہیں۔

اب اس دعا کی تین صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر نماز کے بعد دعا کرے۔ دوسرے یہ کہ علاوہ فرض نمازوں کے ہر شخص کچھ نفلیں پڑھ کر دعا کیا کرے۔ تیسرے یہ کہ سب مل کر کسی جنگل میں جمع ہوں اور وہاں جا کر خدا تعالیٰ سے دعا کریں۔ ان تینوں میں سے جو آسان معلوم ہو اس کو کرلیں۔ پس اصل تدبیر بارش کی یہ ہے نہ وہ جو لوگوں نے اپنی طرف سے گھڑ رکھی ہے۔ خدا تعالیٰ سے دعا کریں۔ ان تینوں میں سے جو آسان معلوم ہو اس کو کرلیں۔ خدا تعالیٰ کے کلام سے یہ سب تدبیریں معلوم ہوتی ہیں یہ تو حاصل تھا **وَاتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا** کا۔ ترجمہ: گھروں میں جاؤ ان کے دروازوں سے یعنی جو کام کرو اس کے طریقہ سے کرو۔

باقی آیت کی تفسیر (وعظ ختم)

آگے خدا تعالیٰ جو اصل مقصود ہے اس کو بیان فرماتے ہیں **وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ** ''ترجمہ اور خدا سے ڈرو امید ہے کہ تم کامیاب ہوگے۔''

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جو کام کرو۔ اس میں یہ دیکھ لو کہ ہم خلاف شرع تو نہیں کرتے۔ خواہ دین کا ہو یا دنیا کا۔ دین کے کام میں تو یہ دیکھ لو کہ شریعت نے اس کے کامیابی کا جو طریقہ بتلایا ہے وہ کیا ہے اس کے موافق کرو اور دنیا کا جو کام کرو اس میں صرف یہ دیکھ لو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔

اس وقت آیت کے متعلق جو مضمون بیان کرنا تھا وہ ختم ہوا۔ اور چونکہ اس موجودہ حالت میں اس مضمون کا بیان کرنا نہایت ضروری تھا۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔

اس لیے اس کو بیان کردیا۔ اور اس مضمون کو کچھ اسی حالت موجودہ کے ساتھ خصوصیت نہیں' بلکہ ہر وقت ہر کام میں اسی کا خیال رکھنا چاہیے۔

اب ایک بات اور بتلاتا ہوں کہ ویسے تو ہر طاعت کا اختیار کرنا رفع قحط کی تدبیر ہے۔ جیسے پہلے بیان ہوا۔ مگر صدقہ کرنا بھی اس کی ایک خاص تدبیر ہے۔ کیونکہ صدقے کو خدا تعالیٰ کے غصے کے دور کرنے میں بہت دخل ہے لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں جو لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے' بلکہ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں وقت اپنے اپنے گھر میں سے ایک

ایک روٹی غریبوں کو دے دیا کرو جس قدر توفیق ہو۔ یہ آسان بھی ہے اور ہمیشہ جاری بھی رہ سکتا ہے۔ یا جو لوگ صاحب وسعت ہیں وہ ایک ایک خوراک دونوں وقت مقرر کر دیں اس میں غلہ بھی خرچ ہو جائے گا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔

حدیث شریف میں صدقہ چھپا کر دینے کی یہاں تک تاکید آئی ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس طرح صدقہ کرو کہ دائیاں ہاتھ دے اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

لوگ کہتے ہیں کہ مولوی نیک کاموں سے منع کرتے ہیں۔ صاحبو! وہ منع نہیں کرتے۔ بلکہ تمہاری چیزوں کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں۔ اور تم کو ان کے صرف کرنے کا شرعی طریقہ بتلاتے ہیں کہ اس طرح کرو تا کہ ٹھکانے لگے۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہم کو عمل کی توفیق دے۔ اور ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ اور باران رحمت نازل فرمائے۔

اٰمِیْن یَارَبُّ الْعٰلَمِیْنَ

تمت

(۵۰) نفس کو بھولنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ ماثورہ:

اَمَّا بَعۡدُ: فرمایا اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں:۔

اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ○

''ترجمہ: کیا دوسروں کو تو نیک بات کی تاکید کرتے ہو۔ اور اپنے کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم پڑھتے ہو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو۔ کیا پس تم نہیں سمجھتے۔''

یہ ایک آیت ہے جس کے اندر ظاہر میں صرف عالموں کو نصیحت کی گئی ہے۔ یہ آیت اس معنی میں نہایت مشہور ہے۔ اور اکثر لوگ اس سے یہی سمجھتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق صرف عالموں سے ہے۔ اور اس کا اثر یہ ہے کہ بے علم لوگ اپنے کو بے علمی کی وجہ سے اس خفگی سے الگ سمجھتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس کام پر خفگی کی گئی ہے اور جو کام اس خفگی کا سبب ہے اس میں عالم لوگ بھی عالموں سب کے لیے اس آیت کا عام ہونا بخوبی ظاہر ہو جائے گا۔ اسی طرح قرآن شریف کی دوسری اور آیتیں بھی ہیں۔ جن میں سے بعض آیتوں میں بظاہر صرف عالموں کو ارشاد معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے عام لوگ ان کے مضمون سے اپنے کو بری سمجھتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات کسی آیت کے مضمون کی وجہ سے عالموں پر ناراضی دیکھ کر اپنا عالم نہ ہونا غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنی بے علمی پر فخر کرتے ہیں اور بعض آیتوں میں عام لوگوں کو ارشاد معلوم ہوتا ہے۔ ان سے عالم اپنے کو بری سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ تقسیم اسی وقت تک صحیح ہے جب تک سرسری نظر ان آیتوں

کے مضمون پر کی جائے۔ ورنہ غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کے سب احکام عام ہیں۔ جاہل اور عالم سب ان میں برابر ہیں پس نہ کسی کو ناز کرنے کا موقع ہے اور نہ اپنے آپ کو کسی حکم سے بری سمجھنے کی گنجائش ہے۔ اور چونکہ یہ آیت بھی شریعت کے حکموں میں سے ایک حکم ہے اس لیے اس کا مضمون بھی سب کو عام ہے۔ یہ مختصر تحقیق ہے اس آیت کے مضمون کی۔ اب مجھے اس آیت سے جو بیان کرنا مقصود ہے اس کو مختصر طور بیان کرتا ہوں۔ پوری تفصیل اس کی انشاء اللہ تعالیٰ آگے بیان میں ہوگی۔

حاصل آیت کا:

اس کے لیے اول آیت کا ترجمہ کردوں تاکہ آیت کے ظاہری معنی معلوم ہو جائیں۔ فرماتے ہیں کہ کیا تم دوسروں کو تو نیک اور بھلی باتوں کی تاکید کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ (یعنی یہ کیا بے ہودہ حالت ہے) حالانکہ تم اللہ کی کتاب پڑھتے ہو (اور اس میں یہ لکھا ہے کہ عمل قول کے مخالف ہونا بہت برا اور حکم خداوندی کے بالکل خلاف ہے) یا تم سمجھتے نہیں ہو کہ یہ برا ہے اور خدا تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے۔ یہ حاصل ہے اسی آیت کے ظاہری معنی کا۔

آیت اتامرون الناس الخ کا حکم عام لوگوں نے صرف عالموں کے لیے سمجھا ہے:

اس آیت کے متعلق ایک شبہ تو عالموں کو ہوا اس کو انشاء اللہ درمیان میں بیان کر دیا جائے گا۔ اور ایک شبہ عام لوگوں کو ہوا وہ یہ کہ انہوں نے صرف عالموں کے ساتھ ہی اس آیت کا تعلق سمجھا اور اپنے کو بری سمجھا اور یہ سمجھا کہ صرف اس میں عالموں پر ملامت ہے۔ اور قرنیہ اس شبہ کا یہ ہوا کہ اس آیت کا طرز ایسا اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو کہ دوسروں کو وعظ اور نصیحت کرتا ہے۔ اور یہ منصب صرف عالموں کا ہے۔ اس آیت میں صرف عالموں کو ہی حکم ہوگا۔ اور یہ عام لوگوں کا شبہ ہے۔ اور اثر اس شبہ کا یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس حکم سے بالکل الگ سمجھا۔ اور بہت

بڑی خرابی ہے۔ اس واسطے کہ سمجھنا ایسا ہے جیسا کوئی مریض اپاہج کر دینے والے مرض ہمیں گرفتار ہو اپنے کو اس مرض سے پاک سمجھنے لگے' سو ظاہر ہے کہ ایسا مریض نہایت بدقسمت ہے اور اس کا انجام نہایت برا ہے۔ کیونکہ اگر یہ اپنے کو مریض سمجھتا تو اس کے علاج کی بھی فکر کرتا' کسی حکیم سے رائے لیتا' اس کی تجویز پر عمل کرتا' مضر چیزوں سے پرہیز کرتا۔ اور جب کہ وہ اپنے کو مریض ہی نہیں سمجھتا تو نہ کسی حکیم سے رائے لینے کو ضروری سمجھے گا تو پرہیز کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ مرض میں ترقی ہوتی جائے گی۔ اور پھر اس سے دوسرے مرض پیدا ہوں گے۔ ایک خرابی تو یہ ہوئی دوسرے جب عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ عالموں کو اپنے عمل نہ کرنے اور دوسروں کے نصیحت کرنے پر ملامت ہوئی ہے تو انہوں نے اپنے عالم نہ ہونے کو غنیمت جانا۔ بلکہ اکثر اوقات اپنے جاہل رہنے پر فخر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے تو جاہل ہی اچھے۔ حالانکہ یہ نہایت لغو فخر ہے۔ اس کی حقیقت انشاء اللہ آگے معلوم ہوگی۔ آج کل ہم لوگوں کی کچھ ایسی عجیب حالت ہے کہ ہم کو نہ ناقص چیزوں کی خبر' اور نہ اعلیٰ درجہ کی چیزوں پر اطلاع جس چیز پر جی چاہا فخر کرنے لگے۔ جس چیز میں چاہا عیب نکال دیئے۔

بعض لوگ اپنے غریب ہونے پر فخر کرتے ہیں:

چنانچہ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ وہ اپنے غریب اور مفلس ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ بھلا اگر امیر آدمی فخر کرے تو ایک حد تک بجا بھی ہے کیونکہ اس کے پاس فخر کا سامان موجود ہے۔ غریب آدمی جس کے پاس نہ کھانے کو ٹکڑا نہ پہننے کو لنگوٹا۔ وہ کس چیز پر فخر کرے۔ اور پھر لطف یہ کہ یہ فخر زبان سے ہی نہیں' بلکہ عمل میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی موقع تقریب وغیرہ کا ہوتا ہے تو ہم نے ان غریبوں کو ہی زیادہ اینٹھتے ہوئے دیکھا ہے ان ہی کو سب سے زیادہ فخر اور ناز سوجھتے ہیں۔ اور اس کی یہ بھی وجہ ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے اور یہ خیال کریں گے کہ یہ شخص ہماری دعوت کا منتظر ہی بیٹھا تھا۔ اسی طرح ان غریبوں کا ایک اور مقولہ بھی مشہور ہے کہ میاں کوئی مال میں مست ہے کوئی کھال میں مست ہے ہماری سمجھ

میں نہیں آتا کہ کھال میں مست ہونے کے کیا معنی ہیں۔ لیکن خیر انہوں نے اتنا تو اقرار کیا کہ ہم میں عقل نہیں کیونکہ اپنے کو مست کہا اور مستی عقل کے خلاف ہوتی ہے اور اگر عقل ہوتی تو ایسی حرکت ہی کیوں کرتے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ کو تین آدمیوں سے سخت نفرت ہے ایک وہ شخص جو بادشاہ ہو کہ جھوٹ بولے کیونکہ جھوٹ بولنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بات سچ بولنے میں اصل نہ ہو سکے اس کو اس ذریعہ سے حاصل کیا جائے۔ اور یہ ضرورت اس شخص کو پیش آ سکتی ہے جس کے مقابل کوئی ایسی قوت موجود ہو جو اس کے مقصود کو حاصل نہ ہونے دے اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کو کوئی ایسا مقابل پیش نہیں آتا۔ اس لیے اس کا جھوٹ بولنا۔ اس کی خیانت کی کھلی دلیل ہے۔ دوسرے وہ شخص کہ بڈھا ہو اور پھر زنا کرے کیونکہ زنا اول تو حرام ہے' دوسرے بڈھے آدمی میں کوئی ایسا جوش بھی نہیں جس کی بناء پر کسی درجہ میں اس کو معذور کہا جا سکے۔ اس لیے اس کا یہ فعل بھی اس...... کی خباثت کی دلیل ہے۔ تیسرے وہ شخص کہ غریب ہو کر تکبر کرے گویا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اے شخص تیرے پاس کیا چیز ہے جس پر تو تکبر کرتا ہے۔ تو ایسے ہی جاہل کا فخر بھی بہت برا ہے۔ خاص کر جب کہ جہالت پر فخر ہو۔ یعنی جاہل آدمی کے دوسری چیزوں پر فخر کرنا بھی زیبا نہیں لیکن جہالت پر فخر کرنا تو بہت ہی نازیبا ہے۔ کیونکہ علم انسان کے لیے زندگی ہے اور جہالت موت۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا اکثر امیر جو روپیہ پیسے پر فخر کرتے ہی۔ یہ بھی حقیقت کو وجہ نہ جاننے کی وجہ سے ہے' کیونکہ جب ان میں علم نہیں تو گویا فخر کی کوئی بات نہیں۔

امیروں کا روپیہ پیسے پر فخر کرنا جہالت ہے اور مال کا نتیجہ اور خرابیاں:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ دنیا پر فخر کرنے والوں کی نادانی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حسب نسب کوئی فخر کی چیز نہیں کیونکہ تمام لوگ آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں۔ آگے کہتے ہیں کہ البتہ اگر فخر کریں تو وہ عالم کر سکتے ہیں کیونکہ وہ خود سیدھے راستے پر ہیں اور دوسروں کو راہ بتلاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ بغیر علم کے مال بھی فخر کی چیز نہیں۔ اور مال کو اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس کا نہ ہونا اچھا ہے۔ کیونکہ مال کی حالت سانپ کی سی ہے کہ جیسا اس کا ظاہر نہایت چکنا اور چمکدار۔ لیکن اس کے اندر ہلاک کر دینے والا زہر بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح مال اگر چہ ظاہر میں آسائش اور آرائش و راحت و آرام کا سبب ہے۔ لیکن اس کی اندرونی حالت تمام خرابیوں اور مصیبتوں کی جڑ ہے۔ تو مال پر فخر کرنا ایسا ہے جیسا کوئی اس پر فخر کرنے لگے کہ میرے تمام جسم کو سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی اس پر فخر کرے تو ظاہر ہے کہ سب عقلمند اس کو احمق بنائیں گے اسی طرح مال پر فخر کرنے والے کو بھی احمق بنائیں سمجھنا چاہیے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے علم اور مال کے بارے میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی اسی تقسیم پر ہم راضی ہیں کہ ہم کو علم اور ہمارے دشمنوں کو مال دیا۔ کیونکہ مال تو فنا ہو جائے گا اور علم ہمیشہ باقی رہے گا۔

صاحبو! مال وہ چیز ہے کہ اکثر تو حالت تندرستی میں بھی جاتا رہتا ہے ورنہ موت کی بیماری میں تو اس کا جاتا رہنا بالکل ہی یقینی ہے۔ کیونکہ شریعت کا قانون ہے کہ موت کی بیماری میں دو تہائی مال سے مالک کا حق جاتا رہتا ہے۔ اور وارثوں کا حق اس کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس بیماری میں وصیت کرے یا اپنا مال کسی کو ہبہ کرنا چاہے تو وہ ایک تہائی میں معتبر ہوتا ہے جیسے اگر کسی شخص کے پاس تین ہزار روپیہ ہو اور وہ ان تین ہزار کی وصیت کرے یا دو ہزار کی وصیت کرے تو یہ صرف ایک ہزار میں جاری ہوگی۔ اور بقیہ دو ہزار وارثوں کا حق کل مال میں متعلق ہوتا ہے۔

چنانچہ اگر وصیت نہ کرے تو یہ تہائی بھی وارثوں کو ہی مل جاتا ہے پس معلوم ہوا کہ مال جس کو ہم اپنا سمجھ رہے ہیں واقع میں ہمارا نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات ایسوں کو پہنچ جاتا ہے کہ جن کو دینا گوارا بھی نہیں ہوتا۔ پھر اس تہائی پر بھی جو کچھ اختیار رہتا ہے وہ مرنے سے پہلے تک رہتا ہے۔ اور مرنے کے بعد تو کچھ بھی اختیار نہیں رہتا۔ یعنی اگر کوئی کفن بھی نہ دے تو یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال بہت جلد جدا ہونے والا ہے یہاں

تک کہ قبر تک بھی ساتھ نہیں دیتا۔ کیونکہ قبر میں صرف ایک کفن جاتا ہے۔ مگر کفن سے مردے کو کیا فائدہ غرض نہ قبر میں گیا نہ حشر میں گیا۔ اس لیے کہ وہاں قیامت کے دن یہ حالت ہوگی کہ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ۔ یعنی قیامت کے دن خدا تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم ہمارے پاس بالکل تنہا آئے ہو کہ کوئی چیز بھی تمہارے ساتھ نہیں بالکل ایسے جیسا ہم نے تم کو اول مرتبہ پیدا کیا تھا۔ یعنی یکہ وتنہا۔ ہاں اگر زندگی میں کچھ اللہ کے راستہ میں دے دیا تو وہ ساتھ جائے گا۔ لیکن اس کا جانا کچھ مال ہوئے پر موقوف نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے سے خود مال تو جاتا نہیں۔ بلکہ اس کا ثواب جاتا ہے جو کہ قیامت میں کام آئے گا اور ثواب کا ملنا کچھ مال پر موقوف نہیں۔ بلکہ اس کا مدار نیت پر ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص لاکھوں روپیہ کسی کار خیر میں خرچ کرے اور نیت درست نہ ہو تو اس کو ثواب بالکل نہ ملے گا اور اگر ایک پیسہ بھی پاس نہ ہو اور یہ نیت ہو کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو مال دیں تو ہم خوب نیک کاموں میں خرچ کریں تو ثواب پورا مل جائے گا۔

علم کی فضیلت:

برخلاف علم دین کے جس کے پاس یہ ہو۔ وہ دنیا بھر سے بے پرواہ ہے۔ اس کو نہ کسی دوست کی ضرورت نہ کسی مددگار کی ضرورت' وہ ہر وقت خوش اور مطمئن ہے۔ بلکہ اس کی خوشی اور اطمینان کی یہ حالت ہے کہ کسی بادشاہ کو بھی وہ خوشی اور اطمینان نصیب نہیں۔ بادشاہ کو سب سے اول اپنے مصاحبوں ہی سے خطرہ ہوتا ہے کہ یہ مجھے زہر نہ دے دیں' مار نہ ڈالیں ایسے کتنے واقعات ہو چکے ہیں کہ خود بادشاہ کی بیگم نے اس کو زہر دے دیا۔ اور عالم کی یہ شان ہے کہ تن تنہا جنگل میں ہے مگر اس بادشاہ سے زیادہ اطمینان میں ہے جو کہ حفاظت میں ہو۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ علم کے فائدے اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں ہاں جن لوگوں کو علم نہیں ہے ان کو تعجب ہو تو کچھ تعجب نہیں۔

کون سا علم فخر کے قابل ہے اور اس علم کی علامتیں کیا ہیں:

مگر علم سے مراد یہ نہیں کہ محض الفاظ کی صحت کر لی ہو اور ان کا ترجمہ جانتا ہو۔ بلکہ علم ایک نور ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں وجعلناله نورا یمشی به فی الناس ترجمہ: اور کر دیا ہم نے اس کے لیے ایک نور جس کو لیے پھرتا ہے لوگوں کے درمیان اور اس نور کے ہوتے ہوئے دل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر اس کے قدموں میں سونا چاندی ڈال دیا جائے تو اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اور اگر چاروں طرف سے اس کو تلواروں میں گھیر لیا جائے تب بھی اس کے دل پر ہراس اور خوف نہیں ہوتا۔

جناب رسول اللہ ﷺ کے علم کی حکایت:

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضور ﷺ کسی سفر میں تھے۔ دو پہر کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرمانے کے لیے اترے۔ اتفاق سے صحابیوں رضی اللہ عنہم سے میں کوئی بھی اس وقت قریب نہ تھا۔ آپ ﷺ نے اپنی تلوار درخت پر لٹکا دی اور درخت کے نیچے سو گئے۔ اسی وقت آپ ﷺ کے ایک دشمن کو خبر ہوئی اس نے موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً وہاں آیا۔ آ کر دیکھا تو واقعی حضور ﷺ تن تنہا سو رہے تھے اور تلوار درخت میں لٹک رہی تھی۔ اس نے اول دبے پاؤں آ کر تلوار پر قبضہ کیا اور اس کے بعد اس کو نہایت آہستگی سے نیام سے نکالا اور آپ ﷺ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ جب بالکل تیار ہو گیا تو آپ ﷺ کو بیدار کیا اور پوچھا کہ مَنْ یَعْصِمُكَ مِنِّیْ یعنی اس وقت کون آپ ﷺ کو مجھ سے بچا سکتا ہے۔ آپ ﷺ اس کی یہ شکل دیکھ کر اپنی جگہ سے ہلے تک بھی نہیں اور اس کے سوال کے جواب میں نہایت اطمینان سے یہ فرمایا کہ اَللّٰہُ یعنی اللہ مجھ بچائے گا۔ بھلا کوئی ایسا کر کے تو دکھلا دے بغیر خدا کے ساتھ ایک خاص تعلق کے کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ حضور ﷺ کے اس جواب سے کافر کے ہاتھ میں رعشہ پڑ گیا' تلوار گر گئی۔ پھر حضور ﷺ نے تلوار ہاتھ میں لے کر پوچھا کہ اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ کہنے لگا آپ ﷺ ہی حضور ﷺ نے فوراً تلوار نیام میں کر لی اور اس کو چھوڑ دیا۔ پھر وہ شخص مسلمان ہو گیا۔

غرض نور علم اس کا نام ہے ورنہ نرے الفاظ تو شیطان بھی جانتا ہے۔ یہ ہے علم اور اس کا اثر، جس کو بزرگوں نے کہا ہے کہ ایسے عالم کو نہ کسی سے امید ہوتی ہے اور نہ خوف۔

کامل عالم مصیبت کے وقت گھبراتا نہیں:

اور راز اس کا یہ ہے کہ کامل علم سے خدا تعالیٰ کی معرفت[1] کامل حاصل ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ۔ (ترجمہ) اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو۔ اور وہ تمہارے حق میں خیر ہوں۔ اس لیے وہ گھبراتا نہیں۔ اور سمجھتا ہے کہ یہ مصیبت میرے گناہوں کا علاج اور کفارہ ہو رہا ہے۔ پھر اس میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اپنے نہیں۔ ان کو اختیار ہے کہ جس حالت کو ہمارے لیے مناسب سمجھیں اس میں ہمیں رکھیں۔ چنانچہ اسی کو قرآن شریف میں مصیبت کے موقع پر تعلیم فرماتے ہیں وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۝ ترجمہ: بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو کہ جب کہ ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف واپس ہوں گے۔

سورۂ یٰسٓ اور اِنَّا لِلّٰهِ کو ہم لوگوں نے موت کے موقع کے ساتھ خاص کرلیا ہے:

مگر افسوس کہ ہم لوگوں نے اب اس آیت کو موت کے موقعہ کے لیے خاص کرلیا ہے۔

ایک بڑھیا کا واقعہ ہے کہ اس کا بچہ اکثر مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ پڑھ دیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بڑھیا کہنے لگی، بچے خیر مانگ۔ کس کو مارنے کا ارادہ ہے۔ اسی طرح سورہ یٰسٓ کو دراصل ہر مصیبت کے آسان کرنے کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ لیکن اب عام طور سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سورۂ یٰسٓ صرف دم نکلنے کے وقت پڑھنی چاہیے۔

---

[1] معرفت یعنی علم ۱۲

سورۂ یٰسٓ شریف کی تلاوت کا موقعہ:

چنانچہ آج دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص کسی مریض کی عیادت کو جائے اور اس کی تکلیف کو دیکھ کر سورۂ یٰسٓ پڑھنے لگے تو اس پر کیسی لعنت و ملامت ہوتی ہے۔ حالانکہ دم ٹوٹتے وقت بھی سورۂ یٰسٓ کو اسی واسطے پڑھا جاتا ہے کہ اس کی برکت سے مشکل آسان ہو' اگر زندگی ہو تو اچھا ہو جائے۔ اور اگر موت آگئی ہے تو اس کی برکت سے آسانی سے خاتمہ ہو جائے۔

ہر ناگوار حالت پر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنا سنت ہے:

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت گھر میں چراغ گم ہو گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ☆ حضرت عائشہ فرمانے لگیں کہ حضور ﷺ یہ بھی کوئی مصیبت ہے۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ تو معلوم تھا کہ اِنَّا لِلّٰہِ مصیبت کے وقت پڑھا جاتا ہے۔ لیکن ان کو اس واقعہ کے مصیبت ہونے میں تردد تھا۔ کیونکہ ظاہر میں یہ واقعہ ایک معمولی بات تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو بات مسلمان کو ناگوار ہو وہ مصیبت ہے۔ اور چراغ کے گل ہونے سے جب کہ قصد نہ ہو' ناگواری ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بھی مصیبت ہوئی۔

حق تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بہت رحمت اور شفقت:

اور حضور ﷺ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ثواب دینے کے لیے کیسے معمولی معمولی طریقے رکھے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت بہانہ تلاش کرتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر لیجئے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی چیز جیب میں رکھ کر بھول جائے اور ادھر ادھر تلاش کرے تو اس تلاش کرنے میں جو اس کو پریشانی ہوگی تو اس پر بھی ثواب دیں گے اور اس کے گناہوں کا کفارہ فرمائیں گے۔ بالکل ایسی حالت ہے کہ جیسے ہمارا چاہتا بچہ ہو کہ اس کے چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے یہاں تک کہ گرنے پڑنے پر بھی پیار آتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ بھی ہم کو ہر ہر فعل

پر ثواب دیتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ فعل گناہ نہ ہو۔

اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنے سے مصیبت کے ہلکے ہونے کے کئی سبب:

تو اِنَّا لِلّٰہِ جو سکھلایا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے غم ہلکا ہو۔ کیونکہ جب اس کو پڑھے گا تو اس مضمون کی یاد تازہ ہوگی کہ ہم خدا کی ملک ہیں اور وہ ہمارے مالک ہیں۔ اور مالک کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنی ملک میں جو چاہیں تصرف کریں اور اس سے غم کا ہلکا ہونا ظاہر ہے۔ دوسرے اس خیال کے تازہ ہونے سے خدا تعالیٰ سے محبت بڑھتی ہے۔ اور محبت کی خاصیت ہے کہ اس کی بدولت سخت سے سخت مصیبت بھی ہلکی ہو جاتی ہے۔

دیکھئے جن لوگوں کو لڑکوں اور بازاری عورتوں سے تعلق ہوتا ہے وہ ان کے پیچھے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ جوتیاں بھی مارے تو ان میں لطف آتا ہے اور فخر کرتا ہے۔

مشہور ہے کہ ایک شخص بیوی پر توجہ نہیں کرتا تھا۔ اور کسی بازاری عورت سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ بیوی کو یہ خیال ہوا کہ شاید وہ بازاری عورت مجھ سے زیادہ حسین ہو۔ لیکن تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بالکل کالی بھجنگ ہے۔ سخت تعجب ہوا۔ اور اب وہ اس فکر میں لگی کہ آخر اس میلان کا سبب کیا ہے۔ چھان بین سے معلوم ہوا کہ جب یہ شخص اس کے پاس جاتا ہے تو دور ہی سے دیکھ کر اس کو برا بھلا کہنا شروع کرتی ہے۔ اور خوب جوتیوں سے خبر لیتی ہے۔ کہنے لگی کہ کیا مشکل کام ہے۔ آج سے میں بھی یہی طریقہ اختیار کروں گی۔ چنانچہ جب شوہر آیا تو اس نے دروازے ہی سے اس کی خبر لینی شروع کی اور خوب جوتیوں سے پیٹا۔ کہنے لگا کہ بس اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آج تک تجھ میں یہی کسر تھی۔ سو اب پوری ہوگئی۔

اس حکایت سے معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت میں اگر محبوب کی طرف سے کوئی مصیبت بھی پیش آئے تو وہ خوشی اور فرحت کا سبب ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ یہ دنیا کی محبت کیا ہوتی ہے۔ اس کی محبت کی حقیقت یہ ہے کہ انجام کار شرمندگی اور ندامت ہے۔ کیونکہ رنگ و روپ کی بناء پر ہوتی ہے وہ آخر میں جاتا رہتا ہے۔ پس انسان کو نادم ہونا پڑتا ہے۔ البتہ

خدا سے جو محبت ہو وہ اعتبار کے قابل ہوتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خوبیاں زائل ہونے والی نہیں۔ تیسرے اس معرفت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کو ہم سے محبت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے ہم کو اپنا فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے سے محبت ہوا کرتی ہے۔ اور کوئی محبت کرنے والا محبوب کو تکلیف نہیں دیا کرتا۔ پس ہم پر جو ظاہر میں تکلیف آتی ہے یہ ایسی ہی ہے۔ جیسے کہ ماں باپ کسی بچے کے دنبل میں جس نے اس کو بے حد تکلیف دے رکھی ہو۔ یا آئندہ تکلیف پہنچانے کا اندیشہ ہو' نشتر لگواتے ہیں کہ ظاہر میں تو تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن واقع میں کامل راحت کا سامان ہوتا ہے اس تکلیف کی وہ حالت ہوتی ہے کہ بچہ ڈرتا ہے لرزتا ہے اور ماں باپ خوش ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ نشتر لگانے والے کو انعام دیتے ہیں۔ سو اگر کوئی ناواقف تعجب کرنے لگے' اور کہے کہ یہ انعام کس بات کا دیا ہے' اس شخص نے تو بچہ کو تکلیف پہنچائی ہے اس کو تو سزا دینی چاہیے۔ تو ماں باپ کہیں گے کہ احمق یہ تکلیف نہیں یہ عین راحت ہے۔ کیونکہ یہی تکلیف ہے جس کی بدولت لڑکے کی زندگی کی امید ہو گئی۔ ورنہ یہ دنبل بڑھتا اور اس کا زہریلا مادہ تمام جسم میں پھیل جاتا اور لڑکا ہلاک ہو جاتا۔

تو جب ماںں باپ کا نشتر لگوانا اور اس کو تکلیف دینا ناگوار نہیں ہے کیونکہ وہ ذریعہ ہے راحت پہنچنے کا' تو خدا تعالیٰ کو تو ماں باپ سے بدرجہا زیادہ محبت اپنے بندوں سے ہے۔ پھر اگر وہ فقر فاقہ میں ڈال دیں اور کسی مصیبت میں گرفتار کر دیں تو اس کو نشتر کے مانند کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ تو علم سے یہ فائدے ہیں جو کہ مال سے نہیں ہو سکتے۔ اور یہ فائدے تو دنیا میں ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہوا اور یہ علم دین کی بدولت ہوتا ہے۔

جاہل کا خاتمہ اکثر خراب ہوتا ہے اور جاہل سے ہماری کیا مراد ہے:

جاہل آدمی کا خاتمہ اکثر خراب ہوتا ہے لیکن جاہل سے مراد وہ ہے کہ نہ خود پڑھے نہ عالموں سے ملے نہ کسی سے پوچھے۔ تو ایسے شخص کے ایمان کا بھروسہ نہیں۔ کیونکہ جب یہ شخص مرتا ہے تو شیطان اس کو سمجھاتا ہے کہ تو اس وقت اپنی سب چیزوں سے چھوٹ رہا

ہے اور خدا تعالیٰ تجھ کو ان چیزوں سے چھڑا رہے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے بغض ہو جاتا ہے اور کفر پر خاتمہ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر علم ہو تو اس قسم کے اندیشے نہیں رہتے۔ لیکن عالم سے خاص وہ مراد نہیں جو عربی میں پڑھا ہو۔ بلکہ یا تو خود پڑھا ہو یا عالموں کی صحبت میں بیٹھ کر علم حاصل کر لیا ہو۔ یا عالموں سے پوچھ پوچھ کر دین کی ضروری جانیں۔ حاصل کر لی ہوں۔

غرض علم ایسی نعمت ہے۔ مگر آج کل دنیا کو ایسا مقصود بنا رکھا ہے کہ بہت لوگ عالموں کو ترقی کا مخالف سمجھتے ہیں اور ان کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔

دین کی محبت اگر دل میں رچی ہوئی نہیں تو ظاہری نماز روزہ کچھ ایسا کام کا نہیں ہے۔ ایک مثال:

اور نمازیں بھی ان کی اکثر کسی دباؤ کی وجہ سے نہ بھی ہوں۔ تب بھی چونکہ دل میں رچی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس لیے وہ کچھ ایسی مفید نہیں ہوتیں۔ ان کے پڑھنے کی بالکل وہ حالت ہوتی ہے جیسے کسی نے طوطے کو الم ترکیف تک یاد کرا دیا تھا تا کہ وہ بے تکلف اس کو پڑھتا چلا جاتا تھا۔ لیکن اگر اس پر بلی گرتی تو کیا اس وقت بھی اس کو کوئی سورت یاد رہ سکتی تھی کبھی نہیں۔ اس لیے کہ اس کے دل میں کچھ بھی نہ تھا۔ کسی دل لگی باز نے ایک طوطے کے مرنے کی تاریخ لکھی ہے۔ اگر چہ اس نے محض مسخرہ پن کی بناء پر لکھی ہے لیکن بات نہایت گہری اور کام کی ہے۔ ۱۲۳۰ھ میں کسی طوطے کا حادثہ ہوا تھا اس وقت یہ تاریخ لکھی گئی ہے لکھا ہے

میاں مٹھو جو ذاکر[1] حق تھے
گربہ موت نے جو آدابا
چونچ میں لے کے پانی کی کلھیا
رات دن ذکر حق رٹا کرتے

---

[1] ذاکر ذکر کرنیوالے کو کہتے ہیں ۱۲

مضطرب ہو کے اور گھبرا کے
کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے ٹے

لفظ ٹے میں ٹ[1] کے عددت کے برابر ہیں۔ اور ت کے عدد چار سو ہیں تین ٹے کے عدد بارہ ۱۲۰۰ سو ہوئے۔ اور ی کے عدد دس ۱۰ ہیں تو تین ی کے عدد تیس ہوئے۔ کل ۱۲۳۰ ہوئے۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ چونکہ طوطے کی محض زبان پر ذکر حق تھا۔ اور دل میں اس کا کچھ اثر نہ تھا۔ اس لیے اس کو مصیبت کے وقت کچھ بھی یاد نہیں آیا اور ٹاں ٹاں کر کے خاتمہ ہوگیا۔

یاد رکھو اگر محبت دین کی دل میں نہیں ہے تو یہ سب کچھ لفافہ ہے کہ اوپر سے نہایت مکلّف اور خوشنما۔ لیکن اندر سے بالکل سادہ۔

مشہور ہے کہ ایک میراثی کسی کے پاس لفافہ لے کر آیا۔ دیکھا کہ اوپر سے بالکل سادہ ہے' سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ حضور نہایت جلدی میں خط دیا ہے لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس شخص کو خیال ہوا کہ اندر مضمون ہوگا۔ کھول کر دیکھا تو خط بھی بالکل سادہ پوچھا کہ بھائی اس کا کیا سبب: کہنے لگا' حضور! میں عرض کر چکا ہوں کہ بہت ہی جلدی میں خط دیا ہے لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔

دکھلاوے کی برائی اور خلوص کی تعلیم:

ہم لوگوں میں اکثر کی تو ہو بہ ہو یہی حالت ہے کہ اندر باہر دونوں جانب سے محض کورے۔ اور جو لوگ کچھ ہیں بھی' تو ان کا محض ظاہری مکلّف اور خوشنما ہے۔ اور اندر خاک بھی نہیں۔ حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ چاہے لفافہ باہر سے زیادہ مکلّف اور خوشنما نہ ہو۔ لیکن اندر مضمون سے پر ہو۔ اسی طرح ہم اگر بہت سی نفلیں نہ پڑھیں بہت ذکر شغل نہ کریں' صوفیوں کی شکل نہ بنائیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن خدا کی محبت سے بھرا ہوا ہونا چاہیے۔ اور حقیقی علم یہی ہے جس سے محبت کی دولت دل میں پیدا ہو۔ اسی علم کو حضرت

1 گربہ۔ بلی ۱۲

علی رضی اللہ عنہ نے ان لفظوں میں فرمایا ہے کہ

رضينا قسمة الجبار فينا

لنا علم وللجهال مال

یعنی خدا تعالیٰ کی اس تقسیم پر ہم خوش ہیں کہ ہمارے لیے علم ہے اور جاہلوں کے لیے مال ہے۔ تو فخر کی چیز اگر ہو سکتی ہے تو یہ علم یہ ہو سکتا ہے نہ کہ مال۔

آج کل جہالت پر فخر کیا جاتا ہے:

مگر آج وہ حالت ہے کہ جہالت پر ہی فخر کیا جاتا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ بھائی تم کس طرح فخر کرنے کے لائق ہو گئے۔ بلکہ عالم اگر بدعمل بھی ہے تو تم سے بدرجہا اچھا ہے۔ کیونکہ وہ مریض ہے لیکن اس کے ساتھ اس کو نسخہ بھی معلوم ہے۔ جب ذرا توجہ کرے گا علاج کرے گا۔ اور تم سراپا مرض لیکن نہ مرض کی خبر نہ نسخہ کی خبر۔ غرض کسی حال میں جہالت کوئی فخر کی چیز نہیں ہے۔

بعض جاہلوں کے فخر کرنے کی بناء:

مگر بعض جاہل اس بناء پر فخر کرتے ہیں کہ ہم ان خفگیوں سے بری ہیں جو کہ عالموں کے متعلق قرآن میں آئی ہیں۔ حالانکہ اول تو عالموں کے متعلق جو خفگیاں اور دھمکیاں ہیں ان میں علم سے مراد خاص مولوی ہونا ہی نہیں، بلکہ محض جاننا مراد ہے۔ سو ایسا علم تھوڑا بہت سب کو ہوتا ہے۔ دوسرے اگر علم نہ بھی ہو تب بھی الزام سے بری نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ علم نہ ہونے کا الزام اس سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ علم عمل کرنے کا مدار ہوتا ہے اور مدار ہر چیز کا زیادہ ضروری اور کوشش کا زیادہ مستحق ہوا کرتا ہے۔

آیت اتامرون الخ کے الزام سے جاہل بھی بری نہیں ہیں اور اس الزام کی حقیقت:

اب میں اس کو بیان کرتا ہوں کہ اس آیت کی خفگی سے جاہل کیوں پاک اور بری نہیں ہو سکتے۔ اور اس کے سمجھنے کے لیے الزام کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے جس

کو میں اس آیت سے ثابت کرتا ہوں۔

سنیے حاصل اس الزام کا (جوکہ آیت میں اصل مقصود ہے۔ اور جو کہ عالم جاہل سب میں پایا جاتا ہے۔ اور جو کہ نہایت زہریلا مادہ ہے) یہ ہے کہ ہم اپنے عیبوں کو نہیں دیکھتے۔ بلکہ دوسروں کے عیبوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ ہم رات دن دوسروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کے عیب نکالتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا کیا عیب موجود ہیں۔ اور یہ عیب دوسروں کے عیبوں سے بڑھ کر ہیں یا نہیں۔ کیونکہ نصیحت کرنا لوگوں کو نیک کام کی اس پر موقوف ہے کہ دوسروں کی غلطیوں پر نظر ہو۔ پھر اس کے سات اپنے نفس کے بھولنے کو ملا کر دیکھا جائے تو حاصل یہ نکلے گا کہ تم دوسروں کے عیبوں کو تو دیکھتے ہو۔ اور اپنے عیبوں کو نہیں دیکھتے۔ یہ مرض ایسا پھیلا ہے کہ اکثر موقعوں پر اس کو زبان سے بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔

وبائی مرضوں کا اصلی سبب گناہ ہیں اگرچہ ظاہر پر نظر کرنے والے ان کی نسبت ظاہری سبب کی طرف کریں:

چنانچہ جب کبھی وبائی مرض پھیلتے ہیں تو اکثر لوگوں کو تو اس کی جس بھی نہیں کہ ان مصیبتوں میں گناہوں کا کچھ دخل ہے۔ بلکہ پانی اور ہوا کے خراب ہونے کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں۔ ان کا تو ذہن بھی یہاں تک نہیں پہنچتا کہ گناہوں کو بھی کچھ اس میں دخل ہے۔ حالانکہ یہ ان کے سخت غلطی ہے۔ ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ آخر ہوا میں، خرابی کیوں آئی۔ اگر کہا جائے کہ گرمی یا سردی کی زیادتی کے سبب ایسا ہوا۔ تو میں کہوں گا کہ گرمی یا سردی میں اس قدر شدت کیوں آئی۔ لیکن یہ سوال جس میں انتہاء آگے خدا کی مشیت اور ارادہ پر ہوگی' مسلمان ہی سے ہے کافروں سے نہیں' اگرچہ ہمارے پاس جواب ان کے اعتراضات کے موجود ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان کے جواب دینے سے بھی عاجز نہیں ہیں۔ مگر یہ اس کا موقع نہیں۔

غرض مسلمانوں میں عام لوگ جس چیز کو بھی سبب بتلائیں گے ہم اس کی بابت

پوچھیں گے کہ آخر یہ کیوں ہوا؟ کسی حد پر پہنچ کر ان کو یہ کہنا ضرور پڑے گا کہ خدا کے حکم سے ہوا۔ اس وقت ہم کہیں گے کہ اس کا کیا سبب کہ خدا تعالیٰ نے اس وقت یہ حکم فرمایا' جس سے یہ مصیبت پیدا ہوگئی۔ اور پھر خود ہی قرآن شریف سے ہم جواب میں کہیں گے کہ سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تم سے گناہوں کے سبب ناراض ہوئے۔ اور مصیبت بھیجی۔

چنانچہ فرماتے ہیں: مَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ☆ یعنی تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے' وہ تمہاری کرتوتوں کی بدولت پہنچتی ہے۔ اور بہت سی باتوں سے تو اللہ تعالیٰ درگزر ہی فرماتے ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص کو پھانسی دے دی جائے اور اس کی موت کا سبب پوچھا جائے تو ظاہری حالت دیکھنے والا ہر شخص یہی کہے گا کہ پھانسی کی رسی گلے میں اٹک گئی اس سے مر گیا۔ مگر ایک عقلمند اس پر بس نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ پوچھے گا کہ رسی گلے میں اٹکی کیوں؟ اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ ایک شخص نے اٹکادی تو وہ پوچھے گا اس نے کیوں اٹکادی؟ اس پر کہا جائے گا کہ حاکم نے اس کو حکم کیا تھا۔ تو آخر سبب حاکم کا حکم نکلا۔ لیکن ابھی یہ سوال باقی ہے کہ حاکم نے ایسا حکم کیوں دیا؟ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس شخص نے کسی کو قتل کیا تھا یا ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس جواب کے بعد پھانسی پر لٹکنے کا اصلی سبب کھل جاتا ہے۔ تو ایسے ہی وباء خدا کے حکم سے آئی۔ لیکن خدا تعالیٰ کا حکم ہمارے جرموں کے سبب سے ہوا۔ اسی کو قرآن شریف میں فرماتے ہیں: فَلَمَّا اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ۔ ترجمہ: جب کہ انہوں نے ہم کو غضبناک کیا تو ہم نے بدلہ لیا ان سے۔

جزاء الاعمال میرا ایک رسالہ ہے اس میں اس بحث کو تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اور اللہ کا شکر ہے اس میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ ہم کو جو کچھ پریشانی اور تکلیف ہوتی ہے' ہمارے اعمال کی بدولت ہوتی ہے۔ تو عام لوگوں کو عقل کی رسائی تو محض اس ظاہر سبب تک ہے۔

جو دیندار کہلاتے ہیں وہ مصیبتوں کو نسبت دوسروں کے گناہوں کی طرف کرتے ہیں

لیکن جو ذرا سمجھدار اور دیندار ہیں وہ اگرچہ ان سب وبائی مرضوں کو خدا کی حکم سے مانتے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ گناہوں کے سبب سے یہ حکم ہوا۔ لیکن ہمیشہ دوسروں کے گناہوں کو شمار کرتے ہیں۔ اوپر اسی کا ذکر تھا کہ دوسروں کے عیبیوں پر ہم لوگوں کی نظر ہوتی ہے چنانچہ اکثر لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ دوسرے لوگوں کو زنا اور جوئے میں گرفتار دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ اسی سبب سے تو قحط ٹوٹ رہا ہے' مگر کبھی کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ اس نے اپنے اعمال کو اس کا سبب بتلا دیا ہو۔ حالانکہ زیادہ ضرورت اس کی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے قحط کی شکایت کی۔ فرمایا کہ قحط دور ہونے کی سوائے اس کے اور کوئی ترکیب نہیں ہے کہ مجھ کو شہر سے نکال دو کیونکہ میرے گناہوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ اور یہی نہیں کہ محض زبان سے کہنے پر بس کیا ہو۔ بلکہ آپ اس شہر کو چھوڑ کر چلے بھی گئے۔

ایک بزرگ کہتے تھے کہ جب ریل میں بیٹھتا ہوں تو خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میرے گناہوں کے سبب یہ سب لوگ ہلاک نہ ہو جائیں۔ یہی خرابیاں ہیں جن کا علاج بزرگوں نے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسروں کی برائی اور اپنی اچھائی پر نظر مت کرو۔

مگر یہاں رات دن ہمارا یہی سبق ہے کہ ہم ایسے اور ہم ویسے۔ اور دوسرا ایسا اور ایسا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اے عزیز! تیری ایسی مثال ہے کہ تیرے بدن پر سانپ اور بچھو لپٹ رہے ہیں۔ اور دوسرے شخص کے بدن پر ایک لکھی بیٹھی ہے تو اس کو مکھی بیٹھنے پر ملامت کر رہا ہے۔ لیکن اپنے سانپ اور بچھو کی خبر نہیں لیتا جو کوئی دم میں تجھ کو فناہ کیے ڈالتے ہیں۔

ایک دوسرے بزرگ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو اپنی آنکھ میں کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا اور دوسرے کی آنکھ کے تنکے کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اول تو یہ دونوں جدا جدا عیب ہیں کیونکہ اپنے عیبیوں کا نہ دیکھنا یہ بھی گناہ اور دوسروں کے عیبیوں کو بے ضرورت دیکھنا بھی گناہ، اور بے ضرورت سے مراد یہ ہے کہ وہ شریعت کے نزدیک ضروری نہ ہو۔

بے کار اور فضول کام کے چھوڑنے کی رغبت دلانا اور حکم کرنا مع حکایتوں کے:

اور ایسے افعال جو شریعت کے نزدیک ضروری اور مفید نہ ہوں' وہ عبث اور بے کار کہلاتے ہیں۔

حدیث شریف میں ان کے چھوڑنے کا حکم ہے اور بزرگوں نے اس کی بڑی کوشش فرمائی ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کسی شخص کے مکان پر گئے اور دروازے پر جا کر آواز دی' گھر میں سے جواب آیا کہ وہ نہیں ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں گئے' جواب آیا کہ معلوم نہیں۔ لکھا ہے کہ اپنے اس دریافت کرنے پر کہ کہاں گئے ہیں' تیس برس تک روتے رہے کہ میں نے ایک بیکار بات کیوں دریافت کی۔

مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم کے والد مولانا فرید الدین صاحب رحمہ اللہ کی نسبت سنا ہے کہ وہ بہت ہی کم بولتے تھے' اور بلا کسی شدید ضرورت کے نگاہ کبھی اوپر نہ اٹھاتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر ان سے کوئی بات پوچھتا تو زبان سے جواب دے دیتے تھے لیکن منہ نہ اٹھاتے تھے' صرف اس لیے کہ بلا ضرورت نگاہ کو کیوں صرف کیا جائے۔ دوسرے قرآن میں حکم بھی ہے: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ترجمہ: کہہ دیجیے آپ ایمان والوں سے کہ نیچی رکھیں اپنی نگاہیں اور حفاظت رکھیں اپنی شرمگاہوں کی۔

دوسری جگہ ایمان والوں کی تعریف میں ارشاد ہے اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (ترجمہ) وہ ایسے لوگوں ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

آفتوں سے حفاظت نظر کے زمین پر رکھنے میں ہے:

عالموں نے لکھا ہے کہ شیطان نے انسان کو بہکانے کی چار سمتیں بیان کی ہیں کہ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَمِنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ (ترجمہ) پھر آؤں گا ان کے پاس ان کے سامنے سے اور پیچھے سے اور داہنے سے۔ اور بائیں سے۔ اور دو سمتوں کو بیان نہیں کیا۔ یعنی اوپر اور نیچے اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سمتیں اس کے بہکانے سے محفوظ ہیں۔ لیکن اوپر سے مراد دہلی کے اندنی چوک کا کوٹھا نہیں ہے بلکہ آسمان مراد ہے لیکن ہر وقت اوپر دیکھا بہت دشوار تھا اس لیے سب سے بہتر نیچے کی سمت ہے۔ باقی چار سمتیں آگے پیچھے دائیں بائیں ان کی یہ حالت کہ ان کی طرف دیکھنے میں اکثر انسان فتنے میں پڑ جاتا ہے۔ اسی سبب سے بعض بزرگوں نے یہاں تک کیا ہے کہ شہر کو چھوڑ کر جنگل میں رہنا سہنا اختیار کر لیا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگ کو ایک پہاڑ کے غار میں بیٹھا ہوا دیکھا۔ میں نے کہا آپ تنہا کیوں رہتے ہیں' شہر میں کبھی کیوں نہیں آتے۔ تا کہ راحت اور آرام کا سامان میسر آئے۔ فرمایا کہ شہر میں حسینوں اور خوبصورتوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اس حالت میں بڑے بڑے دینداروں کا سنبھلنا مشکل ہے جیسے زیادہ دلدل میں ہاتھی کا سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بہر حال ایسا ہوتا ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ ان چاروں سمتوں کی جانب دیکھنا بہت کم کر دیا جائے اور اوپر کے دیکھنے میں گرنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا پس اتنا تجربہ اور قرآن پاک اور بزرگوں کی حکایتیں اس سب سے معلوم ہو گیا کہ حفاظت اور امن میں رہنے کی سمت نیچے کی سمت ہے اور جب بزرگوں نے بیکار باتوں سے اس قدر پرہیز کیا۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ ترکه مَالَا يَعْنِيْهِ ترجمہ: آدمی کے مسلمان ہونے کی بعض خوبی یہ ہے کہ بے کار باتوں کو چھوڑ دے۔ اس لیے عیبوں کی تفتیش کے گناہ ہونے میں یہ قید لگائی ہے کہ بے ضرورت ہو اور دوسروں کے عیبوں کی تلاش اگر گناہ بھی نہ ہوتی تو بے کار تو ضرور تھی۔ اور اس سے بچنا بھی ضرور ہے۔

فضول اور لغو باتوں کی ممانعت اور مضرت:

تو جب کہ وہ گناہ بھی ہے تو اس سے بچنا اور زیادہ ضرورت ہے۔ بعض احمقوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تمام وقت فضولیات میں برباد کرتے ہیں۔ جیسے اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملے میں آپ کی کیا تحقیق ہے۔ کوئی عقلمند اس سے پوچھے کہ تجھ کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملے کی کیا پڑی تو اپنا معاملہ درست کر۔

مولانا محمد نعیم صاحب لکھنوی فرنگی محلی کے پاس ایک رنگریز آیا' کہنے لگا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میاں تم جا کر کپڑے رنگو' جب تمہارے پاس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقدمہ آئے گا تو لینے انکار کر دینا' اور کہہ دینا کہ میں نے اس کی تحقیق کی تھی، مگر مجھے کسی نے بتلائی نہیں۔

ایک اور صاحب ایک مولوی صاحب کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کی بابت دریافت کرتے ہوئے آئے۔ کہ وہ ایماندار تھے یا نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ تم کو نماز کے فرض معلوم ہیں؟ کہنے لگا کہ نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ غضب کی بات ہے کہ نماز جس کا سوال سب سے پہلے قیامت میں ہوگا اس کے وہ فرض جن سے دن میں پانچ مرتبہ کام پڑتا ہے اور جن کے معلوم نہ ہونے سے اندیشہ ہے کہ ادا نہ ہوں تو نماز ہی نہ ہو ان کی تو تم کو خبر نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا ایمان جس کی بابت ہم سے یقیناً نہ قیامت میں سوال ہوگا نہ دنیا کا کوئی کام اس کے جاننے پر موقوف ہے۔ اس کی تحقیق کی جاتی ہے۔

صاحبو! اگر کوئی برا ہے تو تم کیا غرض اور اچھا ہے تو تم کو کیا مطلب' تمہیں اپنی اچھائی برائی کی فکر ہونی چاہیے۔ باقی ہر شخص کی خبر رکھنا یا اس کا خیال ہونا یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے یا اس بندے کا ہے جس کے سپرد خدا تعالیٰ نے مخلوق کی اصلاح کرنے کا کام کر دیا ہو۔ کیونکہ بغیر جاننے حالات کے اصلاح کرنا ممکن ہی نہیں اور انہی وجہ سے میں نے بلا ضرورت کی قید لگا دی تھی۔ اس لیے کہ جیسے حاکم وقت جب تک حالات کی تفتیش نہ کرے گا تو مجرموں کو سزا نہ دے سکے گا۔ مگر اس کو بھی ایسے معاملوں میں اجازت ہے کہ جن میں

تفتیش نہ کرنے سے فساد ہونے کا خطرہ ہو اور جو معاملے ایسے نہیں ان میں حاکم کو بھی چھان بین کی اجازت نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ اچانک ایک گھر میں سے لگانے کی آواز آئی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے دروازہ کھلوانا چاہا۔ مگر وہ لوگ اس قدر گانے میں منہمک تھے کہ آپ کی آواز ہی نہ سن سکے۔ آخر آپ مکان کی پشت سے اندر تشریف لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہرگز غصہ نہ آئے گا۔ اس لیے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا اے امیر المؤمنین[1]! ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا۔ لیکن آپ کے تین گناہ ہوگئے۔ ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر چلے آئے حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے لَاتَدْخُلُوْا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ترجمہ: مت داخل ہو دوسروں کے گھروں میں، یہاں تک کہ اجازت لے لو اور سلام کرو ان گھروں کے رہنے والوں پر۔

دوسرا یہ کہ آپ نے بے ضرورت تفتیش کی۔ اور قرآن پاک میں اس کی ممانعت ہے: لَاتَجَسَّسُوْا ترجمہ: بے ضرورت تفتیش مت کرو۔

تیسرا یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے۔ حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا۔ ترجمہ: یہ بات اچھی نہیں کہ جاؤ تم مکانوں کے اندر پشت کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کرلو۔

آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنی چاہیے کہ آزادی ان حضرات میں تھی یا آج کل کے آزادی کے دعویٰ داروں میں کہ چوپاؤں کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے بس دونوں وقت کھالیا اور خواہشات نفسانی میں عمر گزار دی۔

صاحبو! خدا کی قسم یہ آزادی نہیں۔ یہ نفس کی شرارت اور بے لگامی اور خواہشوں کی

---

[1] اگلے زمانہ میں مسلمان بادشاہوں کا لقب تھا۔ اس کے معنی ہیں ایمان والوں کا امیر ۱۲

غلامی ہے۔ اور یہ آزادی سانڈھ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا منہ مار دیا۔ جدھر چاہا چل دیا۔ یا جو چاہا کرلیا۔ تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈھ کو پسند کرتے ہیں۔ اگر اس کا جواب ہاں ہے تو آج سے پانے لیے ہماری طرف سے یہی لقب قبول کر لیجئے اور اگر نہیں میں جواب ہے تو پھر ذرا مہربانی کر کے اپنے اور سانڈھ کے درمیان کچھ فرق بتلائیے۔

اسی طرح اگر کوئی اتالیق[1] یا نگران ہو تو اس کو بھی حالات کی تفتیش کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اصلاح کرنا غیر ممکن ہے یا شوہر ہے تو اس کو بھی بیوی کے حالات کی تفتیش کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے ذمہ اس کی اصلاح کرنا ہے یا کوئی شخص قوم کا اصلاح کرنے والا ہو تو اس کو مجموعی طور سے پوری قوم کے حالات سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ ورنہ وعظ اور نصیحت کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ مگر اس کو بھی اسی وقت تک اجازت ہے کہ تفتیش سے اصلاح کرنی مقصود ہو اور اگر کسی کی حقارت کے لیے ایسا کرے گا تو اس کو بھی ہرگز اجازت نہ ہوگی۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّات ترجمہ: انسان کے اعمال کا مدار اس کی نیت اور غرض پر ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ جورہ گئے ہیں وہ دیکھ لیں کہ دوسرے کے عیب کی تلاش سے ان کا کیا مقصود ہوتا ہے:

غیبت کرنے سے منع کرنا اور یہ کہ یہ فعل ناقص ہونے کی دلیل ہے:

آیا یہ کہ اس شخص میں سے یہ عیب جاتا رہے یا اس کو محض بدنام کرنا اگر اول مقصود ہے تو کیا وجہ کہ کبھی اس کی علامتیں نہیں پائی گئیں کیا کبھی کسی شخص نے کسی عیب والے کو شفقت کے ساتھ کہہ کر اس کے عیبوں پر مطلع کیا ہے۔ اور اگر نہیں کیا تو محض چار آدمیوں میں سے کسی کے عیب کا تذکرہ کر دینا اصلاح اور اور درستی کرنا کہلائے گا۔ ہرگز نہیں۔ مگر ہم لوگ کی مجلسوں میں رات دن ساری مخلوق کی غیبتیں اور شکائتیں ہی ہوتی ہیں۔ کیا ان سے سوائے ایک شخص کو بدنام کرنے کے کچھ اور بھی نفع ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں تو یہ لوگ ایک تو غیبت کے گناہ میں پڑے دوسرے ایک بیکار کام کیا جس کی برائی اوپر بیان ہو چکی ہے۔

---

[1] تالیق اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کے متعلق بچوں کی تعلیم وتربیت اور دیکھ بھال ہو۔۱۲

حضرت رابعہ بصری رحمہا اللہ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ شیطان کو برا نہ کہتی تھیں۔ اور فرمایا کرتی تھیں کہ جتنی دیر اس فضول کام میں صرف کی جائے اتنی دیر تک اگر محبوب کے ذکر میں مشغول رہیں تو کس قدر فائدہ ہے۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ نے حضرت بہلول دانا کی حکایت نقل کی ہے کہ وہ ایک صوفی پر گزرے جو دوسروں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کر رہا تھا تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ دعوے دار دوست کو شناخت کر لیتا تو دشمنوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے میں مشغول نہ ہوتا۔ دیکھو اگر کسی کا محبوب بغل میں بیٹھا باتیں کر رہا ہو اور اس حالت میں ایک شخص آ کر اس عاشق کو ماں کی سڑی ہوئی گالی دے تو کیا عاشق کی طبیعت اس کو گوارا کرے گی کہ محبوب کو چھوڑ کر دشمن سے انتقام اور بدلہ لینے کے درپے ہو جائے۔ اور اگر اس نے ایسا کیا تو کہا جائے گا کہ اس کا عشق نہایت کمزور اور ناقص ہے۔ اسی طرح سمجھدار لوگ ایسے موقع پر سمجھ جاتے ہیں کہ شیطان جو ہمارا وطن ہے۔ وہ اس شخص کو بہکا کر لایا ہے تاکہ ان کو دوسری طرف مشغول کر کے بہکائے اس لیے وہ پرواہ بھی نہیں کرتے۔ اور محبوب کی طرف توجہ رکھتے ہیں اور جتنی اس میں کمی ہوتی ہے اسی قدر ان میں بھی کمی ہوتی ہے۔

تین بزرگوں کی حکایت:

ایک شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ بزرگوں کی شان اور ان کے حالات کس طرح مختلف ہوتے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ فلاں مسجد میں تین بزرگ بیٹھے ہیں ان کے پاس جاؤ، معلوم ہو جائے گا کہ بزرگوں کے حالات میں کیا فرق ہوتا ہے۔

چنانچہ وہ شخص گیا اور جا کر دیکھا کہ کوئی بے ادب آیا اور ان بزرگوں میں سے اول ایک کے چپت رسید کیا۔ انہوں نے اٹھ کر اتنے ہی زور سے ایک چپت اس کے مار دیا۔ پھر بیٹھ کر ذکر میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد وہ دوسرے بزرگ کی طرف متوجہ ہوا اور ایک چپت ان کے بھی مار دیا وہ بولے بھی نہیں اور اپنے کام میں لگے رہے۔ اس کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوا ایک ایک چپت ان کے مارا۔ انہوں نے اٹھ کر فوراً اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو دبانا اور پیار کرنا شروع کیا اور کہنے لگے کہ تمہارے ہاتھ میں

بہت چوٹ لگی ہوگی۔ یہاں سے یہ تماشا دیکھ کران بزرگ کے پاس گیا اور تمام ماجرا بیان کیا۔ کہنے لگے کہ بس اتنا ہی فرق ان تینوں کی حالت اور شان میں بھی ہے تو دیکھ لیجیے کہ جو بزرگ صابر نہ تھے وہ بغیر بدلہ لیے نہ رہ سکے انہوں نے بھی فضول کام ذرا نہیں کیا یعنی مارنیوالے سے یہ سوال تک بھی نہیں کیا کہ تو نے ایسی حرکت کیوں کی بلکہ اس قاعدے پر جس کو قرآن نے بیان کیا ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ بِمِثْلِهَا ترجمہ: برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے۔عمل کر کے ایک چپت خود بھی مار دیا۔ پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

آج کل لوگ ذراسی بات کو بڑھا لیتے ہیں:

آج یہ حالت ہے کہ ایک ذرا سی بات کسی کو کہہ دیجئے پھر دیکھئے کیا قیامت برپا ہوتی ہے بلکہ بلاوجہ بھی لوگ سر ہو جاتے ہیں۔

میرے ایک دوست مولوی اسحاق علی صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ چلا جارہا تھا۔ سامنے سے ایک شخص پر نظر پڑتے مجھے خیال ہوا کہ یہ میرے ملنے والوں میں سے کوئی شخص ہیں اس خیال کی بناء پر میں نے نہایت تپاک سے ان کو سلام کیا' قریب آئے تو معلوم ہوا کہ یہ تو کوئی دوسرے صاحب ہیں اپنے دھوکہ میں آنے پر میرے منہ سے بے ساختہ لاحول نکل گئی۔ بس وہ شخص سر ہو گیا کہ تم نے مجھ کو شیطان سمجھا ہے۔ اس لیے لَاحَوْلَ پڑھی۔ اب یہ کتنا ہی سمجھاتے ہیں' خوشامد کرتے ہیں وہ مانتا ہی نہیں۔ بڑی دور تک ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ آخر شاید یہ کسی گلی میں اس کی نظر بچا کر گھس کر جلدی سے نکل گئے جب پیچھا چھوٹا۔ غرض یہ حالت ہے۔ ہم لوگوں کے دینداروں کی۔ حالانکہ پہلے لوگوں نے اس قدر احتیاط کی ہے کہ فضول باتوں سے بھی بچے ہیں۔ ایک خرابی اور مضرت دوسروں کے عیب ڈھونڈنے اور برائی کرنے میں یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں جس شخص کی برائی کی جارہی ہے اس کو خبر نہ ہو اور خبر ہونے کے بعد بہت دشوار ہے کہ وہ تم کو برا نہ کہے اور پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے کہنے کی خبر نہ ہو۔ اور اس تمام الٹ پھیر کا نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں عداوتیں بڑھیں اور دشمنیاں قائم ہوں اور پھر یہ عداوتیں بعض اوقات پشتہا پشت تک چلتی ہیں اور بنیاد ان کی محض ذراسی بات کہ اس نے ہم کو یوں کہہ دیا تھا۔ حالانکہ کہہ بھی دیا

تھا تو کیا عزت میں فرق آ گیا۔

ایک بزرگ کے تحمل کی حکایت:

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے چند مرید ساتھ تھے راستے میں ایک شخص نے دیکھ کر کہا یہ شخص بڑا ٹھگ ہے۔ ایک مرید کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس شخص کو مارنے چلا۔ پیر صاحب نے روکا اور گھر پر لے گئے اور بہت سے لفافے جو ان کے نام آئے ہوئے تھے اس کے سامنے ڈال دیئے۔ ان لفافوں میں بڑے بڑے القاب اور آداب لکھے ہوئے تھے۔ کسی میں قبلہ کونین کسی میں کعبہ دارین کسی میں رہنمائے جہاں وغیرہ وغیرہ اور فرمایا کہ بھائی میں نہ اس قدر برا ہوں جتنا اس شخص نے ظاہر کیا اور نہ اس قدر اچھا ہوں جتنا ان لوگوں نے لکھا۔ پس اگر خلاف واقع کہنے کی وجہ سے اس شخص پر غصہ آیا تو ان لوگوں پر بھی آنا چاہیے اور ان کا منہ بھی بند کرنا چاہیے جو مجھ کو جنید رحمۃ اللہ علیہ عصر اور فرید وقت لکھتے ہیں۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تحمل:

مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث سہانپوری کو ایک شخص نے آ کر برا بھلا کہنا شروع کیا۔ مولانا چونکہ بڑے مرتبے کے شخص تھے طالب علموں کو سخت غصہ آیا اور اس کے مارنے کو اٹھے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی سب باتیں تو جھوٹ نہیں کہتا کچھ تو سچ بھی ہے۔ اسی کو دیکھو۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا تحمل:

اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ایک شخص نے برا کہا تو آپ نے اس کو ہدیہ بھیجا۔ اور امام صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ آپ کسی کی غیبت نہ کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں کسی کی غیبت کروں تو اپنی ماں کی غیبت زیادہ بہتر ہے۔ تاکہ میری نیکیاں میری ماں ہی کے پاس رہیں۔ غیروں کے پاس تو نہ جائیں۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے عقلمند ہیں کہ

ہم لوگوں کی نیکیاں تو وہ لے لیتے ہیں۔ (یعنی چونکہ ہم اس کی بابت کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں اور وہ اپنی نیکیاں کبھی کسی کو نہیں دیتے۔ (یعنی چونکہ وہ کسی کی غیبت نہیں) کرتے۔

صاحبو! غور کرو کہ ایک یہ اگلے ہیں جن کے وہ حالات ہیں۔ ایک ہم پچھلے ہیں کہ جن کے یہ حالات ہیں۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب کہا ہے کہ ہم نے تو یہ سنا ہے کہ اللہ والے دشمنوں کے دل بھی تنگ نہیں کرتے۔ پس اے شخص تجھ کو کس طرح یہ مرتبہ مل سکتا ہے جبکہ تو اپنے دوستوں سے ہی لڑائی جھگڑا کرتا رہتا ہے۔

نا اتفاقی کی جڑ زبان کی بدلگامی ہے:

آج کل بڑے زور سے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم لوگوں میں نا اتفاقی نہ رہے۔ اس کے لیے تقریریں ہوتی ہیں۔ اخباروں میں مضمون بھیجے جاتے ہیں' جلسے کیے جاتے ہیں۔ لیکن جو نا اتفاقی کی جڑ ہے یعنی زبان' اس کے کاٹنے کی آج تک کسی کو فکر نہیں۔

صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ نا اتفاقی کا بڑا سبب ہم لوگوں کی زبان ہے جس کو لگام ہی نہیں جو چاہا بک دیا۔ جس کو جو چاہا کہہ دیا۔ یہ ظالم اس قدر چلتی ہے کہ جس کی حد نہیں۔ پھر غضب یہ کہ بے حیا کبھی تھکتی بھی نہیں۔ دوسرے عضو جیسے سر' آنکھ' کان' ہاتھ' پیر جب ان سے ضرورت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے تو تھک جاتے ہیں لیکن زبان کسی وقت بھی تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب صبح ہوتی ہے تو تمام اعضائے بدن زبان سے خوشامد کر کے کہتے ہیں کہ تو ٹھیک رہنا۔ اگر تو درست رہی تو ہم بھی درست رہیں گے۔ اور اگر تو بگڑی تو ہم سب بھی بگڑ جائیں گے۔

غیبت کرنے کا مرض سب قوموں میں عام ہے:

غرض برا کہنے۔ اور برائی تلاش کرنے کا مرض م لوگوں میں نہایت عام ہے۔ اور جن کو خدا تعالیٰ نے چار پیسے دیئے ہیں وہ تو خاص طور پر اس میں گرفتار ہیں۔ کیونکہ روزی

کی طرف سے بے فکری ہو جانے کی وجہ سے ان کو کوئی کام تو رہا نہیں۔ اور جو اصلی کام تھا یعنی اللہ کا ذکر۔ اس کو کرتے نہیں۔ اس لیے دن رات کے چوبیس گھنٹے پورے ہونے کی اس کے سوا کوئی ترکیب نہیں کہ کچھ ایسے ہی ایسوں کا مجمع ہو اور اس میں دنیا بھر کے خرافات ہانکے جائیں۔ بلکہ بعض دیندار بھی جن کو کچھ فراغت ہے اس میں گرفتار ہیں۔ اور جو بے فکر ہیں وہ عام لوگوں سے زیادہ گرفتار ہیں کیونکہ وہ لوگ تو اکثر شطرنج ' گنجفہ' نرد وغیرہ میں لگ کر اس سے چھوٹ بھی جاتے ہیں اور دیندار لوگ اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اس لیے ان کو سوائے جلسہ بازی اور برائی کرنے کے اکثر اور کوئی شغل ہی نہیں ملتا۔ لیکن اس سے میرا یہ مقصود نہیں کہ غیبت سے بچنے کے لیے شطرنج یا گنجفہ کی اجازت دیتا ہوں۔ ہوگز نہیں۔ ان دونوں کی حالت پیشاب سے زیادہ خراب اور پیشاب پاخانہ سے زیادہ دوسرے شطرنج وغیرہ میں اکثر اسقدر انہاک ہوتا ہے کہ اس کی بدولت تمام دنیا و دین کے کاروبار چھوٹ جاتے ہیں

ایک شطرنج باز کی حکایت:

میں نے اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ایک شخص شطرنج کھیل رہے تھے اور ان کا لڑکا بیمار بڑا ہوا تھا۔ ابھی درمیان میں کسی نے آ کر اطلاع کی کہ لڑکے کی حالت بہت خراب ہے کہنے لگے اچھا آتے ہیں اور پھر شطرنج میں مشغول ہو گئے' تھوڑی دیر میں پھر کسی نے آ کر کہا وہ مر رہا ہے کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں اور یہ کہہ کر پھر مشغول ہو گئے اس کے بعد پھر کسی نے آ کر کہا کہ لڑکے کا انتقال ہو گیا ہے کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں یہ سوال اور جواب سب کچھ ہو لیا' لیکن ان کو اٹھنے کی توفیق نہیں ہوئی' جب شطرنج کی بازی ختم ہوئی تو آپ کی آنکھیں کھلیں اور ہوش آیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

فرمایئے کہ جس کھیل کا انجام یہ ہو اس کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے۔ سو اجازت دینا مقصود نہیں' بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ عام لوگ تو صریح گناہ میں مشغول ہو کر غیبت سے بعض اوقات بچ ہی جاتے ہیں۔ مگر یہ دینداری کا دعویٰ کرنے والے ظاہری دینداری کے پردے میں اس سے بڑھ کر گناہ میں گرفتار ہوتے ہیں۔ پس اس بناء پر ہماری وہ حالت

ہے کہ جیسے کافر کی گور جس کا ظاہر نہایت آراستہ اور اس کے اندر خدا تعالیٰ کا غضب یا جیسے کوئی یزید پر طعنہ زنی کرے۔ اگر چہ اس کی اندرونی حالت سے یزید بھی شرم کرتا ہو۔ ہم نے صرف وضع کی درستی اور ظاہر کی آراستگی کا نام آج کل دینداری رکھ لیا ہے۔ باقی اعمال واخلاق' وہ چاہے کیسے بھی ہوں۔ اور عام لوگوں کی حالت پر ایک اعتبار سے اس سے بھی زیادہ افسوس ہے کہ ان کا ظاہر بھی درست نہیں۔ دینداروں میں اگر ایک کمی ہے تو ان میں دو ہیں۔

صرف ظاہر کی درستی بھی بے کار نہیں جاتی:

اور یاد رکھو کہ ظاہر کی درستی بھی بے کار نہیں ہے' اس کا بھی دل پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے جادوگروں کے مقابلے کے لیے تشریف لے گئے تو مقابلے کے بعد جادوگر تو سب مسلمان ہو گئے تھے لیکن فرعون نہیں ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے اس کا سبب پوچھا ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! فرعون کے جادوگر اس وقت تمہارا سا لباس پہن کر آگے تھے' ہماری رحمت نے گوارا نہ کیا کہ تمہارے لباس کے ساتھ یہ لوگ دوزخ میں جائیں۔ اس لیے ہم نے ان کو ایمان کی توفیق دے دی اور فرعون محروم رہا۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ ظاہر کی بھی درستی اچھی چیز ہے۔ مگر محض اس کی درستی پر کفایت نہ کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کے ساتھ دل کو بھی درست و آراستہ بنانے کی فکر ہونی چاہیے۔

دین کے پیشواؤں کو غیبت سننے سے بچنا ضروری ہے:

اور جو لوگ مقتداء ہیں وہ اس کی زیادہ فکر کریں۔ کیونکہ غیر مقتداء کو تو غیبت کرنے کی کم نوبت آتی ہے۔ اور یہ لوگ چونکہ ان کے پاس مخلوق کا ہجوم ہوتا ہے اس لیے ان کو غیبت سننے کی بھی بہت نوبت آتی ہے سینکڑوں آدمی ان کے پاس آتے ہیں اور ہر شخص ان کے پاس یہی تحفہ لے کر آتا ہے اور یہ اس تحفہ کو قبول کرتے ہیں۔ ہاں جو عقلمند ہوتے ہیں وہ ایسے لوگوں کا بھی علاج کرتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک

شخص آیا اور کہا کہ فلاں شخص آپ کو یوں کہتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس نے تو پیٹھ پیچھے کہا' لیکن تم اس سے زیادہ بے حیا ہو کہ میرے منہ پر کہتے ہو۔

حضرت میر درد دہلوی کو گانا سننے سے کچھ رغبت تھی ان کی نسبت حضرت میرزا مظہر جان جاناں سے آ کر کسی نے کہا کہ حضرت میر درد گانا سنتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی کوئی کانوں کا بیمار ہے' کوئی آنکھوں کا بیمار ہے۔ میرزا صاحب کے اس مقولے سے اکثر جاہلوں نے یہ سمجھا کہ میرزا صاحب بوجہ مزاج کے لطیف اور نازک ہونے کے بدصورت آدمی کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ اور میرزا صاحب کے بچپن کے واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے یعنی میرزا صاحب کی نسبت یہ مشہور بات ہے کہ دودھ پینے کے زمانہ میں آپ کسی بدصورت عورت کی گود میں نہ جاتے تھے۔ حالانکہ اس وقت آپ خوب صورتی اور بدصورتی کو جانتے بھی نہ تھے۔ لیکن روح کے لطیف اور نازک ہونے کی وجہ سے آپ کو بدصورت آدمی سے اسی وقت تکلیف ہوتی تھی اور اس کا اثر بڑے ہو کر بھی تھا۔ غرض اس قسم کے حضرات ایسے لوگوں کا منہ اس وقت بند کر دیتے ہیں۔ اور جو لوگ احتیاط نہیں کرتے وہ ان کے آنے والوں کی بدولت اکثر گناہوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیے کہ وہ شخص دوسروں کی برائی ان کے سامنے کرتا ہے وہ ان کی برائی بھی دوسروں کے سامنے ضرور کرے گا اس لیے میں نے کہا تھا کہ مقتداء لوگ علاوہ احتیاط اور تقویٰ کرنے والوں کے زیادہ اس آفت میں گرفتار ہیں۔ یہ ہیں وہ مرض۔

آیت اتامرون الخ سے اپنے عیبوں پر نظر رکھنے کو ثابت کرنا

اب میں اس مضمون کا آیت سے مراد ہونا ظاہر کرتا ہوں' مگر اس کے لیے چند باتوں کی ضرورت ہے۔ اول ان کو سمجھ لیا جائے۔ اس کے بعد سے یہ سمجھ میں آ جائے گا۔

نیک بات دوسرے کو بتانا طاعت ہے خواہ خود عمل کرے یا نہ کرے

اول بات یہ ہے کہ نیک بات بتلانا ہر وقت طاعت ہے۔ خواہ بتلانے والا عمل اس پر کرے یا نہ کرے۔ اور یہی وہ غلطی ہے جو کہ اس آیت کی غلط مراد سمجھنے کی بدولت عالموں

کو ہوئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض نے وعظ اور نصیحت کرنے کو بالکل ہی چھوڑ دیا۔ اور جب اس سے سبب پوچھا گیا تو جواب دیا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ترجمہ: یہ کیا کہ حکم کرتے ہو لوگوں کو بھلائی کا اور بھولتے ہو اپنے نفسوں کو۔ حالانکہ تم پڑھتے ہو اللہ کی کتاب۔ اور اس جواب کے بعد اپنے کو بالکل بری الذمہ سمجھ لیا۔ مگر یہ دھوکہ ہے۔ اور سبب اس دھوکے کا یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ اگر خود عمل نہ کرو تو دوسروں کو نصیحت بھی نہ کرو۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ نصیحت کرنا طاعت ہے اور اس طاعت کی شرطوں میں کہیں یہ شرط نہیں کہ اگر خود بھی عمل کرے تو طاعت ہوگی ورنہ نہیں۔ ہاں اپنا عمل نہ کرنا ایک جدا گناہ ہے جو کہ قابل چھوڑنے کے ہے۔ لیکن نصیحت کرنے کے لیے یہ شرط وغیرہ کچھ نہیں۔ اور یہ کسی حدیث سے یا کسی امام کے قول سے ثابت نہیں کہ اگر گناہ سے نہ بچے تو دوسری طاعت بھی طاعت نہ ہوگی۔ اور اگر اس کو مانا جائے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ترجمہ:۔ تحقیق نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے بارے میں ہے جو کہ نیکی بھی کرتا ہے لیکن گناہ میں بھی گرفتار ہے۔ تو اگر گناہ کرنا دوسری طاعت کے طاعت نہ ہونے کا سبب ہو تو اس کفارہ کی کوئی صورت بھی نہ رہے گی اور یہ آیت کے مضمون کے بالکل خلاف لازم آتا ہے۔ البتہ اگر کوئی ایسا گناہ کرے جس سے طاعت فوت ہو جاتی ہے تو بے شک وہ طاعت' طاعت نہ رہے گی۔ اور اگر وہ گناہ ایسا نہیں تو طاعت اپنی حالت پر رہے گی اگر چہ برا کام کرنے سے گناہ بھی ہوگا۔ ہاں اتنا اثر ضرور ہوگا کہ گناہ کی وجہ سے طاعت کی برکت کم ہو جائے گی۔ سو یہ ایک جدا مسئلہ ہے جس کو انشاء اللہ کسی دوسرے وقت پورے وعظ میں بیان کروں گا۔ (فرمایا کہ بہتر ہو اگر مجھے اس کے متعلق یاد دلایا جائے۔ کیونکہ بعض لوگوں کو اس مسئلے کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے گناہ کرنے میں بہت بے پروائی ہوگئی ہے اور یوں سمجھتے ہیں کہ گناہ کرنے سے طاعت میں کچھ کمی نہیں' حالانکہ اس کی برکت میں کمی ہو جاتی ہے)

گناہ کرنے سے طاعت اپنی حالت پر رہے گی۔ ہاں اس کی برکت کم ہو جاتی ہے

مگر اس وقت یہ بیان کرنا ہے کہ گناہ کرنے سے طاعت فوت نہ ہو جائے گی۔ اور دلیل اس کی یہ آیت ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ (ترجمہ) تحقیق نیکیاں کفارہ ہوتی ہیں گناہوں کی۔ پس جب آیت میں ملامت کرنے کا سبب ایک اور بات ہے تو یہ سمجھنا کہ اگر وعظ کہوں گا تو گہنگار رہوں گا غلط ہے۔

پس نصیحت کرنا ہر حال میں طاعت ہوا۔ اور اس کا اطاعت ہونا گناہ نہ کرنے پر موقوف نہ ہوا' بلکہ آیت میں ملامت اس پر ہے کہ تم خود عمل کیوں نہیں کرتے۔ اور وعظ کے چھوڑ دینے سے تو دوسرا جرم قائم ہو گیا۔ یعنی نہ خود عمل کریں اور نہ باوجود معلوم ہونے کے دوسروں کو بتلائیں۔ یہ ہے عالموں کی اس غلطی کا بیان۔

دوسری بات یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ترجمہ: تحقیق نیکیاں کفارہ ہوتی ہیں برائیوں کا۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب ایک شخص نصیحت کرتا ہے جو کہ طاعت ہے اور طاعت کفارہ ہوتی ہے برائی کا۔ تو اس کا یہ اثر ہو سکتا تھا کہ یہ کفارہ ہو جاتی نفس کو بھولنے کا۔ جس سے مراد ہے عمل کو چھوڑنا۔ مگر اس اطاعت اور نیکی کے ہوتے ہوئے بھی اس عمل کا چھوڑنا قابل ملامت کے ہوا۔ تو جہاں یہ طاعت اور نیکی بھی نہ ہو نری بدعملی ہو' جس میں غیبت کرنا بھی داخل ہے وہ تو کیونکر ملامت کا سبب نہ ہو گی' ضرور ہو گی۔

آیت اَتَاْمُرُوْنَ النَّاس کا خلاصہ:

خلاصہ یہ ہو گا کہ اے شخص جو کہ اپنی حالت کو بھول رہا ہے۔ جب کہ تیری حالت ایک گناہ اور ایک اطاعت کے مجموعے پر بھی ملامت کے قابل ہے تو جب طاعت ایک بھی نہ ہو' بلکہ دونوں کام گناہ کے ہوں تو کیونکر ملامت کا سبب نہ ہو گی۔ اور دو گناہ اس طرح ہوئے کہ بدعملی تو اپنی حالت پر رہی جس کو تَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ میں فرمایا ہے کہ بھولتے ہو تم اپنے نفسوں کو' اور نصیحت کرنے کے بجائے دوسرے کی غیبت ہو گئی۔ تو اس

حالت میں اس سے زیادہ ملامت ہونی چاہیے۔

پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس میں ملامت کا سبب بدعملی اور غیبت ہے۔ عالموں کی ہی شکایت نہیں بلکہ جاہلوں کی زیادہ سخت شکایت ہے۔ اور عالموں کی معمولی کیونکہ ان کے پاس ایک نیکی تو ہے یعنی نصیحت کرنا۔ اور جاہلوں کے پاس تو ایک بھی نہیں۔ اب اس میں غور کیجیے اور جہالت پر اپنے فخر کرنے کو دیکھئے کہ اس کی بدولت خدائی تعزیرات کی ایک دفعہ اور بڑھ گئی۔

مقصود اس سب بیان سے یہ ہے کہ ہماری جو یہ عادت پڑ گئی ہے کے ہم دوسروں کی غیبت کیا کرتے ہیں۔ اس کو چھوڑ دینا چاہیے اور اپنی فکر میں لگنا چاہیے۔

صاحبو! اپنے جرم کیا کچھ کم ہیں کہ دوسروں کی فکر کریں۔

قوم کی اصلاح کرنے کے لیے حالات کی تفتیش کرنے کے قاعدے:

اور یہ جو میں نے کہا تھا کہ قوم کی اصلاح کرنے کے واسطے حالات کی تفتیش جائز ہے۔ اس کے کچھ قاعدے بھی ہیں ان کو معلوم کر لینا ضروری ہے۔ سو ایک قاعدہ تو یہ ہے کہ کسی شخص کی اصلاح عام مجمع میں نہ کی جائے کیونکہ اس سے دوسرے کو شرمندگی ہوتی ہے اور اس شرمندگی کا اثر یہ ہے کہ نصیحت کرنے والے سے بغض پیدا ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کام کے چھوڑنے کے بجائے اس میں اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے کیونکہ سمجھتا ہے کہ میری رسوائی تو ہو ہی گئی پھر میں کیوں چھوڑوں۔ اس کے لے بہتر یہ ہے کہ یا تو خود اس کو تنہائی میں لے جا کر اس سے کہہ دے یا اگر اس سے کہہ نہ سکے تو کسی ایسے شخص سے کہہ دے جو کہ اس کی اصلاح کر سکے۔ لیکن اس کے دشمن سے نہ کہے۔ کیونکہ دشمن سے کہنے میں اصلاح تو ہو نہیں سکتی۔ ہاں اس کی ذلت ہوگی۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ نرمی سے کہے تحقیر اور طعن کے طور پر نہ کہے۔ تیسرا قاعدہ یہ ہے کہ اگر مجمع میں عام طریقے سے کہے تو ایسے پتے نہ دے کہ سب میں اس کی رسوائی ہو جائے۔ مجھے یہ بات بہت پیش آئی ہے۔ یعنی یہ فرمائش کی جاتی ہے کہ فلاں شخص سود لیتا ہے ذرا وعظ میں اس کی خبر لیجئے گا فلاں شخص نے دوسروں کے حقوق دبا رکھے ہیں ذرا اس

کے متعلق فرما دیجیے گا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں ان فرمائشوں پر کبھی عمل نہیں کرتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ طریقہ بجائے مفید ہونے کے مضر ہے۔ سننے والے قرینہ سے سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں کو کہا جا رہا ہے اور اس سے عام مجمع میں اس کو شرمندگی ہوتی ہے جس کا نتیجہ بغض اور عداوت ہے۔ اور اس کے سبب سے اس کو اپنے فعل کی اور زیادہ بیچ ہو جاتی ہے۔ اس کا بہتر طریق یہ ہے کہ واقعی اگر ان لوگوں کی اصلاح کرنا منظور ہے تو اول ان سے میل جول پیدا کیا جائے۔ جب خوب بے تکلفی پیدا ہو جائے تو وقتاً فوقتاً نرمی سے ان کو سمجھایا جائے اور خدا تعالیٰ سے ان کے لیے دعا کی جائے۔ اور جو تدبیریں مفید ثابت ہوں ان کو عمل میں لایا جائے۔

غرض وہ برتاؤ کیا جائے جو کہ اپنی اولاد سے کیا جاتا ہے کہ اگر ان کی شکایت کسی دوسرے سے کی جائے گی تو وہ اپنے دوستوں سے کی جائے گی جو کہ اس کی اصلاح کر سکیں یا بزرگوں سے کی جائے کہ وہ اس کے لیے دعا کریں۔ غرض جن سے درست کرنے امید ہوگی۔ انہی سے کہا جائے گا۔ اور جہاں یہ بات نہ ہوگی وہاں زبان پر بھی اپنی اولاد کے عیبوں کو نہ لایا جائے گا۔ یہ مثال اللہ کے فضل سے ایسی عمدہ ہے کہ اس کے پیش نظر رکھنے کے بعد اصلاح کرنے کے سارے قاعدے معلوم ہو جائیں گے یعنی جس مسلمان کی اصلاح کرنا چاہو یہ غور کر لو۔ اگر یہ حالت ہماری اولاد کی ہوتی تو ہم کیا برتاؤ اس کے ساتھ کرتے۔ پس جو برتاؤ اس کے ساتھ طبیعت تجویز کرے وہی برتاؤ اس غیر کے ساتھ بھی کرو۔

حدیث اَلْمُسْلِمُ مَرْاٰۃُ الْمُسْلِمِ کے معنٰے:

اور میں اس حدیث کے کہ اَلْمُسْلِمُ مَرْاٰۃُ الْمُسْلِمِ یہی معنیٰ بیان کرتا ہوں۔ یعنی جس طرح آئینہ کا خاصہ ہے کہ وہ تمہارے چہرے کے عیبوں کو تم سے چھپاتا نہیں۔ اور دوسروں پر ظاہر نہ کرے۔

دوسرے یہ کہ کسی مسلمان کی طرف سے کینہ نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ آئینہ کی طرح بالکل صاف دل رہنا چاہیے۔ حاصل یہ ہے کہ جب کسی کے عیبوں پر مطلع ہو تو اس کو

اطلاع کردو۔ اور اگر یہ کارگر نہ ہو تو خدا تعالیٰ سے دعا کرو۔

غرض دوسرے کے عیبوں کو تلاش کرنا اور بیان کرنا ان مصلحتوں سے تو جائز ہے۔ اور اگر یہ مصلحتیں نہ ہوں تو علاوہ ایک موقع کے بالکل حرام ہے۔

برائی کرنے کے جائز ہونے کا ایک موقع:

اور وہ موقع یہ ہے کہ مظلوم شخص ظالم کی برائی کرے۔ کیونکہ مظلوم کو ظالم پر غصہ آتا ہے۔ اور وہ غصہ حق ہوتا ہے۔ پس شریعت نے مظلوم کو اجازت دے دی ہے کہ وہ اپنے غصے کو نکال لے۔

سبحان اللہ! شریعت کی تعلیم بھی عجیب پاکیزہ تعلیم ہے کسی رعایت کے لائق پہلو کو نہیں چھوڑا۔ دیکھئے مظلوم چونکہ اپنے جائز غصے کو نکالتا ہے اور یہ طبعی بات ہے کہ اس کے ضبط کرنے سے کلفت ہوتی ہے تو اس کو اجازت دے دی گئی۔ پھر اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ جب اس مظلوم کو غیبت کرنے سے لوگوں کو ظالم کے ظلم کی حالت معلوم ہوگی تو وہ اپنے کو اس سے بچانے کی فکر کریں گے۔ بلکہ بعض بزرگوں نے تو ایک باریک مصلحت سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مظلوم کو چاہیے کہ اگر اس قرینہ سے معلوم ہو جائے کہ میرے صبر کرنے سے ظالم پر ضرور خدا کا قہر نازل ہوگا (کیونکہ بعض لوگوں کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہوتا ہے تو اپنی زبان سے کچھ تھوڑا ضرور ظالم کو کہہ لیا کرے۔ کیونکہ اس کی خاموشی سے اندیشہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا غضب دنیا ہی میں ظالم پر ٹوٹے۔

اور بعض لوگوں کے کلام سے جو نہ کہنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے وہ اس بناء پر کہ صبر کرنا ایک نیک عمل ہے اس کے کرنے سے مظلوم کو زیادہ ثواب ملے گا۔ لیکن جنہوں نے کچھ کہنے کی اجازت دی اور اس کو افضل بتلایا' انہوں نے یہ خیال کیا کہ مسلمان بندے کو دوزخ کا عذاب نہ ہو اور وہ خدا تعالیٰ کے قہر سے محفوظ رہے۔

شاید کسی طالب علم کو شبہ ہو کہ خدا تعالیٰ کے قہر سے محفوظ رہنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ وہ مظلوم معاف کر دے تو سمجھنا چاہیے کہ بعض لوگوں کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ معاف بھی کر دیں تو خدا تعالیٰ اپنا حق کہ ان کے بندے کو ستایا تھا'

معاف نہیں فرماتے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ چلے جا رہے تھے کہ ایک شخص نے کچھ ان کو بیہودہ کہا۔ اس بزرگ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا کہ اس کے ایک دھول مار وہ ذرا رُکا فوراً وہ شخص زمین پر گرا اور مرگیا۔ انہوں نے اپنے مرید سے کہا' تم نے دیر کی اور اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ اور فرمایا کہ جب اس نے مجھے برا بھلا کہا تو میں نے دیکھا کہ خدا کا قہر اس پر نازل ہوا چاہتا ہے۔ اس لیے میں نے چاہا تھا کہ میں خود ہی اس کو کچھ کہہ لوں۔ تا کہ خدا کا قہر اس پر نہ پڑے۔ لیکن تم نے دیر کی آخر یہ شخص ہلاک ہو گیا اور یہی راز ہے کہ جب حضور ﷺ کے مبارک منہ میں کڑوی دوا ڈالی گئی۔ اور آپ ﷺ کے منع فرمانے پر بھی لوگوں نے نہیں مانا تو حضور ﷺ نے ہوش آ جانے کے بعد فرمایا کہ جن لوگوں نے میرے منہ میں دوا ڈالی ہے ان سب کے منہ میں دوا ڈالی جائے سوائے عباس کے' اس لیے کہ وہ اس رائے میں شریک نہیں تھے تا کہ بدلہ ہو جائے اور یہ لوگ خدا کے قہر میں گرفتار نہ ہوں۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اکثر لوگوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ کسی نے اس کا سبب پوچھا' تو آپ نے فرمایا کہ لوگوں کی حرکتوں سے اکثر مجھے تکلیف ہوتی ہے اور میری تکلیف کی وجہ سے لوگ وبال میں پڑ جاتے ہیں اور میں نے کتنی مرتبہ خدا تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ میری وجہ سے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ لیکن میری یہ دعا قبول نہ ہوئی۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اکثر تجربہ کیا ہے کہ جو شخص بزرگوں سے الجھا وہ گرا۔ تو چونکہ بعض کے معاف کرنے سے بھی پورا معاف نہیں ہوتا۔ اس لیے کچھ کہہ لینا ہی مصلحت ہے۔

غرض مظلوم کو ظلم ظاہر کرنے کی بغیر کسی مصلحت کے بھی اجازت ہے۔ اور اگر وبال کے ٹل جانے یا ہلکا ہو جانے کی نیت ہو تو وہ ثواب کی بات ہے۔ لیکن اور دوسروں کو بغیر کسی مصلحت کے اجازت نہ ہوگی۔

بقیہ آیت کی تفسیر اور وعظ کا خاتمہ:

اب میں اپنے بیان کو بقیہ آیت کا ترجمہ کر کے ختم کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں: وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ یعنی تم کیا حالانکہ تم اللہ کی کتاب بکو پڑھتے ہو۔ اور اس کے حکم تم کو معلوم ہیں۔ شاید بعض لوگ اس ترجمے کو سن کر خوش ہوں کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے ہے جو کہ کتاب کو پڑھتے ہیں۔ ہم چونکہ پڑھے ہوئے نہیں' اس لیے ہم کو یہ حکم نہیں ہے۔ لیکن یہ خوشی صحیح نہیں۔ کیونکہ آگے یہ بھی ارشاد ہے کہ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی تم کیا سمجھتے نہیں ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ جس طرح شریعت کا ہے' عقل سے بھی ثابت ہے۔ یعنی عقل بھی اس کی برائی پر فتویٰ دیتی ہے۔

بہر حال اس آیت سے صریح طور پر اس پر ملامت ہوئی کہ اوروں کو سمجھاؤ اور خود عمل نہ کرو' اور اس سے بڑھ کر یقینی طور پر یہ ثابت ہوا کہ اوروں کی برائی کے درپے ہونا اور اپنی برائیوں کو فراموش کرنا برا ہے۔

ضرورت اس کی ہے کہ ہر وقت اپنے گناہوں اور عیبوں پر نظر ہو۔ اور اس کے علاج کی فکر کی جائے۔ اور جس میں اپنی فکر اور تدبیر کافی نہ ہو۔ اس میں دوسرے کسی ماہر سے دریافت کر لو۔

شرم وحجاب کی وجہ سے اپنے مرضوں کو علاج کرنے والے سے چھپانا نہ چاہیے۔ کیونکہ بغیر مرض کے ظاہر کیے علاج ممکن نہیں۔ بیان ختم ہوا۔ چونکہ اس مرض میں اکثر لوگ گرفتار تھے' اس لیے اس کا بیان کرنا ضروری سمجھا گیا۔ سو اللہ کا شکر ہے کہ اس پر کافی گفتگو ہوگئی۔

اب خدا سے دعا کی جائے کہ وہ ہم کو اچھی سمجھ اور نیک کاموں کی توفیق دے۔

آمین یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ

تَمَّتْ بِالْخَیْرِ وَبِكَ نَسْتَعِیْنُ

(۵۱) عالموں کو عمل کی ضرورت!

منتخب از العمل للعلماء وعظ ششم دعوات عبدیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خطبہ ماثورہ:

اَمَّا بَعْد۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے: اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ

ترجمہ: ''تحقیق وہ لوگ مستعدی کرتے تھے نیک کاموں میں۔ اور پکارتے تھے ہم کو رغبت اور خوف کے ساتھ اور وہ ہمارے سامنے نیاز مندی کرنے والے تھے۔''

آیت کا خلاصہ اور بیان کی ضرورت:

یہ ایک آیت کا جزو ہے اس لیے پہلے حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے اور خاص خاص مقاصد کے لیے ان کے کچھ خاص خاص حالات مقامی ضرورت کے موافق بیان فرمائے ہیں۔ اس کے بعد ان حضرات کے عام حالات کو اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔

یہ حاصل ہے اس آیت کا۔ اور مقصود اس آیت سے اس وقت ایک خاص بات کو ظاہر کرنا ہے۔ اور وہ حقیقت میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ آپ لوگوں کی جانی ہوئی بات ہے۔ لیکن بعض بات ایسی ہوتی ہے کہ باوجود اس کے معلوم ہونے کے اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اور اس لیے اس کو نئی بات بھی کہہ دیا جاتا ہے تو چونکہ اس کی طرف بھی توجہ

نہیں ہے۔ اس واسطے اس کو بھی اس خاص اعتبار سے نئی بات کہنا درست ہوگا۔ اور توجہ نہ ہونے کے سبب مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی تو کسی بات کی نہایت درجہ ظاہر ہونے کی وجہ سے اس کو معمولی سمجھا جاتا ہے اور اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور کبھی توجہ نہ ہونے کی یہ وجہ ہوتی ہے کہ وہ بات بہت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور جب حال یہ ہے تو ممکن ہے کہ جس بات کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے۔ اس کی کسی جزئی کو نہایت ظاہر ہونے کی وجہ سے معمولی سمجھا جاتا ہو۔ اور اس کی طرف توجہ نہ ہو۔ اور کسی جزئی کی طرف بوجہ بہت پوشیدہ ہونے کے توجہ نہ ہو۔ غرض چونکہ بعض باتوں کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور واقع میں ان کی طرف توجہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو بیان کیا جاتا ہے اور ان کا بیان کرنا باجود اس کے کہ وہ سننے والوں کو معلوم ہوتی ہیں بے فائدہ نہیں ہوتا۔ سو اس مقصود کا بیان ہے کہ اس مقام پر انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے۔ اور آپ[1] لوگ علم کی دولت رکھتے ہیں۔ ان حضرات کے وارث ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ ترجمہ: عالم انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں۔

حدیث العلماء ورثۃ الانبیاء کی شرح اور معنی:

اور یہ ایسی بات ہے کہ اس کو تمام اہل علم نے بڑی خوشی سے مان لیا ہے۔ اور سب کا اتفاق اس پر ہوگیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کے ماننے میں اہل علم کا نفع ہی نفع ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس سے ایک بڑا مرتبہ اور فخر حاصل ہوتا ہے۔ اور کسی قسم کی محنت اور مشقت اس میں ہے نہیں۔ اس لیے اپنا لقب وارث قرار دے کر بیٹھ رہے۔ حالانکہ اس میں اس بات پر غور کرنے کی ضرورت تھی کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں کمال علمی کے ساتھ کوئی دوسرا کمال یعنی کمال عملی بھی تھا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا اقرار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر انبیاء علیہم السلام میں بھی کمال عملی نہ مانا جائے تو کس کے اندر مانا جائے گا۔ کیونکہ وہ حضرات ساری مخلوقات میں افضل ہیں۔ پس یہ کہنا ضرور پڑے گا کہ انبیاء میں اس درجہ کمال عملی تھا کہ کسی دوسرے میں ہونا ممکن نہیں۔

---

[1] یہ وعظ مدرسہ دیوبند میں ہوا تھا جس میں عالموں اور طالب علموں کا مجمع تھا۔ ۱۲

نائب ہونے کی وجہ میں عملی کمال کو بڑا دخل ہے:

جب یہ بات ثابت ہوگئی تواب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وارث ہونے کی وجہ آیا صرف علمی کمال ہے یا کمال عملی کو بھی اس میں دخل ہے۔

ہم جو غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف کمال علمی وارث کی وجہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ جو عالم بے عمل ہیں۔ ان میں کوئی شان مقبولیت کی ہم نہیں پاتے۔ حالانکہ نبی کے وارث کے لیے مقبول ہونا ضروری ہے۔ جیسے ابلیس شیطان کہ وہ بہت بڑا عالم ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ وہ عالموں کے بہکانے کی تدبیریں کرتا ہے۔ اور بسا اوقات اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ کسی شخص کے خیالات کو وہی بدل سکتا ہے جو کہ خود بھی ان خیالات میں کم سے کم اس کے برابر تو ماہر ہو کہ جس کے خیالات بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔

دیکھئے قانون کے سمجھنے میں قانون دان کو وہی شخص دھوکہ دے سکتا ہے جو کہ خود بھی قانون کو جانتا ہو تو شیطان کا عالموں کے بہکانے اور دھوکہ دینے میں کامیاب ہونا صاف بتلا رہا ہے کہ وہ بھی بہت بڑا عالم ہے۔ لیکن جو اس کا انجام ہوگا وہ سب کو معلوم ہے ایسی ہی بنی اسرائیل عالموں کا حال ہے۔ جس کی نسبت قرآن شریف میں ارشاد ہے: اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (ترجمہ) تم لوگ پڑھتے ہو اللہ کی کتاب کو۔ مگر ان کے بدانجامی کا ذکر خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ اور جگہ جگہ ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے یہاں تک کہ کسی فرقے کی اتنی مذمت قرآن میں نہیں جتنی بنی اسرائیل کی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ صرف کمال علمی وارث ہونے کی وجہ نہیں بلکہ عمل کی ضرورت ہے کیونکہ بعض عمل کے مقبولیت نہیں ہوتی۔ اور غیر مقبول انبیاء کا وارث نہیں ہوسکتا۔ اس کو رسول مقبول ﷺ نے ایک حدیث میں نہایت واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

العلماء ورثة الانبیآء ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درهما ولكن ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وفرا۔ (ترجمہ) سب عالم انبیاء کے وارث اور نائب ہیں اور تحقیقاً انبیاء نے دینار و درہم کی میراث نہیں چھوڑی۔ بلکہ علم کی میراث چھوڑی ہے۔ پس

جس شخص نے اس کو حاصل کیا تو بڑی دولت حاصل کی۔

اس حدیث میں علم کو حظ وافر (یعنی بڑی دولت فرمایا ہے اور علم کو حظ وافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا وبال جان ہونا خود حدیث میں آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ لَجَهْلًا ترجمہ: تحقیق بعض علم یقیناً جہالت ہوتا ہے تو اس حدیث میں علم کو جہالت فرمانا صاف بتلا رہا ہے۔

خالی علم کسی درجہ میں شمار نہیں:

کہ یہ علم کسی درجہ میں بھی اعتبار کے قابل نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ واضح لیجیے۔ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کو دیکھا جائے گا کہ اس کی آنتیں باہر نکلی پڑی ہیں اور وہ ان کے گرد گھوم رہا ہے۔ لوگ اس سے اس سزا کا سبب پوچھیں گے۔ کہے گا کہ میں اپنے علم پر عمل نہ کرتا تھا۔ پس ان حدیثوں سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ علم بلا عمل حظ وافر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جو علم عذاب سے نہ بچا سکے وہ حظ وافر کیا ہو گا۔

پس حظ وافر وہی علم ہو گا کہ جس کے ساتھ عمل ہو۔ پس وارث ہونے کی بھی بناء وہی علم ہو گا...... جس کے ساتھ عمل ہو ہر علم وارث ہونے کا سبب نہ ہو گا۔ باوجود اس کے ہم لوگ جو اپنے کو عالم کہتے ہیں۔ ذرا اپنے علم پر عمل نہ کرتا تھا۔ پس ان حدیثوں سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ علم بلا عمل حظ وافر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جو علم عذاب سے نہ بچا سکے وہ حظ وافر کیا ہو گا۔

پس حظ وافر وہی علم ہو گا کہ جس کے ساتھ عمل ہو۔ پس وارث ہونے کی بھی بناء وہی علم ہو گا...... جس کے ساتھ عمل ہو ہر علم وارث ہونے کا سبب نہ ہو گا۔ باوجود اس کے ہم لوگ جو اپنے کو عالم کہتے ہیں۔ ذرا اپنے دلوں میں ٹٹول کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ ہمارے دلوں میں محض اپنے عالم ہونے ہی پر ناز اور فخر پایا جاتا ہے اور ہم صرف اسی صفت کی وجہ سے خود کو بہت بڑا سمجھتے ہیں اور عمل کی کمی سے ہم کو اپنے کمال اور خوبی میں نقصان کا شبہ ہی نہیں ہوتا۔

اور یہ ایسی ظاہر بات ہے کہ اس پر کسی قرینہ کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر

شخص ذرا غور سے خود معلوم کر سکتا ہے۔ اور اگر اس قرینہ کی ضرورت ہے تو قرینے بھی اس کے موجود ہیں۔ جیسے ایک قرینہ اس کا یہ ہے کہ باوجود عمل نہ کرنے کے ہم لوگ اپنے کو عام لوگوں سے برتر سمجھتے ہیں اور اپنے کو ان سے بہتر خیال کرتے ہیں پس اگر عالم لوگ ہماری تعظیم میں کمی کریں تو ہم کو سخت تعجب ہوتا ہے اور بہت ہی غصہ آتا ہے۔ یہ صاف دلیل اس کی ہے کہ ہم لوگ محض علم کی وجہ سے اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم کہیں چلے جارہے ہوں اور کوئی عام لوگوں میں ہم کو راستے میں ملے تو خود سلام کرنا تو درکنار اس کے سلام کا جواب دے دینا بھی اپنا احسان سمجھتے ہیں۔ کیوں صاحب! کیا قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کی بابت فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ارشاد نہیں ہوا۔ اور جب یہ ہے تو کیا نرا علم ناز یا فخر کرنے کے قابل ہوسکتا ہے؟ کبھی نہیں جیسا کہ حدیث شریف میں صاف آیا ہے۔ ایک علم بندے کے لیے حجتہ (یعنی مفید ہے) اور ایک علم خدا کی حجتہ ہے بندے پر (یعنی بندے کے لیے مضر ہے) تو ایسا علم کیا ناز کے لائق ہوسکتا ہے۔ اور اپنے کو جو انبیاء کا وارث اور نائب سمجھتے ہیں تو کیا ہمارا نرا عالم بن جانا اس وارث بننے کے لیے کافی ہوگیا۔ ہرگز نہیں۔ چونکہ ہم لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں اور یہ آیت اس خیال کا لغو اور باطل ہونا بتلارہی ہے۔ اس لیے اس آیت کو اس وقت اختیار کیا گیا جس میں انبیاء علیہم السلام کے لیے صفت علم ثابت کرنے کے بعد عملی حالت کو بیان کیا گیا ہے تاکہ ہم توجہ کریں اور غور کریں کہ جن کے ہم وارث اور نائب بنتے ہیں ان کی کیا کیا صفتیں تھیں۔ اور یہی غور کرنا غرض ہے۔ قرآن میں بار بار حضرت انبیاء علیہم السلام کے قصوں کے ذکر کرنے کی یہ غرض تھی تاکہ ہم ان میں غور کیا کریں۔ پس ہم کو توجہ اس بات کی طرف کرنی چاہیے کہ آیا ہم میں وہی عمل کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں پائی جاتی تو نائب ہونے کا دعویٰ ہم کو چھوڑ دینا چاہیے۔ تو گویا یہ آیت ہمارے اس مرض کا علاج ہے۔

آیت اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ کی تفسیر:

پس بیان اس آیت کا یہ ہے کہ اس میں اول حضرات انبیاء علیہم السلام کے علم کے لیے نبوت لازم ہے یا یوں کہیے کہ ایسا کامل علم نبوت کے لیے لازم ہے۔ یا دونوں میں سے ہر

ایک کو دوسرے کے لیے بازم مانا جائے۔

بہر حال جو کچھ بھی کہا جائے۔ اتنا ضرور ماننا پڑتا ہے کہ نبوت اور کمال علم میں علیحدگی نہیں ہوتی تو باوجود علم کے اس کامل مرتبہ پر ہونے کے پھر بھی ان کی تعریف کا مدار صرف اس علم کو قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے ساتھ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ کو بھی ذکر فرمایا۔ اور تعریف کے مدار کا ایک جزو اس کو قرار دے کو مجموعہ پر تعریف کو ختم فرمایا۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ صرف علم ہی تعریف کے لائق نہیں' بلکہ اس کے لیے عمل کی بھی ضرورت ہے کیونکہ اس جگہ اگر عمل کا دخل تعریف میں نہ مانا جائے۔ اور صرف علم کے ذکر کرنے ہی کو تعریف کے لیے کافی سمجھا جائے تو پھر ان حضرات کے عمل کو ذکر کرنا بالکل بے کار ہوگا۔

پس معلوم ہوا کہ تعریف کے لیے صرف کمال علمی کافی نہیں' بلکہ کسی دوسرے کمال کی بھی ضرورت ہے۔ اور وہ عمل ہے جس کو اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس وقت آپ حضرات کو وہی سنایا جارہا ہے۔ اگر چہ آپ کو سنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ آپ خود مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن اس اوپر کے قاعدے کی بناء پر کہ کبھی بعض بات ایسی ہوتی ہے کہ باوجود معلوم ہونے کے اس کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ اس کو سنانا مفید معلوم ہوا اور یہ شبہ نہ ہو کہ علم سے اصل مقصود عمل ہے اور علم اس کا ذریعہ ہے، اور اصل مقصود کی طرف توجہ ہونا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے اس اصل مقصود کو یاد دلانے کی حاجت نہ ہونا چاہیے۔

اصل مقصود سے غافل ہو جانا اور اس کے ذریعہ کی فکر میں پڑ جانا سخت غلطی ہے:

بات یہ ہے کہ آدمی کبھی کسی مقصود کے ذریعہ کی فکر میں اس قدر پڑ جاتا ہے کہ اصل مقصود ہی اس کی نظر سے غائب ہو جاتا ہے اور یاد نہیں رہتا۔ اگر چہ ہے یہ بڑی غلطی۔ کیونکہ اس سے اکثر خود صحیح ذریعہ کے اختیار کرنے میں بھی غلطی واقع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ

اگر اصل مقصود پیش نظر نہ ہوتو تو پتہ نہیں چلتا کہ کون ذریعہ سے مقصود حاصل ہوسکتا ہے تا کہ اس کو اختیار کیا جائے۔ اور کون ذریعہ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ تا کہ اس کو چھوڑا جائے تو ایسی حالت میں کوشش کا مفید یا بے کار ہونا معلوم نہیں ہوتا۔

دیکھئے اگر کوئی شخص دہلی جانا چاہے تو ریل میں بیٹھنا وہاں پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن اگر دہلی جانا پیش نظر ہے تو اس کو فکر اس کی ہوگی کہ وہ گاڑی تلاش کرے۔ جس کے ذریعہ سے دہلی پہنچ جائے۔ اور اگر دہلی جانا پیش نظر نہیں رہا۔ بلکہ محض چلنے اور پھرنے اور سیر کرنے کی فکر ہے تو تعجب نہیں کہ اس میں غلطی ہو۔ اور بجائے دہلی کے کلکتہ پہنچ جائے۔

یہی حاصل ہر ذریعہ کا اور اس کے مقصود کا ہے۔ کہ اگر خود ذریعہ ہی کو بجائے مقصود کے سمجھ لیا اور اصل مقصود کو بھول گیا تو بعض اوقات اس کی فکر میں پڑ کر ضرور غلطی ہوگی۔ پس ذریعہ کے اہتمام میں مقصود کو بھلانا بڑی کمی کی بات ہے۔ مگر پھر بھی علم کے حاصل کرنے میں یہ کوتاہی کثرت سے واقع ہو رہی ہے کہ طالب علموں کو یہ یاد ہی نہیں کہ اس علم کی غرض عمل ہے۔ اسی وجہ سے باوجود آپ کے جاننے کے پھر بھی آپ کو یاد دلانے کا خیال پیدا ہوا۔ سو اس کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہمارے لیے کافی نمونہ ہے۔ کیونکہ ہم انبیاء علیہم السلام کے نائب ہیں۔ اور جو ان کی حالت تھی وہی ہم کو اختیار کرنی چاہیے اور وہ حالت اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ اور اس میں کئی قسم جو ان کی حالت تھی وہی ہم کو اختیار کرنی چاہیے اور عمل الگ الگ بیان کیے گئے ہیں۔

علم سیکھنے کے بعد عمل کی ضرورت:

چنانچہ اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ ط کہ وہ لوگ مستعدی اور بہت کوشش کرتے تھے نیک کاموں میں۔ اس میں ظاہری عملوں کا ذکر ہے جیسے نماز، روزہ۔ آگے ارشاد ہے وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَھَبًا ط (ترجمہ) ہم کو پکارتے تھے شوق سے۔ اور خوف سے۔ اس میں زبان کے عمل کا ذکر ہے۔ آگے فرماتے ہیں:۔ وَکَانُوْا لَنَا خَاشِعِیْنَ ○ ترجمہ: اور تھے ہمارے لیے خشوع کرنے والے' اس مین دل کے عمل کا بیان ہے۔ اور اسی پر ختم کر دیا گیا ہے۔ ان قسموں کو ایک ساتھ بیان کرنے سے یہ بات سمجھ میں

آتی ہے کہ عمل ان تینوں کے جمع کرنے سے کامل ہوتا ہے۔ اور اگر ایک جزو کی بھی کمی رہی تو عمل ناقص اور ادھورا رہے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص گھر بنائے تو اس گھر کو پورا گھر اس وقت کہا جائے گا کہ اس میں گھر کے تمام ضروری حصے ہوں کمرہ سہ دری۔ باورچی خانہ وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر ایک جزو بھی کم ہوا تو اس گھر کو پورا گھر نہ کہیں گے۔ بس یہی حالت عمل کی بھی ہے کہ اگر ایک قسم بھی چھوٹ گئی تو عمل کامل اور پورا نہ ہوا بلکہ ناقص اور ادھورا رہا۔

علم پر عمل نہ کرنے کی شکایت:

اب ہم اپنی حالت کو غور کر کے دیکھیں کہ اول تو مسلمانوں میں خود عملی ہی کی کمی ہے۔ اور اگر کچھ عمل کیا بھی جاتا ہے تو وہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا جاتا اس لیے اول تو سارے مسلمانوں پر افسوس ہے۔ لیکن عالموں کی جماعت پر زیادہ افسوس ہے' اس لیے کہ وہ جانتے ہیں اور پھر کوتاہی کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں میں اگرچہ سب ایسے نہیں ہیں۔ لیکن ان میں کسی ایک کا بھی ایسا ہونا شکایت کی بات ہے کہ کیوں اپنے آپ کو جان بوجھ کر تباہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ تباہی ان ہی تک نہیں رہتی بلکہ اس ایک کو دیکھ کر دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔

چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ عالموں کی جماعت میں اگر ایک شخص بھی بگڑ جاتا ہے تو اس کا اثر سب پر پہنچتا ہے۔ اور یہ اثر دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کو دیکھ کر دوسرے عالم لوگ بددینی پر جرأت کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سب عالموں سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اور اس وجہ سے سب پر اعتراض کر جاتے ہیں۔

بے عمل عالم کا اثر عوام پر کیا ہوتا ہے:

اور سب ہی کو برا بھلا کہہ ڈالتے ہیں اگرچہ عام لوگ ہی غلطی پر ہیں۔ کیونکہ کسی کی برائی دوسروں کے سر نہیں منڈھی جاتی۔ لیکن زیادہ تر اس کا سبب ہم ہیں۔ اور کوئی صاحب یہ کہیں کہ یہ اعتراضات مخالفوں کے ہوتے ہیں۔ حسد اور عداوت کی وجہ سے کیا کرتے

ہیں۔ یا یہ کہ اعتراضات تو انبیاء علیہم پر بھی ہوئے ہیں پھر ہم کو اعتراضات کی کیا پرواہ۔ کیونکہ حضرات انبیاء علیہم پر جو اعتراضات ہوئے تھے وہ کافروں اور دشمنوں کی طرف سے ہوتے تھے۔ اور عالموں کی جماعت پر اکثر ان کے متقد ہی جو کہ ہر وقت ان کا دم بھرتے ہیں۔

اعتراض کرتے ہیں۔ اور ہمارے لیے یہ بڑی عیب کی بات ہے کہ ہم کسی موافق یا مخالف کو اتنا موقع دیں۔ تو جب اپنے لوگ بھی اعتراض کرنے پر مجبور ہوں تو ہماری حالت پر بے حد افسوس ہے۔ اور وہ اعتراض اگر چہ ظاہر میں ایک ہی پر ہو۔

لیکن یہ بات نسب جانتے ہیں کہ ایک کے بگڑنے سے ساری قوم بدنام ہو جاتی ہے اور پھر کسی کا اعتبار نہیں رہتا۔

صاحبو! بددینی ہر وقت بری چیز ہے۔ لیکن خاص کر اس زمانہ میں بہت بری ہے کیونکہ عالم طور پر علم دین سے لوگوں کو تفرت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس سے بھاگنے کے لیے لوگ بہانے ڈھونڈتے ہیں' ایسے وقت میں ہماری ایسی حالت ہونا لوگوں کے برے خیالات کو گویا پکا کرنا ہے اور علم دین سے نفرت دلانا ہے' ملا گھر میں افسوس ہے کہ ہم لوگ ایسے ہیں کہ وہ صرف علم ہی کو اصل مقصود سمجھتے ہیں اور عمل کو کوئی چیز نہیں سمجھتے۔

اس وقت عالموں کی بدعملی کی مختلف صورتیں:

بعض کی حالت تو یہاں تک خراب ہے کہ وہ نماز تک بھی نہیں پڑھتے' بعض ایسے ہیں کہ وہ اس قدر کھلم کھلا تو بے حیا نہیں لیکن اپنی زبان وغیرہ کی حفاظت تو وہ بھی نہیں کرتے جس جگہ بیٹھیں گے لوگوں کی شکایت غیبت کے ڈھیر لگا دیں گے۔

بعض ایسے ہیں کہ وہ زبان کی حفاظت کرتے ہیں لیکن وہ نگاہ کی حفاظت بالکل نہیں کرتے۔ اکثر نامحرموں کو دیکھنا رستہ چلتے ہوئے ادھر ادھر تاکنا جھانکنا عادت ہو جاتی ہے۔

صاحبو! اول تو علم اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود عمل ہے پس ان کی کوشش کرنا ضرور ہے دوسرے اگر علم کو اصل مقصود بھی مان لیا جائے تب بھی یہ سمجھ لو کہ یہ حالت بدعملی

کی تو خود علمی کمال کے حاصل ہونے میں بھی روکاوٹ ہے۔

بدعملی خود علم کے لیے بھی مضر ہے:

کیونکہ یہ تجربہ ہے کہ دینداری میں جتنی کمی ہوگی اتنی ہی کمی علم میں بھی ہوگی' اس کا آسان امتحان یہ ہے کہ دو مہینے کے لیے آپ بالکل پکے دیندار بن جائیں اور پھر علم کی پہلی حالت اور اس دینداری کے زمانہ کی حالت میں مقابلہ کریں' ان دونوں حالتوں میں جو فرق ہوگا وہ بتلادے گا کہ دینداری کو اس میں بڑا دخل ہے۔

ممکن ہے کہ کسی صاحب کہ یہ شبہ ہو کہ ہم تو دیندار بھی نہیں لیکن پھر بھی ہم کو تو اچھا خاصہ علم ہے' ہر قسم کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھا سکتے ہیں۔

علم کس چیز کا نام ہے:

سو سمجھ لیں کہ علم سے مراد صرف کتابوں کا ترجمہ کردینے اور پڑھانے کا نام نہیں بلکہ دل کے اندر وہ ایک نور ہوتا ہے جو بغیر دینداری کے پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ شخص اگر پہلی حالت اور دینداری کی حالت میں غور کرے گا تو معلوم کرے گا کہ پہلے میرا علم کیا تھا اور مہینہ دو مہینہ کے اندر علم میں کسی ترقی ہوگئی تو علم اگر اصل یہی مان لیا جائے تب بھی اس کے حاصل کرنے کے لیے۔

دینداری علم حاصل کرنے کے لیے بہت بڑا سبب ہے:

دینداری کی ضرورت ہے مگر ہم لوگ اکثر بے باک ہیں' دینداری کی ذرا پرواہ نہیں کرتے' رات دن اس کی فکر ہے کہ کسی طرح کتابیں ختم ہو جائیں' بہت لوگوں کی تو ایسی حرکتیں ہیں کہ ان کی وجہ سے ساری قوم بدنام ہوتی ہے' اور چونکہ ان لوگوں کی عادت ہوگئی ہے اس لیے ان کو ان حرکتوں کے ساتھ توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی' یعنی بشر سے غلطی تو ہو ہی جاتی ہے لیکن اگر ذرا چار دن تقویٰ رہے اور ایک دن ٹوٹ جائے اور گناہ ہونے پر پھر توبہ کرلی جائے تب بھی اس قدر خراب حالت نہ ہو اور تھوڑے دنوں میں گناہ چھوٹ جائیں' لیکن بعض لوگوں کو تو پرواہ ہی نہیں رہتی اور اس سے عام لوگوں پر بہت برا اثر پڑتا

ہے یعنی ان کو یہ کہنے کی گنجائش ملتی ہے کہ مولوی ایسے ہوتے ہیں' پس اگر خلوص[1] سے تقویٰ اور دینداری اختیار نہ کیا جائے تو اسی مصلحت سے اختیار کرلیا جائے' ہماری اس بد دینی سے عام لوگ بگڑیں گے' ورنہ ایسے لوگ خدا کے رستہ سے روکنے والے کہے جاسکتے ہیں' کیونکہ روکنا جس طرح زبان سے یا ہاتھ سے ہوتا اسی طرح اس کے لیے سبب بننا بھی گناہ ہے' یہاں تک کہ بعضے کام جو حقیقت میں نیک ہیں' جب کسی گناہ کا سبب بن گئے' تو ان کو بھی منع کیا گیا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد:

لَاتَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍO

''(ترجمہ) مت برا بھلا کہو ان لوگوں کو جو خدا کے سوا کسی دوسرے کو پوجتے ہیں پس وہ لوگ برا بھلا کہنے لگیں گے خدا کو دشمنی سے جو کہ نادانی سے ہے۔''

تو دیکھئے بتوں سے نفرت کا ظاہر کرنا اوران کو برا کہنا ایک قسم کا نیک کام تھا' لیکن چونکہ وہ سبب تھا ایک گناہ کا اس لیے اس کو بھی منع کر دیا گیا۔

گناہ کا سبب بھی گناہ ہے:

پس معلوم ہوا کہ جس طرح گناہ کرنا گناہ ہے اس طرح اس کے لیے سبب بننا بھی گناہ ہے تو اگر کسی شخص نے عمل نہ کیا تو دیکھنے والوں کے لیے عمل چھوڑنے کا سبب بن گیا۔

غرض عمل کے چھوڑنے میں یہ مضرتیں ہیں اس لیے اگر خلوص سے عمل نہ ہو تو کم سے کم دوسروں کے دین کی حفاظت ہی کے لیے ہو۔

پہلی آیت کی تفسیر:

حاصل یہ ہے کہ ارشاد ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہر قسم کے نیک کام کیا کرتے تھے اور چونکہ ہم ان کے نائب ہیں اس لیے ہم کو بھی ہر قسم کا عمل کرنا چاہیے۔

---

1 اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے کام کرنے کو کہتے ہیں ۱۲۔

ہم لوگوں میں دین کی بہت کوتاہیاں ہیں:

مگر ہم لوگوں میں اس کے متعلق کچھ کوتاہیاں ہیں' جیسے ایک کوتاہی تو یہ ہے۔ کہ عمل ہی کی طرف التفات نہیں کرتے اور اگر کچھ لوگ عمل کرتے بھی ہیں تو تو غضب یہ کیا ہے کہ صرف بعض باتوں پر کرتے ہیں' سب پر نہیں کرتے اور اسی کو کافی سمجھ کر اپنے کو شریعت پر عمل کرنے والے اور دیندار سمجھتے ہیں۔

صاحبو! ظاہر ہے کہ حسین وہ شخص کہلائے گا کہ اس کی آنکھ ناک' چہرہ سب خوبصورت ہوں' ورنہ اگر کسی کی آنکھیں تو نہایت اچھی ہوں اور ناک بالکل خراب چپٹی ہو یادانت باہر کو نکلے ہوئے ہوں تو وہ حسین نہ کہلائے گا اسی طرح دین بھی ایک قسم کا حسن ہے تو یہاں حسین یعنی دیندار بھی اسی کو کہیں اگے جس میں ساری دین کی خوبیاں ہوں' اور جس میں کچھ ہوں اور کچھ نہ ہوں وہ شخص ہرگز حسین اور دیندار نہ سمجھا جائے گا' آج کل ہم لوگوں میں اکثر جو کچھ عمل کرتے ہیں تو وہ بھی ظاہری نیک کام جیسے نماز' روزہ حج وغیرہ کر لیتے ہیں' ورنہ اکثر تو عمل ہی نہیں کرتے کہ نماز ہو رہی ہے اور وہ پڑے سو رہے ہیں' ممکن ہے کہ ایسے لوگ اپنے عذر میں یہ حدیث پیش کریں کہ "لَاتَفْرِيْطَ فِي النَّوْمِ"

حدیث "لَاتَفْرِيْطَ فِي النَّوْمِ" کے معنیٰ

(ترجمہ): "نیند کی حالت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوتی۔"

لیکن یہ حدیث ان کے لیے کچھ مفید نہیں کیونکہ یہ کوتاہی نہ ہونا اس وقت ہے کہ اپنی طرف سے تو جاگنے کا پورا انتظام کر کے سوئے لیکن باوجود اس انتظام کے پھر بھی آنکھ نہ کھلے اور اگر ایسے وقت سویا کہ غالب گمان یہ ہو کہ نماز کے وقت آنکھ نہ کھلے گی' اور جاگنے کا کچھ انتظام نہ کیا ہو تو یہ ضرور کوتاہی ہے۔

اس واسطے کہ یہ ارشاد ایک خاص قصے کے متعلق ہے وہ کہ حضور ﷺ کو ایک مرتبہ ایسے ہی تنگ وقت سونے کی نوبت آئی تو حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بٹھا دیا تھا کہ جب صبح ہو ہم کو جگا دو' مگر اتفاق سے ان کی بھی بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی اور پھر اٹھے تو

صحابی بے حد گھبرائے تو اس موقعہ پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

"لَاتَفْرِيطَ فِي النَّوْمِ"

یعنی جبکہ ہم لوگوں نے جاگنے کا پورا انتظام کیا لیکن باوجود کوشش کے پھر بھی آنکھ لگ گئی اس لیے اس سونے میں کوتاہی نہیں ہوئی' یہ تو ان لوگوں کا ذکر تھا جو جاگتے ہی نہیں اور بعض لوگ بیدار تو ہو جاتے ہیں لیکن محض سستی کی وجہ سے پڑے رہتے ہیں۔

صاحبو! سو اول تو نماز وغیرہ میں بھی ٹوٹا ہے' لیکن خیر اگر بڑی دوڑ دوڑی تو نماز کے پابند ہو گئے' لیکن دوسرے عمل یا تقویٰ کی باتیں ان میں موجود نہیں۔

بعض لوگ بدنگاہی میں مبتلا ہیں:

چنانچہ بعض لوگ بدنگاہی میں پھنس جاتے ہیں یعنی نامحرم عورتوں کی طرف نڈر ہو کر دیکھتے ہیں اور اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتے بلکہ یہ ایسا مرض ہے کہ اس سے بہت کم لوگ پاک ہیں' کیونکہ اکثر ان گناہوں سے بچتے ہیں جن کے کرنے سے بے عزتی یا رسوائی کا خوف ہو اور اس گناہ میں عزت جاتی نہیں اس لیے کہ اول تو دوسرے کو دیکھنے کی خبر ہی کیونکر ہو سکتی ہے' دوسرے اگر دیکھنے کی اطلاع ہی ہو جائے تو نیت کی کیا خبر' اس میں کوئی بھی فرق نہیں کر سکتا کہ یہ دیکھنا نفسانی خواہش سے ہے یا شفقت اور محبت سے' کیونکہ یہ ایک پوشیدہ چیز ہے خاص کر جبکہ شریعت نے دوسروں کو بدگمانی سے بھی منع کر دیا تو اور بھی بدنگاہی کا گمان نہ کیا جائے' اور اس شخص کی عزت قائم رہے گی۔

پس اس گناہ سے چونکہ عزت نہیں جاتی اس واسطے اس میں اکثر وہ لوگ بھی گرفتار ہیں جو ظاہر میں دیندار معلوم ہوتے ہیں اس لیے اس گناہ کی نسبت خاص طور سے خدا تعالیٰ نے اپنے جاننے کی اطلاع دی' فرماتے ہیں:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ

یعنی اگر کسی دوسرے کو اس خیانت کی خبر نہیں ہوئی تو ہم کو تو اس کی خبر ہے اور ہماری خبر کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ

(ترجمہ) ''اور جو بات سینوں میں چھپی ہوئی ہے اس کو بھی جانتے ہیں' یہ اس لیے بڑھا دیا کہ بعض لوگ بدنگاہی سے بھی اس لیے بچتے ہیں کہ ممکن ہے کہ دوسروں کو خبر ہو کر بدگمانی پیدا ہو جائے اور عزت جاتی رہے لیکن ان کے دل میں یہ مرض شہوت کا ہوتا ہے اور لطف یہ کہ باوجود اس مرض کے یہ شخص اپنے آپ کو دیندار سمجھتا ہے حالانکہ خیالات اس کے گندے ہوتے ہیں کہ وہ اکثر دل ہی دل میں مزہ لیتا رہتا ہے' بلکہ کبھی کبھی بدکاری کا پختہ ارادہ بھی ہو جاتا ہے کہ اگر اس کو موقع مل جائے تو یہ ہرگز نہ بچے تو ان لوگوں کے علاج کے لیے یہ بڑھا دیا کہ ہم دلوں کی چھپی ہوئی بات کو بھی جانتے ہیں۔

غرض بدنگاہی اتنا بڑا سخت گناہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو علیحدہ ذکر فرمایا'' اور جب اس کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کا چھوٹنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

بدنگاہی میں شیطان کا ایک سخت دھوکہ:

کہ کسی وقت اس میں یہ ہوتا ہے کہ شیطان بہکاتا ہے کہ ایک دفعہ نظر بھر کر دیکھ لو تو جی بھر جائے گا' اور یہ شیطان کا ایسا دھوکہ ہے کہ سب چھوٹے بڑے گناہوں میں اس کے ذریعہ سے کام لیتا ہے' یہ دھوکہ ظاہر میں خفیف سا معلوم ہوتا ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا دھوکہ ہے اور کتنی اس میں خرابی ہے' خلاصہ اس کا یہ ہے کہ شیطان نے ایک گناہ کو نیکی بنا کر اس کے سامنے پیش کیا اور اس طرح اس میں پھنسا دیا' اور یہ نیکی اس لیے بنا کر شیطان نے دل میں یہ بات ڈالی کہ یہ فعل ایک گناہ کے چھوٹنے کا ذریعہ ہے اور گناہ چھوٹنے کا ذریعہ کم سے کم ثواب تو ضرور ہوگا' اور اگر ثواب کا کام بھی نہ ہوگا تو جائز تو ضرور ہوگا تو گویا شیطان نے ایک گناہ کو طاعت یا جائز اس کو سمجھا دیا۔ تو دیکھئے اس شخص کا کتنا خراب عقیدہ ہو گیا کہ حرام کام کو کم سے کم جائز سمجھنے لگا اور باوجود اس خرابی کے پھر وہ فائدہ بھی جس کا شیطان نے وعدہ کیا ہے' حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس بدنگاہی کی حالت یہ ہے کہ جب تک انسان بچا رہے اس وقت تو بچا رہتا ہے' اور جب ایک مرتبہ اس میں پھنس

جائے اور پھر چھوڑ بھی دے اگرچہ دو چار دن کے لیے اس میں کامیاب ہو جائے اور اس مدت میں پھر طبیعت ادھر توجہ نہ کرے لیکن دو چار دن گزرنے کے بعد پھر تقاضا شروع ہوتا ہے اور چونکہ ایک مرتبہ پھنس جانے سے وہ رکاوٹ رہی نہیں اس لیے بہت جلد اس میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ساری عمر اس میں گزر جاتی ہے کہ آج چھوڑوں کل چھوڑوں اور چھوڑنے کی نوبت نہیں ملتی اور یہ دو چار دن کے لیے گناہ چھوٹنے میں کامیابی فرضی مان لی گئی' ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ گناہ کبھی کسی دوسرے گناہ سے بچنے کا سبب نہیں ہوتا۔

غرض کہ اول تو یہ گمان غلط ہے کہ ایسا کر لینے سے جی بھر جائے گا اور اگر کسی کو کبھی اتفاقاً ایسا ہو بھی جائے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ اس گناہ میں یہ فائدہ ہے' لیکن کسی گناہ میں کچھ فائدہ ثابت ہو جانے سے بھی وہ گناہ گناہ ہی رہتا ہے'

دیکھئے شراب میں بھی کچھ فائدے ہیں' حکیموں نے لکھا ہے کہ اس کے پینے سے سخاوت بڑھتی ہے اور بہادری پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ اور بعض عادتیں جن کا حاصل کرنا شریعت کے نزدیک اچھا ہے' اس سے حاصل ہوتی ہیں' بلکہ خود قرآن شریف میں اس کے اندر فائدے مان لیے گئے ہیں فرماتے ہیں:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (ترجمہ) آپ سے لوگ دریافت کرتے ہیں شراب اور جوئے کی بات کہہ دیجئے' ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں اور گناہ ان دونوں کا بڑھا ہوا ہے ان کے فائدے سے لیکن ان فائدوں کے ہونے سے شراب کو حلال نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کی حرمت ویسی ہی باقی رہی' پس اسی طرح اگر کسی دوسرے گناہ میں بھی کچھ فائدے ہو جائیں تو ان کی وجہ سے وہ حلال اور جائز نہ ہو جائے گا' بلکہ ان فائدوں کو کالعدم قرار دے کر اس فعل کو گناہ ہی کہیں گے پھر ان سب باتوں کے علاوہ ایک بات اور ہے اور اگر عین گناہ کرنے کی حالت میں دم نکل جائے' کیونکہ موت حیات کسی کے اختیار میں نہیں ہے تو بتلایئے کہ کسی ردّی حالت میں انتقال ہوگا' اور اگر نہ بھی مرے تو ممکن ہے کہ کرنے کے بعد توبہ نصیب نہ ہو' بلکہ ایسے لوگوں کو اکثر توبہ نصیب نہیں ہوتی'

کیونکہ جب بے باکی بڑھ جاتی ہے تو ان کاموں پر ندامت نہیں ہوتی اور جب ندامت نہیں ہوتی تو توبہ بھی قبول نہیں ہوتی' کیونکہ توبہ کے لیے ندامت ضروری ہے' کیونکہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ

اَلتَّوْبَۃُ نَدَمٌ (ترجمہ) توبہ ندامت ہے

اور جب یہ بات ہے تو ذرا غور کر لیجیے کہ ہم لوگ کس برتے پر گناہ کی جرأت کرتے ہیں' یہ لکھے پڑھے لوگوں کے گناہ ہیں کہ تاویلیں کر کر کے ان کو کیا کرتے ہیں۔

بعض صوفیوں کو بھی گناہ کے بابت دھوکہ ہوتا ہے:

ایسے ہی صوفیوں کو بھی اکثر اوقات اسی قسم کا دھوکہ ہوتا ہے کہ اگر عجب[1] پیدا ہوتا ہے تو اس کا علاج کسی گناہ سے کیا جاتا ہے اور یہ مصلحت سمجھی جاتی ہے۔ کہ ایسا کرنے سے ہم اپنی نظروں میں گناہ گار اور ذلیل رہیں گے اور اس سے عجب کی جڑ کٹ جائے گی۔

صاحبو! یہ ایسا علاج ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے بدن سے پاخانہ کو پیشاب سے دھونے لگے' دوسرے بات یہ ہے کہ یہ لوگ در پردہ شریعت پر اعتراض کرتے ہیں' اور شریعت کو اب تک کامل نہیں سمجھتے' کیونکہ شریعت نے گناہ سے بچنے کی یہ ترکیب کہیں نہیں بتلائی کہ اس گناہ کو کرنے لگو' اور یہ لوگ اس ترکیب کو علاج سمجھتے ہیں' تو معلوم ہوا کہ شریعت کو روحانی مرضوں کے علاج میں ناقص سمجھتے ہیں اور یہ اس آیت کے بالکل خلاف ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

(ترجمہ) ''آج کے دن کامل کر دیا تمہارے واسطے تمہارے دین کو اور پورا کر دیا اپنے انعام کو تم پر''......اور اگر کہیے کہ بعض بزرگوں نے بھی اس کو علاج بتلایا ہے تو ہم کہیں گے کہ اول تو یہ بات غلط ہے' دوسرے اگر یہ صحیح ہو تو خود انہوں نے غلطی کی' بزرگوں سے بھی غلطی ہو جایا کرتی ہے۔

زبان کا گناہ:

اسی طرح زبان کا گناہ ہے طالب علموں سے زیادہ شاید اس میں کوئی شخص مبتلا ہوتا ہو اور یہ گناہ نہایت ہی سخت ہے حدیث میں ہے۔

اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا (ترجمہ) غیبت زیادہ سخت ہے زنا سے۔ اور پھر یہ غیبت دو قسم کے لوگوں کی ہوتی ہے ایک تو بروں کو برا کہنا اور اچھوں کو برا کہنا' عام لوگ تو اگر غیبت میں گرفتار ہیں تو وہ اکثر ایسے لوگوں کو برا کہتے ہیں جو کہ حقیقت میں برے ہیں' اور ہم لوگ ایسے لوگوں کو برا کہتے ہیں جو کہ نہایت دیندار' پرہیز گار عالم فاضل ہیں' اکثر طالب علموں کی زبان سے سنا ہوگا کہ فلاں شخص کو آتا ہی کیا ہے' فلاں میں یہ عیب ہے' اگرچہ اس زمانہ کے عالموں میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کی غیبت جائز ہے' یہ وہ لوگ ہیں جو کہ خدا کی مخلوق کو گمراہ کر رہے ہیں لیکن پھر بھی بہتر یہ ہے کہ ان کی غیبت سے بچا جائے' کیونکہ جب غیبت کی عادت ہو جاتی ہے تو پھر اچھے اور برے کی تمیز نہیں رہتی اور غیبت کے جائز اور ناجائز موقعوں کا خیال نہیں رہتا' یہ حالت ہوتی ہے کہ جس طرف سے ذرا بھی کدروت ہوئی فوراً اس کا ذکر برائی کے ساتھ شروع کر دیا' اس طرح دل کی یہ حالت ہے اس میں کینہ' بغض عداوت۔ غرض تمام دنیا بھر کی خرابیاں بھری ہوئی ہیں اس لیے میں نے کہا تھا کہ اگر عمل کی تھوڑی بہت کوشش بھی ہے تو صرف ظاہری اعمال کی' باقی زبان اور دل تو اکثروں کا تباہ ہے' اور اکثر ہم میں سے ان تینوں ہی قسم کے گناہ میں خوب اچھی طرح سے گرفتار ہیں۔

غرض کہ بے باک اور بددین تو سب طرح کے گناہ کرتے ہیں اور دیندار ذرا ظاہری عبادت کی پابندی کرتے ہیں لیکن زبان کو وہ بھی قابو میں نہیں رکھتے۔

دل کے گناہ:

اور جو بہت ہی پرہیز گار ہیں وہ زبان کو بھی قابو میں کر لیتے ہیں مگر دل کو قابو میں وہ بھی کم کرتے ہیں اور دل کے گناہوں سے ان کو بہت کم نجات ملتی ہے تو دل کا مرض وہ

مرض ہوا کہ قریب قریب سب کے سب اس میں گرفتار ہیں۔

بقیہ آیت کی تفسیر:

اس لیے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں تینوں قسموں کو بیان فرما دیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ظاہری گناہوں سے بھی بچتے تھے اور زبان کو بھی گناہوں سے روک کر اس کو اطاعت میں لگاتے تھے، اور دل کو بھی گناہوں سے پاک رکھتے تھے اور اس میں خشوع[1] پیدا کرتے تھے مجھے زیادہ تر اس وقت یہی بیان کرنا بھی ہے کہ یہ تیسری قسم یعنی خشوع کہ دل کا عمل ہے، ہم میں بہت کم پایا جاتا ہے حالانکہ یہ ساری عبادتوں کی اصل ہے، مگر ہم لوگ ذرا فکر اور کوشش نہیں کرتے اور ہمارے اندر خشوع نہ ہونے کی حالت پر شکایت نہایت صاف طور پر قرآن شریف میں بھی فرماتے ہیں، اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ (ترجمہ) اس لیے ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل نرم ہو جائیں، اللہ کے ذکر کے واسطے اور یہ بات ظاہر ہے کہ شکایت اس کام کے چھوڑنے پر ہوتی ہے، جس کا کرنا نہایت ضروری اور واجب ہو تو معلوم ہوا کہ خشوع نہایت ضروری کام ہے اور اس کی ضد قساوت[2] ہے اور قساوت کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے ان ابعد شیئی من اللّٰہ الْقَلْبِ القاسِیْ (ترجمہ) ''بیشک سب سے زیادہ دور اللہ سے قساوت والا دل ہے'' پس خشوع حاصل کرنے کی تاکید کرنا جیسا کہ آیت میں ہے اور قساوت کی برائی کرنا جیسا کہ حدیث میں ہے، اس سے زیادہ اس کے ضروری اور واجب ہونے کے لیے کیا چاہیے، پس ہر عالم اور طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ دل میں خشوع پیدا کرے اور اس کے ظاہری آثار یہ ہیں کہ جب چلے گردن جھکا کر چلے، بات چیت میں، معاملات میں سختی نہ کرے، غصہ اور غضب میں آپے سے باہر نہ ہو، بدلہ لینے کی فکر میں نہ رہے وغیرہ وغیرہ۔

اور ان کو آثار اس لیے کہا ہے کہ جب دل میں خشوع ہوگا تو ظاہر بدن پر اس کا اثر ضرور ہوگا۔

---

[1] نرمی اور عاجزی کو کہتے ہیں

[2] دل کی سختی کہ خدا تعالیٰ کے حکم کا اثر نہ ہو۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا اور اپنی داڑھی سے کھیل رہا تھا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو یہ ہرگز ایسا نہ کرتا' اب اس کی ضرورت اور آثار معلوم ہو جانے کے بعد دیکھ لیجیے کہ آیا ہمارے دل میں خشوع ہے یا نہیں اور ہمارے دلوں میں بڑائی اور شیخی تو نہیں پائی جاتی۔

پس اگر ہمارے دلوں میں خشوع ہے تو کیا وجہ کہ اس کی آثار نہیں پائے جاتے' اس کی کیا وجہ کہ ہم کو اپنا کام خود کرنے سے یا کسی مسلمان کا کام کرنے سے عار آتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانا کھانے کی حالت:

صاحبو! حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی بڑھ کر نہیں ہے' پھر دیکھ لیجیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حالت تھی' فرماتے ہیں اِنِّیْ اٰکُلُ کَمَایَا کُلُ الْعَبْدُ کہ کھانا اس طرح کھاتا ہوں جیسے کوئی غلام کھاتا ہے جس میں بڑائی اور تکبر کا نام نہیں ہوتا حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی کیفیت:

چلنے پھرنے کی یہ حالت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی آگے نہ چلتے تھے بلکہ کچھ صحابی رضی اللہ عنہ آگے ہوتے تھے اور کچھ برابر میں ہوتے تھے اور کچھ پیچھے ہوتے تھے اور یہ کسی کا آگے پیچھے چلنا بھی کسی خاص قاعدے اور ترتیب سے نہیں تھا' جیسے آج کل بادشاہوں اور بڑے لوگوں کی عادت ہے کہ جب چلتے ہیں تو باقاعدہ کچھ لوگ ان کی عزت اور شان بڑھانے کو ان کے آگے پرا جمائے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ان کے پیچھے ہوتے ہیں' سو یہ نہ تھا' بلکہ جس طرح بے تکلف دوست احباب ملے جلے چلتے ہیں کہ کبھی کوئی آگے ہو گیا اور کبھی کوئی آگے ہو گیا اس طرح چلتے تھے' لباس کی یہ حالت تھی کہ ایک ایک کپڑے میں کئی کئی پیوند لگا کر پہنتے تھے' آرام کرنے کی یہ حالت تھی کہ ٹاٹ کے اوپر آرام کرتے تھے۔

حضور ﷺ کی معاشرت کی حالت:

معاشرت کی یہ حالت تھی کہ اپنا کاروبار خود کرتے تھے بازار سے ضرورت کی چیزیں جا کر خرید لاتے تھے۔ غرض یہ سب فعل جو حضور ﷺ کے نقل اور بیان کیے جاتے ہیں تو کس لیے؟ کیا اس لیے کہ ہم سنیں اور پرواہ بھی نہ کریں۔

صاحبو! جس طرح حضور ﷺ کے قول پر عمل کرنا ضروری ہے اسی طرح آپ ﷺ کے فعل کی پیروی کرنا بھی ضروری ہے جب تک کسی فعل کی حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو کیونکہ قرآن پاک میں ارشاد ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (ترجمہ) بے شبہ رسول اللہ ﷺ میں تمہارے لیے بہتر نمونہ ہے تو یہ افعال بھی سب پر پیروی ہی کے لیے ہیں کہ ہماری بھی وہی وضع ہو وہی چال ڈھال ہو وہی معاشرت یعنی طرز زندگی ہو

ایک صحابی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضور پرنور ﷺ کو کھانا کھاتے دیکھا تو کانپ اٹھا کہ حضور ﷺ کس طرح عاجزی کے ساتھ بیٹھے ہیں۔

ایک بار حضور ﷺ سے کوئی باہر کا ایلچی ڈر گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے مت ڈرو میں ایک عورت کا بیٹا ہوں جو کہ سوکھا گوشت کھاتی تھی حضور ﷺ کے ان حالات کو دیکھئے اور پھر اپنی حالت کو تو معلوم ہو گا کہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ "اَلْبَذَاذَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ" سادگی ایمان کی بات ہے۔

سادگی کی اور تکلف اور زینت چھوڑنے کی تعلیم معہ شکایت:

سو دیکھ لیجیے کہ ہم میں سادگی پائی جاتی ہے یا نہیں میرے خیال میں جہاں تک غور کیا جائے گا ہم میں سادگی کا پتہ ہی نہیں چلے گا اور نہایت افسوس اس امر کا ہے کہ اس وقت خود اکثر عالموں میں عورتوں کی سی زینت آ گئی ہے۔

صاحبو! یہ ہمارے لیے دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا کے لحاظ سے بھی سخت کمی ہے اس سے بجائے عزت بڑھنے کے اور ذلت بڑھتی ہے' ہمارے لیے خوبی یہی ہے کہ نہ لباس میں کوئی شان وشوکت ہو نہ دوسرے سامان میں' مگر اس وقت یہ حالت کہ طالب علموں کو دیکھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ طالب علم ہیں یا کسی نواب کے لڑکے اور یہ دیندار ہیں یا دنیا دار۔

صاحبو! یا تو آدمی کسی جماعت میں داخل نہ ہو اور اگر داخل ہو تو پھر وضع قطع سب اسی کی ہونا چاہیے' علم کی بھی زینت ہے کہ عالموں کی وضع پر رہے' میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا بھی خیال نہیں تو کم سے کم اس کا خیال کیجیے کہ آپ کس کے وارث اور نائب ہونے کے دعوے دار ہیں اور ان مورث کی کیا حالت تھی' خدا کی قسم ہماری حالت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابھی دین کا ہم پر کامل اثر نہیں ہوا' دین نے ہمارے دل میں پوری جگہ نہیں کی' ہمارے پہلے بزرگوں کی تو یہ حالت تھی کہ انہوں نے بعضے مباح اور جائز کاموں کو بھی' جب کہ ان میں تکلف پیدا ہو گیا تھا یا فاسقوں کا شیوہ ہو گئے تھے' چھوڑ دیا تھا۔

چنانچہ اول بناء پر باریک کپڑا پہننا چھوڑ دیا تھا اور اسی بناء پر حدیث شریف میں ہے کہ مَنْ رَقَّ ثَوْبُهٗ رَقَّ دِيْنُهٗ (ترجمہ) جس کے کپڑے باریک (تکلف کی وجہ سے) ہوں گے اس کا دین کمزور ہوگا'

دوسری بناء کے متعلق ایک واقعہ ہے کہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ یا تابعی[1] نے (میں اس وقت بھولتا ہوں) ایک مرتبہ کسی خلیفہ کو مہین لباس پہنے ہوئے دیکھ کر یہ کہا تھا اُنْظُرُوْا اِلٰی اَمِيْرِنَا هٰذَا يَلْبِسُ الْفُسَّاق (ترجمہ) دیکھو ہمارے اس امیر اور خلیفہ کی طرف فاسقوں کا سا لباس پہنتا ہے اور یہ دوسری بناء بھی حقیقت میں اول بناء کے سبب تھی' یعنی چونکہ پہلے لوگوں میں سادگی بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی اس لیے اس وقت دیندار باریک کپڑا نہ پہنتے تھے' بلکہ فاسق ہی پہنتے تھے' اس لیے امیر کو فاسقوں کا لباس پہنے دیکھ کر یہ اعتراض کیا' پس اس وقت بھی وہ کام جو بد دینوں اور فاسقوں کا شیوہ ہو گئے ہیں۔

---

[1] تابعی صحابی کے دیکھنے والے کو کہتے ہیں ۱۲

گو وہ خود جائز بھی ہوں ان کو ترک کرنا چاہیے' جیسے انگریزی بوٹ جوتے' پھندنے دار ٹوپ وغیرہ' کیونکہ اس قسم کے کام اول تو ان بے دینوں سے مشابہ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہیں' دوسرے اگر ان کاموں کو مشابہ ہونے سے قطع نظر کر کے ہر طرح جائز بھی مان لیا جائے' تب بھی چونکہ دیندار لوگوں کی وضع اور شیوہ نہیں اس لیے بھی وہ چھوڑ دینے کے قابل ہوں گے۔

ہماری وضع ایسی ہونی چاہیے کہ لوگوں کو دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ ان لوگوں' جن کو وحشی و ناکارہ سمجھا جاتا ہے جو کہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے' کیونکہ خدا تعالیٰ کا عاشق ہو کر دنیا کے کام کا کیونکر رہ سکتا ہے۔

زینت اور تکلف کی مضرت:

اور تکلف کے لباس اور وضع کے شغل میں علاوہ اس کے کہ یہ سادگی کے بالکل خلاف ہے' ایک بڑی مضرت یہ ہے کہ جب ہر وقت یہی شغل رہے گا تو چونکہ انسان کو توجہ ایک وقت میں دو کاموں کی طرف پورے طور سے نہیں ہو سکتی اس لیے یہ ضروری ہے کہ علم کی طرف توجہ نہ رہے گی اور علم سے بالکل کورا رہے گا۔

دیکھ لیجیے جو لوگ ہر وقت اپنے بناؤ سنگار میں رہتے ہیں نہ ان میں کوئی قابلیت ہوتی ہے نہ مناسبت اور یقینی بات ہے کہ جو شخص بڑے کاموں میں مشغول ہوتا ہے اس کی توجہ چھوٹے کاموں کی طرف نہیں ہوا کرتی' یہاں تک کہ یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ غسل کب کیا تھا اور کپڑے کب بدلے تھے۔

صفائی اور ستھرائی کی تعلیم:

اور یہی سبب ہے کہ شریعت نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ ایک ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور غسل کر لیا کرو' ورنہ یہ تو خود طبعی امر تھا' مگر کام کرنے والے لوگوں کو اس طرف التفات نہیں رہتی اس لیے قانون کی ضرورت پڑی' سبحان اللہ کس قدر رعایتیں شریعت نے لحاظ رکھی ہیں کہ ایک طرف تو سادگی کا حکم ہو رہا ہے تا کہ زینت اور تکلف نہ آ جائے

اور چونکہ بعض لوگوں سے اس پر ایسا عمل کرنے کا اندیشہ تھا کہ وہ اپنے تن بدن کی خبر نہ رکھنے کی وجہ سے صفائی کی حد سے نکل جاتے' اس لیے دوسرے موقع پر یہ بھی فرمادیا کہ ہفتے بھر میں ایک مرتبہ غسل ضرور کرلیا کروتا کہ صفائی بھی ہاتھ سے نہ جائے کیونکہ صفائی مطلوب ہے' چنانچہ اس کی اس قدر ترغیب دی کہ یوں ارشاد فرمایا کہ: **نَظِّفُوْا افلیتکم ولا تشبّهُوا بِالیَهُودِ** یعنی اپنے فنا دار کو صاف رکھا کرو اور اس کو میلا کچیلا رکھ کر یہود جیسے نہ بنو۔'' فناء دار زمین کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو کہ گھر سے باہر دروازہ کے سامنے ہو' اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب فناء دار تک صفائی مطلوب ہے تو گھر کی اس سے بڑھ کر لباس اور بدن کی صفائی کس درجہ مطلوب ہوگی' سو شریعت کی تو یہ تعلیم ہے کہ دونوں کاموں میں درمیانی چال بتلائی ہے۔

افسوس! برخلاف اس کے ہماری یہ حالت ہے کہ اگر صفائی اختیار کریں گے تو اس درجہ کہ نواب معلوم ہوں اور سادگی پر اتریں گے تو اس حد تک کہ کپڑے بھی سڑے ہوئے' بدن بھی سڑا ہوا وہ درمیانی چال جو شریعت نے سکھلائی ہے اس کا کہیں کوسوں بھی پتہ نہیں حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ صفائی اور سادگی دونوں کو ہاتھ سے نہ جانے دے یہ تو شرعی اعتبار سے سادگی پر گفتگو تھی۔

کام کا آدمی ہمیشہ سادہ دیکھا جاتا ہے:

اب دنیا کے اعتبار سے لیجئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے کاروبار میں بھی یہی حالت ہے کہ جو آدمی کسی بڑے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کو چھوٹے کاموں کی طرف توجہ نہیں ہوتی' جیسے شادی کے موقع پر جن لوگوں کے سپرد شادی کا انتظام ہوتا ہے ان کو نہ اپنے کپڑوں کی خبر ہوتی ہے نہ بدن کی اور وہ اس کو کچھ عار نہیں سمجھتے بلکہ اپنی کارگزاری پر ناز کرتے ہیں۔ بلکہ جو زیادہ مشغول ہوتے ہیں' ان کو اس طرف بھی توجہ ہوتی ہے کہ اس کار گزاری کو ظاہر کیا جائے۔

پس معلوم ہوا کہ بڑے کاموں میں مشغول ہونے کے لیے سادگی اور چھوٹے کاموں کی طرف سے بے توجہی ہونا لازم ہے' پس جو طالبعلم اپنے علم کی شغل میں لگا ہوگا

اس کو کبھی اس کی فکر نہ ہوگی کہ میرے پاس بوٹ بھی ہے یا نہیں اور رومال بھی ہے یا نہیں' اسی بناء پر بڑے بڑے عالموں نے کہا ہے ریفارمر' یعنی قوم کی اصلاح کرنے والے کے لیے عادۃً لازم ہے کہ وہ بالکل سادہ زندگی بسر کرے گا اور بڑے لوگوں کی سوانح عمری دیکھنے سے بھی خواہ وہ دنیا ہی کے بڑے ہوں' صاف معلوم ہوسکتا ہے کہ انہوں نے زندگی نہایت سادگی کے ساتھ اور بے تکلف بسر کی۔

پس جو شخص ہر وقت مانگ پٹی میں لگا رہے اس کی نسبت سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں کسی قسم کا کمال اور خوبی نہیں۔

تکلف کرنے والوں کی حکایتیں اور بعض شبہات کا جواب اور سادگی کی تعلیم:

ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ ان کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی ان کو گھر پر آواز دیتا تو کم سے کم آدھے گھنٹے میں باہر آتے' اس کی وجہ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ جس وقت پکارنے کی آواز گھر میں پہنچتی ہے تو وہ آئینہ اور کنگھا طلب کرتے اور نہایت تکلف سے بالوں کو درست کر کے مانگ نکال کر داڑھی میں کنگھا کر کے ایک ایک بال سنوار کر' غرض دولہا بن کر باہر تشریف لاتے تھے' ع

جنوں وخبط نہ کہیے اسے تو کیا کہیے

اسی طرح اکثر تکلف والوں کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ایک دو جوڑا محض اس کام کے لیے رہتا ہے کہ جب باہر نکلیں تو اس کو پہن کر نکلیں اور جب واپس آئیں تو پھر وہی لنگوٹی یا سڑے ہوئے کپڑے ان کا لباس' گویا ہاتھی کے دانت ہیں کہ کھانے کے اور' دکھانے اور۔ اور ان لوگوں کو شیطان نے یہ دھوکہ دیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَّ يُحِبُّ الْجَمَالَ (ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ جمیل ہیں پسند کرتے ہیں جمال کو۔'' اور جب خدا تعالیٰ کو جمال پسند ہے تو ہم کو بھی خوبصورت بن کر رہنا چاہیے' لیکن میں ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ اگر یہ نیت اور تکلف محض جمال حاصل کرنے کی وجہ سے ہے تو اس کی کیا وجہ کہ محض دوسروں کے سامنے یہ تکلف کا لباس پہنا جاتا کیا تنہائی میں خدا تعالیٰ کی جمال پسند نہیں۔

صاحبو! یہ نفس کی تاویلیں ہیں اور خود آثار سے پتہ چلتا ہے کہ اصل غرض کیا ہے'

چنانچہ ہم نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ نہایت کم قیمت معمولی کپڑا پہنیں گے لیکن وضع ایسی اختیار کریں گے کہ دوسرے کو نہایت قیمتی معلوم ہو' پھر تراش ایسی ہوگی کہ یہ بڑے لوگوں میں شمار ہوں اور وضع و تراش کا ذکر تکلف کی مثال میں اس لیے کیا کہ کپڑے میں ایک تو حقیقت اور اصل ہوتی ہے اور ایک صورت اور ہیئت' سو تکلف اور زینت میں اکثر زیادہ دخل ہیئت کو ہوتا ہے یعنی اگر کسی قیمتی کپڑے کی سادہ شکل بنالی جائے تو وہی معمولی اور سادہ معلوم ہونے لگتا ہے' اور اگر کسی قیمتی کپڑے کی عمدہ شکل بنالی جائے تو وہی قیمتی اور بھڑک دار معلوم ہونے لگتا ہے۔

ہم نے بعض امیروں کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت قیمتی کپڑا پہنتے ہیں لیکن اس کی وضع ایسی سادہ ہوتی ہے کہ وہ بالکل معمولی معلوم ہوتا ہے اسی طرح بعض غریبوں کو دیکھا ہے کہ وہ کپڑا کم قیمت پہنتے ہیں' مگر بہت ہی خوبصورت بنا کر' تو اگر خدا تعالیٰ نے وسعت دی ہو' قیمتی کپڑا پہنو' لیکن اس کی وضع بالکل سادہ رکھو اس میں بناوٹ اور زینت ہرگز نہ ہونے دو' مگر یہ اسی سے ہو سکے گا جو کسی بڑے کام میں مشغول ہوگا۔

پہلے طالب علموں کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ وہ بالکل الول جلول رہتے تھے کہ نہ کرتے کی خبر ہے نہ پاجامہ کی' پھر دیکھ لیجیے کہ ان میں سے جواب موجود ہیں وہ اپنے وقت کے مقتدا اور پیشوا ہیں اور جو شخص کرتے پاجامے کی زیب وزنیت میں مشغول رہے اس کو کبھی یہ بات کہاں میسر ہوگی' پھر ان لوگوں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہم جو تکلف اور فیشن کے پیچھے پڑے ہیں آخر اس کی غرض کیا ہے' ظاہر ہے کہ اپنی قدر بڑھانا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا بننا' یہی اس کی غرض ہوتی ہے' عالموں کی جماعت میں تو اس سے کچھ قدر نہیں ہوتی' اس جماعت کی نظروں میں قدر بڑھانے کی صورت تو یہ ہے کہ علم میں کمال حاصل ہو اگرچہ پاجامہ نصف ساق تک ہی ہو اور اگرچہ کرتا بالکل بھی نہ ہو۔

کانپور میں جس زمانہ میں میرا قیام تھا' ایک مرتبہ میں مدرسہ میں پڑھ رہا تھا کہ ایک شخص آ کر بیٹھے' ان کے بدن پر صرف ایک لنگی اور ایک چادر اتھا اس ہیئت کو دیکھ کر کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی لیکن جب انہوں نے گفتگو شروع کی تو معلوم ہوا کہ بہت بڑے

عالم فاضل ہیں' پھر تو ان کی اس قدر وقعت ہوئی کہ ہر ہر طالب علم ان پر جھکا جاتا تھا۔ اور عام لوگوں کے خیالات اور حالات کے اندازہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظروں میں بھی عالموں کی وقعت وضع اور لباس سے نہیں۔

غرض! آپ لوگوں کی وقعت علم اور تقوی وطہارت سے ہے نہ کہ لباس سے۔

یہ ظاہری زیب وزینت اور ٹیپ ٹاپ صرف ان لوگوں کے لیے وقعت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جو کمال سے خالی ہیں' ورنہ خوب سمجھ لو کہ

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ دیکھو خوشنما لگتا ہے کیسا چاند بن گہنے

اور یہ بھی اس وقت ہے کہ وقعت کو کسی درجے میں شمار کے قابل کہا جائے ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود یہ وقعت ہی کوئی چیز اہتمام کے قابل نہیں' غرض یہ آثار ہیں کپڑے میں خشوع اور بڑائی کے۔

خشوع کے آثار چلنے اور بولنے میں ظاہر ہوتے ہیں:

اسی طرح چلنے اور بولنے میں بھی اس کے کچھ آثار ہیں' جس کی نسبت خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (ترجمہ) اپنی رفتار میں میانہ روی پیدا کرو اور آواز کو پست کرو' پس معلوم ہوا کہ جب قلب میں خشوع ہوتا ہے تو چال میں بھی خشوع کا اثر ہوتا ہے اور آواز میں بھی اس کا اثر ہوتا ہے اور جیسے خشوع کے لیے یہ آثار لازم ہیں' اسی طرح تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان آثار کے لیے بھی خشوع لازم ہے' یعنی جو شخص اپنے اندر ان آثار کو پیدا کرے گا' اس کے دل میں خشوع پیدا ہو جائے گا' بلکہ ہر ظاہری ہیبت کا اثر دل پر پڑتا ہے۔

دیکھیے اگر کوئی شخص غمگین صورت بنا کر بیٹھ جائے تو قلب میں بھی غم کا اثر پایا جائے گا' اور کوئی شخص شاندار وضع بنائے تو دل میں بھی ایک بڑائی اور تکبر کی شان پائی جائے گی' تو جیسے دل کی کیفیت کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے کہ اس کے موافق آثار ظاہر میں پائے جاتے ہیں اس طرح ظاہری صورت کا بھی اثر دل پر پڑتا ہے' جب ایسا ہے تو جن لوگوں کو اس

وقت خشوع کی صفت حاصل نہیں ہوسکی ان کو چاہیے کہ اہل تواضع کے سے کام اختیار کریں' انشاء اللہ تعالیٰ اس سے قلب میں بھی تواضع کی صفت پیدا ہوگی۔

اور صاحبو! کوئی تو وجہ ہے کہ رسول مقبول ﷺ نے متکبروں کے افعال سے ممانعت فرمائی اور قرآن شریف کے اندر رفتار میں میانہ روی اور آواز کو پشت کرنے کا ارشاد ہوا ہے' ذرا آپ اپنے پچھلے بزرگوں کے حالات کو دیکھئے کہ ان کی کیا شان تھی بلکہ میں کہتا ہوں کہ جو حضرات بزرگان دین اس وقت موجود ہیں ان ہی کے حالات کو دیکھ لیجیے کیا ان کے افعال پیروی کے قابل نہیں ہیں' ضرور ہیں۔

پس ہم کو لازم ہے کہ ہم وہی وضع اختیار کریں جو کہ ان کو مرغوب اور جس کو وہ اختیار کر چکے ہیں' کیا عجب ہے کہ ہم ان کی سی ظاہری صورت کی بدولت اپنے دل کو درست کرسکیں۔

اہل اللہ کی سی ظاہری صورت سے بھی نفع ہو جاتا ہے:

اہل اللہ کی سی یہ ظاہری صورت بھی وہ چیز ہے کہ اس کی بدولت کافروں پر فضل ہو گیا ہے۔

روایت ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے جادوگروں کو جمع کیا تو وہ لوگ اسی لباس میں آئے تھے جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لباس تھا آخر مقابلہ ہوتے ہی تمام جادوگر مسلمان ہوگئے' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درگاہ خداوندی میں عرض کیا کہ یا الٰہی یہ سامان فرعون کے اسلام لانے کے لیے ہوا تھا' کیا سبب کہ اس پر فضل نہ ہوا اور جادوگروں کو ایمان کی توفیق ہوگئی۔

ارشاد ہوا اے موسیٰ یہ تمہاری سی صورت بنا کر آئے تھے' ہماری رحمت نے پسند نہ کیا کہ ہمارے محبوب کے ہم وضع لوگ دوزخ میں جائیں اس لیے ان کو توفیق ہوگئی' اور فرعون کو چونکہ تم سے اتنا بھی لگاؤ نہ تھا اس لیے اس کو یہ دولت نصیب نہ ہوسکی' اسی حکایت کو دلیل بنانا مقصود نہیں' کہ اس کے ثبوت میں کام کرنے لگو' بلکہ صرف اپنے دعویٰ کی تائید منظور ہے۔

اگر یہ حکایت صحیح نہ ہو اور اس لیے تقریر سے نکال دی جائے تو بھی اصل مضمون دلیلوں سے ثابت ہے اس قسم کی اگر ایک حکایت بھی ثابت نہ ہو تو کچھ مضر نہیں۔

غرض یہ ہے کہ خشوع اور اس کے آثار اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اگر ہم میں صفت خشوع موجود ہے تب تو ہم کو اس کے مناسب وضع اختیار کرنا لازم ہے۔

خشوع کے حاصل کرنے کے طریقے:

اگر یہ صفت موجود نہیں تو خود اس کے حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا یعنی اس کے آثار کا اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ خشوع حاصل کرنے کے سبب کئی ہیں' ان میں سے ایک یہ بھی ہے جس کا ذکر ہو چکا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اہل خشوع کی صحبت اختیار کی جائے' تیسرا سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا خوف دل میں بٹھایا جائے اس خوف کو پیدا کرنے کے لیے یہ تدبیر کی جائے کہ کوئی مناسب وقت تجویز کر کے اس میں تنہا بیٹھ کر اپنی نافرمانی کی حالت اور پھر خدا تعالیٰ کی نعمتیں سوچے کہ نافرمانی کے سبب کہیں موقوف نہ ہو جائیں اور عذاب آخرت اور قیامت کی ہولناک باتوں' پل صراط' میزان' دوزخ کی حالت وغیرہ کو سوچا کرے' اگر دس منٹ روزانہ ہی ان باتوں کو سوچ لیا کرے تو انشاء اللہ بہت فائدہ ہو' کیونکہ اس کو خوف کے پیدا ہونے میں بڑا دخل ہے اور پھر خوف سے خشوع پیدا ہو گا دوسرے طور پر بھی اس کو خشوع کے آثار پیدا ہونے میں دخل ہے وہ یہ کہ سب سے پہلا اثر جو اس سے ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا سے دل بالکل اٹھ جاتا ہے اور جب دنیا سے دل اٹھ جاتا ہے تو تکلف اور زینت اور اسی طرح دنیا میں دل لگنے کے سب آثار جاتے رہتے ہیں اور اس قسم کی تمام باتوں سے نفرت ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس شخص کے سامنے ہر وقت آخرت کا سفر رہے گا اور دنیا میں اپنے تئیں مسافر سمجھے گا' اور ظاہر ہے کہ مسافر کا سفر میں دل نہیں لگا کرتا' اس کو منزل پر پہنچنے کی ہر وقت فکر دامن گیر رہتی ہے' چوتھا سبب خشوع کے پیدا ہونے کا یہ ہے (اور یہ کتابوں سے فراغت کے بعد آپ کے ذمہ واجب ہے) اگر ظاہری علم کے حاصل کرنے میں دس سال ختم کیے ہیں تو باطن کی درستی میں فی سال ایک مہینہ ہی خرچ کر دیجیے' یعنی کم سے کم دس مہینے ہی کسی کامل بزرگ کی صحبت میں صرف

کیجئے' اوراس کے ارشاد کے مطابق عمل کیجئے' خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے خشوع کی دولت عطا فرماتے ہیں اور علم کا اثر قلب کے اندر پیوست ہو جاتا ہے۔

اور صاحبو! علم وہی مفید ہے جو دل میں پیوست ہو جائے کیونکہ بدوں اس کے خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو نہیں سکتی اور یہ بات بدوں بزرگوں کی صحبت میں رہے حاصل نہیں ہو سکتی' کیونکہ نفس بغیر بزرگوں کی صحبت کے مرتا نہیں' ان کے قدموں میں پامال کرنے سے اس کی خواہشیں دبتی ہیں اور علم بدون نفس کے مردہ ہوئے دل میں رچتا نہیں' پس ثابت ہوا کہ علم پڑھنے کے بعد بزرگوں کی صحبت کی ضرورت ہے' شاید کسی کو گھمنڈ ہو کہ ہمارے پاس تو دین کی ہر قسم کی کتابیں ہیں' ان کو دیکھ کر ہم سب کچھ حاصل کرلیں گے' سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تجربہ کے خلاف ہے دیکھا جاتا ہے کہ ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں ختم ہو جاتی ہے اور اس دولت سے محروم رہتے ہیں' بدوں پیر کامل کے یہ دولت حاصل ہو نہیں سکتی۔

شاید اس کو سن کر کسی کو یہ شبہ پیدا ہوا ہو کہ ہم نے تو بہت حضرات کی نسبت سنا ہے کہ وہ بغیر مرید ہوئے اس راستہ میں کامیاب ہو گئے جواب یہ ہے کہ اگر کہیں ایسا بھی ہوا ہے تو وہ بھی محض ظاہر میں ہوا ہے' ورنہ واقع میں وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور مدد ہی سے مقصود تک پہنچا ہے' اگرچہ اس کی اس مدد کی خبر بھی نہ ہو۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے بچے کی پرورش کر بدوں ماں باپ کی مدد اور اعانت کے وہ پرورش نہیں پا سکتا لیکن اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی تو اگر وہ بچہ بڑا ہو کر کہنے لگے کہ میں بغیر کسی کی مدد کے اتنا بڑا موٹا تازہ طاقت ور ہو گیا ہوں تو جس طرح اس کا یہ قول بالکل غلط اور ہنسی کے قابل ہے اسی طرح اس راستہ کے طے کرنے والے کا یہ قول بھی بالکل غلط ہو گا۔

بات یہ ہے کہ بعض مرتبہ ظاہر میں ایک شخص کو کسی کے سپرد نہیں کیا جاتا لیکن واقع میں بہت سے حضرات خدا تعالیٰ کے حکم سے اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور وہ اس کو غلطیوں میں پھنسنے نہیں دیتے اور راستہ کے قطع کرنے میں مدد فرماتے ہیں۔

بہر حال اس جزو کی سخت ضرورت ہے لیکن اس پر عمل کرنا اسی وقت مناسب ہے کہ جب کتابوں سے فراغت ہو چکے اور استاد ادھر متوجہ ہونے کی اجازت دے دیں' اور اگر استاد کتابوں کے ختم کرنے کے بعد بھی کچھ مدت تک کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہنے کا حکم فرمائیں تو ان کے ارشاد پر عمل کرے اور جب تک کافی استعداد اور لیاقت نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک کتابوں میں ہی مشغول رہے اور جب کافی لیاقت ہو جائے تو چند روز کسی کے پاس رہ کر دل کی درستی کرلے اور پھر پڑھنے پڑھانے کا شغل بھی جاری کر دے۔ یہ ہے تدبیر خشوع کے پیدا ہونے کی' چونکہ اس کا اہتمام بہت ضروری تھا' اس لیے اس کو عرض کیا گیا۔

بذادۃ یعنی سادگی کی حقیقت اور شرح:

اس کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بذادۃ یعنی سادگی جس کو اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق کچھ تفصیل تھوڑی سی عرض کردوں' کیونکہ ممکن ہے کوئی صاحب بذاوۃ کے وہ معنی سمجھ لیں' جیسے غالب[1] نے سمجھتے تھے۔

مشہور ہے کہ غالب نے ایک دوست کو اپنے گھر بلانا چاہا اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم تکلف زیادہ کرتے ہو اور اس سے مجھے اور تمہیں دونوں کو تکلف ہوتی ہے' اس واسطے آنے کی ہمت نہیں ہوتی' آپ نے اس کے جواب میں کہہ بھیجا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مرتبہ کچھ تکلف نہ ہوگا اور اس کے بعد محلہ بھر کا گھورا (کوڑا) جمع کر کے اپنے گھر میں ٹیلہ لگا دیا جب دوست کے آنے کا وقت ہوا تو آپ اس پر چڑھ بیٹھے اور نہایت ہی مفلسانہ وضع بنائی' مہمان نے آ کر یہ وضع دیکھی تو اس کو سخت رنج ہوا سمجھا کہ آج کل غالب کسی سخت مصیبت میں ہے قریب پہنچ کر حال دریافت کیا تو آپ فرماتے ہیں کہ بہت اچھا ہوں لیکن چونکہ تم نے تکلف سے روک دیا تھا اس لیے میں نے یہ بے تکلفی کی وضع اختیار کی ہے' تو جیسے غالب نے بے تکلفی کے معنی سمجھے تھے اسی طرح بعض لوگ شاید بذاوۃ کے یہ معنی سمجھ جائیں کہ نہ صفائی ہو اور نہ ستھرائی ہو بالکل میلی کچیلی حالت میں رہے'

[1] ایک مشہور شاعر ہے ۱۲

حالانکہ میلے پن سے بذاذۃ کو کوئی علاقہ نہیں اور یہ بات بھی ضروری بیان کرنے کے قابل تھی' کیونکہ ہماری جماعت جو کہ مولویوں و طالب علموں کی جماعت کہلاتی ہے اس کے لیے اس کی بھی ضرورت ہے کہ یہ ستھرائی کی طرف متوجہ ہوں' جہاں تک دیکھا جاتا ہے ان لوگوں کو ذرا اس کا خیال نہیں ہے' بعض لوگ تکلف کے تو خوگر ہوتے ہیں' لیکن صفائی ان میں بالکل نہیں ہوتی' حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ تکلف نہ ہو اور صفائی ہو' جیسے آج کل گرمی کا موسم ہے اس موسم میں عام طور سے کپڑوں میں بدبو جلد پیدا ہو جاتی ہے اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ ہفتہ میں دو مرتبہ غسل کر کے کپڑے بدلے جائیں اور اگر کسی کے پاس اتنی گنجائش نہ ہو تو وہ یہ کرے کہ اپنے ان ہی کپڑوں کو جن کو پہنے ہوئے ہے دھو کر صاف کر لے۔

صاحبو! کپڑے میں کلف اور استری کی ضرورت نہیں' ضرورت صرف یہ ہے کہ میلا نہ ہو پسینے کی بدبو نہ آتی ہو کیونکہ بدبو سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے' خاص کر استادوں کو ایسے لوگوں سے سخت تکلیف پہنچتی ہے اور استادوں کو تکلیف پہنچانے میں علم سے محروم رہ جانے کا قوی اندیشہ ہے۔

پس ایسے لوگوں کو اس کا خود خیال ہونا چاہیے اور اگر کسی کے ذہن میں اب تک یہ بات خود نہ آئی تھی تو اب سننے کے بعد تو ضرور خیال رکھنا چاہیے' آپ لوگوں نے حدیث میں پڑھا ہے **اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ** (ترجمہ) پکا مسلمان وہ شخص ہے کہ مسلمانوں کو اس کی زبان اور ہاتھ سے اذیت نہ پہنچے اور پسینے کی بدبو سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے۔

چنانچہ حدیث میں جمعہ کے دن غسل کرنے کی بابت آیا ہے **کان یوذی بعضھم بَعْضًا**' یعنی ایک دوسرے کو پسینے کی وجہ سے تکلیف ہوتی تھی اس لیے اس دن غسل کا حکم ہوا' اور لیجیے فقہ کے عالموں نے لکھا ہے' اور حدیث میں بھی ہے کہ کچا پیاز کھا کر مسجد میں نہ جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ ممانعت اسی وجہ سے ہے کہ اس کی بدبو سے فرشتوں اور دوسرے نماز

یوں کو تکلیف پہنچے گی ایسے ہی یہ حدیث بھی سن چکے ہو کہ نظفوا افنیتکم جن میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ جب فنا دار کے صاف کرنے کا حکم ہے تو خود حجرہ اور لباس اور بدن کے صاف کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا اور علاوہ دوسرے کی تکلیف کے صفائی نہ رکھنے سے طرح طرح کی بیماریوں کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اور صفائی کو صحت میں بڑا دخل ہے' کیونکہ صفائی سے نشاط پیدا ہوتا ہے اور نشاط کو صحت میں دخل ہے۔

اب طالب علموں کی یہ حالت ہے کہ چاہے دو بالشت کوڑا ان کے حجرے میں جمع ہو جائے لیکن یہ کبھی صاف نہ کریں گے' مجھے تھانہ بھون کی ایک حکایت یاد آئی کہ ایک طالب کے حجرے میں چوہے نے زمین کھود کر بہت سی مٹی نکال دی تھی اور وہ کئی روز تک اسی طرح پڑی رہی' لیکن اس کو بھٹ بند کرنے یا مٹی پھینکنے کی توفیق نہ ہوئی' اتفاق سے ایک صاحب جو حاجی بھی ہیں اس طرف کو جو گزرے تو انہوں نے اس کو درست کر دیا' چند روز کے بعد چوہے نے پھر کھود ڈالی اور پھر مٹی اسی طرح جمع ہوگئی کسی شخص نے دیکھ کر اس طالب علم سے کہا کہ اس کو ٹھیک کر دو تو آپ فرماتے ہیں حاجی جی ٹھیک کر دیں گے۔

گویا حاجی صاحب ان کے نوکر ہیں کہ وہ آ کر ان کے حجرے کو صاف کیا کریں' اسی طرح آجکل آموں کا فصل ہے' مدرسے میں جس جگہ دیکھئے چھلکا گٹھلی پھیلا پڑا ہے' میں نے تھانہ بھون میں یہ انتظام کیا ہے کہ ایک جگہ بڑا ٹوکرا رکھ دیا ہے اور سب سے کہدیا ہے کہ اس میں چھلکے وغیرہ ڈالو۔

لیکن باوجود اس کے بھی کسی کو اس کی توفیق بھی نہیں ہوتی' وجہ یہ ہی ہے' کہ مزاج میں صفائی اور ستھرائی نہیں' اسی طرح گرمی کی وجہ سے سب لوگ صحن میں سوتے ہیں لیکن ایسے بہت کم ہیں کہ صبح اٹھ کر چارپائی کو کسی ٹھکانے کی جگہ رکھ دیں بلکہ جس جگہ پڑی ہے وہیں دن چڑھے تک پڑی رہے گی' اکثر طالب علم اپنی ضرورت سے مسجد کے لوٹے حجرے میں لے جاتے ہیں لیکن پھر مسجد میں لا کر کون رکھے' اول تو مسجد کا لوٹا حجروں میں لے جانا ہی جائز نہیں اور اگر کسی جگہ مسجد اور مدرسے کا خرچ ایک جگہ ہونے کی وجہ سے جائز بھی ہو تو

۱؎ صاف رکھو اپنے فنائے دار کو ۱۲ منہ۔

حجرے میں رکھ لینا تو پھر بھی جائز نہیں' غرض ہم لوگ تکلف کریں گے تو نوابوں کی طرح اور بذاذۃ سادگی اختیار کریں گے تو بالکل بدنظم اور میلے کچیلے بن جائیں گے۔

اس لیے میں نے عرض کر دیا ہے کہ صفائی سادگی کے خلاف نہیں بلکہ جس طرح طہارت پاکی ضروری ہے اسی طرح صفائی بھی ضروری ہے اب تو ہماری طبیعت کے میلا پن کی یہ حالت ہوگئی کہ مدراس میں ایک انگریز مسلمان ہوا مسجد میں آ کر دیکھا کہ نالی میں بہت سا رینٹھ وغیرہ پڑا ہے اس نے وہاں کے لوگوں سے کہا کہ مسجد کو صاف رکھنا ضروری ہے اس کی ایسی حالت خراب نہ رکھنی چاہیے۔

اس کو سن کر وہ لوگ کہنے لگے کہ تجھ میں ابھی عیسائی پن باقی ہے ابھی صفائی کی بو دماغ سے نہیں نکلی' ان کی اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا مسلمان کے لیے میلا کچیلا خراب خستہ رہنا لازم ہے' اور اس قدر برہم ہوئے کہ اس کو مار کر مسجد سے نکال دیا۔

بعض سمجھ دار لوگوں کو اس حرکت کی اطلاع ہوئی تو وہ اس انگریز کے پاس آئے اور تسلی وتشفی کرنے لگے' اس نے کہا کیا آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ میں ان لوگوں کی اس حرکت سے اسلام کو چھوڑ دوں گا' میں ان پر ایمان' نہیں لایا' بلکہ حضور ﷺ پرنور پر ایمان لایا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ حضور ﷺ ایسے نہ تھے' تو بعض آدمی ستھرائی کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں' استغفر اللہ' حالانکہ دوسری قوموں نے صفائی اور ستھرائی اسلام سے ہی سیکھی ہے۔

اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ:

سارے بیان کا یہ ہے کہ ہم کو صرف علم حاصل کر لینے پر بس نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کے ساتھ عمل کرنا بھی ضروری ہے' کیونکہ یہ ان کے لیے زینت اور زیور ہے۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ عمل کی توفیق عطا فرمائیں:

اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

اے اللہ! اپنی مرضی اور پسندیدہ باتوں کی ہم کو توفیق عطا فرما! (امین)

تَمَّتْ بِالْخَیْر

(۵۲)علم وعمل کی فضیلت

منتخب از فضل العلم والعمل وعظ ہشتم جلد پنجم دعوات عبدیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خطبہ ماثورہ:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِى الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ○

(ترجمہ) ''اے مسلمانو! جب تم کو حکم ہو کہ مجلس میں فراخی کرو تو فراخی کر دیا کرو حق سبحانہٗ وتعالیٰ تمہارے لیے (اس اطاعت پر جنت میں فراخی کر دیں گے' اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو' خدا تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کے درجے (اطاعت کی بدولت) بلند کریں گے' یعنی جب کسی مصلحت سے صدر مجلس کی طرف سے ایسا حکم ہو تو اس پر عمل کیا کرو' خواہ صدر کوئی ہو نبی ہو یا غیر نبی' اسی واسطے لفظ اذا قیل لایا گیا ہے جس کے معنی ہیں جب کہ حکم ہو اور حکم کرنے والے کو نہیں بتلایا گیا کہ وہ نبی ہو یا غیر نبی' پس وہ عام رہا' آگے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی (ہر طرح سے) خبر رکھتے ہیں' یعنی جیسا جس کا عمل ہو گا ویسا ہی اس کو بدلہ دیں گے' جس آیت کی اس وقت تلاوت کی گئی ہے' گو اس میں ایک خاص مضمون ایک خاص مقام کے متعلق بیان کیا گیا ہے یعنی اس میں ایک خاص عمل کا حکم ہے ایک خاص حالت میں' لیکن اس کا جو ثمرہ اور فائدہ بیان کیا گیا ہے اس کے سبب پر نظر کرنے سے اس سے

ایک عام قاعدہ پیدا ہوتا ہے جس کو یاد رکھنے کی ہر وقت ہر مسلمان کو ضرورت ہے خاص کر اس زمانہ میں کہ عام طور سے لوگوں کے خیالات مختلف ہیں اور ہر شخص اپنی ایک جداگانہ رائے رکھتا ہے اسی وجہ سے اس کی اصلاح کے لیے اس آیت کو اس وقت اختیار کیا گیا ہے ترجمہ سے وہ خاص عمل معلوم ہو گیا ہوگا اور ذرا تامل سے اس کے فائدہ کا سبب بھی معلوم ہو جائے گا اور جو عام قاعدہ اس سے پیدا ہوتا ہے اس کی آئندہ تقریر کی جائے گی' اب بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا شان نزول یعنی وہ واقعہ جس پر آیت نازل ہوئی ہے بیان کر دیا جائے کیونکہ اس سے مراد سمجھنے میں بھی اعانت ہوتی ہے اور تفسیر میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

شان نزول آیت بالا:

شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ حضور ﷺ ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے بہت سے صحابی رضی اللہ عنہ بھی حاضر تھے کہ اصحاب بدر رضی اللہ عنہم آئے' اصحاب بدر وہ لوگ کہلاتے ہیں جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں ان کی فضیلت بہت ہے۔ اس وقت مجلس میں کچھ تنگی تھی۔

حضور ﷺ نے حاضرین مجلس کو حکم فرمایا کہ مل کر بیٹھو اور ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے بعض کو فرمایا کہ تم اٹھ جاؤ اپنے کسی دوسرے کام میں لگو یا اٹھ کر کسی دوسری جگہ بیٹھ جاؤ' ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کسی خاص مصلحت سے بعض کو مل کر بیٹھنے کا حکم دیا ہو اور بعض کو اٹھ جانے کا حکم ہوا ہو' آیت میں بھی ان دونوں باتوں کا ذکر ہے جس سے ان دونوں روایتوں کی تائید ہوتی ہے' صحابہ رضی اللہ عنہم تو حضور ﷺ کے لبوں کو تکتے رہتے تھے' کہ جو حکم ہو اس پر فوراً عمل کریں' انہوں نے تو اس پر نہایت خوشی سے عمل کیا بعض مل کر بیٹھ گئے اور بعض اٹھ کھڑے ہوئے لیکن منافقین نے کہ وہ ایسے موقعوں کے لیے ادھار کھائے بیٹھے رہتے تھے اس پر اعتراض کیا' اور یہ گویا ان کو عیب جوئی اور نکتہ چینی کا ایک موقع مل گیا حالانکہ اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تب بھی اس انتظام میں حضور ﷺ کی کمال خوبی معلوم ہوتی ہے کہ سب لوگوں کی کس قدر رعایت فرمائی کہ جگہ نہ ہونے کی مجبوری سے کوئی شخص محروم نہ رہ جائے' لیکن جن کی عقل

میں کجی ہو اس کا کیا علاج ان کو تو ہنر بھی عیب معلوم ہوتا ہے اور خوبی بھی برائی نظر آتی ہے' غرضیکہ منافقین کو اعتراض کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا' کہنے لگے کہ یہ کیا بات ہے کہ نئے آنے والوں کی خاطر پہلے بیٹھے ہوؤں کو اٹھا دیا جائے' خدا تعالیٰ نے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی۔

آیت کا خلاصہ:

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض لغو اس لیے ہے کہ حضور ﷺ کے وہ دونوں حکم مناسب وقت تھے اور مناسب کو غیر مناسب کہنا حماقت ہے اور مناسب ہونا اس طرح ظاہر فرمایا کہ ان حکموں کو خود بھی بیان فرمایا' اور خدا تعالیٰ جو حکم فرمائیں وہ قبیح اور غیر مناسب نہیں ہو سکتا تمام عقل مند اس کو تسلیم کرتے ہیں اور ایک دوسری آیت میں خدا تعالیٰ نے خود بھی اس کو فرمایا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ"

(ترجمہ: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ فحش باتوں کا حکم نہیں دیتا" اور حضور ﷺ حکموں کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے' پس معلوم ہوا کہ وہ دونوں حکم بہتر اور مناسب ہیں کیونکہ ایسی ذات پاک کا حکم ہے کہ جس کے برابر کوئی حکمت والا نہیں اس کا ہر حکم عین حکمت ہے' پھر آیت میں ان دونوں حکموں سے ہر ایک کا فائدہ بھی بیان فرمایا ہے جس سے ان دونوں حکموں کی مزید خوبی معلوم ہوتی ہے' پہلا حکم آیت میں یہ ہے وَاِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا (ترجمہ) "حق سبحانہ تعالیٰ تمہارے لیے فراخی کر دیں گے۔

یہاں تک تو پہلا حکم مع فائدہ کے بیان ہوا آگے دوسرا حکم مذکور ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (ترجمہ) اور جب حکم ہو کہ اٹھ کھڑے ہو' تو اٹھ کھڑے ہو جایا کرو۔"

یہ دوسرا حکم ہے آگے اس کا ثمرہ اور فائدہ بیان فرماتے ہیں:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (ترجمہ) خدا تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کے بہت سے درجے بلند کر دیگا خدا تعالیٰ کے اس ارشاد ہی سے' حضور ﷺ کے دونوں حکموں کی خوبی اور سراسر حکمت ہونا ثابت ہو گیا'

اور منافقین کا وہ بے ہودہ اعتراض کافور ہو گیا۔

اس کے علاوہ عقل سے بھی ان میں مصلحت اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ صدر مجلس جب اہل ہو اور اس قسم کا حکم کرے تو وہ کسی مصلحت کی بنا پر ہو گا اور حضور ﷺ کے اہل ہونے میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے' پس حضور ﷺ کے اس حکم میں یقیناً مصلحت ہو گی اور اس کا قبول کرنا ضرور ہو گا اور اس عقلی تقریر میں بلا تخصیص ہر صدر مجلس کو اس لیے کہا گیا' کہ یہ قاعدہ ہر صدر کے لیے ہے نہ کسی خاص صدر کے لیے نیز قرآن میں بھی لفظ اِذَاقِيْلَ آیا ہے (ترجمہ) جب کہ حکم ہو) جو کہ ہر صدر مجلس کے کہنے پر صادق آتا ہے' پس اب یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ اس حکم کا حق و منصب صرف حضور ﷺ ہی کا ہو کسی دوسرے صدر کو یہ حق حاصل نہ ہو' گو اس وقت حضور ﷺ کو اس کی ضرورت پیش آئی' اسی طرح جو حضور ﷺ کے نائب ہیں' اور نائب ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں' جس وقت وہ صدر مجلس ہوں ان کو بھی ایسی ضرورت پیش آ سکتی ہے پس ان کے قول پر عمل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسے حضور ﷺ کے ارشاد پر تو اگر وہ اٹھنے کا حکم دیں تو فوراً اٹھ جانا چاہیے اور اس کے بجالانے میں ذرا تنگ و عار نہ کرنا چاہیے کیونکہ صدر جب اہل ہو گا تو مصلحت وقت سے ایسا حکم دے گا۔

اب اس واقعہ کو وضاحت سے سمجھو کہ ان حکموں کا حاصل یہ ہے کہ ہر شخص کسی شے مشترک سے باری باری سے نفع اٹھائے اور یہ بات شریعت کے نزدیک پسند ہے' کیونکہ شریعت کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی کام سب لوگوں کا مشترک ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لیے سب کی گنجائش ایک مجلس میں نہ ہو تو باری باری سے حاصل کیا جائے اور اس قاعدہ میں شریعت کے ساتھ عقل کا بھی اتفاق ہے' کیونکہ ایسے موقع پر بجز اس طریقہ کے سب کو اپنا اپنا مقصود حاصل کرنے کی اور کیا صورت ہے کہ کچھ لوگ مقصود حاصل کر کے اس جگہ سے چلے جائیں اور دوسرے آ جائیں۔

زیادہ وضاحت اگر چاہتے ہو تو اس کی ایک مثال سے سمجھیے' مثلاً کسی شہر میں ایک ایسا کنواں ہے کہ شہر کے ہر شخص کو اس کے پانی کی ضرورت ہے' جیسے چاہ زمزم مکہ شریف میں' اور ایک ساتھ سب کے سب اس سے پانی نہ بھر سکتے ہوں تو اب سب کے پانی

حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ یکے بعد دیگرے اور باری باری سب کے سب پانی حاصل کریں اور چار آدمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کنویں پر جم کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو جگہ نہ دیں۔

یہ مثال ایسی ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں یہ طریقہ مسلم ہے اسی طرح دینی نفع میں بھی سب کے حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ یکے بعد دیگرے سب نفع حاصل کریں' اسی مثال کے قریب دوسری مثال پیش کرتا ہوں کہ وہ وضاحت میں تو اس سے کم ہے مگر اس موقع کے زیادہ مناسب ہے' کیونکہ اس وقت طلبہ کا مجمع زیادہ ہے وہ مثال یہ ہے کہ اگر ایک مدرسہ میں ایک عالم ایسے ہوں کہ ہر طالب کو ان کی ضرورت ہو اور ہر شخص ان سے نفع حاصل کرنا چاہیے' کوئی بخاری شریف پڑھنا چاہے اور کوئی مسلم شریف اور کوئی منطق وفلسفہ کی کتاب تو اگر بخاری شریف والے ان کو گھیر کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو وقت ہی نہ دیں تو دوسروں کے نفع حاصل کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے اور اس لیے بخاری والوں کو یہ حق نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ دوسری جماعتوں کے لیے بھی وقت چھوڑ دیں۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا ہوگا کہ دنیا کا نفع ہو یا دین کا' دونوں میں ایک ضرورت مند ایک وقت میں اس موقع پر جمع نہ ہوسکیں تو یکے بعد دیگرے اس کو حاصل کرنا ضروری ہے۔

پس حضور ﷺ کا یہ ارشاد نہایت ہی قرین مصلحت تھا' تا کہ سب اہل ضرورت فائدہ حاصل کرسکیں' اب یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے کہ آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ اگر سب کو بھی اٹھ جانے کا حکم فرمائیں تو سب کو اس پر عمل کرنا واجب ہے' حالانکہ بعض کے اٹھا دینے میں مصلحت ہے کہ دوسروں کو بھی موقع مل جائے' لیکن سب کے اٹھا دینے میں تو کچھ مصلحت نہیں معلوم ہوتی بلکہ خلاف معمول مصلحت معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب نفع حاصل کرنے سے محروم ہو جائیں گے' جواب یہ ہے:

کہ اس میں بھی وہ مصلحت اس طرح حاصل ہوسکتی ہے کہ شاید آپ خلوت میں

سب کے نفع کو کوئی بات سوچیں یا کچھ دیر آرام فرمائیں تا کہ پھر سب نفع رسانی کے لیے تازہ ہو جائیں' پس اس صورت میں بھی سب ہی کا نفع ہوا' اسی طرح اگر کسی دوسرے صدر مجلس کو بھی اس کی ضرورت پیش آئے کہ وہ کس مصلحت سے بعض کو یا ساری مجلس کو اٹھنے کا حکم دے تو اس کو اجازت ہے کہ کہدے کہ اب تم لوگ اٹھو اور اس کے اہل ہونے کے سبب اس کا یہ حکم قرین مصلحت سمجھا جائے گا اور اس پر عمل کرنا واجب ہوگا' تو منافقین کی یہ شکایت جس کا اوپر ذکر آیا ہے' محض حسد کی بنا پر تھی اور حضور ﷺ کے حکم کو قبول نہ کرنا محض ننگ اور عار کی وجہ سے تھا' اور بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے موقع پر اپنی توہین سمجھتی ہیں۔

اس وقت مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آیا واقعہ شروع بلوغ کا ہے' ایک مرتبہ اپنی مسجد میں نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوا' صف میں داہنی طرف آدمی زیادہ ہو گئے تھے اور بائیں طرف کم تھے' میں نے داہنی طرف کے ایک شخص کو کہا کہ آپ بائیں طرف آ جائیں' یہ سن کر اس کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرہ تمتما گیا زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے' حالانکہ یہ کوئی غصے کی بات نہ تھی' صفوں کی برابری کا حکم شریعت میں بھی تو موجود ہے' غرض کو وہ صاحب اپنی جگہ سے نہ ہٹے' ان کی یہ حرکت مجھے بھی ناگوار ہوئی' آخر میں نے ان کے قریب کے آدمی سے کہا کہ بھائی تم ادھر آ جاؤ' کیونکہ ان کی شان تو گھٹ جائے گی' اس پر وہ ایسے خفا ہوئے کہ صف میں سے نکل کر مسجد ہی کو چھوڑ کر چلے گئے تو بعض طبیعتیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ اس کو عار سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے کا کہنا مانیں اور اس کا اندازہ ان کے حالات دیکھنے اور ان کے پاس رہنے سے ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے ذریعہ سے یہ قانون ہمیشہ کے لیے مقرر کیا گیا کہ جب فراخی کرنے کا حکم ہو تو فراخی کر دیا کرو اور اگر اٹھ جانے کا حکم ہو تو اٹھ جایا کرو' ورنہ بظاہر اس قانون کے بنانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ بات تو ایسی ظاہر ہے کہ اس کے سمجھنے کے لیے اور اس پر عمل کرنے کے لیے صرف عقل ہی کافی تھی' سمجھ دار لوگوں کی مجلسوں میں صدر کا اس قسم کا حق ضرور سمجھا جاتا ہے مگر اس قسم کی طبیعتوں کی بدولت یہ قانون مقرر فرمایا

گیا تا کہ واجب اور ضروری سمجھ کر ماننا پڑے اور اس کی مخالفت کی ہمت نہ کریں اور اس کا حکم بھی فرمایا اور حکم کے ساتھ اس کی ترغیب بھی دی تا کہ کوئی حکم کی ہیبت اور خوف سے مانے اور کوئی فائدہ کی رغبت سے کیونکہ دو ہی قسم کی کی طبیعتیں ہوتی ہیں۔

بعض پر رغبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے بعض پر ہیبت اور خوف کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن شریف میں زیادہ لطف اسی کو آتا ہے جس کی نظر واقعات پر ہو اور وہ واقعات میں غور کرے مثلاً اگر ان بڑے میاں کا واقعہ جو قریب ہی بیان ہو چکا ہے پیش نظر نہ ہوتا تو اس حکم کی حکمت و مصلحت سمجھنے کا لطف نہ آتا اور اب معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے کس قدر پاکیزہ انتظام فرمایا ہے کہ ذراسی بات جس میں انسان کا فائدہ ہو اس کو نہیں چھوڑا' غرض کہ اس قسم کے واقعات ہوئے بھی ہیں کہ بعض لوگوں نے صدر مجلس کے حکم کی تعمیل کرنے میں ناگواری ظاہر کی ہے اور قیامت تک ہوتے بھی رہیں گے اس لیے یہ قانون ہمیشہ کے لیے مقرر فرما دیا۔ اور ساتھ ہی اس قانون کا فائدہ اور ثمرہ بھی بیان فرما دیا کہ اگر تم نے اس حکم پر عمل کیا تو ہم تمہارے لیے جنت میں جگہ کو فراخ کر دیں گے۔ اور دوسرا حکم یہ فرمایا کہ اگر اٹھ کر جانے کا حکم ہوا کرے تو اٹھ جایا کرو۔

پھر اس کا فائدہ بیان فرمایا کہ اس حکم کی تعمیل کرنے پر خدا تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور اہل علم کے درجے بلند فرمائیں گے اس تقریر سے آیت کے نازل ہونے کا واقعہ اور سبب بھی معلوم ہوا اور خلاصہ بھی جس میں حکم اور فائدے دونوں کا ذکر ہے۔

مقصود کا ثبوت:

اب میں وہ بات بیان کرتا ہوں جس کا اس وقت بیان کرنا اصل مقصود ہے۔ میں نے پہلے کہا تھا کہ یہ آیت میں حکم کا جو فائدہ بتلایا گیا ہے اس کا ایک سبب ہے اس میں غور کرنے سے وہ عام قاعدہ نکلے گا جس کا یاد رکھنا ہر وقت ضروری ہے۔

سو سنیے! کہ اس آیت میں دو حکم ہیں ایک تو یہ ہے کہ فَافْسَحُوْا (ترجمہ) جگہ فراخ کر دو۔ اور اس کا فائدہ یہ ہے یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ (ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے

جنت میں فراخی کر دیں گے۔'' اور دوسرا حکم یہ ہے فَانْشُزُوْا (ترجمہ) اٹھ جایا کرو اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ الخ (ترجمہ) اللہ تعالیٰ بلند کر دیں گے تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کے درجے' تو ان دونوں باتوں میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ صدر مجلس کے کہنے سے مجلس میں فراخی کر دینے میں فراخی کیوں ہوگی اور اٹھ جانے میں درجے بلند کیوں ہوں گے جس کو ذرا بھی عقل و سمجھ ہوگی وہ تو اس میں ذرا بھی تأمل نہ کرے گا بلکہ یہی کہے گا کہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس شخص نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس لیے اس کو یہ فائدہ حاصل ہوا۔

خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے مضمون کو اس وقت کیوں اختیار کیا گیا:

سو اصل مقصود اس وقت اسی بات کا بیان کرنا ہے کہ اس آیت سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت سے دو ثمرے حاصل ہوتے ہیں' باقی اور مضامین کا بیان سو اصل مقصود کی مناسبت سے ہوگا۔

رہی یہ بات کہ اس مضمون کو اس وقت بیان کے لیے کیوں اختیار کیا گیا' اس کی بابت میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ آج کل اس مضمون کی سخت ضرورت ہے' کیونکہ اس وقت لوگوں کے خیالات بہت ہی مختلف ہیں ہر شخص کی جدا جدا رائے ہے اور مال اور عزت کی طلب کا بہت چرچا اس وقت ہو رہا ہے جس کو دیکھیے اس کو اسی کا سودا ہے اور اسی کا دھن ہے اور ان کے حاصل کرنے کے لیے کچھ تدبیریں اور طریقے بھی اپنی طرف سے تراش رکھے ہیں جن میں یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ کون سی تدبیر حلال ہے اور کونسی تدبیر حرام ہے' بکثرت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اصل چیز مال اور عزت ہے اور اسی کو ترقی کہا جاتا ہے اور اسی کے لیے رات دن کوشش کی جاتی ہے' خواہ وہ کوشش شریعت کے موافق ہو یا مخالف' اسی لیے مال حاصل کرنے کے وہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن کی بدولت شریعت سے دوری ہوتی جاتی ہے۔

انگریزی تعلیم کی خرابیاں:

جیسے انگریزی تعلیم کہ آج کل اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کو کمال کے ساتھ حاصل کیا جائے اور اس کے بڑے بڑے درجوں کا امتحان دے کر پاس حاصل کیا جائے تاکہ کوئی بڑی تنخواہ کا عہدہ مل جائے اور روپیہ بھی خوب ملے اور عزت بھی حاصل ہو' پھر خواہ اس تعلیم انگریزی کا انجام دین کے لحاظ سے کیسا ہی برا ہو مگر مال کی ہوس میں اس کی ذرا پرواہ نہیں ہے' آج کل اس تعلیم انگریزی کے متعلق مولویوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ انگریزی تعلیم سے روکتے ہیں اور اس کو ناجائز بتلاتے ہیں' مسلمانوں کو ترقی نہیں دیتے۔

حالانکہ میں' بہ قسم کہتا ہوں کہ اگر انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں خرابیاں نہ ہوتیں جو آج کل عام طور سے اس میں نظر آ رہی ہیں تو مولوی اس سے ہرگز منع نہ کرتے لیکن اب دیکھ لیجیے کہ کیا حالت ہو رہی ہے جن لوگوں نے انگریزی پڑھی ہے ان میں سے کچھ ہی ایسے ہوں گے جن کے عقیدے شریعت کے موافق ہوں یا نماز روزے کے پابند ہوں یا صورت وشکل ان کی مسلمانوں کی سی ہو' ورنہ قریب قریب سب ہی ایسے ملیں گے کہ جن کے یا تو عقیدے خراب ہیں' شریعت کی باتوں پر بیہودہ اعتراض کرتے رہتے ہیں یا نماز روزہ کے پابند نہیں' یہ بھی نہیں جانتے کہ نماز کتنے وقت کی فرض ہے' روزوں کا کونسا مہینہ ہے اور اس کا کیا نام ہے اور بعض تو ایسے غافل ہو جاتے ہیں کہ ان کو یہ بھی خبر نہیں رہتی کہ مسلمانوں کی عید کب اور کیسی ہوتی ہے' حالانکہ یہ باتیں ہندو تک بھی جانتے ہیں اور اگر کسی کے عقیدے خراب نہیں ہیں اور نماز روزہ کا بھی پابند ہے تو صورت وشکل مسلمانوں کی سی نہیں' غرضیکہ انگریزی پڑھ کر ہر ہر بات میں شریعت کے خلاف کرتے ہیں اور پھر طرہ یہ ہے کہ یوں کہتے ہیں کہ اس سے اسلام کی ترقی ہوگی۔

انگریزی تعلیم کو اسلام کی ترقی کہنا بالکل غلط ہے:

صاحبو! موٹی بات ہے کہ جب ان میں اسلام کی کوئی بات نہ رہی تو وہ اسلام کی ترقی کہاں ہوئی البتہ مال اور عزت کی ترقی ہوئی۔

سو اسلام روپے اور عزت کو تو نہیں کہتے' خدا کا شکر ہے کہ حضور ﷺ اسلام کی حقیقت بیان فرما گئے ہیں' ہماری تمہاری تفسیر کا محتاج نہیں چھوڑ گئے اور خدا تعالیٰ نے بھی اس کی تفسیر کا خاص اہتمام فرمایا' اور عجب نہیں کہ اسی زمانہ کے لیے یہ اہتمام کیا ہو' کیونکہ آج کل یہ انگریزی پڑھے ہوئے اسلام کی متعلق بہت کچھ گڑ بڑ کر رہے ہیں' پہلے زمانہ میں شاید ہی ایسی گڑبڑ کسی نے کی ہو۔

بیان اس کا یہ ہے کہ اکثر صحابی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ ہیبت سے بہت سی باتیں نہیں پوچھ سکتے تھے تو خدا تعالیٰ نے ایک بار جبریل علیہ السلام کو حضور ﷺ کے پاس انسانی شکل میں بھیجا وہ ایک مجلس عام کے وقت تشریف لائے اور حضور ﷺ سے دوسروں کے سنانے کو چند سوالات کیے ان سوالوں میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ مَاالْاِسْلَامُ یعنی اسلام کیا چیز ہے' حضور نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَصَوْمَ رَمَضَانَ وَاَنْ تَحُجَّ الْبَيْتَ (الحدیث) ''یعنی کلمہ شہادت کا دل سے اقرار کرو اور زبان سے بھی ظاہر ہو' اور نماز و زکوٰۃ وروزہ و حج کا ادا کرنا' بس جب حضور ﷺ کے اس ارشاد سے اسلام کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اسلام کی ترقی تو یہ ہوگی کہ ان نیک کاموں میں ترقی ہو' نماز میں ترقی ہو' روزے میں ترقی ہو' نہ یہ کہ بس ٹم ٹم یا موٹر ہو اور ایک عالیشان محل یا کوٹھی ہو' یعنی اس قسم کی ترقی کو اسلام کی ترقی ہوگز نہ کہا جائے گا۔

غرض جب حضور ﷺ خود اسلام کی حقیقت بیان فرما چکے ہیں تو آج کون ہے کہ وہ بڑے بڑے عہدوں کو اور مال اور عزت کی ترقی کو اسلام کی ترقی بتلائے' انگریزی پڑھے ہوئے مال اور عزت کی ترقی کے ساتھ اگر دین پر بھی پورے قائم رہتے تب بھی ان چیزوں کو اسلام کی ترقی نہ کہتے' البتہ مسلمانوں کی دنیا کی ترقی کہتے' جب کہ وہ دین پر بھی باقی نہیں ہیں تو اس حالت میں یہ مال کی ترقی مسلمانوں کی کسی قسم کی ترقی نہیں ہوئی ہے بلکہ کافروں کی مالی ترقی ہوئی ہے' کیونکہ جب ان لوگوں کے عقیدے اور نماز روزہ سب رخصت ہو گئے تو اب اگر مال اور عزت کی ترقی بھی ہوئی تو یہ اہل اسلام کی ترقی بھی نہیں

کہلائے گی' غرض اس ترقی کو ایسا مقصود بنا رکھا ہے کہ حلال وحرام کی بھی مطلق تمیز نہیں رہی' چاہے مال سود سے حاصل ہو چاہے رشوت سے' چاہے شریعت کو بالکل ہی چھوڑنا پڑے مگر اس کو ضرور حاصل کیا جائے' ان لوگوں میں سے تو بعض نے غضب ہی کیا ہے' کہ صاف یہ کہہ دیا کہ یہ وقت حلال حرام کے دیکھنے کا نہیں یہ وہ وقت ہے کہ جس طرح ہو سکے روپیہ سمیٹ لو۔

غور کیجیے کہ جب یہ لوگ ایسی رائے دینے لگے تو مولویوں کا کیا قصور ہے اگر وہ انگریزی تعلیم سے روکیں اور منع کریں۔

عزت کی ترقی اور اس سے کام لینے میں کیا خرابیاں ہیں:

اور جس طرح آجکل مال کی طلب ہے اسی طرح لوگوں کو عزت اور شان کے حاصل کرنے کی کوشش ہے اس میں بھی یہ تمیز نہیں رہی کہ اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ حلال ہے یا حرام۔

اکثر ایسے طریقوں سے عزت اور بڑائی حاصل کی جاتی ہے جو کہ شریعت کے بالکل ہی خلاف ہیں اور پھر اس پر طرہ یہ کہ اس سے کام بھی ناپاک ہی لیا جاتا ہے کبھی اس کو ظلم وستم کا آلہ بناتے ہیں اور بیچارے غریبوں اور چھوٹوں کو خوب ستاتے ہیں بات بات پر ان کو دباتے اور دھمکاتے ہیں' بعض لوگ ان میں سے اپنی سرخروئی اور بات بنانے کے لیے کہتے ہیں کہ لَا رِیاسةَ اِلَّا بالسیاسة' یعنی ریاست بغیر سیاست کے نہیں ہوتی' تو ہمارا چھوٹوں کے ساتھ یہ طرزِ عمل سیاست ہے' جس کی ضرورت ریاست کے لیے ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات تو بالکل صحیح ہے کہ ریاست بغیر سیاست کے نہ ہونی چاہیے' اگر اس میں سیاست کے معنی ناحق ظلم وستم کرنا اور چھوٹوں کو ستانا نہیں ہیں' بلکہ اس کے معنی شریعت کے موافق انتظام کرنا ہے' غرضکہ مال اور عزت کو لوگوں نے اصل مقصود اور قبلہ وکعبہ بنا رکھا ہے اور یہ مرض عالمگیر ہو گیا ہے اسی لیے اس وقت اس کے بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی' تا کہ لوگ اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں۔

پس سنیے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں دونوں حکموں کے دو فائدے عجیب بیان فرمائے ہیں جو اس وقت کے مقاصد کے نہایت مناسب ہیں' ایک حکم فائدہ بیان فرمایا ہے یفسح جس کے معنی ہیں فراخی جو مناسب ہے مالی ترقی اور عیش کے' دوسرے حکم کا ثمرہ اور فائدہ بیان فرمایا ہے یرفع جس کے معنی ہیں بلندی کے جو مناسب ہے عزت اور بڑائی کے' گویا خدا تعالیٰ نے اس آیت میں یہ فرما دیا ہے کہ اگر فراخی اور عزت حاصل ہو سکتی ہے تو اطاعت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اور ہم اپنی حماقت سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ شریعت کے خلاف کرنے میں فراخی حاصل ہوگی' کیونکہ کاروبار میں آزادی نہ رہے گی حرام مال سے بچنا پڑے گا۔

تو بس پانچ روپیہ کے کسی مسجد یا مکتب کے ملا بن کر رہیں گے' پھر نہ کسی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بلاٹکٹ کے جا سکیں گے اور نہ بے ٹکٹ ریل گاڑی میں بیٹھ سکیں گے' گویا ہم لوگوں کے نزدیک ساری عزت وآبرو پلیٹ فارم پر بلاٹکٹ کے جانے میں ہی ہے۔

فراخی اور عزت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت میں ہے اور تنگی و ذلت معصیت میں ہے:

تو خدا تعالیٰ اس خیال کو رد کرنے کے لیے فرماتے ہیں کہ فراخی اور عزت دونوں محض خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہیں' اور اگر یہ نہیں ہے تو نہ ترقی مال کی ہے اور نہ ترقی عزت کی بلکہ ذلت ہے اور تنگی ہے' اسی کو خدا تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں بیان فرمایا ہے' وہ آیت یہ ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (ترجمہ) اور جس نے منہ پھیرا میرے ذکر سے تو اس کو عیش تنگ ملتا ہے (یہ تو قیامت سے پہلے سزا ملے گی) اور قیامت کے دن ہم اس کو اٹھائیں گے اندھا۔

پھر مشاہدہ ہے کہ گناہ اور معصیت سے دنیا کے عیش میں بھی تنگی ہو جاتی ہے فراخی اور راحت اسی میں منحصر ہے کہ انسان خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کرے ورنہ دنیا میں تنگی

ہوگی' اس مقام پر کسی کو شبہ ہوسکتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جو لوگ نافرمان ہیں وہ بڑی فراخی اور چین میں ہیں۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ جس کو آپ فراخی سمجھ رہے ہیں یہ سب ظاہر نمائش ہی نمائش ہے' ورنہ ایسے لوگ حقیقت میں بے چین اور زندگی سے تنگ ہیں اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا○ (ترجمہ) اور تعجب نہ کرو ان (کفار) کے مال اور اولاد سے یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب کرے ان کو ان چیزوں سے دنیا میں۔''

تو نافرمانی کی صورت میں یہ سب مال ومتاع لفافہ ہی لفافہ ہے اور حقیقت میں ایسے شخص کے دل کے اندر بے حد پریشانی اور تنگی ہوتی ہے اور کسی وقت اس کو چین نصیب نہیں ہوتا' کیونکہ ہونے والے واقعات اس کے اختیار میں نہیں' اولاد ہے وہ بیمار رہتی ہے' مرتی بھی رہتی ہے' مال ہے اس میں نقصان ہوتا رہتا ہے' اس کی بدولت مقدمات کا سلسلہ قائم رہتا ہے ایک سے نجات ملتی ہے تو دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے' اس سے جان بچی' تیسرا مقدمہ لگ جاتا ہے' اس دھندے میں ہزاروں روپیوں کا خون ہو جاتا ہے' اور پریشانی رہی سو الگ' پھر کبھی چوری ہو جاتی ہے اور کبھی اولاد بدچلن ہو کر مال اڑا دیتی ہے' ان مالداروں پر کم وبیش یہ واقعات خلاف طبعیت گزرتے ہیں اور ان کو عیش کی زیادہ عادت ہوتی ہے' پھر ان کے پاس کوئی غم ہلکا کرنے والی چیز ہوتی نہیں' اس لیے ان لوگوں کو اس وقت پریشانی اور تکلیف ہوتی ہے' اس جواب کو واضح کرنے کے لیے میں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

فرض کیجیے! کہ دو آدمیوں کے دو جوان لائق بیٹے مر گئے اور یہ دونوں شخص آپس میں ایک دوسرے کے سب حالتوں میں برابر ہیں لیکن صرف فرق اتنا ہی ہے کہ ایک ان میں سے خدا تعالیٰ کا فرمانبردار ہے اور دوسرا نافرمان اور فقط تدابیر پر اس کی نظر ہے۔

اب دیکھئے کہ بیٹے کے مرنے کا زیادہ رنج اور غم کس کو ہوگا اور زیادہ دنوں تک کس کو رہے گا' ظاہر ہے کہ فرمانبردار کو ہرگز زیادہ غم نہ ہوگا کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ خدا کا ہر کام

بہتر ہوتا ہے تو اس میں بھی کچھ بہتری ہوگی اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ تو آج ہی مرنے والا تھا' ٹل نہ سکتا تھا' پھر صبر کرنے سے ثواب بھی بہت ملے گا' تو ان خیالات کی بدولت بہت جلد اس کی تسلی ہو جائے گی۔

برخلاف اس نافرمان کے کہ اس کو عمر بھر کڑھتے اور لوٹتے ہی گزر جائے گی' کبھی خیال ہوگا کہ افسوس فلاں حکیم یا ڈاکٹر کے بلانے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے بچہ مر گیا' کبھی خیال ہوگا کہ فلاں نسخہ پلایا جاتا یا فلاں مقام میں لے جایا جاتا تو ضرور شفا ہو جاتی۔

غرض! اس قسم کے خیالات کا سلسلہ عمر بھر کے لیے بندھ گیا اور گویا ایک گھن لگ گیا' تو اس کے پاس ظاہری سامان اگرچہ سب کچھ ہو لیکن اس سامان سے فراخی اور راحت حاصل نہ ہوگی' کیونکہ اس کے دل میں تنگی اور بے چینی ہے' بلکہ یہ سامان تو اور دل پر ایک عذاب ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کسی پکے دنیا دار کو آرام میں نہ دیکھیں گے' کیونکہ نافرمانی کر کے دل کو چین نہیں مل سکتا' البتہ اگر فرمانبردار ہے تو وہ چین میں ہوگا' گو مالدار بھی نہ ہو' اور اگر یہ شخص مالدار بھی ہے تو راحت کا سبب مال نہ ہوگا' بلکہ اطاعت اور فرمانبرداری ہوگی' تو راحت وچین کا اصل سبب اطاعت ہے۔

اب وہ شبہ جاتا رہا' اسی طرح عزت بھی اطاعت ہی سے ہوتی ہے' لیکن اس بارے میں لوگ بڑی غلطی میں ہیں کہ خدا اور رسول ﷺ کی مخالفت کر کے عزت اور آبرو چاہتے ہیں' غرضکہ تجربہ ہے کہ خدا اور رسول ﷺ کی موافقت میں راحت ہی راحت ہے چاہے زیادہ مال اور عزت نہ ہو' لیکن مال اور عزت سے یہی تو مقصود ہے کہ دنیا کی ضرورتیں پوری ہوں' مال سے کھانے پینے کا سامان خریدا جا سکے' مکان بن سکے' اور عزت کی وجہ سے کوئی ستا نہ سکے' بیگار میں نہ پکڑ سکے اور ان سب باتوں سے مقصود راحت اور آرام سے زندگی بسر کرنا ہے' سو یہ اطاعت اور موافقت سے میسر ہوتی ہے چاہے ظاہری سامان کچھ ہی ہو۔

پس دیکھ لیجیے کہ یہ راحت خدا اور رسول ﷺ کے فرمانبردار کو حاصل ہے؟ یا نافرمانبردار کو' تمام جہان میں تلاش کر لیجیے خدا اور رسول ﷺ کا مخالف ایک بھی حقیقی

راحت میں نہ ملے گا' اس کا پتہ لوگوں کے حالات میں غور کرنے سے چلتا ہے کہ نافرمانبردار ہر وقت کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے' غرض مال اور عزت سے جو فائدہ مقصود ہے یعنی راحت' وہ اطاعت ہی سے حاصل ہوتا ہے سو دنیا کی راحت کا بھی ذریعہ اطاعت ہی ہوئی' تو اس تقریر کے بعد ان دنیاداروں سے کہا جائے گا کہ اے مال اور عزت کے طلب کرنے والو جس طریقہ سے تم دنیا کی راحت حاصل کرنا چاہتے ہو اس کا وہ طریقہ ہی نہیں' تم لوگ سراسر غلطی میں ہو' بلکہ اس کا صحیح طریقہ خدا اور رسول ﷺ کی سچی اطاعت پر موقوف ہے' یہی بات مجھ کو اس وقت بیان کرنی مقصود تھی' سو خدا کا شکر ہے کہ ضرورت کے موافق اس کا بیان بھی ہو چکا اور اس کی بابت مسلمانوں کی غلطی بھی رفع کر دی گئی' البتہ کوئی یہ شبہ کر سکتا ہے کہ آیت میں جس فراخی کا وعدہ ہے اس سے تو جنت کی فراخی مراد ہے اور ہمیں ضرورت ہے دنیا کی فراخی کی اور اس کا یہ سبب بغیر اطاعت کے حاصل ہونا آیت سے ثابت نہیں ہوا تو جنت کے ادھار پر کہا بیٹھے رہیں' اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں کہیں جنت کا نام نہیں اور اگر ہم دنیا اور جنت دونوں جگہ کی راخی مراد لیں' یوں کہیں کہ آیت میں دونوں جگہ کی فراخی کا اطاعت پر وعدہ ہے تو کیا حرج ہے' خاص کر جب کہ ہمارا مشاہدہ بھی ہے کہ خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت سے دنیا میں بھی فراخی کا وعدہ ہو گیا تو دنیا کی کیا رغبت رہنا چاہیے' مثلاً اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں تم کو ایک گنی دوں گا تو اس کو پھر کوڑیوں اور پیسوں کی تمنا رہے گی' ہرگز نہیں۔

اب اس مثال کے بعد یہ دیکھئے کہ جنت اور دنیا میں کیا نسبت ہے' سو حدیث میں آیا ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں ایک سوئی کے ناکے پر لگا ہوا پانی کا قطرہ' تو اس پانی کو سمندر کے ساتھ جو نسبت ہے وہی نسبت ہے دنیا کو آخرت کے ساتھ' تو اگر دنیا میں مال اور عزت نہ بھی حاصل ہو اور اس آیت میں وہ نہ بھی مراد ہو تو کیا حرج ہے اور یہ بالکل فرضی اور اخیر درجہ کی بات ہے' ورنہ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ اطاعت سے یہاں دنیا میں بھی فراخی ملتی ہے' زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ تمہاری بات مان لینے سے کہ اس آیت میں جنت کی فراخی مراد ہے یہ لازم آئے گا کہ اس آیت میں

دنیا کی فراخی کا دعویٰ ثابت نہ ہوگا' مگر ہم دوسری آیتوں سے ثابت کردیں گے۔

سو سنیے! ایک جگہ ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (ترجمہ) اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ط

''(ترجمہ) اور اگر یہ لوگ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی ہے' پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے۔''

ان کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں دنیا کی فراخی کے' اطاعت پر ملنے کا وعدہ ہے' تو اگر بعض آیتوں میں آخرت و جنت کی فراخی مراد ہو اور بعض میں دنیا کی فراخی و راحت' تو جرم کیا ہے۔

دنیا کی تکلیف و راحت آخرت کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں مع ایک مثال کے:

اور یہ تمام تر گفتگو دنیا پرستوں کی رعایت سے کی گئی ہے ورنہ اصل تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیا کی طرف جس قدر رغبت اور طلب ہے اس قدر نہ ہونا چاہیے اس کا اصل مقصود آخرت ہی ہونا چاہیے' کیونکہ آخرت کی فراخی کے مقابلے میں دنیا کی فراخی اور آخرت کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کا عذاب کچھ بھی نہیں ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص جو کہ عمر بھر نعمت اور عیش میں رہا ہوگا دوزخ میں ایک غوطہ دے کر کہیں گے کہ هَلْ رَاَيْتَ نَعِيْمًا قَطُّ یعنی کیا تو نے کبھی کوئی نعمت و آرام دیکھا ہے تو وہ کہے گا کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا' اور ایک شخص کو جو کہ عمر بھر تکلیف میں رہا ہوگا جنت میں داخل کر کے پوچھا جائے گا کہ تم کو کبھی کوئی تکلیف ہوئی ہے تو وہ کہے گا کہ کبھی نہیں۔

اس کو ایک مثال سے سمجھو' فرض کیجئے کہ ایک شخص نے حالت خواب میں یہ دیکھا کہ مجھے خوب پیٹا جا رہا ہے اور چاروں طرف سے سانپ بچھو ڈس رہے ہیں لیکن بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ تخت شاہی پر آرام کرتا ہے کوئی مورچھل جھل رہا ہے کوئی عطر لا رہا ہے کوئی پان لا رہا ہے' چاروں طرف لوگ دست بستہ کھڑے ہیں تو اس کے دل پر اس کے خواب کا کوئی اثر رنج و غم کا باقی رہے گا' ہرگز نہیں' بلکہ اگر وہ خواب از خود یاد بھی آئے گا تو طبیعت اس کو بھلا دیگی اور اس کے برعکس ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں تخت شاہی پر بڑی شان کے ساتھ بیٹھا ہوں اور تمام لوگ میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور حاجت مند اپنی اپنی حاجتیں میرے سامنے پیش کرتے ہیں اور میں ان کو پورا کرتا ہوں وغیرہ وغیرہ لیکن آنکھ جو کھلی تو دیکھا کہ ایک شخص سر پر جوتیاں مار رہا ہے اور بہت سے سانپ بدن کو لپٹے ہوئے ہیں اور ایک کتا منہ میں پیشاب کر رہا ہے' کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بیداری کی اس مصیبت کے بعد بھی خواب کی کسی قسم کی مسرت اس کے دل پر رہ سکتی ہے' کبھی نہیں۔

پس دنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ خواب کی مثال بیداری کے مقابلے میں' اگر دنیا میں عمر بھر عیش کیا اور مرنے کے ساتھ ہی پکڑا گیا تو وہ عیش کیا کام آئے گا۔

دنیا کے مال و متاع کی ایک مثال:

دنیا کی حالت پر مجھے ایک حکایت یاد آئی' ہے تو مہمل سی لیکن منطبق خوب ہے۔

ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ روزانہ سوتے میں پیشاب کر دیا کرتا تھا' اور اس کی بیوی اس کو دھوتی تھی' ایک روز بیوی نے کہا کہ کم بخت میں پیشاب دھوتے دھوتے بھی پریشان ہوگئی آخر تجھ پر کیا شامت سوار ہوتی ہے' کہنے لگا کہ میں روزانہ خواب میں دیکھتا کہ شیطان آتا ہے اور کہتا ہے چل تجھے سیر کرالاؤں' جب میں چلنے پر آمادہ ہو جاتا ہوں تو کہتا ہے کہ پہلے پیشاب تو کرلو' میں سمجھتا ہوں کہ پیشاب خانہ میں پیشاب کر رہا ہوں' حالانکہ وہ بستر ہوتا ہے' بیوی نے یہ خواب سن کر کہا کہ ہم لوگ غریب ہیں' شیطان تو جن کا

بادشاہ ہے اس سے کہنا کہ ہم کو کہیں سے کچھ روپیہ لادے' شوہر نے کہنے کا وعدہ کیا رات کو جب سویا تو شیطان پھر خواب میں آیا' اس نے شیطان سے کہا یار ہم خالی خولی نہیں چلتے کہیں سے کچھ روپیہ دلواؤ' شیطان نے کہا کہ یہ کیا مشکل ہے تم میرے ساتھ چلو پھر جس قدر روپیہ کہو گے ملے گا اس نے ایک بادشاہ کے خزانے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اور ایک گٹھڑی میں بہت سارو پیہ باندھ کر اس کے کندھے پر رکھ دیا اس میں اس قدر بوجھ تھا کہ مارے بوجھ کے اس کا پاخانہ نکل پڑا' جب صبح ہوئی تو بستر پر پاخانہ دھرا ہوا۔

بیوی نے پوچھا یہ کیا ہوا کہنے لگا کہ شیطان نے روپیوں کے اس قدر توڑے میرے کندھے پر رکھ دیئے کہ بوجھ کے مارے پاخانہ خطا ہو گیا وہ کہنے لگی میاں! تم پیشاب ہی کر لیا کرو ہمیں روپیوں کی ضرورت نہیں خدا کے لیے پاخانہ تو نہ کرو۔

تو یہ حکایت ہے تو مہمل سی' لیکن اگر غور کیجیے تو یہ ہماری حالت پر بالکل منطبق ہے کہ ہم بھی مثل اس شخص کے اس وقت خواب میں ہیں اور بہت سے روپیوں اور گنیوں کے توڑے اپنے سروں پر لادے ہوئے ہیں' لیکن جس وقت آنکھ کھلے گی جس کو موت کہتے ہیں اس وقت معلوم ہو گا کہ وہ سب محض خیال ہی تھا اور بس! اور اس وقت ہم اپنے گناہوں کی نجاست میں لت پت ہوں گے' نہ روپیہ پیسہ ہمارے پاس ہو گا نہ کوئی یار و مددگار ہو گا بالکل تنہا ہوں گے'

جیسے اس آیت میں فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ۔

(ترجمہ) ''اور تم ہمارے پاس آئے ایک ایک جیسے ہم نے بنایا تھا تم کو پہلی بار اور چھوڑ دیا تم نے جو ہم نے اسباب دیا تھا پیٹھ کے پیچھے۔''

اور اگر بالفرض روپیہ ہوتا بھی تب بھی کچھ کام نہ آتا' جیسے اور دوسری آیت میں فرماتے ہیں۔

لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ

الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

یعنی قیامت کے دن اگر ساری دنیا سے دوگنا مال ایک شخص کو مل جائے اور وہ عذاب کے بدلہ میں دنیا چاہے تو اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور اگر یہاں چند روز تکلیف اٹھا کر ہمیشہ ہمیشہ کا عیش و آرام حاصل ہوگیا تو یہ کلفت بھی راحت ہے' اسی وجہ سے خدا کے نیک بندوں نے آخرت کے عیش کی خاطر دنیا میں طرح طرح کی کلفتیں بخوشی برداشت کی ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے فقر و فاقہ اور صبر کی حکایت:

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جب متصل تین تین دن تک فقر و فاقہ ہوتا تو بیوی کہتیں کہ حضرت اب تو صبر نہیں ہوسکتا' آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے لیے جنت میں کھانے تیار ہو رہے ہیں ذرا اور صبر کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب بہت جلد اس نعمت سے مالا مال ہوں گے' اللہ اکبر! بیوی بھی خدا کی بندی ایسی شاکر و صابر تھیں کہ جنت کے ادھار پر رضامند ہوکر خاموش ہو جاتیں۔

ایک بزرگ کے فقر و فاقہ کو پسند کرنے کی حکایت:

ایک اور بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کو ایک بادشاہ نے لکھا کہ آپ پر کھانے پینے کی بھی بہت تنگی ہے اور کپڑے کی بھی' بہتر ہے کہ آپ میرے پاس چلے آئیں اور یہاں رہیں' انہوں نے اس کو بہت تیز اور خشک جواب دیا' اس کا حاصل یہ ہے کہ تم کو تمہارا عیش مبارک ہو' ہم کو اس کی ضرورت نہیں' ہمیں اپنا فقر و فاقہ ہی پسند ہے' تو واقعی وہاں جا کر نہ یہاں کا عیش رہے گا نہ مصیبت' اور آخرت میں تو یہ گزرے ہوئے واقعات کیا یاد رہتے ہیں' دنیا ہی میں دیکھ لیجئے' عمر گزری ہوئی خواب سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ جتنی تازہ خواب خیال میں رہتی ہے عمر گزری ہوئی اتنی بھی نہیں رہتی' تو خواب سے بھی کم درجہ ہے تو زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے آخر ختم ہو کر رہے گا' جیسے برف کا ٹکڑا کہ پگھلنا شروع ہوا تو ختم ہی ہوکر رہا' یہاں کی تکلیفوں سے مت گھبراؤ' مشقتوں کو جھیلو' ان کے بدلہ آخرت میں بڑے

بڑے درجے ملیں گے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب قیامت کے روز مصیبت والوں کو بڑے بڑے درجے عنایت ہوں گے تو نعمت والے کہیں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچی سے کاٹی گئی ہوتیں لیکن آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے تو اگر اس حالت پر نظر کر کے دیکھا جائے تو بے تامل یہ کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں کچھ بھی نہ ملتا تب بھی کچھ حرج نہ تھا' تو یہ اعتراض لغو ہے کہ آیت میں جنت کی فراخی کا وعدہ ہے اور ہم کو ضرورت ہے دنیا کی فراخی کی۔

صاحبو! کیا جنت تھوڑی چیز ہے' ابھی آپ نے دیکھا نہیں اس واسطے جنت کی کچھ قدر نہیں' جب دیکھو گے تو حقیقت کھلے گی' اور جنہوں نے ان چیزوں کو دل کی آنکھوں سے آج دیکھ لیا ہے' ان کی وہی حالت ہے جو دیکھنے والے کی ہوتی ہے۔

رہا یہ شبہ کہ عیش جب ہوگا تب ہوگا' اس وقت تو مصیبت میں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کی غلطی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہ کر کے مصیبت میں مبتلا ہیں:

اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والا کبھی مصیبت میں نہیں ہوتا اور اس کی جس حالت کو مصیبت سمجھا جاتا ہے وہ مصیبت نہیں:

اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر کے دیکھئے اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والا کبھی مصیبت میں نہیں ہے' اصل بات یہ ہے کہ جس چیز کا نام آپ نے مصیبت رکھا ہے وہ صرف ظاہر میں ہی مصیبت نظر آتی ہے ورنہ حقیقت میں وہ مصیبت نہیں ہے۔

دیکھو اگر ایک شخص کا محبوب مدت کا بچھڑا ہوا اچانک مل جائے اور اس عاشق کو بہت زور سے اپنی بغل میں دبائے یہاں تک کہ اس کی ہڈیاں اور پسلیاں بھی ٹوٹنے لگیں تو بظاہر یہ صورت نہایت تکلیف کی ہے لیکن اس میں جو لطف ہے وہ عاشق سے پوچھو اس کا دل یہی چاہے گا کہ اور دبائے تو اچھا ہے اور اگر محبوب کہے کہ اگر تم کو دبانے سے تکلیف ہو تو تم کو چھوڑ کر تمہارے اس رقیب کو اسی طرح دبا لوں تو عاشق کہے گا خدا نہ کرے کہ ایسا ہو اور یہ کہے گا کہ

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے!

حتی کہ اگر اس کا دم بھی اس حالت میں نکل جائے تو اس کے لیے عین راحت ہے حالانکہ بظاہر یہ نہایت ہی تکلیف میں ہے کہ اگر کسی ناواقف کی جس کو ان دونوں میں محبت کا علاقہ معلوم نہ ہو اس دبانے کی خبر ہو تو وہ بہت ہی رحم کھائے اور محبوب سے چھوڑنے کی سفارش کرے لیکن عاشق کو یہ رحم اور سفارش بے رحمی اور عداوت معلوم ہوگی کیونکہ جانتا ہے کہ اس سفارش کا اثر یہ ہے کہ محبوب چھوڑ کر ابھی علیحدہ ہو جائے گا' اسی طرح جن لوگوں کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو گیا ہے اور بظاہر کسی تکلیف میں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ آپ کی اس خیر خواہی کو کہ "ہائے یہ اللہ والے بڑی مصیبت میں ہیں ان کو اس سے نکلنے کی تدبیر بتلائیں" نہایت ناگوار سمجھتے ہیں۔

میں نے اپنے استاد سے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک بزرگ چلے جاتے تھے' راستے میں ایک شخص کو دیکھا کہ زمین پر پڑا ہوا ہے اور تمام بدن زخمی ہو رہا ہے' غور کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو کوئی بزرگ ہیں' ان کو بہت رحم آیا اور قریب جا کر ادب سے زخموں کی مکھیاں اڑانے لگے کچھ دیر کے بعد ان کو افاقہ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ کون شخص ہے کہ میرے محبوب کے درمیان حائل ہو رہا ہے' اور میرے لطف وعیش میں خلل ڈال رہا ہے' تو محبت کا علاقہ ایسی چیز ہے کہ ناگوار بھی گوارا ہوتا ہے۔

ایک شخص کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی شخص کی محبت کے جرم میں اس کو چابک سے سزا دی جا رہی تھی تو ننانوے چابکوں میں تو آہ نہیں کی لیکن اس کے بعد جو ایک چابک لگا تو اس میں بہت زور سے آہ کی۔ لوگوں نے سبب پوچھا کہنے لگا کہ ننانوے چابک تک تو محبوب بھی میرے سامنے کھڑا تھا' مجھ کو یہ لذت تھی کہ محبوب میری حالت کو دیکھ رہا ہے' اس میں تکلیف محسوس نہیں ہوئی اور اخیر کے چابک میں وہ جا چکا تھا' اسی لیے اس کی تکلیف محسوس ہوئی۔

حق سبحانہٗ وتعالیٰ اسی کو حضور ﷺ سے فرماتے ہیں "وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ

بِاَعْيُنِنَا" یعنی آپ صبر کیجیے اس لیے کہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال میں یہ خاصیت ہے کہ کہ تکلیف راحت سے بدل جاتی ہے تو جب محبت میں یہ خاصیت ہے تو جن کو آپ تکلیف میں سمجھتے ہیں اور ان کے اس حالت کے برداشت کرنے پر تعجب کرتے ہیں اگر ان کو بھی اس تکلیف میں راحت ہوتی تو کیا تعجب ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نماز میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ ان کے ایک تیر آ لگا لیکن قرآن پڑھنا نہیں چھوڑا' آخر ایک دوسرے صحابی سوتے تھے کہ جاگنے کے بعد انہوں نے اس حالت کو دیکھا اور بعد سلام پھیرنے کے ان سے پوچھا تو فرمانے لگے کہ نہ چاہا کہ تلاوت قرآن کو بیچ میں چھوڑ دوں۔

غرض محبت الٰہی ایسی چیز ہے' لیکن جب کہ ہم نے محبت کا مزہ چکھا نہیں اس لیے سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مصیبت میں ہیں اور واقع میں وہ مصیبت میں نہیں کیونکہ مصیبت نام ہے اس شے کا جو حقیقت میں مصیبت ہو نہ کہ اس کا جو کہ ظاہر میں مصیبت نظر آتی ہو۔

پس شبہ جاتا رہا کہ اللہ والے مصیبت میں ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نافرمانی کے ساتھ راحت اور عزت نہیں حاصل ہوتی اور اطاعت وفرمانبرداری کے ساتھ تکلیف اور ذلت جمع نہیں ہوتی' پس اگر ہم عزت چاہتے ہیں تو اطاعت خداوندی اختیار کریں' ہم نے جب سے اس کو چھوڑ دیا ہے اسی وقت سے ہماری راحت اور عزت بھی جاتی رہی ہے۔

مجھ کو اس وقت یہی مضمون بیان کرنا تھا جو کافی طور سے بحمد اللہ بیان ہو چکا' اب میں اس آیت کے متعلق اور مفید باتیں جو اس آیت سے ثابت ہوتی ہیں اور آج کل لوگ ان میں بھی غلطی کرتے ہیں بیان کرتا ہوں' منجملہ ان کے حسن معاشرت ہے' یعنی آپس میں اچھا برتاؤ برتنا شریعت کا یہ بھی جزو ہے' آیت میں مجلسوں میں ضرورت کے وقت فراخی کر دینے اور کھڑے ہو جانے کا جو حکم ہے وہ اسی میں داخل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ شریعت پانچ جزو ہیں عقیدے' جیسے اللہ تعالیٰ کو ایک اور حضور ﷺ کو رسول سمجھنا' اعمال جیسے نماز روزہ معاملات' جیسے خرید وفروخت نکاح وغیرہ اخلاق یعنی

عادتیں جیسے تواضع سخاوت وغیرہ' حسن معاشرت یعنی اچھا برتاؤ جیسے کسی کے سونے میں کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے اس کی نیند اچٹ جائے' شریعت ان پانچوں کے مجموعہ کا نام ہے' مسلمانوں کو ان سب کا اختیار کرنا ضروری ہے' مگر اس وقت لوگوں نے اختصار کر دیا ہے' کسی نے تو صرف عقیدوں کو لیا کہ لا الہ الا اللہ کے قائل ہونے سے جنت مل ہی جائے گی' گو سزا پا کر اور پٹ پٹا کر ہی سہی' پھر نماز روزہ اور دوسرے دینی کاموں کی کیا حاجت ہے' ان لوگوں کا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ چیزیں بھی تو فرض ہیں' مگر عمل کی توفیق نہیں ہوتی' بعض ایسے ہیں کہ عقیدوں کے ساتھ نماز روزہ وغیرہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں' باقی معاملات وغیرہ کو چھوڑ دیا' لین دین میں اس کی ذرا پرواہ نہیں کہ جائز طریقہ سے ہو یا ناجائز طریقہ سے' آمدنی کے ذریعوں میں حلال وحرام کا بالکل خیال نہیں' بعض وہ ہیں کہ انہوں نے معاملات کو بھی درست کر لیا۔ لیکن اخلاق وعادتوں کی اصلاح نہیں کرتے' بہت کم لوگ ان کی اصلاح کا اہتمام کرتے ہیں' بلکہ ایسے بھی لوگ دیکھے گئے ہیں کہ ان کو دوسروں کی اصلاح کرتے ہوئے مدتیں گزر جاتی ہیں لیکن خود ان کی عادتوں سے لوگوں کو عام طور پر تکلیف پہنچتی ہے اور ان کو اپنی حالت کی ذرا پرواہ نہیں ہوتی بلکہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم سے دوسروں کو کیا تکلیف ہوتی ہے' اور ایسے تو بہت ہی ہیں کہ راستے میں کوئی غریب مسلمان مل جائے تو اس کو خود پہلے کبھی سلام نہ کریں گے' بلکہ اس کے سلام کے منتظر رہیں گے۔

بعض لوگ عقاید اور اعمال ومعاملات کے ساتھ اخلاق کی درستی کا خیال رکھتے ہیں اور ان کا علاج کرتے ہیں' لیکن انہوں نے حسن معاشرت کو چھوڑ رکھا ہے' بلکہ شریعت ہی سے خارج سمجھتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے آپس کے برتاؤ ہیں' ان سے شریعت کو کیا غرض' جو برتاؤ ہم مناسب سمجھیں گے کریں گے اس میں شریعت کے دخل دینے کی کیا ضرورت ہے'

اس قسم کے بہت سے لوگ دیکھنے میں آئے ہیں کہ وہ دیندار بھی ہیں ان کے اخلاق مثل تواضع وغیرہ درست ہیں لیکن معاشرت برتاؤ میں اکثر چھوٹی باتوں میں اس کا

لحاظ نہیں کرتے کہ ان سے دوسروں کو اذیت تو نہ پہنچے گی بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت زیادہ تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اس طرف توجہ نہیں ہوتی'

حالانکہ حدیث شریف میں بکثرت آیا ہے کہ حضور ﷺ کو چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف بھی اس قدر توجہ ان کا بھی اتنا ہی اہتمام ہوتا تھا جتنا کہ بڑی باتوں کا تھا' اس بارہ میں میرا ایک رسالہ ہے ''آداب المعاشرت'' اس کے شروع میں اس قسم کی بہت سی حدیثیں لکھ دی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ شریعت ایسی باتوں کو ہرگز جائز نہیں رکھتی جن سے کسی کو ذرا بھی تکلیف پہنچے یا کسی قسم کا بار ہو اس وقت یہ مرض ایسا عام ہو گیا ہے کہ جو لوگ اللہ اللہ کرنے والے کہلاتے ہیں ان کو بھی اس کی پرواہ نہیں' عین اللہ اللہ کرنے کے وقت بھی لوگوں کو اذیت و تکلیف کا خیال نہیں کرتے' زور زور سے ضربیں لگا کر دوسروں کی نیند خراب کرتے ہیں' میں نے یہی حالت دیکھ کر اپنے ذمے اس کی اصلاح کو ضروری سمجھ لیا ہے کہ جو لوگ میر پاس آئیں ان کو ذکر و شغل میں لگانے سے زیادہ ان کے اخلاق اور معاشرت کی زیادہ توجہ کے ساتھ اصلاح کی جائے اور معاشرت کی کسی بات میں بھی حتی الامکان کمی نہ کی جائے' کیونکہ آج کل اس کی بڑی ضرورت ہے' لوگ ان کے اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے' اور جب تک اس کے طریقے تفصیلاً معلوم نہ ہوں' میں اس کا ایک سہل و آسان قاعدہ بتلائے دیتا ہوں کے اس میں ذرا توجہ کرنے سے قریب قریب تمام معاشرت کے طریقے خود بخود سمجھ میں آنے لگیں' وہ قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی کے ساتھ جو برتاؤ کرنا ہو گو وہ برتاؤ ادب و تعظیم ہی کا ہو' اول یہ دیکھ لے کہ اگر میرے ساتھ یہی برتاؤ ایسے شخص کی طرف سے کیا جائے کہ جس کو میرے ساتھ وہ نسبت ہو جو مجھ کو اس شخص سے ہے تو مجھ کو ناگوار اور گراں تو نہ ہوگا' اس کا جو جواب ذہن میں آئے اسی کے موافق دوسرے کے ساتھ برتاؤ کرے۔

معاشرت میں کوتاہی کرنے کا حکایتیں اور اذیت کے اسباب کا بیان:

ایک مرتبہ میں کچھ پڑھ رہا تھا کہ ایک صاحب میری پشت کی طرف جا کر بیٹھ گئے میں نے ان کو منع کیا' جب نہ مانے تو میں ان کی پشت کی طرف جا کر بیٹھ گیا گھبرا کر فوراً

کھڑے ہو گئے' میں نے کہا کہ جناب پشت کی طرف بیٹھنا اگر بری بات ہے تو آپ باوجود منع کرنے کے اس سے کیوں نہ باز آئے اور اگر اچھی بات ہے تو مجھے کیوں نہیں کرنے دیتے اور میں نے کہا کہ آپ اندازہ کیجیے کہ میری پشت کی جانب بیٹھنے سے آپ کو کس قدر گرانی ہوئی' اسی سے میری تکلیف کا بھی اندازہ کر لیجیے' اور اگر بجائے میرے کوئی دوسرا بھی تمہارے پیچھے بیٹھ جائے تب بھی گرانی یقینی ہے' گو میرے بیٹھنے میں کچھ تفاوت ہو مگر اذیت تو تھوڑی سی بھی جائز نہیں۔

خدا جانے لوگ پشت کی طرف بیٹھنے میں کیا مصلحت سمجھتے ہیں' آیا یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص بزرگ ہے ہماری عبادت اس کے اندر سے نکل کر جائے گی تو قبول ہوگی' گویا وہ جنس کی ٹٹی ہیں کہ ہوا کہ طرح ان میں سے عبادت چھن کر جائے گا۔

بعض لوگ تو یہ غضب کرتے ہیں کہ جن کو بزرگ سمجھتے ہیں ان کے پس پشت کھڑے ہو کر نماز شروع کر دیتے ہیں کہ اگر وہ کسی ضرورت سے اٹھنا چاہیں تو اٹھ ہی نہ سکیں۔

صاحبو! یہ کیا ادب ہے کہ ان کو قید کر دیا' فرض کیجیے کہ نماز کی نیت باندھتے ہی ان بزرگ کو پاخانہ کی ضرورت ہو اور تقاضا بھی شدت سے تو وہ کیا کریں یا تو نمازی کے سامنے سے اٹھ کر جائیں یا ان کی چار رکعتیں پوری ہونے تک جبراً قہراً بیٹھے رہیں' اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بزرگوں کے پاؤں ان کے منع کرنے پر بھی پکڑتے ہیں اور ان کی تکلیف کی ذرا پرواہ نہیں کرتے اور اس روکنے کو بناوٹ اور تکلف سمجھتے ہیں اور باز نہیں آتے' حالانکہ غور کرنا چاہیے کہ جب ان کے روکنے کو بناوٹ سمجھا تو ان کو جھوٹا سمجھا تو پھر وہ بزرگ ہی نہ ہوئے' پھر پاؤں کیوں پکڑتے ہو۔

مجھے ایک مرتبہ بنگالہ جانے کا اتفاق ہوا' وہاں پاؤں پکڑنے کی رسم کا کچھ ایسا رواج دیکھا کہ شاید ہی کہیں ہو' جو شخص مجھ سے ملنے آتا مصافحہ کے بعد پیر بھی ضرور پکڑتا' دو چار آدمیوں کو تو میں نے منع کیا لیکن جب میں نے دیکھا کہ کوئی نہیں مانتا تو میں نے یہ علاج کیا کہ جو شخص میرے پیر پکڑتا میں اس کے پیر پکڑ لیتا' وہ لوگ گھبراتے تب میں کہتا کہ

جناب پیر پکڑنا اگر اچھی بات ہے تو مجھے اس فعل کی کیوں اجازت نہیں دی جاتی' کہنے لگے کہ آپ تو بزرگ ہیں' میں نے کہا کہ میں قسم سے کہتا ہوں کہ میں آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں' تب لوگوں نے پیر پکڑنا چھوڑا۔

بعض تعظیم وتکریم بھی تکلیف کا سبب ہوتی ہے:

تو میں کہتا ہوں کہ جو کام ظاہر میں اذیت اور تکلیف کے ہیں ان کا چھوڑنا تو ضرور ہے ہی مگر جن باتوں کو آج کل لوگ تعظیم وتکریم کے طور پر کرتے ہیں ان سے بھی اگر کسی کو اذیت ہو ان کا چھوڑنا بھی لازم ہے' جیسے پاؤں پکڑنا' یا جوتا اٹھانا یا جوتا اٹھا کر رکھنا یا آتا ہوا دیکھ کر کھڑے ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اپنے بزرگوں کی خدمت اسی لیے نہیں کی کہ شاید میری ناواقفیت سے اس خدمت سے ان کو تکلیف ہو یا ان کے قلب میں میرا لحاظ ہو اور اس کے سبب ان کو گرانی ہو' کیونکہ بعض کے قلب میں بعض کا لحاظ ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح نکلتا ہی نہیں' خواہ طبیعت کو کتنا ہی مجبور کیا جائے تو اگر ایسا شخص بدن دبانے لگے یا پنکھا جھلنے لگے تو اس سے بجائے آرام کے تکلیف اور گرانی ہوتی ہے' اب لوگ اس کی مطلق پرواہ نہیں کرتے' زبردستی بھی آکر چمٹ جاتے ہیں' تو ایسے موقعہ پر سمجھ سے کام لینا چاہیے تاکہ دوسرے کو خدمت اور تعظیم وتکریم سے اذیت نہ ہو اور اگر اپنے آپ کو اتنی سمجھ نہ ہو تو دوسرے کے کہنے کے بعد تو ضد نہ کرنا چاہیے' جس سے اعتقاد ومحبت ہو اس کی بڑی تعظیم یہ ہے کہ کوئی برتاؤ اس کے ساتھ اذیت رسانی کا نہ کرے۔

دیکھئے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہمارا تعظیم کے لیے اٹھنا پسند نہیں' تو ہم آپ کی تعظیم کو نہ اٹھتے تھے' حالانکہ پہلے اٹھا کرتے اور اس وقت بھی اندر سے دل اٹھنے کو چاہتا تھا سبحان اللہ یہ ہے سچی محبت اور تابعداری۔

مجھے اپنے طالب علمی کے زمانہ کا قصہ یاد ہے کہ جب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرسہ میں تشریف لاتے تو ہم سب لوگ ادب سے اٹھ کھڑے ہوتے' ایک روز

مولانا نے فرمایا کہ مجھ کو اس سے تکلیف ہوتی ہے' تم لوگ میرے آنے کے وقت مت اٹھا کرو' اس روز سے ہم نے اٹھنا چھوڑ دیا ہے دل میں ولولہ پیدا ہوتا تھا' لیکن یہ خیال ہوتا کہ مقصود تو ان کو راحت پہنچانا ہے' سو جس میں ان کو راحت ہو وہی کرنا مناسب ہے' اب لوگ اس کا خیال نہیں کرتے بعض لوگوں کو بزرگوں کے جوتے اٹھا کر لے چلنے پر اصرار ہوتا ہے' تو خود اس فعل میں تو کچھ حرج نہیں لیکن اگر کسی وقت منع کیا جائے تو فوراً رک جانا چاہیے' کیونکہ اصرار کرنے میں تکلیف ہوتی ہے' بعضے تو یہاں تک بے تمیزی کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ تھانہ بھون کی جامع مسجد سے میرے استاذ مولانا فتح محمد صاحب مرحوم جمعہ کی نماز پڑھ کر چلے' درمیان فرش تک پہنچے تھے کہ ایک شخص نے آ کر ہاتھ سے جوتا لینا چاہا' مولانا نے تواضع سے انکار فرما دیا' لیکن اس شخص نے نہ مانا آخر اس قیل وقال میں بہت دیر ہوگئی اور اس حماقت کی بدولت مولانا کو دھوپ کی تپش میں جلتے ہوئے فرش پر کھڑا رہنا پڑا' جب اس نے دیکھا کہ مولانا کسی طرح نہیں مانتے تو ایک ہاتھ سے مولانا کی کلائی پکڑ لی۔ اور دوسرے ہاتھ جھٹکا مارا اور جوتے لے لیے اور دوڑ کر کنارۂ فرش پر رکھ آیا اور اپنی اس کامیابی اور خدمت پر بہت خوش ہوا' میں نے جو یہ حرکت دیکھی تو مجھ کو سخت ناگواری ہوئی اور اس شخص کو میں نے بہت ہی برا بھلا کہا اور میں نے کہا ظالم تو نے جوتے لے چلنے کو تو ادب سمجھا لیکن اس بے تمیزی اور گستاخی کا خیال تجھ کو نہ ہوا کہ تو نے تپتے ہوئے فرش پر دھوپ میں مولانا کو اتنی دیر کھڑا کیے رکھا اور ہاتھ کو جھٹکا دے کر جوتا چھین لیا۔

آج کل لوگوں نے نری تعظیم کا نام خدمت رکھا ہے' حالانکہ خدمت تعظیم کو نہیں کہتے' بلکہ خدمت اصل میں راحت پہنچانے کو کہتے ہیں اور اس میں لوگوں کی عادتیں مختلف ہیں' کسی کو تعظیم و تکریم پسند ہے اور کسی کو ناپسند تو جو بزرگ تعظیم سے خوش نہ ہوں اور اس سے روکیں ان کی تعظیم مت کرو' کیونکہ اس سے ان کو تکلیف ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس بات سے کسی کو تکلیف ہو اس کو بالکل ترک کر دینا چاہیے' خواہ وہ بات ظاہر میں تعظیم ہی کیوں نہ ہو' اور اگر وہ بات ظاہراً تعظیم بھی نہ ہو' تب تو ظاہر ہے

کہ وہ بری ہے اور اس کا چھوڑ دینا واجب وضروری ہے' جیسے کسی شخص کی رات کو آنکھ کھلی اور استنجے کی ضرورت ہوئی اور اس نے روز سے ڈھیلے توڑنے شروع کر دیئے' جس سے قریب کے سونے والوں کی نیند خراب ہوئی اور نیند خراب ہونے سے کسی کے سر میں درد ہو گیا کسی کی آنکھوں میں درد ہو گیا اور اگر کسی کو پھر نیند آ گئی تو صبح کی نماز قضا ہو گئی' پس ایسی حالت میں زور سے ڈھیلے توڑنا جائز نہیں۔

صاحبو! یہ باتیں ظاہر میں نہایت چھوٹی چھوٹی اور معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان سے دوسروں کو تکلیف اور اذیت بہت ہوتی ہے اس لیے قابل ترک ہیں فقہ کی کتابوں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر بلند آواز سے ذکر کرنے سے سونے والے کی نیند میں خلل پڑتا ہو تو پکار کر ذکر کرنا حرام ہے تو جب اللہ کا نام لینا بھی تکلیف پہنچا کر جائز نہیں تو دوسرے کام تکلیف پہنچا کر کیونکر جائز ہوں گے۔

حضور ﷺ کے ایک بار رات کے وقت اٹھنے کا قصہ:

اور سنیے! ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور سرور کائنات ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آرام فرماتے تھے کہ رات کو اٹھنے کی ضرورت ہوئی' تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ قَامَ رُوَيْدًا یعنی آپ ﷺ نہایت آہستہ اٹھے...... وانتعل رویدًا اور جوتے نہایت آہستہ سے پہنے وفتح الباب رویدًا اور نہایت آہستہ سے دروازہ کھولا وَخَرَجَ رویدًا اور نہایت آہستہ سے باہر تشریف لے گئے کہ حضرت عائشہ بھی چپکے سے اٹھ کر پیچھے پیچھے ہولیں' حضور ﷺ جنت البقیع میں تشریف لے گئے پیچھے پیچھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی رہیں' جب آپ واپس ہونے لگے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جلدی سے آ کر پہلے اپنے بستر پر لیٹ رہیں' حضور ﷺ نے تشریف لا کر دیکھا کہ ان کا سانس پھول رہا ہے' پوچھا کہ یہ سانس کیوں پھول رہا ہے انہوں نے چھپانا چاہا' لیکن چھپ نہ سکا' تب انہوں نے اپنے پیچھے جانے کا تمام قصہ بیان کیا' آپ نے فرمایا شاید تم کو خیال ہوا کہ میں تمہاری باری میں کسی دوسری بیوی کے پاس چلا جاؤں گا' تو ایسا کب ہو سکتا ہے۔

یہ بڑی حدیث ہے مجھ کو اس حدیث میں سے صرف بیان کرنا اس کا مقصود ہے کہ حضور ﷺ کی شان محبوبیت ایسی کامل ہے کہ اگر آپ کسی کو تکلیف بھی پہنچائیں تب بھی اس شخص کو راحت ہی ہو' پھر خاص کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہ وہ تو عاشق زار تھیں تو اگر بالفرض وہ سوئی ہوتیں اور ان کی اس وقت آنکھ کھل بھی جاتی تب بھی ناگواری کا احتمال نہ تھا' لیکن اس وقت بے تکلف اٹھنا اور دروازہ کھولنا صورت تکلیف کی تھی' اس لیے آپ نے اس کو بھی گوارا نہیں فرمایا اور سب کام آہستہ آہستہ کیے جو جب آپ ﷺ نے برتاؤ میں باوجود اس کے باعث تکلیف نہ ہونے کے اتنی رعایت فرمائی تو ہم کو کب اجازت ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسی حرکت کریں جس سے دوسروں کو تکلیف کا احتمال ہو۔

سفر میں جانے والے کو کسی شئے کے لانے کی فرمائش کرنا بعض مرتبہ تکلیف کا سبب بن جاتا ہے:

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ سفر میں جانے والے کو کچھ نہ کچھ فرمائش کر دیتے ہیں اس سے بعض اوقات ایسی تکلیف ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ جب میں کانپور میں تھا تو دیکھتا تھا کہ جب کوئی شخص لکھنو جاتا تو لوگ فرمائش کر دیتے کہ وہاں سے فلاں ترکاری لیتے آنا اور بعض اوقات اس مسافر کے ٹھہرنے کی جگہ سے سبزی منڈی اتنی دور ہوتی تھی کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے کم از کم دو آنہ یکہ کا کرایہ ہوتا' تو دو آنہ کرایہ کے پاس سے خرچ کر کے تب اس فرمائش کرنے والے کی چار پیسے کی فرمائش پوری کرو اور شرم کے مارے یکے کے پیسے مت مانگو اور ایسا نہ کرو تو عمر بھر کی شکایت خریدو۔

پھر بعض تو یہ غضب کرتے ہیں کہ فرمائش کر کے قیمت بھی نہیں دیتے۔ گویا وہ شخص اپنے گھر سے خزانہ لے کر چلا ہے کہ اپنی اور دوسروں کی سب کی ضرورتیں پوری کر کے لائے گا'

دستی خط بھیجنے میں بعض مرتبہ تکلیف ہوتی ہے:

بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جب کسی کو جاتے ہوئے دیکھا ایک دستی خط کسی کے

نام دے دیا' اس میں بھی اکثر اوقات بہت دقتیں ہوتی ہیں' بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بھیجنے والا مطمئن ہو جاتا ہے کہ خط اس شخص کے پاس پہنچے گا' مگر اتفاق سے خود وہ لے جانے والا ہی کبھی درمیان میں رہ جاتا ہے' کبھی خط ضائع ہو جاتا ہے یہ تو بھیجنے والے کا ضرر ہے کہ اس کا خط نہیں پہنچا' کبھی جس کے نام بھیجا جائے اس کو تنگی ہوتی ہے کہ لانے والا تقاضا جواب کا کرتا ہے کہ میں ابھی واپس جاؤں گا' بعض اوقات تو فرصت نہیں ہوتی' جیسے میرے پاس بعض دستی فتویٰ آتے ہیں اور لانے والا تقاضا کرتا ہے کہ ابھی واپس جاؤں گا' آخر دوسرے کاموں کا حرج کر کے جواب لکھنا پڑتا ہے' اور بعض اوقات بغیر تحقیق کیے جواب لکھ دیا جاتا ہے' اس میں بعض مرتبہ جلدی کی وجہ سے کسی پہلو سے نظر چوک جاتی ہے' اور جواب میں غلطی ہو جاتی ہے' بعض مرتبہ جواب لکھنے کے لیے کتاب دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور جلدی کے سبب عین وقت پر روایت نہیں ملتی۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اسی طرح ایک شخص کو میں نے فرائض کے ایک مسئلہ کا جواب لکھ کر دے دیا' جب وہ چلا گیا تب یاد آیا کہ جواب غلط لکھا گیا' سخت تشویش ہوئی' اس شخص کو تلاش کرایا تو نہ ملا اور یہ پوچھا نہ تھا کہ کدھر جاوگے آخر خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ یا الٰہی میرے اختیار سے تو یہ خارج ہو چکا ہے آپ کے اختیار کی بات ہے' خدا تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی' پندرہ بیس منٹ نہ گزرے تھے کہ وہ شخص واپس آیا' کہنے لگا کہ مولوی صاحب! آپ نے مہر تو لگائی ہی نہیں' مجھے بڑی مسرت ہوئی' میں نے کہا ہاں بھائی لے آؤ' اس سے لے کر جواب کو صحیح کیا اور اس سے کہا کہ بھائی مہر تو میرے پاس ہے نہیں' اس وقت تو خدا تعالیٰ نے میری دعا قبول فرما کر تجھے واپس بھیجا ہے کیونکہ مسئلہ میں ایک غلطی ہو گئی تھی۔

اس واقعے کے بعد میں نے عہد کر لیا تھا کہ کبھی دستی فتویٰ کا جواب نہ دوں گا' اکثر لوگ ایسی باتوں پر مجھے بے مروت کہتے ہیں' لیکن بتلایئے کہ ان واقعات پر کیونکر خاک ڈال دوں اور اس معاملہ میں احتیاط کیسے نہ کروں' اس لیے اب میں نے یہ معمول بنا رکھا ہے کہ جب کوئی شخص دستی فتویٰ لاتا ہے تو اس سے کہتا ہوں کہ ایک لفافہ اپنا پورا پتہ لکھ کر

رکھ جاؤ' میں اطمینان سے جواب لکھ کر تمہارے پاس ڈاک میں بھیج دوں گا۔

میرے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب تو کبھی ایسا کرتے تھے کہ جب ان کو کوئی دستی خط کسی کے نام دیتا ہے تو کہتے تھے کہ اس لفافے میں بند کر کے پورا پتہ اس پر لکھ دو تا کہ پہنچانے میں سہولت ہو اس کے بعد دو پیسے کا ٹکٹ لگا کر اس کو ڈاک خانہ میں چھوڑ دیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ دستی خط دینے کی زیادہ غرض یہی ہے کہ ان کے دو پیسے بچیں سو ہم اپنے پاس سے یہ دو پیسے صرف کر دیں گے مگر پہنچانے کی زحمت اور دوسرے خلجانوں سے تو بچیں گے' ان واقعات سے معلوم ہوا کہ دستی خط دینے سے بچنا چاہیے ہاں شاذ و نادر اتفاقاً جہاں بے تکلفی ہو تو مضائقہ نہیں' لیکن عام طور پر ایسا کرنا نہایت تکلیف کا سبب ہوتا ہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں نمونہ کے طور پر عرض کر دی ہیں' مقصود یہ ہے کہ ہم لوگوں کی معاشرت یعنی آپس کا برتاؤ ایسا ہونا چاہیے کہ کسی سے تکلیف نہ پہنچے۔

معاشرت کا مسئلہ قرآن شریف سے ثابت ہے:

اور معاشرت کا مسئلہ قرآن شریف میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے' جیسے ایک آیت میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ الخ

یعنی اے ایمان والو! دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت کے مت داخل ہو اور اس آیت میں بھی اس مسئلہ کا ذکر ہے جس کو شروع وعظ میں تلاوت کیا گیا ہے' پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں معاشرت کے دو مسئلے بیان فرمائے گئے ہیں' ایک تو یہ کہ اگر صدر مجلس فراخی کرنے کا حکم کرے تو فراخی کر دیا کرو۔ دوسرے یہ کہ اگر مجلس سے اٹھ جانے کا حکم کرے تو اٹھ جایا کرو۔

معاشرت کی اصلاح سے بھی آخرت میں ثمرہ ملتا ہے

ایک بات آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ معاشرت کی اصلاح پر بھی آخرت میں ثمرہ ملے گا' جس سے اشارہ اس طرف ہے کہ شریعت کے احکام میں سے جس حکم کو تم بالکل دنیا سمجھتے ہو اس میں بھی تم کو اجر ملے گا' کیونکہ معاشرت کی باتیں تو خالص دنیا ہی کی سمجھی جاتی ہیں اور آیت میں اس پر اجر کا وعدہ کیا گیا ہے' تو یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ شریعت کے ہر حکم پر اجر ملے گا' خواہ وہ محض دنیا ہی کا سمجھا جا رہا ہو مگر جب اس پر ثواب ملتا ہے تو وہ دین میں بھی داخل ہو گیا' محض دنیا کا نہ رہا' اس کے متعلق بعض بددینوں نے لکھا ہے کہ مولویوں نے شریعت کو طومار بنا دیا ہے' ہر بات کو شریعت میں داخل کر دیا ہے حتیٰ کہ روٹی توڑنا بھی شریعت میں داخل' پانی پینا بھی شریعت میں داخل۔

اس پر مجھے ایک ایسے ہی بے دین کا قصہ دردناک یاد آیا' ایک شخص نے ایمان کی شاخوں میں ایک کتاب لکھی ہے انہوں نے میرے پاس وہ کتاب اصلاح کے لیے بھیجی اور لکھا کہ میں نے یہ کتاب اپنے ایک عزیز کو بھی جو کہ وکالت کرتا ہے' دکھلانے کے لیے بھیجی تھی' اس نے لکھا کہ اگر یہ سب باتیں ایمان میں داخل ہیں تو ایمان (نعوذ باللہ) شیطان کی آنت ہوا اور اس کفریہ کلمہ کو نقل کر کے سخت افسوس ہوا اور رنج کا اظہار کیا تھا' اور اس کے جواب میں اس وکیل کو خط بھیجنے کا ارادہ کیا تھا...... وہ بھی میرے پاس اصلاح کے لیے بھیج دیا تھا' میں نے لکھا اختیار ہے جواب بھیج دو۔ لیکن اس شخص کا دل بالکل مسخ ہو چکا ہے' نفع کی ہرگز امید نہیں یہ گفتگو سے سیدھا ہونے والا نہیں ہے اس کا اصل جواب یہی ہے کہ اس کو خدا کے حوالے کیا جائے' اس گستاخ کی بے تمیزی تو دیکھئے کہ دین کی باتوں کو (نعوذ باللہ) شیطان کی آنت کہتا ہے اگر اس کم بخت کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ سب باتیں ایمان کی شاخیں ہیں' تو اس مضمون کو کسی تہذیب کے طریقہ سے بھی تو لکھ سکتا تھا' لیکن خبیث روح کی خباثت تہذیب کی کیسے اجازت دیتی۔

اصل یہ ہے کہ علم دین یا اہل اللہ کی صحبت نہ ہو تو ایمان کا بھی بھروسہ نہیں' دیکھئے جہالت سے کیا کلمہ کفر بک دیا' کیوں صاحب بتلایئے؟ اگر اس شخص کو بھی کافر کہنا جائز نہ

ہوتو کیا نعوذ باللہ اسلام میں کفر بھی داخل ہے لوگ کہتے ہیں کہ مولوی کافر بنادیتے ہیں' صاحبو! انصاف شرط ہے یہ کافر بنانے کی نسبت تو مولویوں کی طرف اس وقت صحیح ہوسکتی تھی جب کہ وہ کسی کو کفر کی باتوں کی تعلیم وتلقین کرتے' ترغیب دیتے' جیسے مسلمان بنانا سب جانتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم وتلقین کو کہتے ہیں' تو مولوی یہ کام ہرگز نہیں کرتے۔

سچ بتلاؤ تم نے کس مولوی کو کفر کی تعلیم دیتے ہوئے دیکھایاسنا' بلکہ وہ تو ایسی باتوں سے اپنی تقریر اور تحریر میں روکتے رہتے ہیں مگر جب کہ یہ لوگ خود ہی اپنی جہالت اور خباثت سے کفر کرتے ہوں تو مولوی کیا کریں انہوں نے تو کافر نہیں بنایا یہ خود بنے' البتہ مولوی اس کو بتادیتے ہیں تاکہ توبہ کرے اور کفر سے باز آئے تو مولوی لوگوں کو کافر بناتے نہیں بلکہ کافر بننے والوں کو کافر بتادیتے ہیں' ایک نقطہ کا فرق ہے۔

غرض کہ اس قسم کے بے دین لوگوں کے دعوے کے رد کرنے کے واسطے یہ آیت بالکل کافی ہے' دوطور پر ایک تو یہ کہ معاشرت کے ان دونوں حکموں پر عمل کرنا اس آیت سے ضروری اور واجب معلوم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ضروری کام جتنے ہیں سب دین میں داخل ہیں' دوسرا یہ کہ آیت میں دونوں حکموں پر عمل کرنے میں ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اور یہ بھی موٹی بات ہے کہ ثواب دین ہی کے کام میں ہوتا ہے' پس دونوں طور سے یہ معلوم ہوا کہ معاشرت کے یہ دونوں حکم دین کے کام ہیں اور ان لوگوں کا دعویٰ غلط ہے۔

نیک عمل پر ثواب کا ملنا ایمان پر موقوف ہے:

ایک بات اس آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ نیک عملوں پر ثواب ملنا ایمان لانے پر موقوف ہے' کیونکہ آیت میں حکم کی تعمیل پر ثواب کا وعدہ ایمان لانے والوں ہی سے کیا گیا خواہ مسلمان ہو یا نہ ہو۔

بعض عوام ہندوؤں اور شرابی کبابی لوگوں کو بھی بزرگ سمجھتے ہیں:

اس مسئلہ سے عوام لوگوں کے کام کی ایک بات ثابت ہوئی کہ بعض عوام جن کو بزرگوں سے ملنے کا شوق رہتا ہے' ان میں کچھ ایسی بے تمیزی ہوگئی ہے کہ ہندو جوگیوں کو

بھی بزرگ سمجھتے ہیں اور ان مسلمانوں کو بھی جو کہ شراب پی کر نشہ کی حالت میں یا جنون کے مرض میں بے تکی باتیں ہانکتے ہیں' مجذوب سمجھتے ہیں اور ان لوگوں نے مجذوبوں کی ایک عجیب پہچان تراشی ہے کہ اگر اس کی پشت کی طرف کھڑے ہو کر درود شریف پڑھا جائے تو وہ فوراً ادھر منہ کرے۔ سو اول تو یہ خود اس کی بھی دلیل نہیں کہ اس کو درود پڑھنے کی خبر ہوگئی ممکن ہے کہ ادھر اتفاقاً منہ کر لیا' دوسرے زیادہ سے زیادہ اس شخص کو کشف ہونے کی دلیل ہوگی اور کشف ہونا کوئی بڑا کمال نہیں' اگر کافر بھی مجاہدہ اور ریاضت کرے تو اس کو بھی کشف ہونے لگتا ہے' نیز مجنونوں کو بھی کشف ہوتا ہے۔

طب کی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ مجنون کو کشف ہوتا ہے' میں نے خود ایک مجنونہ عورت کو دیکھا کہ اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہیں ہوتا لیکن جب اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ کشف بھی نکل گیا' تو کشف بھی مجذوب ہونے کی دلیل نہیں۔

غرض عوام کو یہ معلوم ہونا نہایت دشوار ہے کہ یہ شخص مجذوب ہے' اور فرض کرو کہ وہ اس علامت سے مجذوب بھی ثابت ہوگئے تو تم نے مجذوب کو تلاش کر لیا' اور حضور اقدس ﷺ کے نام مبارک کی بےحرمتی کی کہ قصداً اس کی پشت کی طرف درود شریف پڑھا' پھر یہ کہ اس کے مجذوب ہونے سے تم کو کیا فائدہ؟

مجذوب سے تو نہ دنیا کا فائدہ ہوتا ہے نہ دین کا' دین کا تو اس لیے نہیں کہ وہ تعلیم ونصیحت پر موقوف ہے اور تعلیم ونصیحت اس سے حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ ظاہر ہے' اور دنیا کا اس لیے نہیں کہ وہ دعا سے ہوتا ہے اور مجذوب دعا نہیں کرتے' کیونکہ اکثر وہ لوگ صاحب کشف ہوتے ہیں ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس طرح ہوگا تو اس کے موافق دعا کرنا تو فضول وبیکار ہے اور اس کے خلاف دعا کرنا تقدیر کا مقابلہ کرنا ہے' بہرحال وہ لوگ دعا نہیں کرتے' البتہ کشف کی بنا پر کبھی بطور پیشین گوئی کے کچھ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں یوں ہوگا' سو اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی اسی طرح ہوتا' اس طرح ہو جاتا کچھ ان کے کہنے کے سبب نہیں ہوا۔

غرض کہ مجذوب سے کسی طرح کا نفع نہیں ہوتا' ہاں دوسرے بزرگوں سے ہر طرح

کا نفع ہوتا ہے' کیونکہ وہاں تعلیم ونصیحت بھی ہوتی ہے اور دعا بھی دین کا بھی نفع ہوتا ہے اور دنیا کا بھی۔

بلکہ مجذوبوں کے فکر میں پڑنے ضرر یہ ہوتا ہے کہ لوگ شریعت کو بیکار سمجھنے لگتے ہیں شریعت کی وقعت وعظمت ایسے لوگوں کے دلوں سے جاتی رہتی ہے کیونکہ مجذوب مکلف نہ ہونے کی سبب شریعت کی پیروی تو کرتے نہیں' پس ان کی فکر کرنے والے بھی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں' حالانکہ مجذوب لوگ تو معذور ہیں' بوجہ عقل جاتی رہنے کے اور ان لوگوں میں عقل وسمجھ سب کچھ ہے اس لیے یہ معذور نہیں' تو یہ کتنا بڑا ضرر ہے جو مجذوبوں کی بدولت بجائے نفع کے پہنچتا ہے اس لیے ان کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے' ایسے ہی جوگیوں کو بزرگ سمجھنا بالکل حرام ہے کیونکہ بزرگی کے لیے ایمان شرط ہے۔

اسی طرح جاہل فقیروں کے بھی پیچھے نہ پڑنا چاہیے' کیونکہ ان کو خود راستہ معلوم نہیں تو دوسروں کو کیا بتائیں گے' ایسوں سے تعلق رکھنے سے آدمی بالکل گمراہ ہو جاتا ہے اور اپنی عاقبت خراب کر لیتا ہے۔

مولوی عام ایمان والوں سے افضل ہیں:

ایک بات اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مولوی لوگ عام مسلمانوں سے افضل ہیں' کیونکہ اول عام طور پر سب ایمان والوں کے درجے بلند فرمانے کا ذکر ہے' پھر خاص طور پر عالموں کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالموں میں کوئی خاص خوبی اور فضیلت ہے جو ان کو جدا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

عام مسلمانوں کو بھی ذلیل نہ سمجھنا چاہیے:

ایک بات اس آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ عام مسلمان بھی خواہ وہ جاہل ہی ہوں خدا تعالیٰ کے ہاں مقبول ہیں' کیونکہ عالموں سے پہلے تمام ایمان والوں کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے' جس میں وہ داخل ہیں' اس لیے عام مسلمانوں کو بھی حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا چاہیے' پس ہر مسلمان اگر وہ مطیع اور فرمانبردار ہو تو مقبول ہے اور فرمانبرداری کی قید

اس وجہ سے لگائی کہ یہاں جو وعدہ درجے بلند کرنے کا کیا گیا ہے وہ ایک اطاعت اور فرما نبرداری پر کیا گیا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ فرمانبرداری پر وہ مرتبہ ملے گا ورنہ نہیں اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی مزدور سے کہا جائے کہ چھت پر مٹی ڈال دو چار آنہ ملیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس مزدور کا پیسہ لینے کا حق مٹی ڈالنے سے ہی ہوگا' ورنہ نہیں' اسی طرح یہاں سمجھو کہ اطاعت کرنے پر وہ درجہ ملے گا' ورنہ نہیں۔ اور اس بات سے عالموں اور غیر عالموں دونوں کی اصلاح کرنا مقصود ہے عالموں کو تو چاہیے کہ جاہل مسلمانوں کو ذلیل اور حقیر نہ سمجھیں' ایسے ہی غیر عالموں میں جو لوگ بڑے اور شریف کہلاتے ہیں ان کو یہ حق نہیں کہ دھنے جلا ہے تیلی چھوٹی ذات کے لوگوں کی ذلیل اور حقیر نہ سمجھیں' کیونکہ یہاں فضیلت کا مدار محض ایمان اور اطاعت پر ہے خواہ کوئی قوم ہو کوئی پیشہ والا ہو' چھوٹی ذات اور بڑی ذات کی کوئی خصوصیت نہیں' بلکہ بہت ممکن ہے کہ چھوٹی ذات والا بہ سبب تقویٰ اور پرہیز گاری کے بڑی ذات والے سے زیادہ مقبول ہو جائے لیکن اس سے دونوں کی ذات میں برابری سمجھنا بڑی غلطی ہے' کیونکہ اول تو یہ بات شریعت کے خلاف ہے' دوسرے یہ کہ تقویٰ طہارت کی قیمت تو آخرت میں ملے گی' اور ذات اور نسب کی قیمت دنیا میں ملتی ہے تو ممکن ہے کہ دنیا میں اس کی قیمت زیادہ ہو اور آخرت میں تقویٰ کی۔ جیسے ہم دنیا ہی میں دیکھتے ہیں کہ ایک جگہ ایک شے کی قیمت دوسری شے سے زائد ہوتی ہے اور دوسری جگہ اس کے خلاف ہوتا ہے یعنی کم قیمت کی زیادہ قیمت اور زیادہ قیمت کی کم غرضکہ کسی مسلمان کو ذلیل وحقیر نہ سمجھو' خواہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہو' البتہ اس کے افعل کو برا سمجھو اور اگر خدا کے لیے ان پر ان کے برے اعمال کے سبب غصہ کرو تو یہ بھی جائز ہے لیکن ان کے ساتھ ہمدردی اور شفقت ہونا بھی ضروری ہے' اپنا نفسانی غصہ اور بڑائی نہ ہو' اور ان میں فرق کے لیے میں ایک موٹی سی مثال بیان کیا کرتا ہوں' جس کو میرے ایک دوست نے بہت پسند کیا اور ان ہی کی پسند سے مجھے بھی اس کی بہت قدر ہوئی۔

وہ مثال یہ ہے کہ معمولی قصوں میں غصہ دو موقعوں پر آتا ہے ایک تو اجنبی پر اور

ایک اپنے بیٹے پر' سو اجنبی سے تو اس کی شرارت پر نفرت اور عداوت ہو جاتی ہے' اور اگر اپنا بیٹا وہی حرکت کرے تو اس سے نفرت نہیں ہوتی' بلکہ شفقت کے ساتھ افسوس و رنج ہوتا ہے اس کے لیے خود بھی دعا کرتا ہے اور دوسروں سے بھی کراتا پھرتا ہے' اس کی حالت پر دل کڑھتا ہے اور غصہ جو ہوتا ہے تو اس کے ساتھ یہ شفقت ملی ہوئی ہے۔

پس اسلامی ہمدردی یہ ہے کہ اجنبی گنہگار کے ساتھ بھی بیٹے کا سا برتاؤ رکھنا چاہیے' اگر کبھی اس پر غصہ آئے اور خیال ہو کہ یہ غصہ خدا کے لیے ہے اس میں نفس کی آمیزش نہیں تو اس وقت دیکھنا چاہیے کہ اگر میرا بیٹا اس حالت میں مبتلا ہوتا تو اس پر مجھے اسی قسم کا غصہ آتا یا نہیں' اگر دل سے نہیں کا جواب ملے تو سمجھئے کہ یہ غصہ خدا کے لیے نہیں ہے بلکہ اپنی بڑائی کا غصہ ہے اور خود کو بڑا سمجھنا اس شخص کے گناہ سے بھی بڑھ کر گناہ ہے' اور نہایت خوف کا مقام ہے خدا تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر گنہگار اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے تو اس کی مغفرت ہو جاتی ہے' اور اگر ایک متقی پرہیزگار اپنے کو بڑا سمجھتا ہے تو وہ مردود ہو جاتا ہے' اگر ایسے واقعات ہوئے ہیں' اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے' سو نہ تو خدا تعالیٰ پر ناز کرنا چاہیے اور نہ ناامید ہونا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ تحقیر تو کسی مسلمان کی کرے نہیں' لیکن غیظ و غضب اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے ہمدردی و شفقت کے ساتھ کرے تو اس کا مضائقہ نہیں۔

اپنے آپ کو بڑا اور اچھا سمجھنا بہت برا ہے:

باقی اپنے آپ کو بڑا اور اچھا سمجھنا خدا تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے آدمی کیسی ہی عبادت کرے اگر اس میں یہ مرض پیدا ہو گیا تو بڑا اندیشہ ہے کہ کہیں مردود نہ ہو جائے' ہمارے ہاں ایک لڑکی تھی نماز روزہ کی پابند (اب اس کا انتقال ہو گیا ہے) اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گئی جو اس قدر پابند نہ تھا' ایک روز کہتی ہے کہ اللہ کی شان' میں ایسی پرہیزگار پارسا اور میرا نکاح ایسے شخص سے ہوا۔

صاحبو! کس قدر حماقت ہے کیونکہ اگر کوئی بزرگ بھی ہے تو ناز کس پر کرتا ہے' اپنی

بزرگی پر ناز کرنے کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے کوئی احمق مریض طبیب کا نسخہ پی کر ناز کرنے لگے کہ ہم ایسے بزرگ ہیں کہ ہم نے دوا پی لی' کوئی اس سے پوچھے کہ اگر دوا پی لی تو کس پر احسان کیا نہ پیتا مرض میں گھل گھل کر مرتا' اسی طرح اگر کسی نے نماز پڑھی' روزہ رکھا تو کس پر احسان کیا اور کیا کمال کیا' نہ کرتا جہنم میں سڑتا۔

صاحبو! شریعت بھی ہماری روح کے واسطے ایک نسخہ ہے اس پر عمل کر کے ناز کیسا' البتہ بجائے ناز کے خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائی:

حاصل یہ کہ گنہگار مسلمانوں کو بھی خدا تعالیٰ کے یہاں درجہ اور مرتب مل سکتا ہے اس لیے اس کو بھی حقیر نہ سمجھے۔

ایک بات اس آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ نیک کاموں میں کمال کا درجہ خلوص سے ہی حاصل ہوتا ہے' کیونکہ عالموں کو جدا طور پر ایک خاص امتیازی شان سے ذکر کیا گیا' تو اس کا سبب خلوص ہی ہے کہ ان میں خلوص زیادہ ہوتا ہے' اور اس مسئلہ کو بیان کرنا اس لیے ضروری ہے کہ آج کل لوگ نیک کاموں کو تو شوق سے کرتے ہیں' لیکن خلوص کی پرواہ اکثر نہیں ہوتی' نیت خراب ہوتی' حالانکہ خلوص وہ چیز ہے کہ اس کی بدولت صحابیوں رضی اللہ عنہم کا مرتبہ اس قدر بلند ہوا کہ اس کے تھوڑے سے جو اللہ کے واسطے خرچ کرنا' اور ہمارا احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنا برابر نہیں' اور اگر کوئی کہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت ہے جو اتنا بڑا مرتبہ ہوا' میں کہوں گا کہ ان حضرات کا خلوص بھی صحبت ہی کی برکت سے ہے' اب خواہ صحبت کو اس کا سبب کہو یا خلوص کو' ان کو یہ دولتیں حاصل تھیں میں نے اپنے پیر و مرشد سے سنا ہے کہ عارف کی (یعنی وہ شخص جس کو خدا کی سچی معرفت حاصل ہو) ایک رکعت دوسروں کی ایک لاکھ رکعت سے افضل ہے تو وجہ اس کی یہی ہے کہ اس کی ایک رکعت میں بوجہ معرفت کے خلوص زیادہ ہوگا۔

اس مسئلہ سے ایک اور بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ آج کل اکثر لوگ بعضے انگریزی خوانوں کی تعریف کیا کرتے ہیں کہ یہ اس قدر انگریزی پڑھے ہوئے ہیں لیکن

قرآن شریف کے بہت پابند ہیں' یا نماز پنج وقتہ پڑھتے ہیں اور ان کی کی باطنی حالت خلوص وغیرہ پر بالکل نظر نہیں جاتی' میں بھی مدتوں اس دھوکے میں مبتلا رہا' مگر میرے ایک نوجوان دوست نے ایسے لوگوں کی نسبت کہا کہ بعض لوگوں میں دین کی صورت ہوتی ہے' مگر دین کی حقیقت نہیں ہوتی یعنی ان کے دلوں میں دین رچا ہوا نہیں ہوتا' اسی طرح ان لوگوں میں دین کی کوئی خاص عظمت اور محبت نہیں ہوتی' چاہے ظاہر میں نیک کاموں کے پابند ہوں' مگر امتحان کے وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں کوئی خاص محبت وحمیت دین کی نہیں' اور یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں' کیونکہ اصل دینداری یہی ہے کہ دل میں دین کی عظمت ومحبت گھس گئی ہو' ہاں اگر کبھی شاذ و نادر کسی عذر کے سبب عمل میں کوتاہی ہو جائے تو اور بات ہے۔

یہاں تک آیت کے اکثر مضمون کا بیان ہو چکا' آگے ارشاد فرماتے ہیں:

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

(ترجمہ) ''اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں پر خبردار ہیں''

اس کو پہلے مضمون سے یہ تعلق ہے کہ تم ہر حکم کی پابندی کرو اور اس میں کوتاہی نہ ہونے دو' کیونکہ خدا تعالیٰ کو تمہارے ہر کام کی خبر ہے' ظاہر کی بھی باطن کی بھی' تو خدا تعالیٰ کو اس کمی اور کوتاہی کی بھی اطلاع ہو جائے گی جو تمہاری نیتوں میں ہوگی' پس کسی عمل میں کوتاہی نہ کرو اور ہر نیک کام کو قاعدہ کے موافق کرو' گویا اس سے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک مضمون کا خیال میں رکھنا سکھلایا ہے' کہ اگر اس کا دھیان رکھیں تو عمل میں کبھی کوتاہی نہ ہو' وہ مضمون یہ ہے کہ ہر وقت یہ خیال رکھیں کہ اللہ تعالیٰ میرے ظاہر و باطن کو دیکھ رہے ہیں' اس کی مشق اور عادت سے کچھ دنوں کے بعد دل میں خود بخود یہ بات پیدا ہوگی کہ گویا میں خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں' پھر آدمی دین میں پختہ ہو جاتا ہے' اس کے خلاف کرنے کی ہمت نہیں ہوتی' کیونکہ اگر کسی کو یقین ہو کہ اس کام کی حاکم کو بھی اطلاع ہے تو پھر اس میں کوتاہی نہیں ہوا کرتی' اور حاکم تو بڑی چیز ہے' اگر غیر حاکم کا بھی کوئی کام

کرے لیکن اس کو یقین ہو کہ اس کو خبر ہے تو پھر اس میں کوتاہی نہیں کرتا' پس خدا تعالیٰ کے متعلق جس کا یہ یقین ہو وہ کیسے نیک کاموں میں کمی کر سکتا ہے کیونکہ وہ تو بادشاہوں کے بھی بادشاہ ہیں۔

صاحبو! اس بات کا خیال رکھنا نہایت سہل ہے اس میں نہ کسی پیر کی ضرورت ہے نہ خلوت کی ضرورت ہے ہر شخص اس سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے اپنے کاروبار کو بھی کرتے رہیں اور اس کا دھیان بھی رکھیں کہ خدا تعالیٰ کو سب خبر ہے' تو ویسے تو فی نفسہ اس بات کو دھیان میں رکھنے میں پیر وغیرہ کی ضرورت نہیں لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس میں کامیابی بغیر پیر کے ہے مشکل' کیونکہ ہر عمل میں دو چیزوں کی حاجت ہے' ایک تو صحیح رائے اور تجویز کی۔

دوسرے ہمت کی' آج کل ہم لوگوں میں دونوں کی کمی ہے' رائے کی کمی یہ کہ اکثر اوقات ہم ایسے عمل کو تجویز کر لیتے ہیں جو ہمارے لیے مناسب نہیں ہوتا۔

اسی طرح بعض اوقات تجویز تو درست ہوتی ہے لیکن عمل کی ہمت نہیں ہوتی' اور اگر تھوڑی بہت ہوئی بھی تو درمیان میں ٹوٹ جاتی ہے پیر تجربہ کار ہوتا ہے جو عمل اس کے مناسب ہوتا ہے وہ اس کو تجویز کرتا ہے اس کے کہنے میں برکت ہوتی ہے کہ اس سے ہمت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس کی وجہ واقع میں خواہ کچھ بھی ہو' یہ ضرور قدرتی بات ہے کہ جب کسی کو پیر بنا لیا جاتا ہے تو اس کی مخالفت کم ہوتی ہے' تو رائے کے درست کرنے کا اور ہمت کے قوی کرنے کا عادة بجز کسی کو پیر بنانے کے اور کوئی ذریعہ نہیں' تو عمل کے لیے کسی پیر کا دامن پکڑنا ضروری ہوا' مگر پیر کامل ہونا چاہیے اور اس کے پہچاننے میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے اس لیے اس کی پہچان معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔

پہچان یہ ہے کہ علم دین بقدر ضرورت رکھتا ہو' خواہ پڑھ کر یا عالموں کی صحبت سے' عمل میں پختہ اور چست ہو' مریدوں کی روک ٹوک کرتا ہو۔ کسی مسلم پیر سے اس کا تعلق اور سلسلہ ہو' عالموں سے نفرت نہ ہو' ان سے مسئلوں کے دریافت کرنے میں عار نہ ہو اس

کی صحبت میں آخرت کی رغبت اور دنیا کی نفرت پیدا ہونے کی خاصیت ہو پس جس شخص میں یہ علامتیں ہوں وہ کامل ہے اس کا دامن پکڑلے اور اس سے اپنی اصلاح کرانی شروع کردے اور ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت ہونا ضروری نہیں۔ یہ مضامین جو اس وقت بیان کیے گئے ہیں ضروری ہیں ان کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے:

اب دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی
توفیق عطا فرمائیں اور خاتمہ بالخیر فرمائیں۔

(امین)

بحمد اللہ تعالیٰ

@TaleefatHakeemUlUmmatThanvi

ہماری دیگر مطبوعات

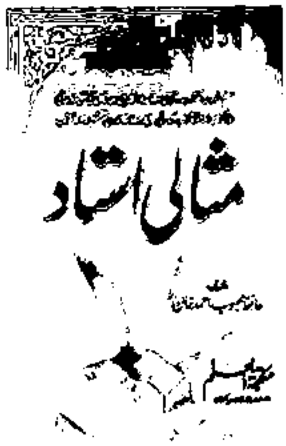

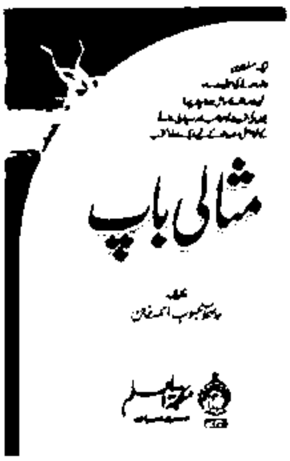

ناشر
مکتبۃ العلم
۱۸-اردو بازار لاہور، پاکستان

37231788
37211788